READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM





جلد46 • شمارہ 08 اگست 2016 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



محفلِ شعر و سخن
قارئین 168

آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

دھماکا
عظیم جمال 171

ایک دوسرے کو پانے کی تمنا میں فنا
ہوجانے والے عاشقوں کا قصہ

ماروی
محی الدین نواب 176

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی
عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دلربا سلسلہ

آگ کا دریا
منظر امام 225

عشق میں سربلند کرنے والے ایک
معصوم عاشق کی کارفرمائیاں

شیخ نجیب الدین متوکل
ضیا تسنیم بلگرامی 231

اللہ پر توکل کرنے والے ایک
متوکل ولی کی مستقل مزاجی

ڈھونگ
سلیم انور 243

مجرمانہ بساط پر قانون کی چالیں
چلنے والے کچھ ذمہ دار افسران کا قصہ

اسیرِ خیال
کاشف زبیر 248

معاشرتی رشتوں اور قانونی اداروں
کے مابین زخمی مسافتوں کی پراثر داستان

کترنیں
ادارہ 000

دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے
اقتباسات، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

محترم قارئین
السلام علیکم !

اگست 2016ء کا خوب صورت شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ ہر سال جب 365 کا دائرہ مکمل ہوتا ہے تو مختلف انداز سے تاریخی لمحات وواقعات کی یاد منانے کا اہتمام بڑے زوروشور سے کیا جاتا ہے۔ واقعے کی مناسبت سے کچھ ارادے، وعدے اور دعوے بھی کیے جاتے ہیں مگر وہ شاید وقتی جوش وجذبات میں کہے سنے گئے فقط الفاظ ہی ہوتے ہیں جن پر عمل کرنے کی نیت ہرگز نہیں ہوتی۔ اسی تناظر میں لیجیے جناب 14 اگست کے تاریخی لمحات 2016ء میں بھی اپنی اہمیت کا احساس دلا رہے ہیں مگر کون ہے جو ان دکھوں اور قربانیوں کی لاج رکھے جن کے بدلے یہ سرزمین ہمارے حصے میں آئی اور ہم اپنے حصے کا حق ادا کرنے میں بری طرح ناکام رہے۔ مضبوط معیشت، پُرسکون ماحول، اعلیٰ تعلیمی معیار، بے روزگاری کا خاتمہ، اچھے دنوں کی آس اور دہشت گردی کا خاتمہ سب دیوانے کا خواب ہیں شاید جن کے متعلق مائک ہاتھوں میں لے کر بااختیار طبقہ کہتا اور سمجھاتا تو پھرتا ہے مگر خود سمجھنے کے لیے ہرگز تیار نہیں...... کیا امجد صابری قوال کا دن دہاڑے بہیمانہ قتل ان دعوؤں کی نفی نہیں کر رہا جو آئے دن عوام سے کیے جاتے ہیں۔ اس سال چھ ماہ کے عرصے میں 160 دہشت گردی کی وارداتیں کیا ہمارے لیے لمحۂ فکریہ نہیں ہیں؟ صرف ایک واقعے سے دوسرے واقعے کے درمیان آجانے والے خاموش وقفے کو ہم ملک میں امن وامان کی صورتِ حال کو بہترین قرار دے کر بے فکر ہوجاتے ہیں۔ نہ تو قائداعظم محمد علی جناح کا یہ مقصدِ حیات تھا اور نہ ہی شاعرِ مشرق کا یہ خواب اور نہ ہی ان مظلوم معصوم اور سادہ لوح پُرخلوص لوگوں کی قربانیوں کا یہ حق ادا کیا جا رہا ہے۔ کراچی میں پے در پے ایسے واقعات سیکیورٹی کے حوالے سے ایک سوالیہ نشان بن گئے ہیں۔ جب تک ذمّے داران نیک نیتی اور پختہ عزم کے ساتھ دہشت گردی اور بھتا خوری کے خلاف قدم نہیں اٹھائیں گے تب تک ایسی وارداتیں ہوتی رہیں گی لیکن افسوس اس ''نیک نیتی'' کا ہی تو فقدان ہے ہمارے ہاں۔ ویسے بھی دہشت گردوں اور جرائم پیشہ عناصر کے خلاف قدم اٹھانا کسی ایک فرد یا ادارے کی ذمّے داری نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ہر طبقہ فکر کے ساتھ مل کر سیاست دانوں کو بھی اقدامات کرنا چاہئیں۔ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا جائزہ لیتے ہوئے مضبوط حکمتِ عملی تیار کرنی چاہیے۔ رمضان المبارک میں جہاں یہ حادثہ پیش آیا وہیں ذمّے داران کے دعوؤں اور وعدوں کی قلعی بھی کھل گئی۔ بہت دعوے سے وعدہ کیا گیا تھا کہ سحر اور افطار کے دوران لوڈشیڈنگ بالکل نہیں ہوگی اور ہوا کیا...... خاص طور پر انہی اوقات کو ہدف بنا کر معصوم لوگوں کو کتنی اذیتوں سے دوچار کیا گیا۔ چھ ماہ کے وعدے سے لوڈشیڈنگ کا خاتمہ کرنے والوں کو آج تقریباً تین سال ہوچکے مگر آج بھی یہی نعرہ زندہ ہے کہ ''بہت جلد لوڈشیڈنگ کا خاتمہ ہوجائے گا۔ وہ وقت دور نہیں جب ملک سے اندھیرے چھٹ جائیں گے اور پورا ملک روشن ہوگا۔'' یہ کیسا اسلامی ملک ہے جہاں انسانیت کی قدر ہے اور نہ ہی اسلامی تہواروں کا خیال کیا جاتا ہے۔ طبقۂ اشرافیہ کو اپنے وسائل سے لطف اندوز ہونے سے فرصت نہیں اور باقی طبقات اپنے اپنے دائرے میں عزت اور تحفظ سے جینے کی گویا جنگ میں مبتلا ہیں۔ ہم نے کہا تھا نا کہ صرف دن منانے سے کچھ نہیں ہوتا...... خلوص کے ساتھ عملی اقدامات کی شدت سے ضرورت ہے۔ اگر اب بھی سنجیدگی سے مثبت رویہ اختیار نہ کیا گیا تو مستقبل ایک سوالیہ نشان بن کر رہ جائے گا...... عید کی گہما گہمی اور موسم کی گرما گرمی سے فراغت کے بعد اب چلتے ہیں اپنی نٹ کھٹ سی محفل کی جانب جہاں نئے نئے سندیسے ہمارے منتظر ہیں۔

✠ قیصر اقبال گچہ، کلول، ضلع بھکر سے محفل کی رونق بن رہے ہیں ''کئی ماہ کی غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر سے اپنی محفل میں حاضر ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ زندگی بہت مصروف ہوگئی ہے مگر اس مصروف زندگی میں بھی اگر زندگی کا محور ہمارے گرد گھومتا ہے تو مہینے کا محور سسپنس کے گرد گھومتا ہے۔ 2016ء کا ساتواں شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ سرورق کی ماہ جبیں حیران اور کھوئی کھوئی سی ہے۔ شاید کراچی کی ٹھنڈی آب وہوا سے پنجاب کی گرم آب وہوا میں آگئی ہے (ارے صاحب اب کراچی کی آب وہوا میں ٹھنڈک کہاں...... آگ ہی آگ ہے) چلو سانو کی۔ انشائیہ حقیقتِ حال کا لب لباب یہ ہے کہ ہم سوالوں کے آدمی ہیں اور جوابوں سے ہماری جھولی خالی ہے۔ اپنی محفل میں محمد خواجہ صدارت کے منصب پر نظر آئے۔ مبارک باد۔ اشفاق شاہین کو ان کے حال پر چھوڑا تو ہیلو ہائے کی تحریم شاہ سے مگر موصوفہ کو ٹائٹل گرل کی جیولری کے چکر میں پایا تو ہم قاسم رحمان کو چکر دے کر زرین آفریدی کے پاس جا ٹھہرے۔ موصوفہ کو بے انتہا باتونی پایا تو ان کو ان

انشائیہ

ایک آرزو

جون ایلیا

میں گلہ کرتا ہوں، میں لہو میں لتھڑا ہوا گلہ کرتا ہوں۔ زندگی اس شہر میں بُری طرح بے حرمت ہوئی ہے۔ خوں ریزی کے ان جانے ہنرمندوں نے اس شہر کی زندگی کو بڑی سفاکی سے لتاڑا ہے اور اس شہر کا حلیہ بگاڑا ہے اور اس کی راہوں اور اس کے چوراہوں کو بڑی شقاوت سے اجاڑا ہے۔

''جون ایلیا! یہ بات تو تم نے پرسوں بھی کہی تھی اور کل بھی۔''

''ہاں، یہ بات میں نے پرسوں بھی کہی تھی اور کل بھی۔ اور یہ بات میں آج بھی کہہ رہا ہوں، کل بھی کہوں گا، پرسوں بھی کہوں گا اور کہتا ہی رہوں گا اس لیے کہ جو کچھ تھا، وہ ہے اور جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ ہوئے جا رہا ہے۔ مجھے اس شہر کے شہریوں کے دکھ جھیلنے کی نوکری ملی ہے۔ اگر اس نوکری سے میرا دل اچاٹ ہوگا تو میں اپنے آپ کو حرام خور سمجھوں گا۔ یہ نوکری پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ نے مجھے بڑی بڑی سفارشوں کے بعد دی ہے۔''

''ہاں، میں اس شہر کے وجود کے سڑے ہوئے زخموں کا، پھپھوندے ہوئے پھوڑوں کا نوکر ہوں، چاکر ہوں۔ اور یہ نوکری، یہ چاکری میرے لیے بڑی عزت کی نوکری اور بڑے فخر کی چاکری ہے کہ اس کی کوئی تنخواہ نہیں ہے۔ کیا میں زخموں سے، اپنے ہی زخموں سے تنخواہ لوں گا؟ کیا میں پھوڑوں سے، اپنے ہی پھوڑوں سے روزینہ طلب کروں گا؟''

''تم جو ہو یعنی تم! تم بھی عجب ہو اور تمہارا روگ بھی عجب ہے۔''

''ہاں، میں بھی عجب کوئی ہوں اور میرا روگ بھی عجب کچھ ہے۔ مجھے اپنے اس روگ کی پہچان نے دل اور دماغ کی جو صحت بخشی ہے، وہ میری روح کا بہت ہی بڑا ابتلا ہے۔ میں اپنی روح کے اس ابتلا سے کسی طرح بھی نجات نہیں پا سکتا۔''

''تم اپنی روح کے اس ابتلا سے کسی طرح بھی نجات نہیں پا سکتے! آخر ایسا کیوں ہے؟''

''ایسا یوں ہے کہ یہ ابتلا میرا، میرا ہی نہیں ہمارا مقسوم ہے۔ یا یوں کہہ لو کہ یہی میری بود و نبود ہے۔ ہماری بود و نبود ہے۔

''لوگو! کیا تم نہیں جانتے، کیا تم میری یہ بات نہیں مانتے کہ میں تم میں ایک عمر سے بڑی اذیت ناکی کے ساتھ تڑپا یا گیا ہوں۔ پر کسی کے نہ جاننے اور نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے اور ایسا تو ہونا ہی تھا۔ مجھے تو اپنے لہو سے اپنے زخموں کو دھونا ہی تھا۔ پر میں ہوں کون؟ یعنی یہ کہ میں ہوں کون، میں کوئی بھی تو نہیں ہوں۔ یعنی یہ کہ تم، یعنی یہ کہ میں۔ ہاں، میں اور تم!

''میں اپنے آپ پر اور اس شہر کے شہرۂ آفاق شہریوں پر صبح سے شام تک اتنی بار ہنستا ہوں، اتنی بار ہنستا ہوں اور اتنی بار روتا ہوں، اتنی بار روتا ہوں کہ بس۔ کیا ہماری سرنوشت ایسی نہیں ہے کہ اس پر بار بار ہنسا اور بار بار رویا جائے؟''

''ہاں، تمہاری سرنوشت ایسی ہی ہے کہ اس پر بار بار ہنسا اور بار بار رویا جائے۔''

ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں اپنے ہونے کا ایسا بھگتان بھلا کس گروہ نے بھگتا ہوگا جیسا بھگتان تم نے بھگتا۔ مجھے تمہارا ہونا، ہر لمحہ ہونا بہت ہی اولوا ولو لگتا ہے، بہت ہی اولو اولو کہ ہو اور ہرگز نہیں ہو۔

کھڑکی کے باہر رات بلا کی اندھیری ہے۔ جانے اس وقت کیا بجا ہوگا! وقفے وقفے سے گولیاں چلنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ ہم ان آوازوں کو اپنے وجود کا لحن کیوں نہ جانیں۔ اپنی نمود کا آہنگ کیوں نہ گردانیں؟ اے گروہ! اگر تیری تہذیب کے سب سے بڑے نوا گر امیر خسرو اس لحن اور اس آہنگ کو سنتے تو کتنے چاؤ سے سر دھنتے!

''اس شہر کا چارہ گر کون ہے اور تیماردار کون؟''

''اس شہر کا چارہ گر کون ہے اور تیماردار کون...... یہی تو کہا نا تو نے؟''

''ہاں، میں نے یہی کہا اور اپنی اس کہن کو سہا۔''

اس شہر کا کوئی چارہ گر نہیں ہے، کوئی تیماردار نہیں ہے۔ دوسرے شہر اس شہر کی حالت پر بس ترس ہی کھا سکتے ہیں اور اس کے سوا بھلا وہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟ سو وہ ترس کھا رہے ہیں۔ اے ترس کھانے والو! میں تم سے اس شہر کی حالت پر بہت زیادہ ترس کھانے کی بھیک مانگتا ہوں۔ یہ شہر اپنے ہونے کے جس عذاب میں مبتلا ہے، اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ پر اس کا اندازہ لگانا اس ملک کی ہر بستی اور ہر شہر کا فرض ہے۔ یہ شہروں کا شہر ہے۔ یہ کسی ایک زبان بولنے والے گروہ کا شہر نہیں ہے۔ یہ تو برادریوں کی برادری کا شہر ہے۔

''اے شہر! یرمیاہ نبی نے یروشلم کا مرثیہ کہا تھا۔ میرا سینہ بھی دکھ سے بری طرح بھرا ہوا ہے۔ میرے پپوٹے بھی سوج گئے ہیں۔ تیری راتیں مجھے بڑی بے رحمی سے جگاتی ہیں۔ تیرے دن مجھے جان لیوا اذیت سے ہلکان رکھتے ہیں۔ تیری گلیاں، تیرے راستے اور تیرے چوک میرے خون سے لتھڑے ہوئے ہیں۔ میرا خون میں نہایا ہوا بدن جگہ جگہ پڑا ہوا تڑپ رہا ہے، میں جگہ جگہ دم توڑ رہا ہوں۔ آخر میں اپنی لاشیں کہاں کہاں سے اٹھاؤں؟

''میں تجھے پھر سے تازہ دم دیکھنا چاہتا ہوں۔ تجھے ایک نئے انداز کی زندگی سے آراستہ دیکھنے کی آرزو رکھتا ہوں۔ مجھے ایک بات کہنی ہے۔ میری اس بات کو دھیان دے کے سننا اور وہ یہ کہ زندگی ایک طور کا نام ہے۔ نفس کے ایک طور کا نام ہے۔ تو بہت ہارا مارا ہے پر دیکھنا نفس کے اس طور کو کبھی نہ ہارنا۔''

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-



کی ہی باتوں کا چکر دے کر ہم ادریس خان کی نظر بچا کر صادق معاویہ سے جا ملے مگر موصوف کو احتجاج کرتا دیکھ کر حافظ شعیب، عبادت کاظمی اور بشیر ایاز کو ان کے پاس چھوڑا اور خود صفدر معاویہ کو ساتھ لے کر مرحا گل کے پاس جا ٹھہرے۔ احتجاج سے جان بچا کر نکلے تھے تو یہاں مرحا گل صاحبہ دھرنے کی تیاری میں تھیں۔ وارث ملاح، عبدالغفار اور پاشا انکل کو دھرنے میں بٹھایا اور دور سے ہی عبدالجبار صاحب کو سلام کیا۔ بلیک ہول کے قیدیوں کے ساتھ اظہار افسوس کیا۔ کہانیوں کا رخ کیا۔ ابتدا شیش محل سے کی۔ ہنگاموں سے لبریز اس قسط میں فاروق بملا بھابیہ کے اہم راز سے واقف ہو چکا ہے۔ ربن وادا کی عارف سے ملاقات بھی خوب رہی۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ مرحوم نواب انکل کی ماروی بھی اپنے جوبن پر ہے۔ مراد، زیب النسا اور ہم زاد کی ہنگاموں بھری زندگی میں پیدا ہونے والی بچی کی صورت میں کچھ انوکھے باب کھلنے والے ہیں۔ حکایت سود و زیاں آخری صفحات کی ایک بہترین کہانی مگر انجام تشنہ سا لگا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ دس سال کا جمپ لگا کر سیف الدین کے بچوں کو بھی کامیابی کے تخت پر بٹھا دیا جاتا۔ (زندگی میں سب کچھ ویسا تو نہیں ہوتا جیسا ہم چاہتے ہیں) بیگ صاحب کا پہلا پتھر ٹھیک نشانے پر لگا اور جہاں وہ اپنے مؤکل عرفان کو بچانے میں کامیاب ہوئے، وہاں اصل قاتل جواد حسین بھی ان کی گرفت سے نہ بچ سکا۔ محبت اور فاصلے میں بہزاد نے دو پیار کرنے والوں کو ملانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تنویر ریاض کی دام میں میری کی موت کا دکھ ہوا مگر ایڈورڈ اپنی زندگی کی بازی ہارنے سے پہلے قاتل کو بے نقاب کر گیا۔ امانت آج کے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت، بانو اور کریم داد اسی انجام کے مستحق تھے۔ سویٹر گرل میں جونی شیرل کے ہاتھوں عبرت ناک انجام سے دو چار ہوا۔ عزت کا سوال میں دوسروں کی عزتوں سے کھیلنے والے رئیس کی اپنی عزت کسی کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی تھی۔ داستان گونگوں کی...... بے شک گونگا بن جانے میں ہی عافیت ہے۔ گم شدہ اور مات بھی خوب رہیں۔ اللہ کے ولی فضل رحمٰن کے ایمان افروز واقعات دل کی دنیا کو منور کر گئے۔ ابتدائی صفحات پر بہشت زار کا اختتام کیا۔ عروج کو زوال آیا اور خور شاہ، جبار اور اسد قبر کی مٹی کی خوراک بنے۔ کترنوں سے محظوظ ہوئے تو محفل شعر و سخن میں اچھا انتخاب پڑھنے کو ملا۔ مجموعی طور پر جولائی کا شمارہ بہترین رہا۔" (مجموعی طور پر آپ کا تبصرہ بھی شاندار رہا)

✠ **صادق معاویہ سعیدی**، خان پور، ضلع رحیم یار خان سے تشریف لائے ہیں "جولائی 2016ء کا سسپنس لینے کڑکتی دوپہر میں بک اسٹال پر گئے۔ سسپنس مل گیا۔ قرار آ گیا۔ واپس اپنی شاپ پر پہنچے تو بجلی غائب، شدید گرمی، ایک ہاتھ میں ڈائجسٹ دوسرے ہاتھ میں ہمت فین (ہاتھ کا پنکھا) دل کی اتھاہ گہرائیوں سے...... واپڈا کے لیے اور نظریں سرورق پُر سرورق کی دوشیزہ، پیکر غیرت نسوانی عذرا ہاشمی اور مونا رضوان کی منتظر محسوس ہوئی۔ فہرست پر نگاہ ڈالی اور پیارے کاشف زبیر کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہوئے آپ کا اداریہ پڑھا۔ مختلف ایام پر نمود و نمائش کے لیے کیے جانے والے بے تحاشا اخراجات۔ اگر متعلقہ معاملہ سدھارنے پر دیانت داری سے خرچ کیے جائیں تو معاملات بہت بہتر ہو سکتے ہیں۔ اپنی محفل میں آئے تو محمد خواجہ کرسیٔ صدارت پر براجمان تھے۔ سوا لاکھ مبارکاں۔ بڑی باریک بینی اور عرق ریزی سے لکھا تبصرہ صدارت کا حقدار تھا۔ بہت خوب جناب اور وزارت اشفاق شاہین کے نام۔ پہلے تولو، پھر بولو کے مصداق چنیدہ الفاظ کے ساتھ مختصر تبصرہ۔ کیا کہنے اشفاق شاہین جی اور سفارت تحریم شاہ کے حصے میں آئی۔ ایگزامز کی مصروفیت کے باوجود سسپنس پر جاندار اور منفرد انداز کا تبصرہ ہمیں تو بہت اچھا لگا۔ عبادت کاظمی اللہ کریم آپ کے والد گرامی کی مغفرت فرمائے اور آخرت کی تمام منزلیں آسان فرمائے (آمین) اور اپنے ہی شہر سے حافظ شعیب معاویہ کی تشریف آوری جمن آون، انکھیں ٹھرن۔ رانا حبیب الرحمان لوٹ آؤ یار، باقی تمام دوستوں کے تبصرے بھی ٹھیک تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل پڑھی۔ یہ قسط بھی لاجواب رہی۔ اسما قادری نے اس قسط میں بھی فاروق اور جولیٹ پر ترس نہیں کھایا اور ماروی پوری رفتار سے بھاگ رہی ہے۔ طاہر جاوید مغل فہرست میں موجود ہوں تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ محبت اور فاصلے یادگار کہانی ہے۔ ابراہیم جمالی کی عزت کا سوال حقائق کی ترجمان اور بے باک تحریر تھی۔ انتہائی سبق آموز اور عبرت انگیز۔ واقعی اگر ہم کسی کی عزت کے درپے ہوں گے تو ہماری عزت بھی برباد ہو کر رہے گی۔ ویلڈن ابراہیم جمالی اور داستان گونگوں کی منظر امام معاشرے کے نبض شناس لکھاری ہیں۔ حکایت سود و زیاں ناہید سلطانہ اختر کا آخری صفحات کے لیے لازوال تحفہ تھی۔ ہمارے بے حس معاشرے کی عکاس اور ہمارے مجموعی رویوں کی ترجمان کاوشیں۔ کاش کہ ہم ایسی تحریریں صرف چٹخارے کے لیے نہ پڑھیں بلکہ ان تحریروں سے سبق حاصل کرتے ہوئے اپنے رویے بھی ٹھیک کریں (اللہ کریم توفیق دے، آمین) ضیا تسنیم بلگرامی کی فضل رحمان، اللہ کے برگزیدہ ولی کی داستان حیات دل منور کر گئی۔ کئی مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ ہر مرتبہ ایمان و عقیدت میں اضافہ محسوس ہوتا ہے۔ حضرت فضل رحمان کی پیارے نبی ﷺ کی مقدس سنتوں کا عاشقانہ اتباع اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے والہانہ عشق پڑھ کر اللہ کی قسم کلیجا ٹھنڈا ہو گیا۔ اگر ممکن ہو تو قینچی نہ چلائیے گا آپ کا احسان ہوگا۔" (ارے صاحب اس کے بغیر گزارہ ممکن نہیں ہے۔ ورنہ یہ سارے قارئین دھرنا دے کر بیٹھ جائیں گے...... پھر کیا ہوگا؟)

✠ **مسز صدیقی** گلشن اقبال کراچی سے تشریف لائی ہیں "جنوری کے بعد آج ایک بار پھر تنویر ریاض کی معمولی عورت نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ بہترین کہانی لکھی ہے۔ بے شک جب کسی کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو پھر وہ بھی کچھ کر گزرتا ہے کہ دکھی دل ہی دوسروں

کا دکھ سمجھتا ہے۔ اس نے طوفان سے لڑ کر ایک بندی کو نئی زندگی دی، دل خوش ہو گیا پڑھ کر میری طرف سے بہت بہت مبارکباد۔ غم گسار دوسری کہانی سلیم انور کی دل چھو لینے والی عمدہ تحریر، ان کو بھی بہت مبارکباد۔ خدا ان لوگوں کی تحریروں میں اور نکھار لائے اور یہ آپ کے رسالوں کو چار چاند لگاتے رہیں۔ اب بزم میں شرکت کرنے والوں نے جس طرح مجھے پذیرائی دی، بے حد شکر گزار ہوں۔ بیٹی طاہرہ گلزار، مرحا گل، زرین آفریدی، بیٹے صفدر معاویہ آپ جیسے بیٹوں پر پاکستان کو فخر ہے۔ خدا لمبی عمر صحت و تندرستی اور خوشیاں دے اور آپ اپنے خاندان کا نام روشن کریں۔ میں پیاری بیٹیوں کو جس میں سعدیہ بخاری بھی شامل ہیں، دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہوں کہ خدا تم سب پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔ اچھے نصیب، خوشیاں، صحت و تندرستی سے پھولو پھلو اور میرے لیے بھی دعا کرنا کہ خدا اپنے سوا کسی کا محتاج نہ کرے۔ آمین۔ آخر میں جو بات کہنی ہے، وہ بہت مشکل لگ رہی ہے۔ کاشف زبیر لاکھوں لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا کر جنت میں گھر بسا بیٹھے، خدا وہاں انہیں بہترین درجات عطا کرے۔ آمین۔''

✠ **محمد انعام**، لودھراں سے چلے آرہے ہیں ''سب سے پہلے اداریہ پڑھا کہ اعلیٰ عہدیداروں کو دوسرے کے مسائل حل کرنے کا کچھ پتا نہیں لیکن خود کرو ڑپتی، اپنی تنخواہ اور مراعات بڑھانے کے لیے کتنے فکر مند ہیں۔ محمد خواجہ اپنی کوششیں جاری رکھیں تاکہ عوام اور طالب علم غیر نصابی کتابیں پڑھ کر اپنے علم میں اضافہ کریں۔ ہمارے خود غرض حکمرانوں نے اسکولوں اور کالجوں کی کتابوں سے معیاری مواد نکال لیا ہے۔ سسپنس ذہن کو فریش کر دیتا ہے۔ قاسم رحمان دوستوں کی تعریف کرتے ہوئے۔ کیوں بھئی پیپر اچھے ہوئے یا پھر...... کہانیوں کا آغاز شیش محل سے کیا۔ میری پسندیدہ کہانی میں بدنام لوگوں کے دل کے اندر خلوص، پیار محبت کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اتنا پیار محبت خون کے رشتوں میں بھی نہیں۔ ربن اگر اپنے آدمی نہ بھیجتا تو رامو کا کام ہو جانا تھا۔ ربن جولیٹ سے اس کے دشمن کے بارے میں اگلوانے میں ناکام رہا۔ اشارے کے ذریعے دلدار آغا تک پہنچ کر بدلہ لے گا۔ ماروی کہانی بس تیزی کے ساتھ جاری ہے۔ بہشت زار بہت زیادہ مزہ دے گئی۔ معلومات کے ساتھ جب ہلاکو خان نے اپنی فوج بھیجی تب جا کے خورشاہ شکست مان کر ہلاکو خان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ چھرا بند سے دلچسپی ہلاکو خان کے لیے تعجب خیز تھی۔ جبار اور اسد نے ان کی جنت کا راز فاش کیا۔ حکایت سود و زیاں میں معاشرتی برائیوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ مفاد پرست خونی رشتوں کو واضح کیا گیا ہے۔ جس کے ساتھ احسان کرو، اس کو بھول جاؤ۔ اس کا اجر لوگوں سے نہیں، اللہ سے ملے گا اور یہ کہ فضول خرچی نہیں کرنی چاہیے اور اس کہانی کا اہم پہلو کہ شادی وقت پر کرو۔ نہیں تو سیف الدین کی طرح خسارہ پانے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ محبت اور فاصلے میں بہزاد نے اپنا مکان دے کر شہزاد کو مایوسی سے بچا لیا۔ امانت میں خیانت کرنے سے کریم داد کو اس کی قیمت بہت بڑی چیز یعنی جان دے کر ادا کرنی پڑی۔ سویٹر گرل دولت کے حصول کے لیے مردوں کو ٹشو پیپر کی طرح بدلتی آئی۔ آخر کار ایڈز کا شکار ہو کر مری۔ پہلا پتھر میں عرفان بے گناہ پھنس گیا۔ بیگ صاحب ہمیشہ کی طرح اس کو بھی بچا کر لے گئے۔ جواد حسین کو بے نقاب کر کے سزا دلوائی۔ آخر میں ادارے سے پُرزور درخواست ہے کہ نامور مسلم سائنس دان کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان لوگوں نے بہت بڑی خدمات سرانجام دیں۔ اس کے باوجود ہمارے ذہنوں میں یہ خیال کیسے سما گیا کہ ہر ایجادات کا کام بس مغربی سائنس دانوں کی تحقیق کا ثمر ہے۔'' (رسالے سے وابستگی کا بے حد شکریہ)

✠ **رانا بشیر احمد ایاز**، احسان پور، رحیم یار خان سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ''سرورق پر اس دفعہ ٹائٹل گرل کچھ ایویں سی تھی۔ لگتا ہے ڈاکرانکل اس دفعہ ڈنڈی مار گئے ہیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا حقیقتِ حال بیان کر رہے تھے جو کہ تشویش ناک اور کافی مخدوش تھی۔ آگے سیدھا اپنی محفل میں قدم رنجہ فرمایا جہاں کراچی سے محمد خواجہ میر محفل بنے بیٹھے تھے۔ مبارکاں خواجہ بھائی۔ اشفاق شاہین، طاہر جاوید سے کچھ لکھنے کی فرمائش کرتے نظر آئے۔ سید عبادت کاظمی اپنے آپ کو نظر انداز کیے جانے پر خفا نظر آئے۔ جناب، آپ لگتا ہے خطوط غور سے نہیں پڑھتے ورنہ اس ناچیز کے ہر خط میں آپ کا ذکرِ خیر ہوتا ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے بہشت زار پڑھی۔ عمدہ کردار نگاری اور دلچسپ انداز بیاں۔ شیخ الجبال آخر کار اپنے انجام کو پہنچا۔ طاہرہ اور ذونوبیہ نے جبار اور اسد سے دھوکا کیا لیکن ہاتھ پھر بھی کچھ نہ آیا۔ محبت اور فاصلے مغل اعظم صاحب نے دل کے تار ہلا دیے۔ شہزاد کی محنت اچھی لگی لیکن بہزاد کی ایثار پسندی نے اپنی محبت کی شکل میں ایک سسکتی ہوئی محبت کو زندگی دے دی۔ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے ابھی تک دنیا آباد ہے۔ شیش محل میں کمو کا بدلہ لینے کے لیے رامو نے جوش میں آکر حملہ تو کر دیا لیکن نقصان کافی اٹھایا مگر عین وقت پر ربن دادا نے آکر کمک پہنچائی تو جا کر گلو خلاصی ہوئی۔ چاند بانو کی بے غرض محبت لگتا ہے فاروق پر اثر کر رہی ہے۔ خبط میں انگوروں کی شوقین بیوی کو اس کے شوہر نے بہ آسانی ٹھکانے لگا دیا لیکن ڈاکٹر کی ذہانت کی وجہ سے اپنے جال میں پھنس گیا۔ مرزا امجد بیگ صاحب اس دفعہ پہلا پتھر مارتے نظر آئے۔ کافی اچھی کہانی رہی۔ بیگ صاحب ہر دفعہ فاتح بن کر عدالت سے باہر آتے ہیں۔ کبھی کوئی ایسا کیس بھی شائع کر دیں جس میں وہ ہارے ہوں۔ محمد زبیر سلیمانی امانت لے کر آئے۔ رئیس کو اپنی عزت کا خیال تھا تو وہ صاحب کے لیے اس کی نفسانی خواہش کو پورا کرنے کے چکر میں ہر حد کراس کر گیا۔ جانو نے بھی خوب وفاداری نبھائی۔ سویٹر گرل بھی مناسب کہانی تھی۔ ناواقف بس گزارے لائق تھی۔ ماروی بھی بہت زبردست رہی اس دفعہ۔

خصوصاً عابی کا کردار سپرہٹ جارہا ہے۔ فضل رحمٰن کے حالاتِ زندگی پڑھ کر بہت معلومات ملیں۔ یہی اہلِ اللہ کی پہچان ہے کہ وہ مشکل حالات میں بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ کافی ایمان افروز داستان تھی۔ منظر امام اس دفعہ گونگوں کی داستان لے کر آئے۔ یہ داستان صرف فرضی نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ ہمارے پورے معاشرے کا المیہ ہے۔ حکایت سود وزیاں ناہید سلطانہ اختر کا مخصوص اندازِ تحریر۔ سیف الدین ساری زندگی بھائیوں اور بہنوں کے لیے قربانی دیتے رہے لیکن آخر میں انہی بہن بھائیوں نے منہ موڑ لیا اور اتنا تک کہہ دیا کہ بھائی صاحب ساری زندگی اسراف کرتے رہے۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ بھائی نے ان کی زندگی سنوار دی ہے۔ اس دفعہ محفلِ شعروسخن بہت دل کش رہی۔ سنعیہ منظور کا انتخاب بہت اچھا رہا۔ سیدہ ثانیہ کاظمی، ثنا عظیم، اظہر حسین، مدحت، بشریٰ غزل اور مرحا اینڈ رمنا گل بھی خوب صورت اشعار کے ساتھ محفل میں جلوہ گر تھے۔'' (رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ)

✠ **حافظ شعیب معاویہ،** خان پور، ضلع رحیم یار خان سے محفل میں حاضری لگا رہے ہیں ''جولائی 16ء کا سسپنس 16 کو ملا۔ میرا پہلا خط شرفِ قبولیت پا گیا۔ اچھا لگا۔ آپ نے غیر حاضری پر جرمانے کی دھمکی دی۔ اس لیے غیر حاضری سے بچنے کے لیے حاضری لگوانے کو حاضر ہیں۔ (شاباش...... یہی عقلمندی کا تقاضا ہے) کیونکہ میں تراویح میں قرآن پاک سنا رہا ہوں۔ وقت کی تنگی ہے تفصیلی تبصرہ تو نہ لکھ سکوں گا (ماشاء اللہ...... بہت خوب) محمد خواجہ کو مبارکباد، بہت اچھا لگا آپ کا تبصرہ۔ اشفاق شاہین، تحریم شاہ، زرین آفریدی، محمد صفدر معاویہ خوب صورت تبصروں کے ساتھ رونق محفل تھے۔ اپنے شہر کے صادق معاویہ کی توجہ کے لیے ہم شہر ہونا اچھا لگا۔ کہانیوں میں صرف شیش محل پڑھی۔ مزہ آ گیا، خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ اور پھر متبع سنت عاشق صحابہؓ حضرت فضل رحمان کی داستانِ حیات پڑھی۔ اتنی محبت کے ساتھ اتباعِ سنت اور صحابہ کرامؓ سے والہانہ عشق حضرت فضل رحمان کی حیات مبارکہ کا چمکتا دمکتا باب ہے۔ پڑھ کر سکون آ گیا، بے شک ان اولیا اللہ کی زندگی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ باقی شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔ ویسے صادق معاویہ کا یہ جملہ اچھا لگتا ہے۔ حیات باقی، ملاقات باقی۔'' (اپنے قیمتی وقت میں سے آپ نے کچھ تو وقت دیا...... بہت شکریہ)

✠ **وارث علی ملاح،** سندیلیانوالی سے تبصرہ کر رہے ہیں ''ٹائٹل گرل ذرا بھی پسند نہیں آئی۔ اسپیشلی اس کی مخروطی انگلیاں دیکھ کر تو صحیح معنوں میں جھرجھری سی آ گئی...... (ارے بھئی کیوں...... وضاحت نہیں کی آپ نے) جون ایلیا کی حقیقت پڑھی جو ہمارے طبقے کے امراء اشرافیہ بلکہ ہم سب کی حقیقت ہے جسے ہم بدلنے پہ قطعی متفق نہیں۔ آپ کے اداریہ میں آپ کی سنی اور پھر اپنے دوستوں کی...... محمد خواجہ کورنگی والے (تساں نو بڑی ڈاہڈی مبارک ہووے) آپ سے پوچھنا ہے کہ کیا حیدرآباد وہی علاقہ ہے جس پر بھارت نے زبردستی قبضہ کیا تھا۔ اشفاق شاہین ہمارا ابھی ماروی کے بارے میں آپ جیسا ہی گمان ہے۔ تحریم شاہ جی، یہ لوڈشیڈنگ تو اب ہماری آنے والی نسلوں کو بھی یقیناً بھگتنا ہو گی۔ چھ مہینے سے اعلانات ہو رہے تھے کہ ماہ صیام میں بجلی کم از کم سحروافطاری کے دوران تو نہیں جائے گی لیکن ہو بالکل الٹ رہا ہے۔ (یہی تو سیاست ہے نادانو! بات کو سمجھا کرو) خود تو حکمران اعلیٰ بیرون ممالک میں سہل پسندی فرما رہے ہیں اور ہمارا اب اللہ ہی والی ہے...... میرے ننھے منے سے لٹل ماسٹر شاگرد علی رحمان کو پورے سال بعد دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ بیٹا جی اب مستقل آتے رہیے گا...... صادق معاویہ جی ایہہ کی گل اے جب پڑھنا ہی ہے تو اسی وقت پڑھ لیتے ناراض دوشیزاؤں کی طرح روٹھے کس سے رہے؟ سید عبادت کاظمی کافی عرصے بعد نظر آئے۔ اچھا تبصرہ تھا۔ آپ کے دکھ میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ رانا بشیر احمد بیچاری کاغذی لڑکی کی تعریف میں سر دھنتے نظر آئے...... (بہت خوب) صفدر معاویہ کا تبصرہ بھی بڑا سوہنا تھا...... مرحا گل جی میرے خیال میں اس دفعہ آپ پھر سرورق پہ چھا گئی ہیں۔ ماروی تو واقعی اب بورنگ ہوتی جا رہی ہے۔ عبدالغفار فردوس لگتا ہے آپ کو اردو زیادہ اچھی نہیں لگتی جبھی وقتاً فوقتاً ہندی بھاشا یوز کر رہے ہو۔ (اوہ سیر کو سوا سیر...... آپ بھی کچھ کم نہیں ہیں) کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل میں انٹری دی لیکن وہی کچھوے کی رفتار مانند دھیمی رفتار سے ہمارا صبر آزما رہی ہیں اسما قادری صاحبہ...... فاروق سے تھوڑی خوشی ملی کہ اس نے بملا کو آئینہ دکھایا...... بملا اب گنیش سے یقیناً چاند بانو کو ہی ٹھکانے لگوانے کا کہتی ہے۔ جوزفین کو اب حویلی میں عداوتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آخری صفحات پر اپنی موسٹ فیورٹ ناہید سلطانہ کو پڑھا...... انہوں نے اس دفعہ بھی ہمیشہ کی طرح بہت اہم پلاٹ منتخب کیا۔ اے کاش کہ بدلے میں سیف الدین سے کوئی بھی بہن بھائی ہمدردی ہی دکھا دیتا...... ان کے بہن بھائیوں کی طوطا چشمی پہ چنداں حیرت نہ ہوئی کیونکہ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے کوئی بے غرض ہو کر کام کرے بھی تو صلہ کبھی نہیں ملتا۔ پلکوں کے گوشے نم کرتی تحریر رلا ہی گئی آخر سے تھوڑا پہلے...... طاہر جاوید مغل کی محبت اور فاصلے عظیم داستان محبت تھی۔ ہمیشہ کی طرح دلوں کے تار چھو گئی۔ طاہر جی پلیز آخری صفحات پہ آئیں۔ کاشف زبیر صاحب کی کمی پوری کریں۔ سویٹ گرل علی اختر نے ایک دوشیزہ کی داستان حیات لکھی۔ خوشیاں کشید کرتے کرتے خود ہی ایڈز میں مبتلا ہو گئی۔ ماروی دیوتا جیسی بنتی جا رہی ہے۔ عزت کا سوال میں رئیس کے ساتھ بالکل ٹھیک ہوا۔ اوروں کی عزتوں سے کھیلنے والوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے، سکینہ کب تک برداشت کرتی...... گمشدہ ثمر عباس کی ہلکی پھلکی تحریر بھی تقریباً صحیح ہی رہی۔ منظر امام ہمیشہ کی طرح معاشرے کی بے حسی کا کھلا مظاہرہ کرتی تحریر لے کر آئے اور چھا گئے۔ داستان گونگوں کی بہت سبق آموز کہانی تھی۔ سچ ہے دوسروں کے

معاملات میں ٹانگ اڑا کر کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا، سوائے ذلت و رسوائی کے۔ مشرقی کہانیوں کی کمی کے باوجود زبردست رہا پورا سسپنس...... سنتِ رسولؐ پر عمل پیرا افضل رحمٰن کا فسانہ حیات بھی بہت زبردست تھا۔'' (بہت عمدہ تبصرہ رہا)

✠ **ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی** سے رونقِ محفل بنے ہیں ''عیدالفطر کی خوشیاں سب ہی قارئین اور اہلِ پاکستان کو مبارک ہوں۔ اللہ تعالیٰ دنیا بھر میں امن و امان کا دور دورہ ہو۔ آمین۔ جولائی کا خوش رنگوں سے سجا سسپنس ڈائجسٹ دل کو بھایا۔ حسب روایت ٹائٹل بھی مہارت کی تصویر لیے ہوئے تھا اندر انشائیہ میں دانش اور دانشوری کا ہی بول بالا رہا جس میں حقیقت کا ادراک کیا گیا جو ہماری زندگیوں پر محیط ہے۔ اپنی محفل میں سرفہرست محمد خواجہ آف کورنگی نظر آ رہے تھے، مبارکباد اور دیگر دوستوں کی بھی حاضری بھرپور تھی جو اپنی اپنی آرا سے مستفید کر رہے تھے۔ بہشت زار کا اختتام ہوا۔ دوسری تحریر کہنہ مشق قلم کار اسما قادری کی منہ بولتی تحریر شیش محل تھی۔ جو پہلی قسط سے ہی دلچسپی برقرار رکھنے میں کامیاب رہی ہے۔ ان کا ہر ہر فقرہ دل کی کتاب پر لکھ جاتا ہے۔ آخری سطر تک احساس نہیں ہوتا اور تحریر ختم ہو جاتی ہے۔ دام بھی خوب صورت تحریر لگی۔ خبط بھی بہتر انداز لیے ہوئے تھی۔ دنیا میں عجیب عجیب عادات کے حامل لوگ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ارنی میڈیسن کی بیوی تھی کہ اس کو پیپر پر چھپے انگور کھانے کا عشق آمیز جنون تھا۔ واقعی اس کو پاگل پن ہی کہیں گے کہ تصویروں سے ہی محض اتنی جنونی محبت کی جائے۔ امانت بھی تاثر انگیز تحریر تھی جو ایک گاؤں کے پس منظر پر لکھی گئی کہانی تھی۔ محفل شعر و سخن نے بھی محظوظ کیا اور معیاری اشعار نے پُرلطف کیا۔ سویٹر گرل بھی بہت اچھی کہانی تھی۔ ناواقف میں ایک شاطر اور مجرم ذہن رکھنے والے جوزف نے محض اپنی عقل کو ہی سب سے بہتر اور کارگر سمجھ کر داؤ چلنے کی کوشش کی جس کا وہ برسوں سے تمنائی تھا مگر اس سے بھی شاطر اور حاضر دماغ وکیل نے آخر کار اس کو مات اس وقت دے دی جب فتح کے نشے میں چور جوزف دولت لے کر تہ خانے سے برآمد ہو رہا تھا مگر وکیل نے اس کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ عزت کا سوال بھی عبرت انگیز کہانی تھی ان کے لیے جو طاقت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ گم شدہ بھی اچھا انداز لیے ہوئے تھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر نے بھی دلوں کو ایمان اور یقین کی روشنی سے اجلا کیا۔ آخری کہانی حکایت سود و زیاں ناہید سلطانہ اختر کی بہترین کہانی تھی، کترنیں بھی بے مثال رہیں۔''

✠ **محمد صفدر معاویہ، ضلع خانیوال** سے اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ ''جولائی 2016ء کا شمارہ 15 جون کی ایک خوب صورت دوپہر میں مسرور بیس میں ملا۔ سرورق کو بہت عمدہ طریقے سے سجایا گیا۔ بہت ہی خوب صورت ماڈل دیسی پس منظر پیش کرتے ہوئے لگتا ہے کہ اپنے پیا کے انتظار میں ہے کہ عید آ گئی ساجن تم نہیں آئے۔ جون ایلیا محترم حقیقتِ حال کو بڑے عمدہ پیرائے میں بیان کرتے نظر آئے۔ آپ کا اداریہ پڑھا، بالکل ٹھیک کہا کہ خالی دن منانے کا فائدہ جب کوئی اس سے مستفید ہی نہ ہو سکے۔ یہ سارے سیاسی ہمیں دکھانے کے لیے ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہیں۔ اندرونِ خانہ یہ سب ایک ہیں۔ اللہ ہی ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ دوستوں کی محفل میں آئے تو محمد خواجہ کورنگی والے کو بہت خوب صورت انداز کے ساتھ تبصرہ کرتے کرسیِ صدارت پر براجمان پایا۔ مبارک ہو خواجہ بھائی۔ اشفاق شاہین، تحریم شاہ، قاسم رحمان کی عمدہ انٹری۔ رانا امتیاز 8 سال بعد ویلکم بیک، زرین آفریدی کا بہت پیارا تبصرہ۔ علی رحمان کی سال بعد واپسی۔ ادریس احمد خان، صادق معاویہ سعیدی کی بہترین تبصرہ نگاری۔ حافظ شعیب معاویہ کو ویلکم کرتے ہیں۔ اس دفعہ تو معاویہ چھا گئے۔ کاظمی بھائی کا دکھ بڑا ہے اللہ پاک آپ کو حوصلہ عطا کرے۔ بشیر احمد ایاز بہت خوب، بڑے تخنتی ہو یار۔ بہشت زار سے شروعات کیں۔ اس دفعہ بس اس کے اختتام پر یہی کہوں گا جا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سو جا۔ محبت اور فاصلے طاہر جاوید کے قلم سے ایک گمشدہ محبت کے طفیل ایک روتی سسکتی محبت کو نئی زندگی مل رہی تھی۔ بہت ہی پیاری اسٹوری بہت عمدہ مغل صاحب۔ شیش محل اس دفعہ کی قسط بہت ہی دلچسپ رہی۔ فاروق کا بملا کو تختی دکھانا بہت اچھا لگا۔ لگتا ہے بملا نے چاند بانو کے لیے گنیش کی خدمات حاصل کر لیں۔ ربن دادا کا جولیٹ کے معاملے میں مجرم کے نام تک پہنچنا گویا دلدار آغا کی موت ہے۔ تنویر ریاض کی دام بھی بہت اچھی رہی۔ ایک نرس کے قتل پر گھومتی کہانی اچھی لگی۔ بابر نعیم خبط لے کر آئے۔ ڈاکٹر بلٹن نے ارنی میڈیسن کی تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ چال اس نے اچھی چلی پر اس کی قسمت وال پیپر پر لگے انگور کھانا کافی انٹرسٹنگ تھا۔ مرزا امجد بیگ پہلا پتھر لے کر آئے۔ بیگ صاحب نے اپنے مؤکل کو قانونی جنگ لڑ کر رہائی دلائی، وہیں اصل مجرم کو بھی بے نقاب کرنے میں پولیس کی مدد کی۔ لالچ انسان سے کیا کچھ کراتا ہے جیسا کہ جواد نے کیا۔ محمد زبیر سلمانی امانت میں کیا خوب حق ادا کیا کریم داد نے۔ لعنت ہے ایسی دوستی پر اشرف نے بھی خوب بدلہ لیا دونوں سے۔ بانو نے بھی تو بے وفائی کی تو صلہ اٹھا لیا۔ پہلا گھر سے نکلنا غلط قدم پھر محبوب سے بے وفائی۔ محفل شعر و سخن بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ اشعار سے مزین رہی۔ علی اختر سویٹر گرل لے کر آئے، کافی اچھی اسٹوری تھی۔ مرسڈیز نے اچھا نکتہ استعمال کیا زندگی گزارنے کا۔ پر آخر میں اس کے ساتھ برا ہوا۔ نسیم جاوید کی ناواقف میں جوزف کلارک کی 6 سال جلاوطنی اور انتظار بھی اسے نہ بچا سکا کیونکہ وہ وقت کے فرق کو نہ سمجھ سکا۔ نواب انکل مرحوم کی ماروی کی یہ قسط بہت عمدہ رہی، کیا کہنے۔ اس دفعہ جمائمہ اور شمائلہ اضافہ اچھا رہا۔ آخر عابی نے نکاح کر ہی لیا۔ مراد کی طرح عابی بھی جدھر جاتا ہے لاشیں ہی گرتی ہیں۔ ابراہیم جمالی کی عزت کا سوال کیا خوب تھی۔ رئیس کی عزت اوروں کی بہن بیٹیوں کے لیے غلط کرتا تھا، وہ اس کی عزت کا سوال ہوتا اور گھر میں سکینہ اور جانو

کے تعلقات کو کیا نام دے گا وہ۔ سچ کہا ہے کسی نے جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ ثمر عباس کی گم شدہ بھی اچھی رہی۔ میلسیا پار کرنے کیا خوب کھیل کھیلا اپنے شوہر سے جان چھڑوانے کے لیے۔ ضیا تسنیم بلگرامی نیک اشخاص کے واقعات میں سے فضل رحمٰن کا واقعہ لے کر آئے، پڑھ کر روح کو سکون سا میسر آ گیا۔ واقعی ولی کامل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اللہ کے حکم پر اور نبی کریمؐ کے طریقوں پر چل کر زندگی گزارنے والے۔ منظر امام گونگوں کی داستان کے ساتھ آئے۔ ویسے آج کے حالات ایسے ہی ہیں کہ بندہ گونگا ہی بن جائے کیونکہ یہاں عام آدمی کچھ بول کر مصیبت میں پڑتا ہے یہاں کون کسی کی سنتا ہے۔ سلیم انور کی مات بھی عمدہ رہی۔ کارل بے چارے کی ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی۔ ناہید سلطانہ اختر کا قلم آخری صفحات پر حکایت سود وزیاں بہت ہی اچھے موضوع کو زیر بحث لایا۔ سیف نے جو کچھ کیا بھائی بہنوں کے لیے کیا۔ وہ اس کا حق ضرور بنتا ہے لیکن باقی لوگ بھی اپنا حق ضرور ادا کرتے پر ہر کسی نے اپنا مطلب دیکھا وہ تو پھر بھائی تھا۔ یہ تو انسان نوجوانی اور پیسے کے غرور میں ماں باپ تک کو بھلا دیتا ہے جنھوں نے دن رات ایک کر دیے اس کے لیے ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اللہ ہم سب کو صحیح معنوں میں بڑوں کے حقوق جاننے کی توفیق دے۔'' (اتنا عمدہ تبصرہ لکھنے کا شکریہ)

✠ **سید عبادت کاظمی**، ڈیرہ اسماعیل خان سے تشریف لائے ہیں ''فاصلوں کا احساس تب ہوا جب میں نے کہا ٹھیک ہوا اور اس نے مان لیا، کہتے ہیں خوش رہنا اور دوسروں کے چہروں پر خوشی لانا ضروری ہے لیکن یہ بھی ہے کہ غم بھی زندگی کا لازمی حصہ ہیں اور ہمارے غم زدہ لمحوں میں ہمارا سسپنس ہمارے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے۔ آج کل شب وروز اداس گزر رہے ہیں۔ یونہی شمارہ ہاتھ میں آتے ہی ٹھنڈے جھونکے کا احساس ہوا اور دل ودماغ پر چھائی اداسی غائب ہوگئی۔ سرورق کو ہم نے بہت دنوں کے بعد غور سے دیکھا۔ حسینہ کے دیکھنے کا انداز اچھا لگا۔ مجموعی طور پر سرورق بہترین تھا۔ جون ایلیا ہمیشہ سچی اور کڑوی باتیں کرتے ہیں۔ آج کل کے دور میں لوگ رشتوں کی قدر کہاں کرتے ہیں۔ کورنگی سے محمد خواجہ محفلِ دوستاں کے اس ماہ کے کپتان ٹھہرے۔ مبارک باد قبول کریں۔ رسالوں سے ان کی محبت دیکھ کر اچھا محسوس ہوا۔ اشفاق شاہین اچھا تبصرہ تھا۔ قاسم رحمان کی کمی محسوس کرنے کا شکریہ۔ آپ کی محبت آپ نے یاد کیا اور ہم حاضر۔ آپ نے دو بہترین ناول تحفے میں ارسال کیے بہت شکریہ۔ روی شادی کی مبارک ہو آپ کو۔ ہمیشہ کی طرح شیش محل سے اسٹارٹ کی کہانیوں کی محفل۔ جولیٹ مجھے نواب خون لگتی ہے۔ بملا بڑی شاطر نکلی، ربن اب ولدار آغا کو سبق سکھا کر رہے گا۔ مغل صاحب کے قلم میں تو جادو ہے۔ محبت اور فاصلے درد سے بھری تحریر رلا گئی۔ شہزاد کو شاہینہ سے ملانے والے بہزاد صاحب کی محبت کی داستان ہمیشہ یاد رہے گی۔ زندگی میں کچھ ہارنا بھی پڑتا ہے یہ اس تحریر سے سیکھا۔ ماروی کتنی رہتی ہے؟ مات، سویٹر گرل، ناواقف اچھی کہانیاں تھیں۔ بہشت زار خوب صورت تحریر تھی۔ ابو کے بغیر یہ پہلی عید گزرے گی۔ سسپنس کی محفلِ دوستاں کو اور ادارے کو میری طرف سے عید مبارک......''
(اللہ آپ کو حوصلہ دے۔ دنیا کا نظام صدیوں سے اسی طرح چلتا آ رہا ہے)

✠ **محمد خواجہ**، کورنگی کراچی سے تبصرے کے ساتھ محفل میں حاضر ہیں ''جولائی کا شمارہ 15 تاریخ کو موصول ہوگیا۔ یہ شمارہ میرے لیے بہت ہی خوش آئند رہا۔ میرے خط کو بڑی پذیرائی ملی۔ مجھے صدارت کی کرسی نصیب ہوئی۔ سرورق پر ایک بہت معصوم صورت لڑکی کی تصویر۔ آنکھیں روشن اور اس میں اچھے وقتوں کی آس نظر آتی ہے۔ جون ایلیا نے حقیقتِ حال پر بڑا پُراثر حال لکھا ہے۔ اب ہم کئی طبقوں میں بٹ چکے ہیں۔ ایک طبقہ دوسرے کی بات نہ سمجھنا چاہتا ہے نہ سننا چاہتا ہے۔ ہمارے ہاں لوگ اچھی سے اچھی بات کو سننے سے پہلے ہی اپنا احمقانہ نکتہ بیان کرتے ہیں۔ چاہے وہ سیاست پر ہو، معاشرتی ہو یا مذہبی۔ مذہب پر بھی ایسے نکتے نکال لیتے ہیں جو نہ قرآن میں نہ حدیث میں۔ بہشت زار، ہلاکو خان کے زمانے کی حیرت انگیز تحریر۔ ہلاکو خان کی بربریت اور خون ریزی سے ہٹ کر عجیب دلچسپ پیرائے میں لکھی گئی داستان۔ محبت اور فاصلے، محبت کے گزرے ہوئے لمحات کی ایک دل گداز کہانی۔ سچی محبت کو دل میں بسا کر کس طرح لوگ ساری زندگی اس کی یاد اور آبیاری کرتے رہتے ہیں۔ بات صرف ایک مکان کی نہیں لیکن محبت کے ایک جذبے کی دل گداز کہانی دل میں اتر جانے والی۔ بہت عمدہ تحریر۔ شیش محل، ربن دادا کے دلفریب کردار نے پاڑے کے غنڈے کا کردار بہت بلند کر دیا۔ لڑائی جھگڑے، محبت، لوگوں کا ساتھ دینا اپنے لوگوں کو بچانا اور ساتھ دینا ایک عظیم کردار، ساتھ ہی جوزفین کا کردار اور کہانی کو ایک خوب صورت موڑ دیتا ہے۔ واقعات کی عکس بندی اور مقامات کی وضاحت بہت خوب لیکن فاروق کے کردار کو پس پشت کر دیا گیا ہے۔ امید ہے وہ آگے ایکشن میں آ جائے۔ کہانی بہت دلچسپ ہے۔ اس کی دلچسپی کو برقرار رکھنا مصنفہ کے ہاتھ میں ہے جس کی پوری امید ہے۔ دام، ہلکی پھلکی تحریر، میری مرتے ہوئے کچھ قاتلوں کی نشاندہی کر دیتی لیکن بہت دیر ہوگئی۔ قاتل گزر گئے۔ خبط، عجیب شوق کی ہوشربا کہانی۔ انگور کھانے کا شوق وہ بھی اصلی نہیں بلکہ وال پیپر پر بنے انگور، یہ کیسا شوق ہے۔ مارنے والے نے وال پیپر پر سائنائڈ زہر لگا دیا۔ کہانی نے دلچسپی سے زیادہ حیرت زدہ کیا۔ پہلا پتھر، بیگ صاحب کی وکالت کا جواب نہیں لیکن اس کہانی میں بیگ صاحب کو اس کیس میں بڑی مشکل پڑتی نظر آئی۔ ایک نوجوان کی تن سازی اس کے لیے مسئلہ بن گئی۔ مجرم نے خوب چالاکی دکھائی لیکن سامنے بیگ صاحب جیسا وکیل ہو تو مجرم کا بچنا ناممکن ہے۔ سویٹر گرل، یورپ میں عجیب چال چلن ہے۔ ایک شریف لیکن حسین لڑکی بہت چاہنے والے۔ آخر لڑکی نے اپنا

روپ بدل ڈالا۔ حسن کی کشش سے دولت کمانے کا شوق اس کو مشکلات میں لے گیا۔ ناواقف، ایک خطرناک مجرم جو اپنی ذہانت سے بچ نکلا۔ آخر اس کو فخر تھا کہ وہ جرم کا اقرار بھی کرلے تو اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ لیکن ایک فرض شناس اخباری نمائندے کی کوشش اور وقت، حالات اور قدرت کے انصاف کے آگے وہ جلد باز مجرم قانون کی گرفت میں آجاتا ہے۔ امانت، اس دفعہ کی بہت بہترین کہانی۔ ایک شخص کی محبت حوصلہ مندی۔ ایک دوست پر اعتبار اس کو معلوم نہ تھا کہ نہ لڑکی وفادار ہے نہ دوست۔ لیکن اس نے ایسا بھیانک کھیل کھیلا کہ دونوں دھوکے باز موت کے گھاٹ اتر گئے۔ عزت کا سوال، علاقے کے رئیس، وڈیرے تھانیدار اپنے گاؤں کی لڑکیوں کو جانوروں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ رئیس کا جرائم پیشہ مجرم ہی رئیس کی بہن کی عزت سے کھیلتا رہا۔ بڑی لرزہ خیز کہانی ہے۔ گم شدہ، ایک جرم کی داستان حالانکہ یہ جرم یا قتل کی واردات نہیں تھی۔ لیکن ایک چالاک اور ذہین عورت نے ایک ظالم شوہر سے جان چھڑانے کے لیے اتنی زبردست پلاننگ کی کہ شوہر سے جان چھوٹ گئی۔ بڑی چونکا دینے والی کہانی۔ لاش نہ ملنے کے باوجود عدالت کا فیصلہ بھی عجیب لگا۔ فضل رحمٰن، ایک ایمان افروز کہانی۔ بزرگان دین کی ریاضت، علم حاصل کرنے کا شوق اپنے سے شرم آتی ہے کہ کیا ہم ان سے سبق حاصل کریں گے۔ کیا رتی برابر ان کی پیروی کر پائیں گے۔ داستان گونگوں کی، ہمارے موجودہ معاشرے کی سچ داستان، ایک مجبور شخص ایک ڈبل روٹی چراتا ہے۔ ایک رحم دل شخص بات کو سمجھ جاتا ہے۔ لیکن جب تعلقات کی بات بنی تو اس کی مالی مدد بھی کردی گئی۔ اگر تعلقات نہ ہوتے تو سزا تو ہونی تھی۔ مجبوری ہار جاتی۔ کیا سب گونگے بن جائیں۔ مات، بہت عمدہ کہانی۔ حقیقت سے دل کو چھو لینے والی تحریر۔ ایک شخص ساری زندگی، بھائی بہنوں کی زندگی بنانے میں مصروف رہا۔ اپنے آپ کو بھلا کر اپنے بیوی بچوں کے مستقبل کو نظر انداز کرنے والا آخر میں بالکل تنہا رہ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اس لیے یہ کہانی سیدھا دل میں اتر گئی۔ اشعار کی محفل بڑی رنگین رہی۔ خاص کر ملائکہ حریم، ظفر احمد اور رمضان پاشا کا انتخاب بہت عمدہ ہے۔ کترنیں اور لطائف کی کمی خاص کر محسوس ہوئی۔ یہ رسالے کے لطف کو دوبالا کردیتے ہیں۔" (رسالے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ)

⌘ طاہرہ گلزار، پشاور سے محفل کی زینت بنی ہیں "میں اس ویک پہ آرمی والے بھائی کے پاس آئی ہوں اور مری کی ٹھنڈی ہواؤں میں بیٹھ کے اپنا تبصرہ لکھ رہی ہوں۔ (بہت خوب) جب اگست کا شمارہ آئے گا تب تک عید کو گزرے 10 یا 11 دن گزر چکے ہوں گے پھر ادارے والوں کو اور سب دوستوں کو عید مبارک..... اس بار عید کاشف زبیر اور نواب انکل کے بغیر بالکل اچھی نہیں گزرے گی۔ میں نے قرآن پاک کی پہلی ختم کاشف زبیر کو بخشی ہے اور دوسری نواب انکل کو بخشوں گی اللہ ان کو اس کا ثواب عطا کرے۔ آمین۔ کہانیوں کی فہرست میں اپنے فیورٹ مغل اعظم، بابر نعیم، منظر امام اور عزت کا سوال لے کر ابراہیم جمالی کو دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ اب تو اللہ کا کرم ہے کہ کراچی کا ماحول پُرسکون ہوگیا ہے۔ (یہ خوش فہمی ہے آپ کی) اس بار جون ایلیا دانش اور دانائی کی باتیں لے کر حاضر تھے۔ اس قوم کی بدنصیبی کہ یہ قوم کتابوں میں صرف یہ الفاظ دانش اور دانائی پڑھتے ہیں لیکن نہ سمجھنا چاہتے ہیں اور نہ سمجھانا چاہتے۔ معراج انکل اردو ادب کے آسمان ہیں اور تمام رائٹرز اور ادارے کے کام والے اور قاری ان کے ستارے ہیں۔ ٹائٹل گرل تو آمد عید کے انتظار میں بیٹھی ہے۔ قمیص اور دوپٹے کے کلر بہت پیارے ہیں۔ خیر انکل معراج کی دانش مندانہ باتیں پڑھیں۔ واہ اس بار تو انکل نے پھر ہم پاکستانیوں کی روح جھنجوڑنے کی سعی کی ہے لیکن ہم بدنصیب اور بے حس مسلمان بھی کیا کریں جو اپنی اسلامی روایات اور طور وطریقے چھوڑ کر غیروں کی رسومات کو بڑے شان سے اپنا کے بیٹھے ہیں۔ اللہ ہم سب پہ رحم کرے۔ چلتے ہیں اپنے دوستوں کی کھٹی میٹھی محفل کی طرف۔ مجھے تو میرے ہر دل عزیز دوست رضوان سلطان تنولی حسب عادت 15 جون کو بتا چکے کہ تم تو اس بار بلیک لسٹ میں بھی نہیں ہو۔ کوئی بات نہیں ایسا چلتا رہتا ہے۔ خطوط کے محل کا دروازہ ناک کیا تو دروازہ میرے پیارے بھائی محمد خواجہ کورنگی نے کھولا۔ مبارکاں بھائی پتا نہیں کیوں میں جب بھی محمد خواجہ بھائی کا نام پڑھتی ہوں تو مجھے اپنے ایک پسندیدہ تبصرہ نگار مدنی کی یاد آجاتی ہے۔ ادارے والوں سے تھوڑا گلہ کہ مجھے Birthday کا وش نہیں کیا...... (اوہو سوری...... وش تو تب کرتے جب آپ کی ڈیٹ معلوم ہوتی) ویلکم علی رحمان بھائی کہانی کو کہانی سمجھ کے پڑھو اس کو عام زندگی سے نہ ملاؤ۔ دیوتا کا سحر ہے ہی ایسا کہ اس کی گرفت سے قاری ابھی تک نہیں نکلا...... صادق معاویہ یہ کیا احتجاج کی سزا اپنے محبوب سسپنس کو دی بری بات ادارے کی یہ ظالم قینچی تو بڑے بڑے تبصرہ نگاروں کے خطوط پہ دشمنان انڈیا کی طرح چلتی ہے تو آپ اور ہم کس کھاتے میں بچ جائیں گے لیکن خوشی ہے کہ یہاں انصاف کے ساتھ قینچی چلائی جاتی ہے۔ میں نے بھی ایک سال تک سسپنس میں خط لکھنا بند کردیا تھا۔ لیکن میں نے ایک منٹ کے لیے بھی سسپنس کو خود سے دور نہیں کیا اور سب سے آخری خط ہمارے بہت ہی سویٹ اور نفیس دوست عبدالجبار رومی کا رہا۔ اب دیکھتے ہیں کہ شادی کے بعد اسی طرح رواں تبصرہ لکھتے ہیں کہ نہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل۔ واہ اس بار کیا تیز ٹیمپو، کیا اندازِ تحریر کیا، منظر نگاری کس کس بات کی تعریف کریں۔ قلم میں اتنا زور کہاں سے لائیں۔ ربن دادا کی حکمت عملی، جوزفین کی داستان گوئی، فاروق کا کمو کے لیے دکھی ہونا اچھا لگا لیکن مجھے یہ ذرا اچھا نہیں لگتا کہ فاروق اپنی محبت کو بھول کر چاند بانو اور بملا کی قربت میں رہے۔ یہ تو محبوب سے دھوکا ہے۔ فاروق کا بملا کو جواب دینا بہت اچھا لگا۔ ماروی کی یہ قسط بھی لاجواب رہی۔ اسلامی صفحات پر اس بار ضیا تسنیم بلگرامی، فضل رحمٰن کی بابرکت شخصیت لے کر حاضر۔ اللہ کی شان دیکھی۔ ناہید سلطانہ اختر ایک بار پھر ایک شاہکار تحریر حکایت

سودوزیاں لے کر حاضر تھیں جو ہمارے معاشرے کی عکاسی کر رہی تھی۔ سیف صاحب جیسے لوگ اب اس معاشرے میں کہاں۔ اب تو ہر طرف نفسانفسی کا دور ہے۔ ویلڈن ناہید سلطانہ صاحبہ اس بار کے سسپنس کا شاہکار کہانیوں کا سرتاج آپ کی تحریر رہی...... اس بار پھر میرے اور آپ سب کے فیورٹ رائٹر مغل اعظم محبتوں کے امین۔ اپنے ایک اور شاہکار محبت اور فاصلے لے کر حاضر تھے۔ شہزادا اور بہزاد صاحب ایک ہی کشتی کے سوار، محبت میں ناکام بہزاد سے شہزاد کی ناکامی برداشت نہ ہوسکی اور اس کا ساتھ دیا دنیا میں ایسے لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں ویلڈن مغل اعظم۔ الیاس سیتاپوری کی تحریروں کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اس بار تو منظر امام صاحب ایک اور انمول تحریر داستان گونگوں کی لائے جو ہمارے معاشرے کے منہ پہ تمانچا ہے۔ ابراہیم جمالی اپنی لاجواب تحریر عزت کا سوال لے کر حاضر تھے۔ ہمارے معاشرے کی منافقت رئیس اور تھانیدار دوسروں کی عزت کو پامال کرتے رہے اور جانو اس کی بہن سکینہ کے ساتھ مل کر ان کی عزت کو پامال کرتا رہا ایک لحاظ سے سکینہ حق بجانب تھی۔ ثمر عباس اپنی مختصر مغربی تحریر گمشدہ لے کر حاضر تھے۔ میلیسا پارکر نے بہت اچھا کیا۔ ایسے ظالم اور بے حس شوہر سے جان چھڑائی۔ ناواقف نسیم جاوید سید کی مغربی تحریر جو مجرم اور قانون کے درمیان ایک سرد جنگ رہی۔ جوزف نے بہت کامیابی کے ساتھ کھیل کھیلا مگر قانون آخر قانون ہے۔ ایک نکتہ جس سے قانون جیت گیا، وہ جوزف کو سمجھ نہیں آیا۔ اس بار مرزا امجد بیگ اپنا نیا کیس پہلا پتھر لائے اور کتنے طریقے سے اپنے موکل عرفان کو بے گناہ ثابت کیا۔ تنویر ریاض کی ایک بہت ہی لاجواب تحریر۔ ڈاکٹروں نے بھی اب اپنے پیشے کو بدنام کر دیا ہے ورنہ ڈاکٹر تو مسیحا ہوتے ہیں۔ آخر میں تمام دوستوں اور اہلِ پاکستان کو عید مبارک۔ اتحاد و اتفاق میں رہنے کی دعا اس لیے نہیں دے رہی کہ ہم میں یہ جذبہ پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔“

✠ **رمضان پاشا گلشن اقبال، کراچی** سے لکھ رہے ہیں ”میری دعا ہے کہ آپ اور عملے کے تمام افراد خیر خیریت سے ہوں۔ میں بھی بفضلِ خدا خیریت سے ہوں۔ ڈاکٹر کی دوا سے زیادہ آپ کے ایک جملے نے کام کر دکھایا اور اب رو بہ صحت ہوں، الحمدللہ! اور اب تازہ شمارے پر تبصرہ۔ تازہ شمارے کا سرورق نہایت سادہ اور حسب ضرورت خوبصورت بنایا ہے۔ فہرست کی ترتیب بھی بہت ہی سادہ اور باسلیقہ ہے۔ انشائیہ میں اس بار جون صاحب نے حقیقتِ حال واضح کر دی، اب جو کچھ کرنا ہے کرلو۔ تاریخی کہانی کے بارے میں اس بار وہی گزشتہ ماہ کا جملہ دہراؤں گا کہ ”یادِ ماضی عذاب ہے یارب“ اب کسی کو برا لگے یا بھلا، ان کی مرضی...... محبت اور فاصلے، مغل صاحب واپس اپنے ٹریک پر آگئے ہیں اور اب مسلسل اور باقاعدگی کے ساتھ آتے رہیں تو اچھا رہے گا۔ شیش محل کی اس قسط نے تو بندے کو ہلا جلا کے رکھ دیا۔ دام کہانی مختصر اور پُرکشش تھی۔ اسی طرح خبط بھی مختصر تھی، یہ ایک انوکھی اور احمقانہ خواہش کا شاخسانہ۔ اس دفعہ بیگ صاحب کو بڑا اچھا اور عمدہ کیس ملا۔ پہلا پتھر عدالتی کارروائی میں خوب لطف آیا۔ امانت، یہ ایک پرانی کہانی کو نئے انداز میں تحریر کیا ہے، جو کہ اچھی لگی اور خوب مزہ بھی آیا۔ سویٹر گرل کہانی اثر انگیز تھی، اختتام بھی اچھا تھا۔ ناواقف، یہ کہانی واقعی دلچسپ تھی مگر اسے اتنی وسعت دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ ماروی کے اختتام پر ہی تبصرہ اچھا لگے گا، اس کی آخری قسط کے بارے میں سوچ کر دکھ ہو رہا ہے، کون لکھے گا آخری قسط؟ عزت کا سوال کہانی بھلی لگی، اختتام چونکا دینے والا تھا۔ گمشدہ بھی دلچسپ کہانی تھی۔ داستان گونگوں کی منظر امام نے ہنسی ہنسی میں ایک بھرپور طنز بھی دے مارا مگر کس پر؟ یہ تو سب ہی جانتے ہیں۔ مات مختصر اور دلچسپ، انسان جو سوچتا ہے وہ کبھی پورا نہیں ہوتا کیونکہ قدرت نے کچھ اور ہی سوچ رکھا ہوتا ہے۔ حکایت سودوزیاں زبردست اور سبق آموز کہانی تھی۔ اس کہانی میں خواتین کی دلچسپی کا سامان وافر مقدار اور تعداد میں موجود تھا۔ اشعار کی محفل میں ملائکہ حریم، سنعیہ منظور، ماہا ایمان، زرین آفریدی، زوہیب احمد ملک کے اشعار قابلِ داد تھے۔“ (بہت شکریہ جناب سسپنس سے آپ کی محبت کا)

✠ **محمد شہباز ناز، سرگودھا** سے تشریف لائے ہیں ”سب سے پہلے تو میں شکر گزار ہوں ادارہ سسپنس ڈائجسٹ کا کہ میرا پہلا خط شائع ہونے پر، اس کے بعد ٹائٹل کی بات کرتے ہیں تو حسینہ 402 ماہ رمضان میں بھی ایسے لگتی تھی جیسے کسی ہوٹل سے لنچ کر کے نکلی ہو۔ خدا بچائے ان حسینوں سے شریف آدمی ان کے چنگل میں پھنس جاتا۔ چلو چھڈو جی اس گل نوں آگے کی بات کرتے ہیں۔ تمام دوستوں کے تبصرے بہت اچھے آپس کی نوک جھونک میں بہت مزہ آتا ہے۔ جب سب دوست پیار و محبت میں ایک دوسرے کو تنگ کرتے ہیں۔ دعا گو ہوں کہ اللہ پاک اس محفل کو اسی طرح آباد و شاد رکھے۔ سسپنس کے پرانے قاری رانا نثار سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ میں دوسرے رسالے پڑھتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے میرے پاس رسالہ دیکھا۔ کہا کہ آپ سب رسالے چھوڑ دیں سسپنس پڑھا کریں۔ اس کے بعد سسپنس پڑھنا شروع کیا تو باقی سب بھول گیا۔ (زبردست...... یہ ہوئی نا بات) ایک درخواست ہے کہ دیوتا جیسی کہانی لکھی جائے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے سسپنس کے قاری زیادہ ہوں گے۔ بہشت زارا اعلیٰ پائے کی کہانی ہے، ماروی اچھی کہانی ہے۔ امانت اچھی تھی۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

مختار احمد، راولپنڈی۔ احمد انصاری، ملتان۔ عابد علی، سیالکوٹ۔ ثمینہ، کراچی۔ مدثر خان، پشاور۔ مہتاب علی خان، اسلام آباد۔ فرید احمد، ساہیوال۔ محمد سرور، حیدرآباد۔ ظہیر الدین، کراچی۔ زوہیب احمد ملک، کراچی۔ ثمرین، سکھر۔ ممتاز علی خان، کوئٹہ۔

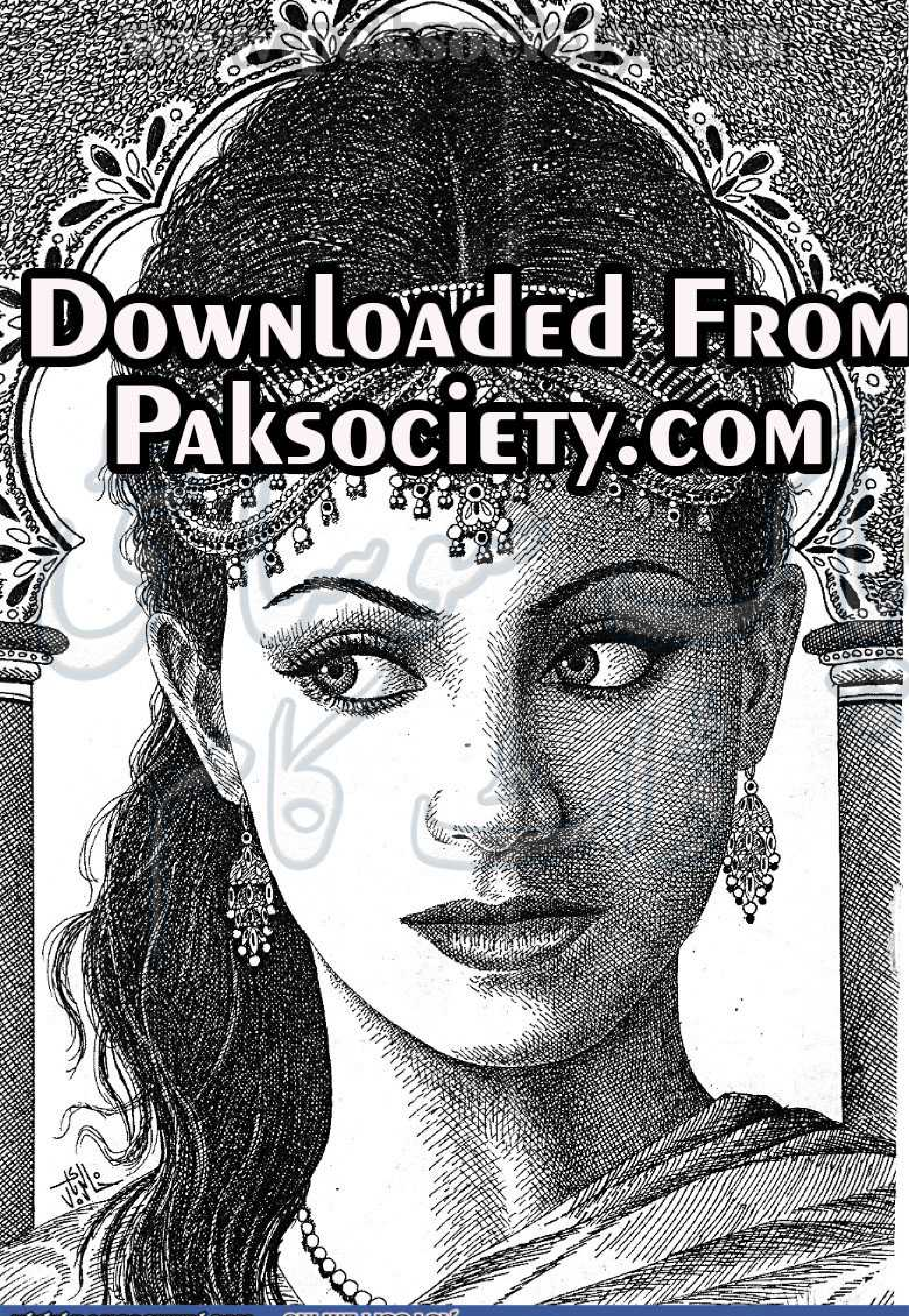
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

داستانِ رزم و بزم

الیاس سیتاپوری

ماضی جیسا بھی ہو گزر ہی جاتا ہے مگر... جیسا بھی گزرے یادوں میں محفوظ بھی رہتا ہے۔ انفرادی زندگی کی بات الگ ہے لیکن... اجتماعی طور پر قوموں کے حوالے سے تاریخی لمحات کی اہمیت ایک اٹل حقیقت ہے۔ انہی اقوام عالم میں سے ایک قوم منگول نے بھی تاریخ میں اپنی انفرادیت اور شناخت کو یوں محفوظ کیا کہ آج بھی یہ قوم وحشت دہشت اور بربریت کے احساس تلے یاد کی جاتی ہے۔ ماضی میں منگولوں نے جب بغداد کا رخ کیا تو جنگ سے پہلے سیاسی بساط پر کچھ ایسی جوڑ توڑ شروع کی کہ بڑے بڑے بازی گران کی حکمت عملی اور دلیرانہ اقدامات پر حیران رہ گئے۔ یہ لوگ اپنی قوم کے شاطروں کو اکٹھا کرکے جنگی تربیت اور سیاسی چالوں سے مخالف کو شکست دینے کے لیے کسی بھی انتہا پر جا کر لڑنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے اور وہ اس راز سے بھی واقف تھے کہ جنگ کے دوران نہ صرف اپنے حریف کے جسموں کو زخمی کرو بلکہ ان کے دل و دماغ کو بھی مجروح کر کے انتشار اور اختلال کے حربوں سے معطل کردو۔ انسانی جبلت کا حسین مرقع، بشری حسن اور بدصورتی کی دلنشین داستان۔





باطنیوں کی بیخ کنی کے بعد ہلاکو خان نے ذرا دم لیا۔

اس کے آس پاس ارمنی عیسائی اور صلیبی جنگجو تک جمع ہو چکے تھے۔ وہ یروشلم جو متحدہ یورپ کی یلغار سے بھی حاصل نہیں کیا جاسکا تھا، اب اسے منگول عفریت کی مدد سے شاید بہ آسانی حاصل کیا جاسکتا تھا۔ ہلاکو خان کی عیسائی بیوی دوقوز اپنے چوبی چیپل (درومی کیتھولک گرجا) میں بڑی مستعدی سے حاضری دیا کرتی۔ یہاں اس کے ہم مذہب بھائی بھی حاضریاں دیتے اور باتوں ہی باتوں میں دوقوز کو یاد دلاتے کہ یروشلم کو مسلمانوں سے حاصل کیے بغیر واپس جانا ایسا ہی ہے جیسے عبادت گاہ سے عبادت کے بغیر واپس چلے جانا۔ دوقوز چیپل کے سرخ پردوں کے پیچھے سے جواب دیتی۔

''میرا شوہر اپنا کام ادھورا چھوڑ کر واپس نہیں جائے گا۔ میں جانتی ہوں کہ خاقان نے میرے شوہر کو کیا حکم دے رکھا ہے۔ خاقان کا حکم ہے کہ سمرقند سے مصر کے آخری سرے تک چنگیز خان کے قوانین کو رواج دو۔ جو تمہارے آگے سر جھکا دیں، ان سے فیاضی سے پیش آؤ۔ جو سرکشی اختیار کریں، انہیں ذلیل وخوار کردو۔''

ایک صلیبی نے کہا۔ ''محترم خاتون! آپ کو یہ بات تو معلوم ہی ہوگی کہ یروشلم پر جو ہاتھ قابض ہے، اس کا جسم کہاں ہے؟''

دوقوز نے جواب دیا۔ ''میں جانتی ہوں اور خوب جانتی ہوں، بغداد کا خلیفہ...... اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جب تک جسدِ خلافت پر فیصلہ کن چوٹ نہیں پڑے گی، یروشلم مسلمانوں کے دستِ تظلم سے نجات نہیں حاصل کرسکے گا۔''

صلیبی مجاہد باغ باغ ہوگیا۔ اس نے اپنے سینے پر اشاروں سے صلیب بنائی اور دوقوز کو مؤدبانہ مخاطب کیا۔ ''خاتون محترم! اگر آپ نے یہ کام کرادیا تو آپ پر ہمیشہ آسمانی برکتوں کا نزول ہوتا رہے گا۔''

دوقوز چیپل سے نکل کر اپنے خیمے میں چلی گئی۔ وہاں یہ پیغام ملا کہ ہلاکو خان نے اسے اپنے دربار میں طلب کیا ہے۔ دربار میں دوقوز کی جگہ، ہلاکو خان کے برابر داہنی جانب تھی اور وہاں تک پہنچنے کے لیے دوقوز کو کہیں باہر سے نہیں، خیمے کے عقبی دروازے سے داخل ہونا پڑا۔ دوقوز نے اس دربار میں منگول سرداروں، شامانوں (ساحروں) عیسائی حلیفوں اور مشہور جنرل قط بوغا کو یوں کھڑے دیکھا کہ ان کی نظریں ہلاکو کی طرف نہیں اٹھ رہی تھیں۔ ہلاکو کے بائیں طرف اس کے بیٹے بیٹھے تھے لیکن دوقوز کی نظریں ایک ایسے شخص پر پڑ کر رک گئیں جو اپنے لباس اور وضع قطع سے مسلمان معلوم ہوتا تھا۔ دوقوز نے ہلاکو کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر اس اجنبی کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

''خانِ محترم! آپ کے دربار میں یہ کون شخص ہے؟''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''نصیر الدین طوسی، شیخ الجبال کا وزیر۔ اب یہ ہمارے ساتھ ہمارے پاس رہے گا۔''

دوقوز نے پوچھا۔ ''کیا یہ مسلمان ہے؟''

ہلاکو نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ مسلمان ہے۔''

دوقوز کے چہرے پر فکرمندی کے بادل چھا گئے۔ وہ نصیر الدین کی بابت کھل کر گفتگو نہیں کرسکتی تھی۔ ہلاکو نے اس کے تردد کو بھانپ لیا۔ پوچھا۔ ''کیا تو کچھ کہنا چاہتی ہے؟''

دوقوز نے جواب دیا۔ ''خانِ محترم! مجھ کو نہیں معلوم کہ نصیر الدین ہمارے ساتھ کتنی وفاداری دکھائے گا لیکن میں مسلمانوں پر اعتبار نہیں کرسکتی۔''

ہلاکو نے دوقوز کو نصیر الدین کی وفاداری کا یقین دلانے کی کوشش کی، بولا۔ ''ہم نے شیخ الجبال پر قابو اسی شخص کے مشوروں سے پایا تھا۔ یہ میرا نمک خوار بن چکا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ نمک کا حق ادا کرے گا۔''

دوقوز نے شک وشبے کا اظہار کیا۔ ''کیا بغداد کے خلاف بھی، یروشلم کے خلاف بھی؟''

ہلاکو نے جواب دیا۔ ''ہاں، ان دونوں کے خلاف بھی۔ نصیر الدین طوسی نہایت دیانت دار انسان ہے، کم از کم میں تو اسے دھوکے باز نہیں کہہ سکتا۔''

ہلاکو خان نے دربار میں موجود کئی مسلمانوں کو اپنے پاس بلایا اور ان سے سوال کیا۔ ''میرے مسلمان دوستو! خدا تمہیں راہِ حق پر لائے۔ ذرا یہ تو بتانا کہ تمہارا خلیفہ ہم سے مقابلہ کرکے کیا فائدہ یا نقصان اٹھائے گا؟''

ایک مسلمان نے جواب دیا۔ ''ہوسکتا ہے آپ کا لشکر بغداد کو فتح کرلے لیکن فتح بغداد کے بعد امیر المومنین کو نقصان نہیں پہنچایا جاسکتا۔''

ہلاکو خان نے چونک کر پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

مسلمان نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین کا تعلق رسول اللہؐ کے خاندان سے ہے چنانچہ اگر امیر المومنین کا خون زمین پر گر گیا تو زمین کانپنے لگے گی اور آسمان آگ برسائے گا۔''

نصیر الدین طوسی مسکرانے لگا۔ ہلاکو نے ایک دوسرے مسلمان سے پوچھا۔ ''اور اس سلسلے میں تو کیا کہتا ہے؟''

اس دوسرے مسلمان نے رک رک کر نظریں ملائے

بغیر جواب دیا۔ ”میں اپنے مسلمان بھائی کا ہم خیال ہوں۔ امیر المومنین کا خون اگر زمین پر گر گیا تو اللہ اس حصۂ زمین کو الٹ دے گا اور آسمان امیر المومنین کے قاتلوں سے عبرت ناک انتقام لے گا۔ مجھ کو جو کچھ معلوم تھا، بتا دیا...... آگے آپ جانیں اور آپ کا کام۔“

ہلاکو نے نصیر الدین سے پوچھا۔ ”اور تو کیا کہتا ہے؟“

نصیر الدین نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور اپنے مسلمان بھائیوں سے پوچھا۔ ”تم دونوں کو یہ بات کس نے بتائی کہ اگر امیر المومنین کا خون بہا تو خدا اس حصۂ زمین کو الٹ دے گا اور آسمان امیر المومنین کے قاتلوں سے عبرت ناک انتقام لے گا؟“

ایک مسلمان نے جواب دیا۔ ”خواجہ طوسی! آپ کو یہ بات ہم سے زیادہ اچھی طرح معلوم ہے۔“

خواجہ نے کہا۔ ”بے شک یہ بات میں تمام مسلمانوں کی نسبت زیادہ بہتر جانتا ہوں۔“ پھر ہلاکو خان کو مخاطب کیا۔ ”محترم ایل خان! (چھوٹے خان) امیر المومنین کی ہلاکت پر نہ تو زمین کانپے گی اور نہ ہی آسمان ناراض ہوگا۔ ذرا ان سادہ لوح مسلمانوں سے یہ تو پوچھیے کہ جب زکریا پیغمبر کو آرے سے چیر کر اور پیغمبر یحییٰ کا خون بہا کر مار دیا گیا تھا اور حسین ابن علیؓ کو کربلا میں شہید کر دیا گیا تھا تو اس وقت نہ تو زمین ہلی تھی، نہ ہی آسمان کانپا تھا پھر کیا مستعصم باللہ ان مذکورہ ہستیوں سے بھی بڑا ہو گیا ہے۔“

ہلاکو نصیر الدین طوسی کے طرزِ استدلال سے بہت خوش ہوا۔ دوقوز سے کہا۔ ”میں اس دانا و بینا کی وفاداری پر یقین رکھتا ہوں۔“

دربار میں موجود مسلمان لاجواب ہو چکے تھے۔ ہلاکو نے انہیں ذلیل کر کے خیمے سے نکلوا دیا۔ عیسائیوں کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔

ہلاکو نے خواجہ طوسی کو حکم دیا۔ ”اسی وقت خلافتِ بغداد کو ایک خط لکھ دے کیونکہ تجھ کو خلیفہ کی زبان آتی ہے۔“

چنانچہ ہلاکو خان کی طرف سے خواجہ طوسی نے ایک چند سطری خط لکھ دیا۔

”تم جانتے ہو کہ چنگیز خان کے زمانے سے اب تک دنیا کی مختلف قوموں کا منگول فوجوں کے ہاتھوں کیا حشر ہو چکا ہے۔ ہم بغداد آ رہے ہیں۔ اپنے معزز مہمانوں کے لیے اس کے سارے دروازے کھول دو۔ چونکہ ماضی میں بغداد کے دروازے خوارزمیوں اور سلجوقیوں کے لیے کھولے جا چکے ہیں اس لیے اسی حق کو اپنے لیے استعمال کرتے ہیں۔ تم ہمیں بغداد میں داخلے سے نہیں روک سکتے کیونکہ ہم طاقتور بھی ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ اپنا حق کس طرح حاصل کیا جاتا ہے۔ دیکھو، خبردار..... یاک کے نو دموں والے چنگیزی پرچم کے مقابلے پر نہ آنا۔ اگر ایسی غلطی کی تو تمہاری خیر نہیں۔“

اس خط کو ایک موٹے تازے منگول کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ منگول بھیڑیے کی بھوری کھال اوڑھے ہوئے تھا اور اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک پائی جاتی تھی۔ یہ دشوار گزار ندی نالوں اور اونچے اونچے پُرپیچ کوہستانی سلسلوں کو عبور کرنے میں ماہر تھا۔ ہلاکو نے اس کو چار آدمی اور دے دیے۔ ان چاروں نے بھی بھیڑیوں کی کھالیں اوڑھ رکھی تھیں اور ان سب کے گھوڑوں کی راس میں چاندی کے سکے پروئے ہوئے تھے۔ قاصدوں کو رخصت کر دینے کے بعد ہلاکو خان نے دربار برخاست کر دیا۔ دوقوز عقبی دروازے سے دوسرے خیمے میں چلی گئی۔ خواجہ طوسی اور چند عیسائی درباری ہلاکو کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

دوقوز کے اشارے پر ایک راہب نے ہلاکو خان کو راستے میں روک لیا اور آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”خان محترم! ہمیں معلوم ہے کہ خدا اور خداوند مسیح نے آپ کو مسیحیت کا نجات دہندہ بنا کے بھیجا ہے۔ یروشلم آپ کو آواز دے رہا ہے، آپ کے بازوؤں میں خدا نے قوت کے شعلے بھر دیے ہیں۔ آپ قہرِ خداوندی ہیں جو باطل پر برقِ خاطف بن کر گرے گا۔“

ہلاکو نے خواجۂ طوسی سے پوچھا۔ ”کیا یہ شخص عربی بول رہا ہے؟“

خواجۂ طوسی نے جواب دیا۔ ”جی بندہ پرور۔ یہ شامی معلوم ہوتا ہے۔“

ہلاکو نے پوچھا۔ ”ابھی ابھی یہ کیا کہہ رہا تھا؟“

خواجہ نے اس کا مطلب سمجھا دیا۔ ہلاکو نے راہب سے پوچھا۔ ”خدا نے اپنا قہر کسی عیسائی کی شکل میں کیوں نہیں نازل کیا؟“

راہب نے جواب دیا۔ ”خدا اپنے کام جس سے چاہتا ہے، لے لیتا ہے۔ وہ بڑی قدرت والا ہے۔“

اسی وقت اس کے سامنے سے دوقوز کی سواری گزری جو چیپل کی طرف جا رہی تھی۔ سواری کے دائیں بائیں اور پیچھے مسیحیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت بھی چل رہی تھی۔ راہب نے عرض کیا۔ ”جناب والا! خدا انسانوں کو راہ راست پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کیا چیپل تک چلنے کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



آپ بھی تکلیف گوارا فرمائیں گے؟‘‘

ہلاکو نے جواب دیا۔ ’’دو قوز تو جا رہی ہے میں وہاں جا کر کیا کروں گا کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ خدا اس بھیڑ بھاڑ کو دیکھ کر پریشان ہو جائے گا اور میں نہیں چاہتا کہ خدا خواہ مخواہ پریشانی اٹھائے۔‘‘

راہب منہ لٹکا کر ایک طرف جانے لگا۔ ہلاکو اس کی مایوس اور افسردہ شکل دیکھ کر مسکرایا اور اس کو روک کر حکم دیا۔ ’’تو چیپل میں چلا جا، وہاں تیرے مذہب اور تیری قوم کے کافی لوگ موجود ہوں گے۔ تم سب اپنے خدا سے دعا کرو کہ وہ مجھے کامیابی و کامرانی عطا فرمائے۔‘‘

راہب چلا گیا۔ ہلاکو خان ٹہل ٹہل کر خواجہ طوسی سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے خلافتِ عباسیہ کو دھمکی آمیز خط بھیج تو دیا تھا مگر ادھر سے مطمئن نہیں تھا کیونکہ اپنے دادا چنگیز خان کی طرح اس کو بھی خلافتِ عباسیہ کی طاقت کی عظمت کا احساس تھا۔

خواجہ نصیر الدین کی تیز نظریں ہلاکو خان کی بے چینی کو بھانپ رہی تھیں اور ہلاکو خان حتی الامکان اپنے اندرونی خلفشار کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہلاکو خان نے پوچھا۔ خواجہ طوسی کیا خلافتِ عباسیہ آج بھی اتنی ہی مضبوط ہے جتنی سالوں پیچھے صلاح الدین ایوبی کے زمانے میں تھی؟‘‘

خواجہ نے جواب دیا۔ ’’نہیں، اب وہ انحطاط پذیر ہے، زوال آمادہ مائل بہ انتشار۔‘‘

ہلاکو خان نے کہا۔ ’’خواجہ طوسی! ہمارا آبائی طریقۂ جنگ یہ ہے کہ ہم اپنے دشمن کے خلاف بیک وقت کئی محاذ جنگ کھول دیتے ہیں اور جب ان میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر اسلحہ اور گھوڑوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں اتر پڑتے ہیں۔‘‘

خواجہ نے کہا۔ ’’بے شک! جنگ کا ماہرانہ طریقہ بھی یہی ہے۔‘‘

ہلاکو خان نے کہا۔ ’’خلافتِ عباسیہ لاکھ لٹ گئی ہو مگر پھر بھی وہ عالمِ اسلام کی طاقتوں کا سرچشمہ ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ موجودہ عباسی خلیفہ مستعصم نااہل ہے اور اس کے لوگ اس سے خوش نہیں ہیں۔‘‘

خواجہ طوسی نے جواب دیا۔ ’’محترم ایل خان! دنیا کے بیشتر حکمرانوں سے ان کی رعایا کبھی خوش نہیں رہی۔ لوگ تبدیلیاں چاہتے ہیں اور برسرِاقتدار شخص سے زیادہ عرصہ خوش نہیں رہتے اور یہ برسرِاقتدار شخص نالائق، نااہل، احمق اور عیش و عشرت کا دلدادہ ہو تو اس کے امراء اس کو بہ آسانی دبوچ کر اپنی مرضی اور پسند کا کوئی کمزور شخص بٹھا کر اس کی آڑ میں حکومت کرنے لگتے ہیں۔‘‘

ہلاکو خان مسکرانے لگا۔ ’’میں یہی بات کہنا چاہتا تھا۔ تم مستعصم کے امراء سے رابطہ قائم کرو اور انہیں بتاؤ کہ میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ بغداد میں امن و امان رہے اور وہاں کے مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو عدم تحفظ کا احساس نہ ہو۔ میں بغداد اس لیے پہنچنا چاہتا ہوں کہ وہاں کے چند امراء مجھ سے درخواست کر رہے ہیں کہ میں ان کی مدد کروں اور بغداد کی حکومت کسی لائق فائق شخص کے حوالے کردوں۔‘‘

خواجہ طوسی کے خلافتِ بغداد کے وزیر ابن علقمی سے خوشگوار تعلقات نہیں تھے۔ کئی سال پہلے خواجہ طوسی نے ایک کتاب (اپنی تصنیف) کے ذریعے بغداد کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر ابن علقمی کی شرارت کی وجہ سے خواجہ طوسی ناکام اور مایوس ہو گیا تھا۔ خواجہ طوسی کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اب وہ بہت جلد خلیفہ اور اس کے وزیر سے انتقام لے سکے گا۔

ہلاکو خان ہر روز اپنے لشکر میں گھوم پھر کر اپنی سپاہ کے جوش و خروش کا اندازہ لگایا کرتا تھا۔ اس نے لوہاروں کو ہتھیار بناتے دیکھا۔ تیر، تلواریں، نیزے کی انیاں، خنجر، حربے اور جانے کیا کیا۔ بڑھئی تیر بناتے رہتے۔ اس تیر میں لوہے کے پھل پیوست کرتے رہتے۔ لشکر کے بیچوں بیچ یاک کی نو دموں والا پرچم نصب تھا جس کے لیے ہلاکو خان اور اس کی قوم کا یہ عقیدہ تھا کہ خان اعظم چنگیز خان کی روح اس میں حلول کر گئی ہے اور یہ پرچم جہاں بھی جائے گا فتح مندی اس کا مقدر ہوگی۔

ہلاکو خان جدھر سے بھی گزر جاتا، اپنے رعب اور دبدبے کے اثرات چھوڑ جاتا۔ خواجہ طوسی اس کے ساتھ رہتا اور دونوں مختلف موضوعات، واقعات، حالات اور شخصیات پر باتیں کرتے رہتے۔ ہلاکو خواجہ طوسی سے بہت متاثر تھا لیکن ایک بات ہلاکو کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس نے اپنے لشکر میں عیسائیوں کی بہتات دیکھی تھی۔ یہ لوگ متفقہ طور پر اس کوشش میں لگے رہتے کہ وہ کسی بھی طرح ہلاکو خان اور اس کے لشکر کو یروشلم اور بغداد تک لے جانے میں کامیاب ہو جائیں تاکہ مسلمانوں کو فیصلہ کن شکست دے کر وہ یروشلم کو آزاد صلیب کے سائے میں دیکھ سکیں۔ اس کی فوج میں یہودی بھی تھے اور انہیں بھی اپنی قوم کا فائدہ مقصود تھا لیکن ان سب کے برعکس اس کی فوج کے مسلمان اس

طرح نہیں سوچتے تھے۔ خواجہ طوسی نے شیخ الجبال اور اس کے متبعین کے خلاف ہلاکو خان کا ساتھ دیا تھا اور اب خواجہ خلافتِ عباسیہ بغداد کے خلاف ہلاکو خان کی بھرپور مدد کر رہا تھا۔ وہ خواجہ طوسی کی بڑی عزت کرتا تھا مگر یہ ضرور جاننا چاہتا تھا کہ ایک مسلمان دانش مند اپنی قوم اور اپنے ہم مذہبوں کے خلاف اس کی کیوں مدد کر رہا ہے؟

ہلاکو خان نے اپنی بیوی دوقوز کو چیپل سے نکلتے دیکھا...... دوقوز کو چند سیحی اپنے حصار میں لیے ہوئے تھے۔ ہلاکو خان نے خواجہ طوسی سے پوچھا۔ ''خواجہ! تیری بابت ایک سوال میرے دل و دماغ کو ہر وقت پریشان کرتا رہتا ہے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ میں تجھ سے یہ سوال نہ کروں اور خود ہی اس کا جواب تلاش کرلوں لیکن تھک ہار کر آج میں تجھ سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔''

خواجہ طوسی نے نہایت اطمینان سے پوچھا۔ ''محترم ایل خان! اپنا سوال فرمائیں، اللہ نے چاہا تو میں اس کا اطمینان بخش جواب دے کر آپ کو خوش کردوں گا۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''خواجہ طوسی! میں تیری بڑی عزت کرتا ہوں۔ آج تک میں اپنا یہ سوال اس لیے نہیں کرسکا تھا کہ اگر تو اس کا کوئی معقول اور اطمینان بخش جواب نہ دے سکا تو، تو خواہ مخواہ میری نظر سے گر جائے گا۔''

خواجہ طوسی پریشان ہو رہا تھا لیکن اپنی اس پریشانی کو چھپائے ہوئے تھا۔

ہلاکو خان نے کہا۔ ''خواجہ! میں دیکھتا ہوں میرے لشکر کے عیسائی اپنی قوم کا بھلا چاہتے ہیں اور میری وساطت سے یروشلم کی آزادی اور بغداد کی بربادی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح یہودی بھی اپنے مفاد کی سوچتے رہتے ہیں۔ ان دونوں کے برعکس ایک تو ہے کہ میرے مفاد اور اپنی قوم کے خلاف سوچنے اور قدم اٹھانے میں بڑی سرگرمی اور جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہا ہے...... آخر کیوں؟ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

خواجہ طوسی نے اطمینان کی سانس لی، بولا۔ ''اس کا جواب نہایت آسان ہے۔ تعصب دنیا کی بدترین اور بہترین چیز ہے۔ تعصب ہی کسی قوم اور مذہب کو بامِ عروج تک لے جاتا ہے اور تعصب ہی اسے قعرِ مذلت میں گرا کر نمونۂ عبرت بنا دیتا ہے۔''

ہلاکو خان اس کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔ خواجہ طوسی نے ذرا سا دم لیا اور پھر بولنے لگا۔ ''محترم خان! آگے بڑھنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ میں اچھے اور برے تعصب کی تعریف کردوں...... اچھا تعصب یہ ہے کہ ناجائز اور نامعقولوں کے مقابلے میں میں اپنے بھائی، اپنے ہم مذہب اور ہم قوم کی جائز اور معقول معاملات میں مدد کروں اور بدترین تعصب یہ ہے کہ میں اپنے نامعقول، ناجائز اور غلط بھائی کا معقول اور جائز غیر کے مقابلے میں ساتھ دوں۔ اس کی مدد کروں۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ ایک عادل اور سچا غیر میرے نامعقول، جھوٹے اور ناجائز بھائیوں کے مقابلے میں اٹھ کھڑا ہوا ہے تو مجھے مجبوراً اور اخلاقاً اس عادل اور سچے غیر کا ساتھ دینا پڑا۔ رہ گئے عیسائی اور یہودی تو وہ اپنے مظلوم بھائیوں کا ساتھ دے کر حق کا ساتھ دے رہے ہیں۔''

خواجہ طوسی کی طاقتِ لسانی نے ہلاکو خان کو زیر کرلیا تھا۔ وہ حیرت سے خواجہ کی صورت دیکھتا رہ گیا، پوچھا۔ ''کیا تو مجھ کو واقعی سچا اور عادل سمجھتا ہے؟''

خواجہ نے جواب دیا۔ ''سچا اور عادل سمجھنا کیا معنی؟ میں نے آپ کو اس سے زیادہ سمجھ رکھا ہے۔''

ہلاکو نے اپنی خوشی کو اندر ہی اندر دبا رکھا تھا، بولا۔ ''تجھ جیسے عقل مند اور بے لاگ شخص کی زبان سے اپنے بارے میں کچھ جان کر خوشی ہو رہی ہے۔ جاودانی نیلا آسمان مجھے تیرے معیار پر پورا اتارے۔''

خواجہ طوسی نے عرض کیا۔ ''خدا آپ کے ساتھ ہے۔ میرے اپنے عقیدے کے مطابق آپ کے دادا، آپ کے چچا، بھائی اور خود آپ کے ہاتھوں جتنے مسلمان مارے گئے ہیں، وہ مسلمان نہیں تھے، بے دین اور بے عقیدہ لوگ تھے۔ اگر خدا ہمیں وہ بینائی عطا فرماتا جس سے ہم انسانوں کو ان کی فطری اور حقیقی خصوصیات کی شکل میں دیکھ سکتے تو ان مرنے والوں کی شکلوں میں سانپ، بھیڑیے، کتے، شیر اور بچھو دکھائی دیتے۔ یہ انسانوں کی شکل میں جانور ہیں۔''

ہلاکو خان کو خواجہ طوسی نے مطمئن اور لاجواب کردیا تھا۔ وہ خواجہ طوسی کو ایک سبزہ زار پر لے گیا۔ یہاں گھاس پر لوگ پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہلاکو خان کو اس سبزے پر آتے دیکھا تو ادھر ادھر چلے گئے لیکن ان میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو جہاں بیٹھا تھا، وہیں بیٹھا رہا۔ یہ شخص اپنے حلیے، لباس اور چہرے کے خط و خال سے مسلمان نظر آتا تھا۔ اس نے ہلاکو کو اپنے سر پر آتا دیکھا تو کھڑے ہو کر خندہ پیشانی سے عرض کیا۔ ''محترم ایل خان! میں آپ

کو آداب بجالاتا ہوں۔''

ہلاکو خان نے اس شخص کو سر سے پاؤں تک بہت غور سے دیکھا۔ ''تیرا کس ملک سے کس مذہب سے اور کس قوم سے تعلق ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''محترم ایل خان! میں آدم کا بیٹا ہوں اور آپ بھی آدم ہی کے بیٹے ہیں۔ کیا ہم دونوں بھائی بھائی نہیں ہیں؟''

ہلاکو خان چکرا گیا۔ یہ کیسا نڈر اور دلیر شخص تھا جو اس کے رعب میں نہیں آتا تھا۔ اس نے تیوریاں چڑھائیں اور ڈانٹا۔ ''او بدنصیب انسان! کیا تو مجھے نہیں جانتا، میں ہلاکو خان ہوں۔ جب میں بولتا ہوں تو دوسرے گنگ ہو جاتے ہیں۔''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''محترم خان! میں نے آپ سے باتیں تو کی ہیں مگر گستاخی سے نہیں پیش آیا۔ اگر میں نے کسی قسم کی بے ادبی کی ہے اور آپ کے احساسِ برتری کو مجروح کیا ہے تو مجھے معاف فرما دیجیے کیونکہ عفو، درگزری، چشم پوشی اور ستاری آپ جیسے بڑے انسانوں کے زیورِ مردانگی ہیں۔''

ہلاکو خان بہت برہم تھا، بولا۔ ''میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو زیور پہن کر عورتوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ میں تجھ کو تیری جسارت اور گستاخی کی سزا ضرور دوں گا۔''

خواجہ طوسی اس شخص سے متاثر ہوا تھا۔ اس نے ہلاکو خان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''بندۂ پرور! میرا دل کہتا ہے کہ یہ شخص ہمارے کام آئے گا اس لیے اس کو سزا نہ دی جائے۔''

ہلاکو خان اس شخص کے چہرے مہرے اور خدوخال سے اس کو منگول سمجھنے پر مجبور تھا مگر اس کی باتیں اسے خوارزم اور بخارا سے بغداد تک کے درمیانی علاقے کا ثابت کر رہی تھیں۔ ہلاکو خان نے خواجہ طوسی سے کہا۔ ''میں اس وقت تک اسے نہیں معاف کروں گا جب تک یہ مجھے اپنے حسب نسب کی بابت صاف صاف نہیں بتا دے گا۔''

خواجہ طوسی نے پوچھا۔ ''اے شخص تیرا نام؟''

اس نے جواب دیا۔ ''دُرداغ۔''

ہلاکو خان نے چونک کر اس شخص کو دیکھا، پوچھا۔ ''لیکن یہ نام تو صحرائے گوبی کے اس پار جھیل بیکال کے آس پاس رکھے جاتے ہیں؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''خان محترم! میں تائی جوت قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرا خاندان جھیل بیکال کے شمال مشرق میں آباد تھا۔''

ہلاکو خان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''کیا تو واقعی تائی جوت قبیلے سے تعلق رکھتا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''محترم خان! جیسا کہ خود آپ بھی جانتے ہیں، ہم لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔''

خواجہ طوسی نے کہا۔ ''درداغ! چونکہ تو زبان و بیان اور اپنے طور طریق سے تائی جوت نہیں لگ رہا، اس لیے خان محترم کو شک ہے۔ اب تو یہ بتا کہ اتنا مہذب کیونکر ہو گیا؟ کیا تجھ کو ہماری زبانیں آتی ہیں؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''جب سوبودائی بہادر ہنگری میں دادِ شجاعت دے رہا تھا، میں اپنے باپ کے ساتھ بخارا چلا آیا تھا پھر میرا باپ مر گیا اور میں کرائت قبیلے کے ایک شخص کے زیرِ سایہ چلا گیا۔ مجھ کو مسلمانوں کی تہذیب اور شستگی نے متاثر کیا اور میں دن رات اس کوشش اور جدوجہد میں رہا کہ کسی طرح میں بھی انہی جیسا ہو جاؤں۔ ان لوگوں میں گھل مل جاؤں۔ میں نے فارسی پڑھی، عربی پڑھی، میں ترکی بھی جانتا ہوں اور قفقاز کی کئی زبانیں بھی مجھے آتی ہیں۔ ان زبانوں نے میرا تہذن بھی بدل دیا اور مزاج کی تندی اور کرختگی کی جگہ نرمی اور شگفتگی آگئی اور اب میں اپنے چہرے اور خدوخال سے تو تائی جوت قبیلے کا ایک فرد ہوں مگر لباس، اس کی تراش خراش اور اپنی وضع قطع میں یہاں کا مسلمان ہوں۔''

ہلاکو خان نے نفرت سے منہ پھیر لیا، پوچھا۔ ''کیا تو مسلمان ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں تائی جوت قبیلے کا ایک شخص ہوں اور جاودانی نیلے آسمان پر یقین رکھتا ہوں۔''

خواجہ طوسی نے درداغ سے پہلے تو فارسی میں باتیں کیں، اس کے بعد عربی ذریعۂ گفتگو بن گئی۔ خواجہ کو حیرت اس بات کی تھی کہ درداغ کا لہجہ بھی فارسی یا عربی بن گیا تھا، پوچھا۔ ''تیرا خیمہ؟''

درداغ اپنے در پر ہی کھڑا ہوا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ رہا میرا خیمہ۔''

ہلاکو خان کا عجب حال تھا۔ وہ درداغ سے خوش بھی تھا اور ناخوش بھی۔ خوش اس لیے تھا کہ ایک تائی جوت جوان عربی، فارسی اور کئی دوسری زبانیں سیکھ کر انہی جیسا بن گیا اور ناخوش اس بات پر تھا کہ اس نے یہ کیا کیا کہ اپنی وضع قطع اور طریقۂ بودوماند تک چھوڑ دیا تھا۔

خواجہ طوسی نے کہا۔ ''محترم خان! درداغ کے لیے کوئی حکم۔''

ہلاکو خان نے درداغ کو خونخوار نظروں سے دیکھا اور پھر

خواجہ طوسی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس جوان سے کوئی کام لیا جائے۔''

خواجہ طوسی نے پوچھا۔ ''درداغ ہمارے کس کام آسکتا ہے خانِ محترم! یہ ہمارے لشکر میں تو شامل ہی ہے، بوقت آنے پر یہ ہمارے کام یوں بھی آئے گا۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''نہیں، یہ کام نہیں...... لڑنے کے لیے میرے لشکر میں سپاہیوں کی کوئی کمی نہیں۔ میں اس سے کوئی اور کام لینا چاہتا ہوں۔'' پھر اچانک درداغ سے پوچھا۔ ''تو تنہا ہے یا کچھ رشتے دار بھی ہیں تیرے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں تنہا ہوں خانِ محترم! بالکل تنہا۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''تب پھر تو کل صبح مجھ سے ملاقات کرے گا۔'' وہ مسکرا رہا تھا۔ ''میں بہت خوش ہوں، بہت زیادہ خوش کہ تائی جوت قبیلے کا جوان مسلمانوں کی کئی زبانیں جانتا ہے، حیرت! گویا کہ تو کتابی آدمی ہے۔ بخارا کی کتابیں پڑھنے والوں جیسا...... یعنی اب ہم میں بھی ایسے جوان موجود ہیں جو سفارت اور......'' اچانک خواجہ طوسی کی طرف گھوم گیا۔ ''خواجہ طوسی! میرا دادا چنگیز خان جس طرح جنگیں لڑا کرتا تھا، میں اس میں ذرا سی تبدیلی، ذرا سا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں، تیرا کیا خیال ہے خواجہ محترم!''

خواجہ طوسی نے دبی زبان میں عرض کیا۔ ''جب تک مجھے آپ کی ذرا سی تبدیلی اور اضافے کا علم نہ ہو جائے میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔''

ہلاکو خان نے درداغ کو حکم دیا۔ ''اب میں واپس جا رہا ہوں۔ کل علی الصباح...... ضروری ہے...... میں تیرا انتظار کروں گا۔''

ہلاکو خان خواجہ طوسی کے ساتھ واپس ہوا۔ وہ بہت خوش تھا۔ وہ خواجہ سے کہنے لگا۔ ''خواجہ طوسی! آج سے پہلے تو میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ہمارے قبائل میں بھی کتابوں والے پیدا ہوں گے۔ کیا تو نے غور نہیں کیا، درداغ کو مسلمانوں کی کئی زبانیں آتی ہیں۔ کمال کر دیا اس جوان نے!''

خواجہ طوسی نے آہستہ سے کہا۔ ''خانِ محترم! جنگیں قوموں کو قریب لے آتی ہیں اور ان کی زبانوں میں اضافے ہونے لگتے ہیں۔ ان کا تمدن بھی ایک دوسرے سے متاثر ہو جاتا ہے جس طرح درداغ نے ہماری زبانیں اور ہمارا تمدن حاصل کر لیا ہے، اسی طرح ایک دن یہ بھی دیکھنے میں آئے گا کہ خانِ محترم سے نبرد آزما قومیں حرب وضرب اور جنگ وجدل میں وہی طریقے اختیار کریں گی جو ان کے مقابل اختیار کیے جاتے رہے ہیں۔''

ہلاکو خان نے شاید خواجہ طوسی کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میرا دادا چنگیز خان یوں تو کتاب والوں کو بیکار، بزدل اور نکما سمجھتا تھا مگر ختائی دانش ور... لیوچت سائی کی بڑی عزت کرتا تھا۔ میرا خیال ہے درداغ بھی مجھ سے عزت کرائے گا۔''

خواجہ طوسی بہت خوش تھا کیونکہ وہ درداغ کی شکل میں منگولوں کو تہذیب وتمدن کا غلام بنتے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہلاکو کو

خان سے جدا ہو کر اپنی قیام گاہ میں چلا گیا۔ خواجہ کا دماغ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔ وہ عالم خیال میں بغداد کی سیر کر رہا تھا۔ اس نے قصر الذہب میں خلیفہ مستعصم باللہ کو بے دست و پا دیکھا۔ خلیفہ کے خوشامدی عیش پرست مصاحبین زندہ مستعصم سے یوں چمٹے ہوئے تھے جس طرح بوڑھے گدھ مردہ یا نیم مردہ لاشوں سے چمٹتے ہوں۔

☆☆☆

ہلاکو خان کچھ دیر کے لیے اپنے خیمے سے باہر نکلا اور اس کی نظروں نے دور تک درداغ کو تلاش کیا۔ جب وہ کہیں نظر نہ آیا تو وہ دوبارہ اپنے خیمے میں چلا گیا۔ وہ درداغ سے ناراض ہو چکا تھا۔

خواجہ طوسی جب ہلاکو خان کے خیمے میں داخل ہوا تو وہ بہت برہم تھا۔ ہلاکو خان کے سامنے غیر معمولی حیثیت کے لوگ موجود تھے اور یہ سارے کے سارے ہلاکو خان میں اس تبدیلی کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

ہلاکو خان نے خواجہ طوسی کو نہایت برہمی سے مخاطب کیا۔ ”خواجہ طوسی! یہ کتاب والے لوگ قول و قرار اور عہد معاہدے کے پابند نہیں ہوتے، بس ان کی یہی چیز ناقابلِ برداشت ہوتی ہے اور میں یہ چیز نہیں برداشت کر سکتا۔“

اتنے میں دربان نے ہلاکو خان کو مطلع کیا۔ ”ایک درداغ نامی جوان باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔“

ہلاکو خان نے حکم دیا۔ ”اس کو فوراً حاضر کیا جائے۔“

کچھ دیر بعد درداغ کو ہلاکو خان کے سامنے پہنچا دیا گیا۔ ہلاکو اس کو دیکھتے ہی گرم ہو گیا۔ ”تجھ کو میں نے طلب کیا تھا پھر اتنی دیر کہاں لگا دی؟ میں پوچھتا ہوں کیا تو اسی طرح اپنے فرائض منصبی ادا کرتا ہے کیا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”محترم خان! میں ذرا پہلے بھی آسکتا تھا مگر محض اس خیال سے نہیں آیا کہ آپ ممکن ہے کسی سے باتیں کر رہے ہوں۔ آپ اپنے اہل لوگوں کو ان کے فرائض منصبی سے آگاہ کر رہے ہوں۔“

ہلاکو خان نے ڈانٹ دیا۔ ”بند کر اپنی بکواس۔ میں تجھ پر اعتبار نہیں کر سکتا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”آپ مجھ پر اعتبار کریں گے۔ ضرور کریں گے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ جھیل بیکال کے چاروں طرف آباد قبائل علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں لیکن میں جو تائی جوت کا ایک شریف ترین فرد ہوں مسلمانوں کی زبانیں سیکھ چکا ہوں خان محترم! سفارتی معاملات میں جتنا وفادار میں ہو سکتا ہوں، کوئی اور نہیں ہو سکتا۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”اس زعم میں نہ رہ۔ میں انسانوں سے کام لینا جانتا ہوں۔ میں سفارت کا کام کسی بھی شخص سے لے سکتا ہوں۔“

خواجہ طوسی نے جوان کی سفارش کر دی۔ ”خان محترم! یہ ہمارے جسم کا ایک حصہ ہے، صحرائے گوبی کے اس پار قبائل کا ایک نہایت قیمتی نوجوان...... دیکھیے اس کو بھی ضائع نہ کر دیجیے گا۔“

ہلاکو خان نے درداغ کو حکم دیا۔ ”تو اس وقت تک خاموش بیٹھا رہے گا جب تک میں خود تجھ کو مخاطب نہ کروں۔“

درداغ چپ چاپ بیٹھ گیا۔ ہلاکو خان حاضرینِ دربار سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے انہیں بغداد اور خلیفہ بغداد کی بابت بتایا کہ وہ کیسا لالچی، کنجوس اور عاقبت نااندیش اور عیش و عشرت کا دلدادہ ہے۔ ”ہمارا آئندہ مقابلہ اسی سے ہو گا، جہاں تک میں جانتا ہوں میرے آدمیوں نے مجھے یہ بتایا ہے کہ مستعصم ہم سے نہیں لڑے گا۔ ہم اس پر کئی احسان کر چکے ہیں......“

خواجہ طوسی نے حیرت سے پوچھا۔ ”پوری بات سنے بغیر یہ نمک حلال آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آپ نے عباسی خلیفہ مستعصم پر کون سے احسانات فرمائے ہیں؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”وہ شیخ الجبال کے فدائیوں سے عاجز تھا، میں نے ان کا قلع قمع کر دیا۔ کیا اس ایک سو ستر سالہ فتنے کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنا آسان کام تھا؟ کیا یہ غیر معمولی کام نہیں تھا؟ کیا میں نے اس طرح خلیفہ پر احسانِ عظیم نہیں کر دیا؟“

خواجہ طوسی نے سر جھکا لیا، بولا۔ ”بجا ارشاد فرمایا آپ نے۔“

ہلاکو خان کہتا رہا۔ ”میں خلیفہ کو ہٹانا نہیں چاہتا لیکن مجھے یہ بات بھی پسند نہیں کہ خلیفہ کے دارالخلافہ بغداد میں دو فرقے آپس میں خون خرابا کریں۔ کسی بھی حکمراں کے لیے یہ بڑی شرمناک بات ہے کہ جس جگہ وہ تشریف فرما ہو، وہیں اس کے آس پاس لوگ ہاتھا پائی میں مشغول ہوں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ اس حکمراں کا جلال اور اقبال اس کا ساتھ چھوڑ چکا اور یہ حقیقت ہے کہ جب میں نے یہ محسوس کیا کہ خلیفہ بغداد کا اقبال اس سے چھن چکا ہے تو میں نے بہ تائید ایزدی اس نااہل سے حکومت چھین کر کسی اہل کے سپرد کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔“

درداغ ہلاکو خان کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا

تھا۔ ہلاکو خان بولتا رہا۔ ”ہمیں اسلام یا مسلمانوں سے کوئی عناد نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس جمود کو دور کردوں جو کئی صدیوں سے بغداد پر چھایا ہوا ہے۔“

اس کے بعد ہلاکو خان نے اپنے سرداروں کو یہ حکم دیا کہ وہ بے مثال تیاری شروع کردیں۔ بغداد پر حملے کی بے مثال تیاریاں...... کیونکہ ہلاکو کا خیال تھا کہ اس کا موجودہ حریف پچھلے تمام حریفوں سے قطعی مختلف اور زیادہ طاقتور ہے۔ طاقتور ان معنی میں کہ پورے عالم اسلام کی عقیدت اور وابستگی کی وجہ سے ہلاکو خان کا بغداد پر حملہ کرنا، گویا حملہ مسلمانوں اور اسلامی قوتوں پر حملہ کرنا ہے۔

دربار برخاست ہوا مگر درداغ اور خواجہ طوسی کو روک لیا گیا۔ ہلاکو خان درداغ پر ایک بار پھر برہم ہوا۔ ”تائی جوت کے جوان! یاد رکھ وقت کی پابندی اور انسان کی مستعدی کارزارِ حیات میں ہمیشہ بہت اہم رہی ہے۔ اس بات کو بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ میرا دادا چنگیز خان فاتح عالم کس طرح بن گیا۔ اس نے اپنے عہد کی عظیم طاقتوں کو کس طرح خاک میں ملا دیا اور اس کی کامیابیوں کا راز کیا تھا؟ آج اس راز پر سے میں پردہ اٹھاتا ہوں۔ میرا دادا چنگیز خان حملے اور دشمن کی سرکوبی برق رفتاری سے کیا کرتا تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کے سر پر ان کی توقع سے پہلے پہنچ جایا کرتا تھا۔ اس کی قوت فیصلہ بہت تیز تھی، بالکل تلوار کی دھار کی طرح۔ جب وہ اپنے گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑتا تو زمین کی طنابیں کھنچ جاتی تھیں، میرا دادا زبردست مردم شناس تھا۔ وہ اقوام عالم کا نباض تھا۔ وہ اپنے سامنے موجود اور مجبور انسانوں کی زبانوں سے ناواقف اور ناآشنا ہونے کے باوجود ان کے چہروں کے تاثرات سے ان کے دلوں کا حال اور ارادے جان لیا کرتا تھا۔ اس کو دھوکا دینا ناممکن تھا۔ میرے کردار اور طریق عمل میں میرے دادا چنگیز خان کی پرچھائیں ملے گی۔ میں بھی اپنے دشمن کو سوچنے اور تیاریاں کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا اور درداغ سست اور خاموش کتابوں کی طرح تو بھی ڈھیلا ڈھالا ہو کر رہ گیا ہے۔ تو نہیں جانتا کہ میں تجھ سے کیا کام لینا چاہتا ہوں۔“

خواجہ طوسی ہلاکو خان کی باتوں سے بیزار سا لگ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہلاکو خان کو جو کچھ کہنا ہے فی الفور کہہ دے، اس کے لیے اتنی تمہید باندھنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ ہلاکو خان نے خواجہ طوسی کے احساسات کو اس کے...... چہرے کے تاثرات سے پڑھ لیا، بولا۔ ”یہ نصیرالدین جو علم و دانش کا پتلا ہے، یہ بھی اس راز سے واقف نہیں کہ اپنے کسی

حقیقت

محبت: جس کے دم سے ریسٹورنٹ آباد ہیں۔
اسٹوڈنٹ: مستقبل کا بے روزگار طبقہ۔
پردہ: جسے لڑکیاں کھڑکیوں پر لٹکاتی ہیں۔
دل: بغیر آپریشن کے دیے جانے والا عضو
کالج: تفریح گاہ
یونیورسٹی: خوشگوار زندگی کے آخری ایام
شادی: ان تمام گناہوں کی سزا
مرسلہ۔ محمد جاوید خان، تحصیل علی پور

حریف کو کس طرح چت کیا جاسکتا ہے۔ رزم گاہ حیات میں ہوشیار اور لائق انسانوں کو بیک وقت کئی محاذوں پر لڑنا پڑتا ہے، اپنے دشمن کو بالکل مغلوب کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے جسم کے ساتھ اس کے دل و دماغ کو بھی مجروح کردیا جائے۔ اس کے دل و دماغ میں انتشار اور اختلال پیدا کردیا جائے۔ میرے دادا چنگیز خان کی طرح میرا علم بھی کتابی نہیں اکتسابی اور تجرباتی ہے۔ میں اور میری فوج خلیفہ بغداد اور اس کی سپاہ کے جسموں کو زخمی کردیں گے لیکن درداغ اور اس جیسے دوسرے جوان خلیفہ اور اس کی فوج کے دل و دماغ کو زخمی کرسکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ درداغ بغداد پہنچ کر مسلمان ہوجائے اور خلیفہ کو میرے ارادوں سے غافل کردے۔ مستعصم باللہ کو یقین دلادے کہ میں اس کے خلاف لشکر کشی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ درداغ خلیفہ اور اس کے مقربین کو یہ بھی بتائے گا کہ میں ہلاکو خان بھی اسلام کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں اور کسی بھی دن اپنے مسلمان ہوجانے کا اعلان کردوں گا۔ اس طرح خلیفہ میری طرف سے غافل اور مطمئن ہوجائے گا اور میں اس کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خلافتِ عباسیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔“

خواجہ طوسی ہلاکو خان کی تجویز سن کر سکتے میں آگیا۔ ہلاکو خان کہتا رہا۔ ”تو اپنے ہی جیسے چند جوانوں کو لے کر بغداد چلا جا اور وہاں کسی مشہور اور بااثر شخص کے ہاتھوں پر اسلام قبول کرلے اور کوشش کر کہ تجھ کو خلیفہ اور اس کے خاص مقربین تک رسائی حاصل ہوجائے۔ تقرب حاصل کرنے کے بعد تو نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے مسلمانوں میں انتشار پھیلاتا رہے گا اور خلیفہ کو یہ باور کرائے گا کہ ہلاکو خان بھی بہت جلد مسلمان ہونے والا ہے۔ یہ ایک خاکہ ہے جس میں رنگ آمیزی تو خود کرے گا۔ جب تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے گا تو کسی پراسرار شاطر بازی گر کی طرح

میں نمودار ہو جاؤں گا اور اپنے حصے کا کام کر کے فراغت حاصل کر لوں گا۔''

درداغ کو اس کام میں خطرات بھی محسوس ہوئے اور دلچسپی بھی۔ وہ بغداد جانے اور ہلاکو خان کی تجویز پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ ہلاکو خان نے خواجہ طوسی سے کہا۔ ''خواجہ طوسی! درداغ کو نماز پڑھنا سکھا دے اور دین اسلام کی بنیادی باتیں بھی سکھا بتا دے تاکہ یہ بغداد میں مار نہ کھا جائے۔''

درداغ نے عرض کیا۔ ''جناب والا! اگر میں اس تجویز میں ذرا سی تبدیلی کر دوں تو؟''

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ''کیسی تبدیلی؟''

خواجہ طوسی نے عرض کیا۔ ''محترم خان کی تجویز میں کسی تبدیلی کی بظاہر تو کوئی گنجائش نہیں، یوں سن لینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔''

درداغ نے کہا۔ ''میں بغداد کے علمائے کرام کو یہ باور کرانے کی کوشش کروں گا کہ منگول معاشرے نے یہ جاننے کے بعد کہ میں اسلام کی طرف مائل ہوں اور مسلمان ہو جانا چاہتا ہوں، مجھ پر بڑے ظلم کیے اور میرا جینا دوبھر ہو گیا۔''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''میری طرف سے اجازت ہے میں تو یہ چاہتا ہوں کہ مجھے میرا مقصد حاصل ہو جائے۔''

خواجہ طوسی نے کہا۔ ''میں درداغ کو ایک حد تک نماز روزہ سکھا بتا دوں گا کیونکہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں سال چھ مہینے میں ایسا کر دیتا کہ خلیفہ بھاگا بھاگا پھرتا اور ہر وقت میرے گیت گایا کرتا۔''

درداغ کو ہلاکو خان نے دیر تک سمجھایا اور ہلاکو کی ہر بات سے یہی محسوس ہوتا رہا کہ وہ تائی جوت کے جوان کے پڑھ لکھ جانے سے بے حد خوش ہے اور اب وہ اقوام عالم کے بیچ میں بیٹھ کر مردانہ وار یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے جنگجو اور وحشی قبائل میں بھی پڑھے لکھے لوگ موجود ہیں۔

خواجہ طوسی نے اسے کلمہ یاد کرایا، وضو کا طریقہ بتایا، چند سورتیں یاد کرائیں اور پنج وقتہ نماز کی بابت سب کچھ یاد کرا دیا۔ اس نے ہلاکو خان کے سامنے دو رکعت نماز پڑھ کر دکھا دی۔ خواجہ طوسی نے درداغ کو ذہن نشین کرا دیا۔ ''تو جب بھی نماز پڑھے گا اس بات کا خیال رکھے گا کہ تیرا منہ قبلے کی طرف رہے۔''

درداغ نے پریشانی سے پوچھا۔ ''مگر مجھے یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ قبلہ کدھر ہے؟''

خواجہ طوسی نے جواب دیا۔ ''تو جہاں بھی جائے گا، تجھے مینا جد سرا اٹھائے کھڑی دکھائی دیں گی اور یہ طے ہے کہ ہر مسجد کا رخ قبلے کی طرف ہوگا۔''

درداغ نے اس بات کو لکھ لیا تاکہ جب بھی ضرورت پڑے دیکھ کر سمجھ لیا کرے۔

ہلاکو خان نے درداغ سے پوچھا۔ ''بغداد تو تنہا جائے گا یا چند نوجوان اور ساتھ کر دیے جائیں؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''فی الحال تو مجھے جانے دیجیے۔ دو چار ماہ بعد میری ہی طرح چند نوجوانوں کو بھیج دیا جائے تاکہ خلیفہ عباسی اور بغداد کے مسلمان اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ منگولوں میں اسلام بڑی تیزی سے مقبول ہو رہا ہے۔''

درداغ کی یہ تجویز ہلاکو خان اور خواجہ طوسی کو یکساں پسند آئی۔ درداغ نے پانی کی چھاگل، چند ہتھیار، زادِ راہ کے طور پر کچھ کھانے کا سامان، چند کپڑے ساتھ لیے اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے لشکر سے جدا ہو گیا۔ اس نے اپنے جسم پر بھیڑیے کی کھال ڈال لی جس سے ہر دیکھنے والا یہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ شخص دوسروں سے قطعی مختلف ہے۔ درداغ کئی دن بعد ایک پڑاؤ پر پہنچ گیا۔ یہاں ایک قافلہ بغداد جانے کے لیے تیار تھا۔ اس قافلے میں انسانی معاشرے کے کافی لوگ شامل تھے۔ سپاہی بھی، تاجر بھی، کاشتکار بھی اور اہل حرفہ بھی۔ دین دار بھی اور دنیا دار بھی۔ عالم بھی اور جاہل بھی۔ درداغ نے اس قافلے میں اپنے لیے ایک دین دار کا انتخاب کیا۔ یہ دین دار عمر رسیدہ شخص خاصا حشم و خدم رکھتا تھا۔ اس کا خیمہ اور دوسرا سامان اونٹوں اور گدھوں پر سفر کر رہا تھا۔ اس کے پاس کھانے پینے کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ قافلے کے مسلمانوں کی امامت کا فریضہ بھی انجام دیتا جا رہا تھا۔ قافلے میں عیسائی بھی موجود تھے لیکن یہ کم تھے۔

درداغ کو ایک کوہستانی سلسلے میں پڑاؤ کے دوران بڑی پریشانی پیش آئی۔ یہاں سخت سردی تھی۔ درداغ رات کو کسی چٹان کے نیچے لیٹ کر نیند مار لیتا۔ اس کے پاس بستر بھی نہیں تھا۔ اس کی پوری کوشش یہ تھی کہ دین دار مسلمان کسی طرح اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔ وہ کئی بار اس کے سامنے سے گزرا بھی مگر درداغ پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ قافلے کے دوسرے لوگ تو درداغ کو دلچسپی سے دیکھتے رہتے لیکن دین دار شخص کو گویا اس سے نفرت تھی۔ وہ

ہر وقت بیزاری کا اظہار کرتا رہتا۔

آخر درداغ کی سمجھ میں ایک ترکیب آئی۔ قافلہ ایک کوہستانی وادی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہاں ایک چشمے پر نمازی ایک ساتھ وضو کرتے اور بھاگ کر دین دار شخص کی اقتدا میں نماز ادا کرتے۔ درداغ نے جب یہ دیکھا کہ سب نے اس عمر رسیدہ شخص کی امامت میں پیچھے کھڑے ہو کر فجر کی نماز پڑھ لی ہے تو وہ چشمے پر تنہا وضو کرنے پہنچ گیا۔ دین دار شخص اپنے خیمے کے در پر کرسی ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ارادت مندوں نے اس کی توجہ درداغ کی طرف منعطف کرائی، درداغ وضو کر رہا تھا۔ دین دار شخص آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر درداغ کو دیکھ رہا تھا۔

وضو کر چکنے کے بعد درداغ نے سبزے پر قبلہ رو ہو کر فجر کی نماز ادا کی۔ دین دار شخص بڑے انہماک سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ بھیڑیے کی بھوری پوستین اس کے جسم کو ڈھانپے ہوئے تھی۔

دین دار شخص نے اپنے ایک ارادت مند سے کہا۔ ''تو نے کچھ دیکھا، مجھ کو یہ وحشی مسلمان معلوم ہوتا ہے۔''

ارادت مند نے عرض کیا۔ ''حضرت! اس کو آپ نے آج دیکھا ہے نماز پڑھتے۔ یہ تو جب سے ہمارے قافلے میں آیا ہے، میں اس کو اسی طرح نمازیں پڑھتے دیکھ رہا ہوں۔''

دین دار شخص نے کہا۔ ''جا، اس کو میرے پاس بلا لا۔ میں اس سے چند باتیں کروں گا۔''

وہ شخص درداغ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد درداغ نے اس شخص پر سرسری نظر ڈالی اور ایک طرف جانے لگا۔ اس شخص نے آگے بڑھ کر درداغ کا راستہ روک لیا، مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ والا! اگر میں آپ کو سمجھنے میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ میرے اندازے کے مطابق کسی وحشی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟''

درداغ نے خونخوار نظروں سے اس شخص کو دیکھا۔ ''اگر میرے دل و دماغ کو اسلام نے مسخر نہ کر لیا ہوتا تو میں تیری باتوں کا جواب تلوار سے دیتا۔ وحشی خاندان! کون سا وحشی خاندان...... کس کا وحشی خاندان؟''

وہ شخص گھبرا گیا، بولا۔ ''بھائی میرے! آپ کو مدرسۂ مستنصریہ کے استاد حضرت شمس الدین مدظلہ العالی یاد فرما رہے ہیں۔''

درداغ نے تجاہل سے کام لیا۔ ''کون؟ یہ کون صاحب ہیں؟ شاید میں انہیں نہیں جانتا۔''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''ہاں، آپ انہیں نہیں

اقوالِ زریں

مولانا رومی سے پوچھا گیا زہر کسے کہتے ہیں؟

جواب دیا۔ ہر وہ چیز جو ہماری ضرورت سے زائد ہو وہ ہمارے لیے زہر ہے۔ خواہ وہ قوت اقتدار ہو، دولت ہو، بھوک ہو، انانیت ہو، لالچ ہو، سستی و کاہلی ہو محبت ہو، نفرت ہو یا کچھ بھی ہو۔

پوچھا گیا خوف کس چیز کا نام ہے؟

جواب ملا غیر متوقع صورتِ حال کو قبول نہ کرنے کا نام خوف ہے۔ اگر ہم غیر متوقع صورتِ حال کو قبول کر لیں تو یہ ایک ایڈونچر ایک مہم جوئی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

پھر پوچھا گیا، حسد سے کہتے ہیں؟

جواب ملا۔ دوسروں میں خیر اور خوبی کو تسلیم نہ کرنے کا نام حسد ہے۔

پوچھا غصہ کس بلا کا نام ہے؟

جواب ملا جو امور ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں، ان کو تسلیم نہ کرنے کا نام غصہ ہے۔

نفرت کسے کہتے ہیں؟

جواب ملا۔ کسی شخص کو جیسا کہ وہ ہے، تسلیم نہ کرنے کا نام نفرت ہے۔

مرسلہ۔ ظفر اقبال ظفر، کامرہ شرقی

☆ امیر اور غریب کا فرق کس درجہ غیر فطری ہے۔ ایک ہی دن کی بھوک اور ایک ہی گھنٹے کی پیاس دونوں کو برابر کر دیتی ہے۔

☆ تاریخ کے تجربوں سے ہم سبق نہیں لیتے اس لیے تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔

☆ دشمن کو بطور تحفہ دینے کے لیے بہترین چیز معافی، مخالف کے لیے قوتِ برداشت، دوست کو دل، بچے کو اعلیٰ مثال، باپ کو احترام ہے۔

☆ جو لوگ چپ چاپ سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں، ان کے بارے میں طے ہے کہ ان کا دل زخم خوردہ ہوتا ہے۔

☆ اربابِ ستم ابھی تک ایسی بیڑیاں ایجاد نہیں کر سکے جو انسانی دماغ کو جکڑ سکیں۔

☆ انصاف کا موتی رحم کی سیپ میں ملتا ہے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

جانتے ہوں گے، بہر حال اس وقت تو آپ میرے ساتھ چلیے کیونکہ استاد نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے اس لیے میں ہی آپ کو اپنے ساتھ لے کر واپس جاؤں گا۔''

درداغ اس شخص کے ساتھ دین دار شخص شمس الدین کے پاس چلا گیا۔ شمس الدین نے درداغ کو اپنے روبرو دیکھتے ہی کرسی چھوڑ دی اور کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا، پوچھا۔ ''کیا تو مسلمان ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں مسلمان ہوں لیکن آپ جیسا مسلمان نہیں ہوں۔''

شمس الدین نے حیرت سے کہا۔ ''میں تیرا مطلب نہیں سمجھا، میں مسلمان ہوں لیکن آپ جیسا نہیں۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''اسلام کی چمک دمک نے مجھ کو اپنی طرف مائل کرایا ہے۔ میں نے مختلف مسلمانوں سے اپنے طور پر جو کچھ بھی معلوم کیا تھا، اس کے مطابق نماز وغیرہ پڑھ لیتا ہوں، ورنہ ابھی تک میں باقاعدہ مسلمان نہیں ہوا۔''

شمس الدین نے پوچھا۔ ''کیا تو کلمہ بھی پڑھ سکتا ہے؟''

درداغ نے کلمہ پڑھ کر سنا دیا، بولا۔ ''میں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا ہوں جناب۔''

شمس الدین کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا، بولے۔ ''جب تو نے کلمہ پڑھ لیا تو، تو مسلمان بھی ہو گیا۔ اب تو مسلمان ہے۔ تو نے نماز کس سے سیکھی؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''کسی ایک سے نہیں، نماز کے سلسلے میں میرے کئی استاد ہیں۔''

شمس الدین نے کہا۔ ''میں نے تجھ کو نماز پڑھتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ تو نے بالکل صحیح نماز پڑھی۔ بخدا میں نے تجھ کو جس حال میں دیکھا ہے، اس سے میری زندگی میں کئی دنوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ میری بینائی میں تیزی اور توانائی میں زیادتی پیدا ہو گئی۔ ہاں تو نے یہ نہیں بتایا کہ تو ہے کون؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کہاں جا رہا ہے؟ جبکہ میں تیری وضع قطع دیکھ کر یہ بتا سکتا ہوں کہ تو شمال کے کسی دور افتادہ سرد ترین علاقے سے تعلق رکھتا ہے اور تیرے خدوخال تجھے منگول ثابت کر رہے ہیں۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''آپ کا اندازہ درست ہے۔ میں جھیل بیکال کے شمال مشرق میں آباد تائی جوت قبیلے کا ایک فرد ہوں۔ کئی دن پہلے تک میں ہلاکو خان کے لشکر میں تھا مگر جب اسلام کی پیاس نے پریشان کیا تو میں خانہ کعبہ کی زیارت اور ثواب کی خاطر چوری سے بھاگ کر اس قافلے میں شامل ہو گیا۔ دورانِ سفر میں اس خوف سے کانپتا رہتا ہوں کہ کہیں ہلاکو خان کے آدمی میرے تعاقب میں تو نہیں آ رہے۔''

شمس الدین نے اس کو تسلی دی۔ ''نوجوان! تو نے اللہ کے پسندیدہ دین اسلام کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ اللہ دلوں کا حال جاننے والا ہے وہ تیرے خلوص اور ایمان کے عوض تجھے ہلاکو خان کے حوالے نہیں کر سکتا۔''

درداغ نے عرض کیا۔ ''خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔''

شمس الدین نے پوچھا۔ ''تیرا خیمہ کہاں ہے؟''

درداغ نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ''افسوس کہ میرا کوئی خیمہ نہیں۔ میں عجلت میں بھاگا ہوں، اس لیے میں اپنے ساتھ کوئی سامان بھی نہیں لا سکا۔''

شمس الدین نے کہا۔ ''اچھا پھر ایسا کرتے ہیں کہ تجھ کو اپنے ہی خیمے میں کچھ جگہ دے دیتے ہیں۔''

درداغ نے عرض کیا۔ ''پھر آپ کو پریشانی ہو جائے گی۔''

شمس الدین نے جواب دیا۔ ''اسلام کی خاطر تو پریشانیاں اٹھائے، یہ میں کس طرح گوارا کر لوں۔''

درداغ نے آہستہ سے کہا۔ ''جیسی آپ کی مرضی۔ میں کیا عرض کروں۔''

شمس الدین کو اس بات پر اور حیرت ہوئی کہ یہ وحشی شخص عربی بھی جانتا تھا۔ درداغ کو شمس الدین نے اپنے خیمے میں جگہ دے دی تھی۔ یہاں درداغ نے شمس الدین سے درخواست کی کہ اسے قرآن پاک پڑھا دیں۔ شمس الدین نے جواب دیا۔ ''میں تجھ کو قرآن پاک بھی پڑھاؤں گا اور دینی تعلیم بھی دوں گا مگر دورانِ سفر نہیں۔ بغداد پہنچنے کے بعد..... چنانچہ میں تجھ کو یہ مشورہ دوں گا کہ تو ابھی خانہ کعبہ کا سفر نہ کر۔ پہلے دینی تعلیم حاصل کر، اس کے بعد مکہ معظمہ جا۔''

درداغ نے شکر گزار نظروں سے شمس الدین کو دیکھا۔ ''میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ آپ جیسا مشورہ دیں گے میں اسی پر عمل کروں گا۔''

شمس الدین نے شام کا کھانا اسے اپنے ساتھ کھلایا۔ انہوں نے دیکھا، ان کا تائی جوت قبیلے کا مہمان گوشت خور ضرورت سے زیادہ واقع ہوا ہے۔ اس کی خوراک بھی زیادہ ہی تھی۔ نیند بھی بہت اچھی آتی تھی۔ ہاں، سردی دوسروں کی نسبت کم لگتی تھی۔

اچانک معلوم نہیں کیوں شمس الدین کو ہلاکو خان اور منگولوں کا خیال آ گیا۔ انہوں نے نصف رات کے لگ

بھگ درداغ سے پوچھا۔ ''میرے معزز مہمان! تو نے ہلاکو خان کا ذکر کیا تھا شاید؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے ہلاکو خان کا ذکر کیا تو تھا مگر؟''

شمس الدین نے کہا۔ ''میں وہی تو جاننا چاہتا ہوں کہ تو نے کیا ذکر کیا تھا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں نے یہ کہا تھا کہ میں چونکہ چوری سے فرار ہوا ہوں، اس لیے کہیں ہلاکو خان کے آدمی میرا تعاقب نہ کر رہے ہوں۔''

شمس الدین کو جھرجھری سی آگئی۔ ''ہلاکو خان کے آدمی تیرا تعاقب کیوں کریں گے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''صرف اس لیے کہ مجھے اسلام قبول کرنے سے روکا جائے۔''

شمس الدین نے پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ ہلاکو خان کی نظریں بغداد پر لگی ہوئی ہیں؟''

درداغ نے بے دھڑک جواب دیا۔ ''نہیں، شاید ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ہلاکو خان بغداد کی طرف نہیں آئے گا کیونکہ اس کے دل میں کسی طرح سے یہ خوف بیٹھ گیا ہے کہ خلافت عباسیہ عسکری لحاظ سے بہت مضبوط ہے اور پورا عالم اسلام خلیفہ کی پشت پر ہے۔''

شمس الدین نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا سچ؟ کیا ہلاکو اس طرح سوچ رہا ہے؟''

درداغ نے عرض کیا۔ ''میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں، میں نے ہلاکو خان کے لشکر میں جو دیکھا، جو سنا اور جو محسوس کیا آپ کے سامنے عرض کر دیا بلکہ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ ہلاکو خان خود بھی اسلام کی بابت سوچنے لگا ہے۔ اس کو اسلام سے انس ہو گیا ہے اور شاید وہ دن زیادہ دور نہیں جب دنیا کے کان یہ عجیب و غریب خبر بھی سن لیں گے کہ ہلاکو اسلام قبول کرنے والا ہے۔''

شمس الدین نے کہا۔ ''اس خبر میں کوئی صداقت نہیں معلوم ہوتی۔ ہلاکو خان اسلام قبول کرنے والا ہے، خدا جانے ایسی خبریں کون اور کہاں سے لاتا ہے۔ میں اس خبر کو افواہ سے زیادہ اہمیت نہیں دوں گا۔''

درداغ گھبرا گیا۔ اس نے سوچا اگر اس طرح بغداد میں دوسروں نے بھی بے یقینی کا رویہ رکھا تو کیا ہوگا؟

شمس الدین نے کہا۔ ''معلوم نہیں، میں خود بھی ہلاکو خان کا خوف محسوس کرتا ہوں۔ سنا ہے وہ آدمی سے زیادہ بھیڑیا ہے جو انسانی گلوں میں سے جس کو دبوچ پاتا ہے اس کو لے کر فرار ہو جاتا ہے۔ خدا اس کے عذاب سے اپنی مخلوق کو محفوظ رکھے۔''

شمس الدین کے خیمے سے ملحق ایک دوسرا خیمہ بھی تھا۔ اس خیمے میں شمس الدین کا خاندان رہتا تھا۔ اس خاندان میں کون کون تھا، کم از کم درداغ کو اس کا ذرا سا بھی علم نہیں تھا۔

شمس الدین اور اس کے ارادت مندوں نے درداغ کے اسلام اور حب الاسلامی کو خاصا مشہور کر دیا تھا۔ درداغ جدھر سے بھی گزر جاتا شائقین اس کو دیکھنے لگتے۔ درداغ کو خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل ہو چکی تھی لیکن درداغ کا اپنا یہ حال تھا کہ اس کو نہ تو کسی بات کی خوشی تھی اور نہ ہی کسی بات کا غم۔ وہ شب و روز دین کی تعلیم میں مست اور مگن رہتا۔ کوہستان کی وادی سے کوچ کر کے یہ قافلہ اور آگے بڑھا۔

شمس الدین جو خود کھاتا، وہی درداغ کو کھلاتا۔ جو خود پہنتا درداغ کو پہناتا۔ ان کو یہ احساس غمزدہ کر دیتا کہ درداغ کو اسلام کی خاطر اپنا ماضی اپنے عزیز و اقارب اپنا سب کچھ چھوڑنا پڑ گیا۔ شمس الدین کے اپنے خیمے سے متصل اس کے گھر والوں کا خیمہ نصب کیا جاتا۔ اس خیمے میں اس کی بیوی، چند خادمائیں اور ایک کنیز فروکش ہوتیں۔ اس کنیز کو شمس الدین نے کسی یونانی تاجر سے خریدا تھا اور اس میں وہ ساری خوبیاں موجود تھیں جو کسی حسین ترین کنیز میں ہونی چاہئیں۔ بذلہ سنجی، حاضر جوابی، فن موسیقی میں مہارت، مردم شناسی اور مجلسی آداب میں ید طولیٰ رکھنے والی۔ شمس الدین کے گھر والوں کو بھی درداغ سے بڑی محبت ہو گئی تھی۔ ان سب کی ایک ہی خواہش تھی۔ یہ سب بھی درداغ کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھیں لیکن شمس الدین کے خوف سے یہ بات اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی تھیں۔

شمس الدین اور درداغ رات کو کھانے کے بعد اپنے چند احباب کے ساتھ ادب اور شاعری پر باتیں کرنے لگے۔ درداغ اس گفتگو میں بس ہاں ہوں کی حد تک شامل رہا۔ شمس الدین نے معلومات اور علم کے دریا بہا دیے۔ شمس الدین کے دوست دم بخود شمس الدین کی باتیں سننے میں مشغول رہے۔ آخر میں شمس الدین نے شکوہ کیا کہ افسوس شاعری اور ادب میں لوگوں کی معلومات اتنی ہیں کہ وہ سکوت کو بولنے پر ترجیح دیتے ہیں۔ شمس الدین نے انہیں شرم دلانے کے لیے اپنی کنیز کی مثال دی، بولے۔ ''ادب اور شاعری کے معاملے میں میری کنیز علیہ کا علم تم سب سے زیادہ ہے اور اس کا مذاق بھی بہتوں سے ستھرا ہے۔''

علیہ کے ذکر نے ہر ایک کے دل میں اس کی دید کا اشتیاق پیدا کر دیا۔ شمس الدین کے ایک دوست نے کہا۔ ''ہمیں کیا پتا کہ علیہ کا علم اور مذاق ہم سب سے زیادہ اور ستھرا ہے۔ ایسی کنیزوں کے بارے میں عموماً لوگ اسی قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں۔''

شمس الدین نے کہا۔ ''رات زیادہ ہو چکی ہے ورنہ میں اس کو اسی وقت تم لوگوں کے سامنے لے آتا اور پھر دیکھتا کہ کون اس کا مقابلہ کرتا ہے۔''

اسی دوست نے جواب دیا۔ ''ابھی کتنی رات گئی ہے اور پھر راتیں تو ہوتی ہی ہیں ایسی باتوں کے لیے۔ میرا خیال ہے اگر آپ اسی وقت علیہ کو بلوالیں تو ہم سب اس کے شستہ اور ستھرے مذاق سے لطف اندوز ہو لیں گے۔''

شمس الدین بھی کنیز کے ذکر اور اس کی پیشی میں احساسِ برتری محسوس کر رہے تھے، بولے۔ ''علیہ آ تو اسی وقت جائے گی لیکن صاحبان! ایک بات کا خاص خیال رہے۔ علیہ کے حسن، ذہانت، علمی و ادبی اور شعری ذوق کو دیکھتے ہوئے اسے خریدنے سے پہلے میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھ کو اگر موقع ملا تو میں اس تحفے کو امیر المومنین کی خدمت میں پیش کر دوں گا کیونکہ اس تحفے کے لیے مجھ کو امیر المومنین کا خیال ہر وقت ستا تا رہتا ہے۔ میں اپنے اس تحفے کو کہیں اور ضائع نہیں کرنا چاہتا۔''

اس کے بعد شمس الدین نے جاتے ہوئے کہا۔ ''صاحبان! آپ یہیں تشریف رکھیں، میں علیہ کو لے کر ابھی آیا۔''

شمس الدین کے جانے کے بعد وہ لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ''کچھ پتا ہے آپ لوگوں کو استاد شمس الدین نے علیہ کو ہمارے سامنے لانے سے پہلے یہ بات کیوں کہی کہ وہ علیہ کو امیر المومنین کے لیے لائے ہیں؟''

کسی نے پوچھا۔ ''کیوں؟ ہمیں کیا پتا کہ استاد نے ایسی بات کیوں کی؟''

ایک نے درداغ سے ازراہِ مذاق کہا۔ ''بھائی تو کیوں خاموش ہے...... کیا تیرے منہ میں زبان نہیں ہے؟'' پھر اسی شخص نے دوسروں سے کہا۔ ''بڑا کرم ہوگا اگر یہ بتا دیا جائے کہ استاد شمس الدین نے علیہ کے سلسلے میں امیر المومنین کا ذکر کیوں کیا؟''

مجلس کا ہر شخص درداغ کو دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگا۔

درداغ نے جواب دیا۔ ''صاحبان! آپ لوگوں کے سامنے میں اپنی زبان اس لیے نہیں کھولنا چاہتا کہ میں ابھی آپ کی زبان پر قدرت نہیں رکھتا۔ اگر میں اپنی مادری زبان میں آپ سے باتیں کروں گا تو آپ سب گونگے ہو جائیں گے۔''

اس جواب نے ہر شخص کو لاجواب کر دیا۔ کسی نے کہا۔ ''صاحبان! اس منگول کو احمق نہ سمجھیں، آپ سب نے اس کا جواب ملاحظہ فرمایا۔''

پہلے شخص نے کہا۔ ''صاحبان! استاد شمس الدین نے علیہ کے سلسلے میں امیر المومنین کا ذکر اس لیے کر دیا کہ کہیں آپ لوگ علیہ پر عاشق نہ ہو جائیں اور اس کے بارے میں غلط سلط انداز میں سوچنے لگیں۔''

اسی دوران استاد شمس الدین علیہ کو لے کر واپس آ گئے۔ انہوں نے اپنے دوست کی باتیں سن لی تھیں، بولے۔ ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں میں ایک لائق فائق اور پڑھا لکھا شخص ہوں۔ علیہ میری موجودگی میں کسی اور طرف کس طرح راغب ہو سکتی ہے؟ لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں علیہ کو امیر المومنین کی خدمت میں پیش کر دینا چاہتا ہوں۔''

شمس الدین نے علیہ کو ایک چوکی پر بٹھا دیا۔ اس پر بھیڑیے کی بھوری کھال بچھی ہوئی تھی۔ شمس الدین نے علیہ والے حصے میں کئی بڑی بڑی شمعیں جلا کر جگہ کو بقعۂ نور بنا دیا تھا۔ اس نے اپنے دوست احباب سے کہا۔ ''حضرات! اب آپ لوگ علیہ سے باتیں کر سکتے ہیں۔''

سبھی نے علیہ کو غور سے دیکھا۔ ان میں درداغ بھی شامل تھا۔ ہر شخص علیہ کی تعریف کرنا چاہتا تھا مگر نہیں کر پا رہا تھا۔ علیہ کا چہرہ کئی شمعوں کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ اس کے کانوں میں سونے کے چھلے پڑے ہوئے تھے۔ ہونٹوں کا رنگ قدرتی سرخ تھا۔ اس نے اپنے بالوں کو گلابی رومال سے باندھ رکھا تھا۔

مجلس کا ہر شخص گونگا بن چکا تھا۔ شمس الدین نے علیہ سے کہا۔ ''علیہ! یہ سب تو خاموش ہیں، میں نے تیرے ادبی اور شعری مذاق کی تعریف کر دی تھی۔ تو خود بھی شاعرہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر تو انہیں اپنے چند اشعار ہی سنا دے گی تو بات بن جائے گی۔''

علیہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس نے کہا۔ ''صاحبان! چند اشعار حسبِ حال موزوں ہو گئے ہیں، وہی سنائے دیتی ہوں۔ اگر پسند آ جائیں تو میری خوش قسمتی اور ناپسند ہوں تو میری قسمت۔''

مجلس میں ہر طرف سے ایک ہی صدا بلند ہوئی۔ ''ارشاد ارشاد۔''

علیہ نے ترنم میں سنانا شروع کیا۔

''خدا نے تمہیں جو کچھ بھی دیا ہے اسے کام میں لانا چاہیے۔
آنکھیں ملی ہیں تو ان سے دیکھو اور صانع حقیقی کے

جلووں میں گم ہو جاؤ۔

کان ملے ہیں تو ان سے سنو، اچھی باتیں، مترنم آوازیں، اپنے محبوب کے رس بھرے بول۔

قوتِ شامہ سے سونگھو تاکہ اچھی بُری چیزوں میں امتیاز کر سکو۔

شباب کے بھی کچھ تقاضے ہیں، یہ قیمتی وقت کے مانند حالتِ سفر میں ہے۔

اس کو نقد کرتا رہ ورنہ کل پچھتائے گا کیونکہ آنے والا کل اسے ماضی کے کل سے بدل دے گا۔

تجھے زبان ملی ہے، بولنے کے لیے، اگر تو خاموش رہے گا تو گونگا سمجھا جائے گا۔

دریا اگر بہنا بند کر دے اور ٹھہر کر رہ جائے تو لوگ اس کو ساحل سمجھنے لگیں گے۔

بول، باتیں کر، ورنہ تیرا محبوب تجھے گونگا سمجھ کر کسی زبان والے پر ملتفت ہو جائے گا۔''

علیہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ درداغ نے کھڑے ہو کر خلاف توقع بولنا شروع کر دیا۔ ''افسوس کہ میں آپ لوگوں کی زبان پر قدرت نہیں رکھتا۔ ورنہ لڑکی کو ایسا جواب دیتا کہ دوبارہ ہمیں نصیحتیں نہ کر سکتی۔''

علیہ نے اس نوجوان کو بڑے اشتیاق اور غور سے دیکھا۔ اس نے درداغ کو پہچان لیا تھا۔ وہ اس نوجوان کو دیکھنے کی تمنا میں وحشت زدہ سی ادھر ادھر چلتی پھرتی رہی تھی۔ اس نے استاد شمس الدین سے پوچھا۔ ''استادِ محترم! کیا یہ وہی نوجوان ہے جو ہلاکو خان کو چھوڑ کر اسلام کے زیرِ سایہ آگیا ہے؟''

استاد شمس الدین نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ وہی خوش قسمت نوجوان ہے درداغ۔ بہت ہی اچھا اور......''

علیہ نے پوچھا۔ ''نوجوان! تو نے جس ہمت اور حوصلے کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔''

درداغ نے حاضرینِ مجلس کا مذاق اڑایا۔ ''میں نے تو اپنی جرأت، حوصلے اور شوقِ تجسس اور ذوقِ طلب کا یوں اظہار کیا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ، آپ لوگوں میں آگیا اور یہ کم حوصلہ ہیں کہ بولنا تک بھول گئے۔ لڑکی! تجھ کو اور استاد شمس الدین کو شاید میری بات اچھی نہ لگے لیکن میں زبان تک آجانے والی بات کو روکتا نہیں، صاف صاف کہہ دیا کرتا ہوں۔ اگر سارے مسلمان ایسے ہی ہیں، ان لوگوں جیسے تو ہلاکو خان اور اس کے عساکر کو تباہی اور بربادی سے باز رکھنا ممکن نہ ہوگا۔''

استاد شمس الدین نے درداغ کو ایسی باتیں کرتے

ٹکٹ

بس میں بھیڑ کی زیادتی کی وجہ سے ایک آدمی بیچ میں کھڑا دھکے کھا رہا تھا۔ کبھی کسی کے دھکے سے آگے چلا جاتا۔ کبھی پیچھے۔ جب وہ اترنے لگا تو کنڈیکٹر نے کہا۔ ''ٹکٹ تو لے لیجیے۔'' وہ کہنے لگا۔

''ٹکٹ کس خوشی میں لوں، میں تو سارا راستہ پیدل چل کر آرہا ہوں۔''

پٹرول

ایک آدمی کی لاٹری میں کار نکل آئی مگر وہ خوش ہونے کی بجائے پریشان ہو گیا۔ اس کے دوست نے وجہ پوچھی۔

''یار تم اتنے دکھی کیوں ہو؟''

جواب ملا۔ ''کار گھر تک لے جانے کے لیے میرے پاس پٹرول کے پیسے نہیں ہیں۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

خاندان والے

ایک آدمی کے گھر کے سامنے گدھا مرا پڑا تھا۔ اس نے میونسپل کمیٹی کو فون کیا اور کہا۔ ''میرے گھر کے سامنے گدھا مرا پڑا ہے۔ ذرا اسے اٹھوائیں۔''

کمیٹی سے جواب ملا۔ ''وہیں دفن کر دو۔''

وہ آدمی تھوڑی دیر تو خاموش رہا۔ پھر جل کر بولا۔ ''دفن کر دیتا مگر میں نے سوچا پہلے مرحوم کے خاندان والوں کو خبر کر دوں۔''

کرکٹر

ایک کرکٹر مریض نرس سے۔ ''میرا ٹمپریچر کتنا ہے؟''

نرس۔ ''ایک سو دو۔''

مریض۔ ''بہت خوب یعنی ایک سنچری اور دو رنز۔''

نرس۔ ''ہاں لیکن ہم آپ کو ابھی آؤٹ نہیں ہونے دیں گے۔''

مرسلہ۔ محمد انعام، لودھراں

سے منع کیا، کہا۔ ”درداغ! تیری یہ باتیں امیر المومنین کے گوش گزار کردی جائیں گی اور میں نہیں چاہتا کہ یہاں تو سیاسی، مذہبی یا فرقہ واری سازش کا شکار ہوجائے۔“

درداغ خاموش ہوگیا۔

مجلس کا ایک سب سے زیادہ تیز طرار شخص بمشکل کھڑا ہوا، بولا۔ ”استادِ محترم! میرے منہ میں بھی زبان ہے میں بھی بول سکتا ہوں لیکن میرے لیے مشکل یہ ہے کہ علیہ امیر المومنین کی امانت ہے...... ہم تو اس سے باتیں کرنے میں بھی محتاط رہیں گے کیونکہ وہ جیسا کہ سنا ہے کہ......“

علیہ نے کہا۔ ”اگر باتیں ادب کے دائرے میں کی جائیں اور جانبین بازاری انداز نہ اختیار کریں تو لطف اندوز ہونے کے لیے، بہت کچھ کہا اور سنا جاسکتا ہے۔“

استاد شمس الدین نے درداغ سے خواہش کی۔ ”دوستو! اس منگول کی باتیں سنو، دیکھو یہ نو مسلم منگول ہلاکو خان کی بابت کیا بتاتا ہے۔“

علیہ نے پوچھا۔ ”کیا ہلاکو خان کوئی مہیب صورت بھیانک انسان ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”نہیں، وہ بھیانک شکل صورت کا نہیں، مردانہ وجاہت کا پیکر ہے۔ اپنے باپ تولوئی خان کی طرح حسین۔“

استاد شمس الدین نے پوچھا۔ ”اگر وہ بدصورت یا مہیب صورت نہیں تو درشت مزاج تو ضرور ہی ہوگا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”وہ درشت مزاج بھی نہیں، وہ بہت ہنس مکھ اور پُرمزاح انسان ہے۔“

علیہ نے پوچھا۔ ”کیا ہلاکو خان تجھ پر مہربان تھا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”بہت زیادہ...... وہ مجھ سے بہت زیادہ انسیت رکھتا تھا لیکن افسوس وہ کافر ہے۔ اے کاش وہ مسلمان ہوجاتا۔“

حاضرینِ مجلس نے آمین کہا۔ استاد شمس الدین نے مکہ معظمہ کی طرف دستِ دعا دراز کرتے ہوئے کہا۔ ”بارِ الٰہا! ہلاکو کو اسلام کی دولت سے سرفراز فرما اور اس کے دل و دماغ پر پڑے ہوئے ظلم و بربریت کے گھناؤنے پردے دور فرما۔“ حاضرین نے ایک بار پھر آمین کہا اور چپ ہوگئے۔

☆☆☆

قافلہ بغداد میں باب الشام کے راستے سے داخل ہوگیا۔ مدرسۂ مستنصریہ میں اس کے اساتذہ کے لیے رہائش کا بندوبست تھا چنانچہ استاد شمس الدین درداغ کو بھی مدرسے کی رہائش گاہ میں لے گئے۔ یہاں شمس الدین نے درداغ کے ساتھ نہایت مخلصانہ رویہ رکھا لیکن خود درداغ جس ذہنی اور قلبی الجھن میں مبتلا ہوگیا تھا، اس کا کوئی حل نہیں نظر آتا تھا۔ درداغ کو علیہ میں حسن اور ذہانت کا حسین ترین امتزاج نظر آیا تھا۔ علیہ جیسی لڑکیاں اور عورتیں اس نے کہیں اور نہیں دیکھی تھیں۔ پڑھی لکھی، مہذب، تستعلیق، شستہ اور خوش اطوار...... اس کی زندگی میں علیہ دبے قدموں غیر محسوس طور پر جانے کب داخل ہوگئی تھی۔ وہ جس مقصد سے یہاں آیا تھا، اسے بھلاتا جارہا تھا۔ اب اس کا سارا وقت اسی سوچ اور اسی فکر میں ضائع جاتا کہ وہ علیہ سے دوبارہ کہاں اور کیونکر ملے۔ اس کو علیہ کی بابت اس انکشاف نے پریشان کردیا تھا کہ استاد شمس الدین اس لڑکی کو امیر المومنین کے لیے لائے ہیں۔ وہ سوچتا ایک ایسی لڑکی کے بارے میں مسلسل سوچتے رہنا جو خلیفہ بغداد کی امانت ہو، بہت خطرناک بات ہے۔

استاد شمس الدین نے اسلام اور اس کی تعلیمات کے بارے میں درداغ کو بہت کچھ بتادیا تھا۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ جب وہ درداغ کو اسلامی تعلیمات میں پختہ اور ماہر بنا دیں گے تو وہ اس کو قصرِ خلافت میں لے جاکر امیر المومنین مستعصم باللہ سے ملوادیں گے۔ انہیں یقین تھا کہ خلیفہ اس بات سے بہت خوش ہوگا کہ انہوں نے ایک منگول کو مسلمان کرلیا اور جب وہ یہ عجیب و غریب انکشاف کرے گا کہ ہلاکو خان خود بھی مسلمان ہونا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں وہ بغداد آئے گا، خلیفہ سے ملے گا اور شاید اس کے ہاتھ پر مسلمان ہوجائے گا تو وہ کتنا خوش ہوگا۔ بغداد کی شان و شوکت اور پُرتکلف معاشرے نے اس میں کسی قدر احساسِ کمتری بھی پیدا کردیا تھا۔

استاد شمس الدین نے اپنے مکان سے ملحق جس حصے میں درداغ کو ٹھہرایا تھا، وہ دراصل ایک چھوٹا سا پائیں باغ تھا۔ اس باغ میں دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ درداغ انہی دو کمروں میں رہ رہا تھا۔ استاد شمس الدین یہاں تشریف لاتے اور درداغ کو اچھی اچھی باتیں بتاکر مدرسے چلے جاتے۔ ان باتوں نے درداغ میں غیر محسوس طور پر انقلاب برپا کرنا شروع کردیا تھا۔

استاد شمس الدین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرصعوبت اور کٹھن زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتاتے ہوئے کہا۔ ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے ان سرکشوں اور خونخواروں کے درمیان تبلیغ حق کا کام شروع فرمایا تھا جو اپنے دیوتاؤں اور خودساختہ خداؤں کے خلاف ایک لفظ بھی

سننا پسند نہ کرتے تھے۔ انسان کو جان سے مار دینا ان کا معمولی مشغلہ تھا۔ آپؐ نے کسی مصلحت کا خیال کیے بغیر انہیں یہ بتایا کہ وہ جس نوع کی زندگی گزار رہے ہیں، وہ انہیں جہنم کی طرف لے جائے گی۔ جوا، شراب، دختر کشی اور بات بات پر خون خرابا ان کا روزمرہ تھا۔ آپؐ نے انہیں بتایا۔ یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے، آج اس میں جو کچھ بوؤ گے کل اسی کی فصل کاٹو گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ علالت سے پہلے فراغت، بڑھاپے سے پہلے جوانی اور افلاس اور تنگ دستی سے پہلے آسودہ حالی بہتر ہے۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ آنے والے وقت سے ڈرو۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ کوئی انسان دوسرے انسان سے دولت، حسب ونسب اور حکومت کی وجہ سے بڑا نہیں ہوسکتا۔ انسان اگر بڑا ہے تو اپنے زہد وتقویٰ کی وجہ سے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہم میں کوئی بڑا نہیں، سب برابر ہیں۔ ہم سب آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔ رنگ نسل کوئی چیز نہیں۔ آپؐ نے حکمراں کو رعایا کا راعی قرار دیا، اس گڈریے کی طرح جو مویشیوں کے ریوڑ کی رکھوالی کررہا ہو۔''

درداغ استاد شمس الدین کی باتیں سنتا رہا اور یوں محسوس کیا گویا ان باتوں میں کوئی سحر ہے جو دل میں اترتا جارہا ہے۔ وہ خود کو بے دست و پا سا محسوس کرنے لگا۔ وہ ہلاکو خان کا منصوبہ بھولنے لگا۔ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کوئی ایسی بات محسوس ہورہی تھی جو انسانوں کو یکسر بدل دیا کرتی ہے۔ وہ اپنی سابقہ زندگی کو فراموش کرتا جارہا تھا۔ اس کا جی چاہتا کہ استاد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بتاتے رہیں اور وہ سنتا رہے۔

استاد شمس الدین کا اچانک قصرِ خلافت سے بلاوا آگیا۔ وہ چلے گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں درداغ آنے والے دنوں کی بابت سوچنے لگا۔ وہ ہلاکو خان سے خوف محسوس کررہا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کو بغداد سے واپس ضرور جانا ہوگا۔ پھر جب وہ واپس جاکر ہلاکو خان سے ملے گا تو اس کو کیا جواب دے گا؟

وہ اپنے کمرے سے نکل کر پھولوں کی روشوں کے درمیان ٹہلنے لگا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ٹہل رہا تھا۔ اس نے عالمِ خیال میں خود کو ہلاکو خان کے روبرو سر جھکائے کھڑا دیکھا۔ ہلاکو خان اس سے بہت ناراض تھا۔ وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ بغداد میں اس نے کیا کیا؟ لیکن درداغ کے پاس ہلاکو خان کے کسی سوال کا بھی جواب نہ تھا۔ ہلاکو خان نے عالمِ خیال میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''درداغ! میں تجھ کو قتل کردوں گا۔''

درداغ نے بہ آواز بلند جواب دیا۔ ''محترم خان! مجھ کو رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے سحر نے بے دست و پا کر دیا تھا۔ مجھ کو ایک موقع اور دیا جائے۔''

کسی نسوانی آواز نے اس کی پشت سے سوال کیا۔ ''کس بات کا موقع؟ کون محترم خان؟ منگول نوجوان! تو اپنے ہوش و حواس میں تو ہے اس وقت؟''

درداغ نے پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو علیہ مسکراتی نظر آئی۔ اس نے گھبرا کر سوال کیا۔ ''علیہ یہ تم! یہاں میرے پاس اس جگہ کیسے؟''

علیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا استاد شمس الدین یہاں تشریف رکھتے ہیں؟''

درداغ بہت زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔ بے خیالی میں اس کے اندر کا چور پکڑا گیا تھا، بولا۔ ''نہیں، استاد شمس الدین کا قصرِ خلافت سے بلاوا آگیا تھا۔ وہ وہاں گئے ہوئے ہیں۔''

علیہ نے پوچھا۔ ''منگول نوجوان! یہ تو یہاں باتیں کس سے کررہا تھا ابھی؟''

درداغ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا، گھبرا کر بولا۔ ''بس یوں ہی ذرا سا پریشان ہوگیا تھا میں۔''

علیہ نے پوچھا۔ ''کس بات سے پریشان ہوگئے تھے؟''

درداغ اس موضوع سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں تھا، کہا۔ ''علیہ! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم اس وقت یہاں کیونکر آگئیں؟''

علیہ نے پائیں باغ کے ایک سرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھ رہے ہو؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ہاں، دیکھ رہا ہوں۔''

علیہ نے پوچھا۔ ''وہ کیا ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''اس پائیں باغ کا چھوٹا سا قصر......''

علیہ نے ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اور وہ کیا ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''کھڑکی۔''

علیہ نے کہا۔ ''میں اس کھڑکی سے تجھ کو دیکھتی رہتی ہوں مگر تو ادھر بھولے سے بھی نہیں دیکھتا۔ معلوم نہیں کن خیالوں میں گم رہتا ہے؟''

درداغ نے پوچھا۔ ''کیا تم اس کھڑکی میں رہتی ہو؟''

علیہ اس کی مخبوط الحواسی پر ہنسنے لگی۔ بولی۔ ''میں اس کھڑکی میں نہیں، اس کمرے میں اکثر موجود رہتی ہوں جس میں یہ کھڑکی بنی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت تو اپنے

ہوش وحواس میں بالکل نہیں۔''

درداغ اپنی حماقت اور بدحواسی پر خود بھی ہنسنے لگا۔ درداغ نے کہا۔ ''علیہ! میں تجھ کو یہاں اپنے پاس تنہا دیکھ کر پریشان ہو رہا ہوں۔ جب سے مجھ کو یہ معلوم ہوا ہے کہ تو امیرالمومنین کی امانت ہے، میں تیرے خیال تک سے خوف کھانے لگا ہوں۔''

علیہ نے پوچھا۔ ''مگر اس میں خوف کھانے کی بات کیا ہے؟ آخر میں کیوں نہیں ڈرتی؟''

درداغ نے کہا۔ ''اچھا اس وقت تو، تو واپس جا، کوئی آ گیا یہاں تو بڑی بدمزگی ہوگی۔''

علیہ نے نہایت پُرسکون اور مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ ''منگول نوجوان! مت گھبرا...... یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ یہ قصر میرا ہے، اس میں، میں تنہا رہتی ہوں۔ یہاں میرا کوئی نگراں یا پہرے دار نہیں۔''

درداغ نے پوچھا۔ ''یہ قصر تیرا ہے؟ یہاں تو تنہا رہتی ہے؟''

علیہ نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ قصر میرا ہے اور میں یہاں تنہا رہتی ہوں، بالکل تیری طرح۔ جس طرح تو یہاں رہتا ہے۔''

درداغ نے کہا۔ ''پھر بھی یہ بات کہاں تک مناسب ہے کہ یہاں مجھ سے ملنے چلی آئی۔ تو نے مجھ سے استاد شمس الدین کی بابت سوال کیا، میں نے اس کا جواب دے دیا۔ اب بات ختم ہوگئی، واپس جا۔''

علیہ نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال تھا، استاد شمس الدین کی صحبت اور تعلیمات نے تجھ کو کسی نہ کسی حد تک مہذب ضرور بنا دیا ہوگا لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ تو اب بھی نرا منگول ہی ہے اجڈ، وحشی منگول۔''

درداغ نے شرمسار ہو کر پوچھا۔ ''وہ کس طرح؟''

علیہ نے جواب دیا۔ ''وہ اس طرح کہ اس وقت میں تیری مہمان ہوں مگر تو نے مجھ کو بٹھایا تک نہیں۔''

درداغ نے عاجزی سے کہا۔ ''مگر میں تجھ کو کیوں بٹھاؤں۔ تجھ کو یہاں سے فوراً چلے جانا چاہیے۔'' درداغ نے بے بسی سے کہا۔ ''اگر تجھ کو کسی نے میرے ساتھ یوں باتیں کرتے دیکھ لیا تو؟''

علیہ نے جواب دیا۔ ''تو کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ تو منگول ہے جو کسی سے ڈرتے نہیں مگر تو ڈر رہا ہے اور میں لڑکی ہونے کے باوجود نڈر ہوں۔''

درداغ نے کہا۔ ''علیہ! میں استاد شمس الدین کا مہمان ہوں۔ اس نازک رشتے نے مجھے خوفزدہ کر دیا ہے ورنہ اگر تو میرے اپنے علاقے، میری اپنی حدود میں ہوتی تو میں تجھ کو اپنی جرأت، دلیری اور بے باکی کا تماشا دکھاتا۔''

علیہ نے کہا۔ ''تجھ کو ایک خوش خبری سنا دوں۔ استاد شمس الدین نے آج صبح مجھ کو اس بات کی اجازت دے دی ہے کہ میں دن میں دو ایک بار یہاں آ جایا کروں۔ استاد شمس الدین تجھ کو بہت نیک اور شریف سمجھتے ہیں۔ وہ تجھ پر بہت زیادہ اعتبار کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے مجھے تیرے پاس آنے کی اجازت دے دی۔''

درداغ نے اس کی توجیہہ پیش کی، بولا۔ ''علیہ! استاد شمس الدین نہایت پڑھے لکھے اور تجربہ کار انسان ہیں۔ ہوسکتا ہے اس طرح وہ ہم دونوں کو آزما رہے ہوں......''

علیہ بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''یہ بھی ممکن ہے کیونکہ جب انہوں نے مجھ کو یہاں آنے کی اجازت دی تھی، ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ خبردار! حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہ کرنا۔''

درداغ نے کہا۔ ''اسی لیے میں یہ کہتا ہوں کہ تو یہاں سے چلی جا۔''

علیہ نے جواب دیا۔ ''میں تیرے کہنے سے نہیں جاؤں گی۔ جاؤں گی تو اپنی مرضی سے جاؤں گی۔''

درداغ نے علیہ کو وہیں چھوڑا اور خود بھاگ کر ایک کمرے میں گھس گیا اور اس کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ وہیں سے بہ آوازِ بلند علیہ کو جواب دیا۔ ''علیہ! میں استاد شمس الدین کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔''

علیہ اس کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے کھڑی ہوگئی، بولی۔ ''درداغ! میں تجھ کو بہت عقل مند سمجھ رہی تھی مگر تو، تو احمق نکلا۔ بے وقوف اس طرح استاد شمس الدین ہم دونوں کا امتحان لے رہے ہیں۔ اگر ہم دونوں اس امتحان میں کامیاب ہوگئے تو استاد شمس الدین ہم دونوں پر خصوصی توجہ دیں گے ورنہ عامیوں کی طرح چند دن گوارا کر کے دھکا دے دیں گے۔''

درداغ ایک بار پھر لاجواب ہوگیا۔ علیہ نے کہا۔ ''درداغ! باہر نکل، مت گھبرا...... میں یہاں استاد شمس الدین کی اجازت سے آئی ہوں۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''جب تک میں خود استاد شمس الدین سے اس موضوع پر کھل کر بات نہ کرلوں، میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔''

علیہ نے کہا۔ ''دیکھ مجھ کو غصہ نہ دلا۔ میری بڑی بے عزتی ہو رہی ہے۔ میں چاہوں تو اس کا بدلہ لے سکتی ہوں۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں مجبور ہوں، میں استاد شمس الدین کے اعتماد کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

علیہ نے کہا۔ ''اچھا میں جارہی ہوں لیکن اس بات کو یاد رکھنا۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں یاد رکھوں گا، بالکل یاد رکھوں گا۔''

علیہ چلی گئی۔ درداغ نے علیہ کے جاتے ہوئے قدموں کی آہٹ سن کر کھڑکی کھولی اور اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ علیہ تیز تیز قدموں سے بھاگتی چلی جارہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنے قصر میں داخل ہوئی تو دروازے کو اتنی زور سے بند کیا کہ اس کی آواز درداغ نے بھی سنی۔

درداغ باہر نکلا اور اس کھڑکی کی طرف نظریں جما کے کھڑا ہوگیا جہاں علیہ خود اپنے بقول کھڑے ہو کر درداغ کو دیکھتی رہی تھی۔ وہ کھڑکی بند تھی، وہ دیر تک ادھر دیکھتا رہا مگر کھڑکی نہیں کھلی۔ معلوم نہیں کیوں اور کون اس کے دل میں بیٹھا اس سے یہ کہہ رہا تھا کہ یہ کھڑکی کھلے گی، ضرور کھلے گی، ایک بار ضرور کھلے گی مگر وہ نہیں کھلی۔ کئی گھنٹے انتظار کرنے کے باوجود نہیں کھلی۔ اس کو دکھ سا محسوس ہوا۔ علیہ ناراض ہوگئی، اس بات کا دکھ، علیہ کو اس نے تکلیف پہنچائی، اس احساس کا دکھ...... وہ کرب کے عالم میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ کھڑکی اس کی کمزوری بن چکی تھی۔ گھنٹوں بار بار اٹھنے اور جھکنے کے عمل نے اس کی گردن میں درد پیدا کر دیا تھا۔

☆☆☆

قصرِ خلافت سے واپس آنے کے بعد استاد شمس الدین نے درداغ سے ملاقات کی۔ انہوں نے اپنے شاگرد کے چہرے پر اضطراب اور مایوسی کی ملی جلی جھلک دیکھی۔ وہ درداغ کو کمرے میں لے گئے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تو اس لیے پریشان اور مضطرب ہے کہ مجھ کو امیر المومنین نے کیوں طلب کیا تھا؟''

درداغ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ استاد شمس الدین سے نظریں بھی نہیں ملا رہا تھا۔

استاد شمس الدین سنجیدہ ہوگئے۔ ''اگر تیرے چہرے کے اضطراب اور پریشانی کا کوئی اور سبب ہے تو وہ مجھے معلوم ہونا چاہیے کیونکہ میں تجھے پریشان نہیں دیکھنا چاہتا۔''

درداغ نے کہا۔ ''آپ ہی بتائیے، میں آپ کے اعتماد کو کس طرح ٹھیس پہنچا سکتا ہوں؟''

استاد شمس الدین نے کہا۔ ''پہلے پوری بات بتا، پھر کوئی اور بات ہوگی۔''

درداغ نے کہا۔ ''آپ کی عدم موجودگی میں علیہ یہاں آئی تھی......'' اور پھر پوری روداد ان کے گوش گزار کر دی۔

استاد شمس الدین کو ہنسی آگئی، بولے۔ ''اس میں پریشانی یا شرمندگی کی کیا بات ہے؟ علیہ نے تجھ سے جو کچھ کہا، درست کہا۔ اس کو میں نے ہی یہاں آنے کی اجازت دی تھی۔''

درداغ نے پوچھا۔ ''استادِ محترم! کیا یہ بات بھی درست ہے کہ اس قصر میں علیہ تنہا رہ رہی ہے؟''

استاد نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ بات بھی درست ہے۔ اس میں اتنا سا اضافہ کرلے۔ علیہ کے ساتھ دو خدمت گار بوڑھی خواتین بھی رہتی ہیں۔''

درداغ نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''استادِ محترم! مجھ کو یہاں سے کہیں اور بھیج دیجیے۔''

استاد نے پوچھا۔ ''آخر کیوں؟ اس کی کوئی خاص وجہ تو نہیں؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''استادِ محترم! میں خوفزدہ ہوں کہ علیہ امیر المومنین کی امانت ہے، کہیں میں کسی وجہ سے موردِ الزام نہ ٹھہروں۔''

استاد شمس الدین نے کہا۔ ''درداغ! میں اسلامی تعلیمات میں تجھ کو اتنا پختہ کر دینا چاہتا ہوں کہ تیرے چاروں طرف تحریص اور ترغیب کے کتنے ہی پھندے کیوں نہ ہوں مگر تو اس سے محفوظ رہے۔''

درداغ نے پوچھا۔ ''کیا آپ کو یقین ہے کہ میں آپ کے امتحان اور آپ کی آزمائش میں پورا اتروں گا؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''ہاں، مجھ کو اس پر یقین ہے۔ میں تجھ پر اعتماد کرتا ہوں، بھروسا کرتا ہوں۔''

درداغ نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''خدایا! مجھ کو شرمندگی سے بچانا، خجالت سے محفوظ رکھنا۔''

استاد شمس الدین اپنے شاگرد سے اور زیادہ خوش ہوگئے۔ انہوں نے درداغ کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہا۔ ''کیا تو جانتا ہے کہ آج امیر المومنین نے مجھ کو کیوں بلایا تھا؟''

درداغ نے نفی میں گردن ہلائی، بولا۔ ''مجھ کو کیا معلوم استادِ محترم۔''

استاد شمس الدین نے کہا۔ ''جب میں قصرِ خلافت میں داخل ہوا تو وہاں میری بڑی پذیرائی ہوئی۔ امیر المومنین نے چند قدم چل کر میرا استقبال کیا اور وزیر ابن علقمی نے فرطِ محبت

اور عقیدت میں میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔‘‘

درداغ نے آہستہ سے پوچھا۔ ’’استادِ محترم! ایسا کیوں ہو رہا تھا؟‘‘

استاد شمس الدین نے جواب دیا۔ ’’بڑی سیدھی سی بات ہے برخوردار...... امیر المومنین تک یہ بات پہنچ چکی ہے کہ میں ایک منگول کو اپنے ساتھ لایا ہوں، اس کو دینی تعلیم دے رہا ہوں کیونکہ وہ مسلمان ہو چکا ہے، امیر المومنین کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔‘‘

درداغ خاموش ہو گیا۔ استاد شمس الدین بولتے رہے۔ ’’میں نے امیر المومنین سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ حکومت کے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیں، کسی پر بھروسا نہ کریں۔‘‘

درداغ نے کہا۔ ’’آپ تو قصر میں کافی دیر رہے ہیں، کیا صرف اتنی سی باتیں ہوئی تھیں یا کچھ اور؟‘‘

استاد شمس الدین نے کہا۔ ’’نہیں تو...... اور بہت ساری باتیں بھی ہوئیں۔ امیر المومنین تو مجھ سے یہ خواہش کر رہے تھے کہ میں تجھ کو اپنے ساتھ لے کر قصرِ خلافت چلا جاؤں اور تیری ملاقات امیر المومنین سے کرادوں۔‘‘

درداغ نے آہستہ سے پوچھا۔ ’’لیکن ان باتوں سے حاصل کیا ہوگا؟‘‘

استاد شمس الدین نے چراغ پا ہو کر اپنے شاگرد کو ڈانٹ دیا۔ ’’زیادہ باتوں سے حاصل تو کچھ ہوتا نہیں مگر دوسروں کو اس سے بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔‘‘

درداغ نے عرض کیا۔ ’’میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا، استادِ محترم!‘‘

استاد شمس الدین نے کہا۔ ’’امیر المومنین کے آس پاس جو لوگ ہوتے ہیں، ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ خاص کر وزیر ابن علقمی پر۔ اس شخص نے امیر المومنین کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔‘‘

درداغ نے کہا۔ ’’استادِ محترم! کوئی اچھا ہو یا برا، مجھ کو کسی سے کیا لینا دینا۔ میرا خیال ہے آپ بھی محتاط ہو جائیے۔‘‘

استاد شمس الدین نے کہا۔ ’’پھر وہی حماقت کی باتیں۔ میں تجھ کو قصرِ خلافت لے جانا چاہتا ہوں لیکن پہلے تجھ کو یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ امیر المومنین کے سامنے تو زیادہ نہیں بولے گا۔‘‘

درداغ نے عرض کیا۔ ’’استادِ محترم! بات دراصل یہ ہے کہ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی، وہ تہذیب وتمدن سے نا آشنا تھا۔ ہر لوگ جنگلی جانوروں کی طرح وحشی

ہوتے ہیں۔‘‘

درداغ رونے لگا۔ اس کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ استاد شمس الدین نے اس سے پہلی بار ذرا جھڑک کر غصے میں بات کی ہے۔ استاد شمس الدین نے اس کو روتے دیکھا تو ہنسنے لگے، بولے۔ ’’یہ کیا، یہ آنسو کیوں؟ کیا تو عورت ہے؟ ارے نالائق! مرد نہیں رویا کرتے۔ لوگ تجھ کو روتے دیکھیں گے تو ہنسیں گے۔‘‘

درداغ برابر روتا رہا اور استاد شمس الدین اسے چپ کراتے رہے پھر وہ وہاں سے چلے گئے۔ اچانک کچھ کہے سنے بغیر۔ درداغ کو اس بات کا بھی بڑا دکھ ہوا۔ کئی بار جی میں آئی کہ وہ انہیں آواز دے کر روک لے لیکن وہ بے حس وحرکت خاموش بیٹھا روتا رہا پھر کچھ دیر بعد اس نے دیکھا، استاد شمس الدین علیہ کے ساتھ واپس چلے آرہے ہیں۔ درداغ کا دل دھڑکنے لگا۔ دوران خون میں تیزی آگئی اور وہ ان دونوں کے قریب آنے سے پہلے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

استاد شمس الدین نے علیہ کو درداغ کے روبرو کھڑا کر دیا، کہا۔ ’’درداغ! ادھر ہماری طرف دیکھ، یہ عورتوں کی طرح آنسو کیوں بہاتا ہے؟‘‘

درداغ نے نظر اوپر اٹھائی اور علیہ کو اچٹتی سرسری نظروں سے دیکھا۔ استاد شمس الدین نے کہا۔ ’’افسوس کہ تو نے علیہ کو بھی ناراض کر دیا۔ یہ تجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔‘‘

درداغ نے جواب دیا۔ ’’استادِ محترم! میں ٹھہرا ایک غریب الوطن غریب الدیار۔ آپ لوگ جس طرح چاہیں، مجھے ذلیل اور شرمندہ کرتے رہیں۔‘‘

استاد شمس الدین نے ایک بار پھر سرزنش کی، کہا۔ ’’لڑکے! یہ کیسا اندازِ گفتگو ہے تیرا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے تجھ کو سمجھنے اور پہچاننے میں سخت غلطی کی ہے۔ میں تجھ کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔‘‘

درداغ نے عرض کیا۔ ’’استادِ محترم! اگر آپ علیہ کو اس پر آمادہ کرلیں کہ یہ میرے کسی معاملے میں دخل نہیں دے گی اور مجھ کو آزمائش میں نہیں ڈالے گی تو میں بھی آپ کو......‘‘

استاد شمس الدین نے دیکھا، علیہ بہت بے چین ہے اور کچھ کہنا چاہتی ہے۔ درداغ کی بات کاٹ دی اور علیہ سے کہا۔ ’’تجھ کو کچھ کہنا ہے؟‘‘

علیہ نے کہا۔ ’’اس نے میری بڑی بے عزتی کی ہے اس لیے میں خود بھی اس سے دور رہنا چاہتی ہوں۔‘‘

استاد شمس الدین نے کہا۔ ’’درداغ! میں نے یہ سوچ کر کہ تو یہاں تنہا رہتا ہے اور تیرا کوئی کنبہ نہیں، علیہ سے یہ

کہہ دیا تھا کہ یہ تیرا دل بہلایا کرے اور تیری تنہائی کے بوجھ کو کم کر دیا کرے مگر تو نے معلوم نہیں کیا سمجھا اور اس کو ذلیل کر کے چلتا کر دیا۔''

درداغ کو اپنے کیے پر ندامت تھی، بولا۔''میں نے تو جو کچھ کیا، آپ کے پاسِ ادب سے۔ اگر میرا یہ عذر مسموع نہیں تو میری بدقسمتی۔''

استاد شمس الدین نے علیہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''علیہ! یہ نادم ہے۔ میرا خیال ہے اس کو معاف کر دو۔ یہ ایک سادہ لوح نوجوان ہے اس لیے اس کا محاسبہ سرِ دست مناسب نہیں ہے۔''

علیہ نے عرض کیا۔''میرے آقا! میرے استاد! اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس منگول نوجوان کو معاف کر دوں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

استاد شمس الدین نے زور سے تالی بجائی۔ تالی کی آواز سن کر ایک خدمت گار حاضر ہو گیا۔ استاد شمس الدین نے حکم دیا۔''فواکہات حاضر کیے جائیں۔''

خدمت گار واپس چلا گیا اور جب وہ واپس آیا تو خشک میووں کی طشت اس کے سر پر تھی۔ اس طشت کو ان تینوں کے سامنے رکھ دیا گیا۔ استاد شمس الدین نے دونوں سے کہا۔''فواکہات حاضر ہیں۔ تم دونوں کھاؤ اور دلوں سے ایک دوسرے کے خلاف عناد نکال دو۔''

علیہ نے بادام کی گری اٹھا کر درداغ کی طرف بڑھا دی کہا۔''کھا، تکلف نہ کر۔''

درداغ نے کسی قسم کا تکلف کیے بغیر بادام کی گری اٹھا کر علیہ کی طرف بڑھا دی، بولا۔''تو بھی کھا۔''

دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ سے گری لے لی اور کھانے لگے۔ بادام، پستہ، کشمش، خشک انجیر اور کھجور ...... باری باری وہ سب کھایا گیا جو طشت میں موجود تھا۔ استاد شمس الدین ان دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ آخر میں رخصت ہوتے وقت ان دونوں سے کہا۔ ''تم دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی ہو، تمہیں اچھے پڑوسیوں کی طرح خوش اخلاقی سے رہنا چاہیے۔''

درداغ نے جواب میں کہا۔''ہم منگولوں میں اتنی زیادہ خوش اخلاقی نہیں ملے گی لیکن جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے بھائی کے لیے خوش اخلاقی سے مسکرا دینا بھی عین ثواب اور عبادت ہے، میں اس پر سختی سے کاربند ہوتا جا رہا ہوں۔''

علیہ نے کہا۔''مجھے روتے بسورتے چہرے ذرا بھی پسند نہیں، پھر میں خود کس طرح افسردگی اور مایوسی سے پیش آؤں گی۔''

استاد شمس الدین نے دونوں کو سمجھایا۔''لیکن خیال رہے کہ اخلاقیات، احتیاط اور آداب کی حدیں برقرار رہیں کیونکہ اسی میں ہم سب کی آبرو اور عزت ہے۔''

درداغ نے سر جھکا کر وعدہ کیا۔''اللہ نے چاہا تو میں نہ صرف خود شرمندگی اور خجالت سے بچوں گا بلکہ دوسروں کو بھی بچاؤں گا۔''

علیہ نے کوئی وعدہ نہیں کیا، وہ نظریں جھکائے ان دونوں کی باتوں پر مسکراتی رہی۔

☆☆☆

درداغ نے اب تک جو کچھ دیکھا، جانا اور سمجھا تھا، وہ ایسا نہیں تھا کہ ہلاکو خان کے لیے کارآمد ہو۔ وہ ابھی تک خلیفہ سے بھی نہیں ملا تھا۔ وہ بغداد کے بازاروں اور گلی کوچوں میں بھی مارا مارا نہیں پھرا تھا۔ وہ تو استاد شمس الدین کا قیدی بن کر رہ گیا تھا۔ اس کو استاد شمس الدین پر رحم آ رہا تھا۔ سادہ لوح، شریف اور نیک انسان۔ وہ اگر چاہتا تو استاد شمس الدین کو ذلیل و خوار کر کے واپس چلا جاتا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ استاد شمس الدین کی خوش اخلاقیاں، مہربانیاں، نوازشیں اور چاہتیں درداغ کو اسیر کر چکی تھیں۔ اب علیہ بھی آہستہ آہستہ اس کے دل و دماغ پر طاری ہوتی جا رہی تھی۔

اس نے استاد شمس الدین سے خواہش کی کہ وہ بغداد کے بازاروں اور گلی کوچوں کی سیر کرنا چاہتا ہے۔

استاد شمس الدین نے جواب دیا۔''کیا میں نے تجھ کو کہیں آنے جانے سے روکا ہے؟''

درداغ اس جواب سے خوش ہو گیا مگر استاد شمس الدین نے اچانک ایک تجویز پیش کر دی، کہا۔''لیکن درداغ! میں چاہتا ہوں جب تک تیری ملاقات امیر المومنین سے نہ ہو جائے تو کہیں بھی مت جا۔ خود کو بردبار اور سنجیدہ باور کرا۔ میں نہیں چاہتا کہ تیرے بارے میں معلومات اور اطلاعات دوسروں کے ذریعے امیر المومنین تک پہنچیں۔''

درداغ نے عرض کیا۔''استادِ محترم! میں نے ایک بار جو کہہ دیا کہ میں آپ کی مرضی اور اجازت کے بغیر کچھ بھی نہ کروں گا۔ آپ جب چاہیں مجھے امیر المومنین سے ملوا دیجیے اور جب چاہیں، بغداد میں گھومنے پھرنے کی اجازت دے دیں۔''

استاد شمس الدین گئے تو علیہ آ گئی، اس نے پوچھا۔

''منگول نوجوان! تو لڑکی کیوں بن گیا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں لڑکی تو کبھی بھی نہیں بنا۔ یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟''

علیہ نے کہا۔ ''میں شب و روز تجھے یہیں اسی پائیں باغ میں موجود دیکھ رہی ہوں، کوئی مرد تو اس طرح ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتا۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''علیہ! تو خوش قسمت ہے کہ تو پیدائشی مسلمان ہے۔ مجھے اسلام کے بارے میں اب معلوم کرنا پڑ رہا ہے اور یہ کام ایسا نہیں ہے کہ میں گوشہ نشینی اور محنتِ شاقہ کیے بغیر حاصل کرلوں۔''

علیہ مسکرا رہی تھی، بولی۔ ''تو تو خاصا احمق معلوم ہوتا ہے، اپنا کام نکال اور گھر کی راہ لے۔ تیری جگہ میں ہوتی تو یہی کرتی۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''علیہ! میں تنہا اکیلا انسان ہوں۔ میرا کوئی کنبہ کوئی خاندان نہیں۔ اس حال میں اگر مجھے کسی کا سہارا مل جائے تو میں بہت کارآمد بن سکتا ہوں۔ ایک پسندیدہ، خواہش اور مرضی کے مطابق سہارا۔''

علیہ نے پوچھا۔ ''سہارا مرد کا ہو یا عورت کا؟''

درداغ نے ہنس کر جواب دیا۔ ''عورت کا، میں مرد ہوں علیہ!''

علیہ نے پوچھا۔ ''کوئی سہارا تلاش بھی کیا یا تلاش اور جستجو کے بغیر اپنا مقصود پا جانے کی آرزو کر رہے ہو؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''علیہ! میں اس سوال کا فی الحال کوئی جواب نہیں دے سکتا۔''

علیہ نے مسکراتے ہوئے طنز کیا۔ ''لیکن میں تیرے جواب سے آگاہ ہوگئی، کوئی اور سہارا تلاش کرلے۔''

درداغ چڑ سا گیا، بولا۔ ''تو معلوم نہیں کیا سمجھ رہی ہے۔ شاید خوش فہمی کا شکار ہوگئی ہے۔''

علیہ نے پوچھا۔ ''میں یا تو؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''تو...... اور کون؟''

علیہ برابر مسکرا رہی تھی۔ ''سبحان اللہ! مجھ پر رکھ کر اپنی بات کر رہا ہے تو...... خدا تجھ پر رحم کرے۔''

درداغ نے کہا۔ ''علیہ! کیا اس وقت ہم دونوں کسی اور موضوع پر بات نہیں کرسکتے؟''

علیہ نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں، بالکل کرسکتے ہیں مگر اس سے زیادہ پُرلطف، لذیذ اور سدا بہار موضوع اور نہیں ہوسکتا۔ دنیا میں لطف و لذت اسی موضوع سے ہے، کم از کم میں یہی سمجھتی ہوں۔''

درداغ علیہ کی دلیری اور بے باکی سے پریشان ہو رہا تھا، کہا۔ ''علیہ! خدا کے لیے بس کرو اور اس وعدے کا خیال کرو جو ہم دونوں استاد شمس الدین سے کرچکے ہیں۔''

علیہ نے جواب دیا۔ ''میں نے جو وعدہ کیا ہے اس کی خلاف ورزی نہیں کر رہی ہوں لیکن میں نے یہ وعدہ تو نہیں کیا تھا کہ میں دل کو خوش کرنے کے لیے مزیدار باتیں بھی نہیں کروں گی۔''

درداغ کو یقین ہوچکا تھا کہ علیہ اس وقت اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہے۔ وہ ہمت کرکے اٹھا اور علیہ سے کہا۔ ''تو یہیں ٹھہر، میں ابھی آیا۔''

وہ پائیں باغ سے نکل کر سڑک پر آگیا، یہاں شاہراہ کے دونوں طرف مکانات کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ مکانات کے سامنے کہیں کہیں درخت بھی لگے ہوئے تھے۔ ان درختوں کے سائے میں لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کہیں کہیں مکانات کا سلسلہ منقطع ہوگیا تھا اور وہاں ایک گلی بن گئی تھی۔ پچاس پچپن گز چھوٹی ہوئی جگہ کے بعد مکانات کا دوبارہ سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ ان گلیوں میں بچے بھاگ دوڑ رہے تھے۔

سڑک پر عورتوں اور مردوں کی آمدورفت سے بڑی چہل پہل تھی۔ عورتیں رداؤں میں منہ چھپائے بڑی مہارت سے چل پھر رہی تھیں۔ پیدل چلنے والوں کے علاوہ گھڑسوار بھی ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ گھوڑے کی ٹاپ سے اٹھنے والی گرد اور آواز سے کان اور نتھنے خاصے متاثر ہو رہے تھے۔ ساربان اپنے اپنے اونٹوں کی مہار پکڑے پیدل سفر کر رہے تھے۔ کسی کسی اونٹ پر عورتیں اور بچے بیٹھے ہچکولے کھا رہے تھے اور شتربان ہلکے سروں میں حدی خوانی کر رہے تھے۔

درداغ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ اجنبی اور اجنبیوں کے اس شہر میں وہ دیر تک ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ یہاں تک کہ مکانات کا سلسلہ ختم ہوا اور وہ ایک بازار میں داخل ہوگیا۔ یہاں عمارتوں اور دکانوں کی دیواروں کا نچلا حصہ کولتار سے سیاہ پتا ہوا تھا اور اوپر کا حصہ سفید گچ سے پوت دیا گیا تھا۔ سفیدی میں کہیں کہیں سرخی کی آمیزش بھی پائی جاتی تھی۔ اس نے دیکھا ان دکانوں اور مکانوں میں لوگ آجا رہے تھے۔ کچھ لوگ اندر چلے جاتے ہیں اور کچھ باہر نکل آتے ہیں۔ آنے جانے والوں کا انداز یہ بتاتا تھا کہ نہ تو یہ مکانات تھے اور نہ ہی دکانیں۔ وہ شوق تجسس میں ایک دکان کے دروازے پر کھڑا ہوگیا۔ اسی وقت دو آدمی

اس کے اندر چلے گئے اور ذرا دیر بعد ایک شخص اندر سے نمودار ہوا۔ یہ شخص صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس شخص نے درداغ کو بغور دیکھا اور ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ درداغ بھی اس کو بغور دیکھنے لگا پھر اس شخص نے عربی میں پوچھا۔ ''کیا تجھے عربی زبان آتی ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ہاں، کچھ کچھ۔ بہت زیادہ نہیں۔ بس کام چلا لیتا ہوں۔''

اس شخص نے پوچھا۔ ''کیا تو منگول ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں منگول ہوں۔ کیا کسی کا منگول ہونا جرم ہے؟''

اس نے کہا۔ ''نہیں بھائی، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو بس یوں ہی پوچھ رہا تھا۔'' پھر پوچھا۔ ''بغداد میں کیا لینے آئے ہو؟''

درداغ نے اس کی بات کا تو کوئی جواب دیا نہیں، الٹا سوال کر دیا، پوچھا۔ ''مشفق و مہربان دوست! ان دکانوں میں کیا بکتا ہے؟''

وہ شخص مسکرایا، بولا۔ ''یہ دکانیں نہیں ہیں، یہ حمام ہیں۔ یہاں لوگ غسل کرنے آتے ہیں۔'' پھر پوچھا۔ ''کیا تو غسل کرے گا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''نہیں، جب میرے پاس گھر موجود ہے تو پھر یہاں حمام میں نہانے سے فائدہ؟''

وہ شخص ہنسے جا رہا تھا، بولا۔ ''میں بھی نہا کر نکلا ہوں، کیا میرا گھر نہیں ہے اور یہ لوگ جو صبح سے شام تک یہاں آتے جاتے رہتے ہیں، کیا سب کے سب بے گھر ہیں؟ ہرگز نہیں۔''

درداغ نے پوچھا۔ ''پھر یہ لوگ بازاروں میں کیوں نہاتے ہیں؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''یہاں سہولتیں بہت ہوتی ہیں۔ ٹھنڈا اور گرم پانی الگ الگ ٹونٹیوں سے نکلتا ہے جبکہ گھروں میں ایسا نہیں ہوتا۔''

درداغ کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کیسی ٹونٹیاں ہیں کہ جن سے بیک وقت گرم پانی بھی نکلتا ہے اور ٹھنڈا بھی۔ پوچھا۔ ''کیا میں انہیں اندر سے دیکھ سکتا ہوں؟''

اس شخص کو اس سادہ لوح نوجوان پر رحم آ رہا تھا، وہ درداغ کو اندر لے گیا۔ وہاں اس نے ایک قطار میں تہ بند لٹکے دیکھے، پوچھا۔ ''یہ اتنے بہت سارے تہ بند کس کام آتے ہیں؟''

اس آدمی نے جواب دیا۔ ''ایک تہ بند تو باندھ کر نہانے کے کام آتا ہے، دوسرا غسل کے بعد پہننے کے کام آتا ہے اور تیسرا جسم پونچھنے کے کام آتا ہے۔''

درداغ کا نہانے کو جی چاہنے لگا۔ یہ شخص کچھ زیادہ مہربان اور شریف تھا، پوچھا۔ ''دوست! کیا تم نہاؤ گے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''جی تو چاہتا ہے غسل کرنے کو لیکن اس وقت میرے پاس رقم نہیں ہے۔''

اس شخص نے کہا۔ ''رقم کی فکر نہ کر میرے بھائی، تو نہانے چلا جا، رقم میں ادا کر دوں گا۔''

درداغ کچھ پس و پیش کے بعد غسل کرنے چلا گیا۔ وہاں اس کو تین تہ بند دے دیے گئے۔ وہ بہت خوش تھا۔ وہ تینوں تہ بند سنبھالے اندر چلا گیا۔ دروازے کو اندر سے بند کر کے اس نے کپڑے اتارے اور ایک تہ بند باندھ کر دونوں ٹونٹیوں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک ٹونٹی کھولی تو اس میں سے گرم پانی نکلا۔ درداغ ہنسنے لگا، پھر اس نے دوسری ٹونٹی کھولی۔ اس میں سے ٹھنڈا پانی نکلا۔ اس کو جھرجھری سی آگئی۔

جب کچھ دیر بعد وہ نہا دھو کر باہر نکلا تو اس نے اجنبی مہربان کو انتظار کرتے دیکھا۔ اس نے درداغ کے غسل کی رقم ادا کی اور پھر درداغ کے ساتھ باہر سڑک پر آگیا، اس نے پوچھا۔ ''تو یہاں کس کے پاس ٹھہرا ہوا ہے؟''

درداغ استاد شمس الدین کا نام لے کر اسے ذلیل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''بھائی میرے! یہاں میرا کوئی بھی نہیں، سچی بات تو یہ ہے کہ میں ہلاکو خان کی فوج کا بھگوڑا ہوں۔ میں یہاں بغداد بھاگ کر اس لیے آیا تھا کہ اسلام کو خوب اچھی طرح سوچ سمجھ لوں اور اگر یہ مذہب سمجھ میں آجائے تو اس کو اختیار کر لوں۔''

اس شخص نے پوچھا۔ ''پھر کچھ سمجھ میں آیا اسلام؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''بہت کچھ سمجھ میں آچکا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ شاید میں مسلمان ہو کر ہی رہوں گا۔ اسلام کی سیدھی سادی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی اثر انگیز زندگی ان دونوں نے مجھے اپنا بندۂ بے دام بنا لیا ہے۔''

اس شخص نے دعا کی۔ ''خدا تجھ کو صراطِ مستقیم دکھائے اور ادھر ادھر بھٹکنے سے بچائے۔''

درداغ اس سے جدا ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ یہ اجنبی اس سے کہے کہ اچھا بھائی اب چلتے ہیں خدا حافظ اور درداغ فوراً اپنی راہ لے لیکن اس شخص کو معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا کہ درداغ کے ساتھ ساتھ تو چل رہا تھا مگر خدا حافظ نہیں کہہ رہا تھا۔ آخر تھک ہار کر درداغ ہی کو کہنا پڑا۔ ''اچھا جناب! بہت بہت شکریہ پھر کسی دن ملاقات

ہو جائے گی اگر اللہ نے چاہا تو۔‘‘
اس شخص نے کہا۔ ’’پھر کسی دن کیا معنی، میں تجھ کو ایک شخص سے ملوانا چاہتا ہوں۔‘‘
درداغ نے پوچھا۔ ’’کس شخص سے میرے بھائی! میں تو یہاں کسی کو پہچانتا بھی نہیں۔‘‘
اس شخص نے ہنس کر جواب دیا۔ ’’لیکن میں تجھ کو جس شخص سے ملواؤں گا تو اسے ضرور پہچان لے گا۔‘‘
درداغ کو ان باتوں سے وحشت بھی ہو رہی تھی اور غصہ بھی آرہا تھا، بولا۔ ’’بھائی میرے! کیا آپ میری بات نہیں سمجھ رہے ہیں؟ میں نے کہہ جو دیا کہ اس شہر بغداد میں، میں بالکل اجنبی ہوں۔ مجھ سے کوئی بھی واقف نہیں، یہاں میرا کوئی بھی دوست یا شناسا نہیں۔‘‘
اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن میرے بھائی! میں بھی تجھ سے غلط نہیں کہہ رہا۔ تو اس شخص کو ضرور جانتا ہے اور وہ شخص تجھ سے ضرور واقف ہے، ذرا میرے ساتھ تو چل۔‘‘
درداغ نے بڑی مایوسی سے کہا۔ ’’پتا نہیں آپ مجھ سے کس قسم کا اور کیوں مذاق کر رہے ہیں۔ اگر میں یہ جانتا کہ مجھ کو اپنے غسل کی یہ قیمت ادا کرنا پڑے گی تو میں آپ کی رقم سے ہرگز غسل نہ کرتا۔‘‘
اس شخص نے جواب دیا۔ ’’کیا تیرا نام درداغ ہے؟ اگر تیرا یہی نام ہے تو تجھے میری باتوں پر یقین کر لینا چاہیے کہ تیرا ایک ساتھی، تجھے دو دن سے تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ کل وہ اتفاق سے ہی بازار میں مل گیا تھا۔ آج تو مل گیا تو میں نے سوچا کہ میں یہ نیک کام انجام دے دوں۔‘‘
اب درداغ کو سنجیدگی سے قائل ہو جانا پڑ گیا تھا کہ یہ اجنبی شخص جو حمام کے باہر اتفاقیہ طور پر مل گیا تھا، اس سے کسی قسم کا مذاق نہیں کر رہا ہے۔ اس شخص کو درداغ کا نام تک معلوم ہو گیا تھا۔ درداغ چپ چاپ اس کے ساتھ چلتا رہا۔
درداغ کو خاموش دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ’’تو گویا تجھ کو میری بات کا یقین آ گیا ہے؟‘‘
درداغ نے بڑی بے بسی سے جواب دیا۔ ’’ہاں میرے بھائی! مجھے یقین تو آ گیا لیکن یہ بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ اس شہر میں وہ کون شخص ہے جو مجھ کو تلاش کرتا پھر رہا ہے اور میں اس کو جانتا ہی نہیں۔‘‘
اس شخص نے کہا۔ ’’یہ مسئلہ بھی جلد ہی حل ہو جائے گا۔ جب تم دونوں کا آمنا سامنا ہوگا تو خود ہی ایک دوسرے کو پہچان لو گے۔‘‘

وہ شخص درداغ کو پیدل چلا کر کافی دور لے گیا۔ درداغ نے بغداد کی اس عجیب و غریب جگہ کو دیکھا تو سمجھ میں نہ آیا کہ اس لمبی چوڑی فوجی بارکوں جیسی جگہ میں کون لوگ رہتے ہیں۔ بالکل اصطبلوں جیسی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک دو رویہ حجرے سے بنے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے پانی کے حوض اور چھوٹی چھوٹی نہریں تھیں، ان حوضوں اور نہروں میں بطخیں تیر رہی تھیں۔
وہ شخص درداغ کو ان حجروں کے اوپر بنے ہوئے حجروں میں لے گیا۔ شروع میں ایک بڑا سا پھاٹک بنا تھا جس کے دو ہاتھیوں جتنی بلندی کے چوبی پھاٹک آغوش مادر کی طرح وا تھے اور پھاٹک کے دونوں طرف ان کے پیچھے اوپر جانے کے لیے زینے بنے ہوئے تھے۔ وہ درداغ کو ایک درمیانی حجرے کے سامنے پہنچا کر کھڑا ہو گیا۔ حجرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس شخص نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کسی نے پوچھا۔ ’’کون؟ ارے بھائی! کون؟‘‘
اس شخص نے جواب دیا۔ ’’ارے بھائی میرے! دروازہ تو کھول پھر پہچان تو کہ یہ کون ہیں اور میں کس کو لے کر آیا ہوں۔‘‘
ذرا سی دیر میں حجرے کا در کھل گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ درداغ کو یاد آرہا تھا کہ اس شخص کو وہ ہلاکو خان کے آس پاس دیکھ چکا ہے لیکن وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ اس اجنبی منگول نے درداغ کو مخاطب کیا۔ ’’ارے درداغ! یہ تو...... میں نے تجھ کو بہت تلاش کیا اور اب ناکام ہو کر میں واپس جانے ہی والا تھا۔‘‘
درداغ نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ ’’خیریت تو ہے، تم یہاں کیا لینے آ گئے؟‘‘
اس منگول نے اجنبی شخص کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ’’میں بھی تیری طرح اسلام کے سوا کسی اور مذہب کو پسند نہیں کرتا۔ اب میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ بغداد کے اہلِ علم اور فاضل و باکمال لوگوں سے مل کر ان سے اسلامی تعلیمات کا درس لوں۔‘‘
درداغ نے کہا۔ ’’بڑا اچھا خیال ہے آپ کا۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کے بعد بھگوڑے منگولوں کا ایک تانتا سا لگ جائے گا۔‘‘ اس کے بعد یہ دونوں اپنے مہربان اجنبی کی طرف رجوع ہو گئے۔ درداغ نے کہا۔ ’’اب تو جناب آپ کو اپنا پتا ہمیں سمجھانا ہوگا تاکہ ہم دونوں آپ کا شکریہ

ادا کرنے کے لیے آپ کے گھر آسکیں۔''

اس شخص نے جواب دیا۔''میرا پتا بالکل سیدھا سادہ ہے۔ آپ دونوں محلہ عتابیہ میں آجائیے، یہاں بغداد کا مشہور کپڑا عتابیہ تیار ہوتا ہے۔ اس محلے میں عتابیہ بننے کا سب سے بڑا کارخانہ میرا ہی ہے۔ میرا نام ہے سیف الدین۔''

وہ شخص اپنا پتا سمجھانے کے بعد وہاں نہیں رکا۔ فوراً جدا ہوگیا۔ اس کے جاتے ہی اجنبی منگول نے کہا۔ ''درداغ! میرا نام گوت ہے۔ مجھ کو خانِ محترم ہلاکو خان اور نصیر الدین طوسی نے تیری مدد کے لیے بھیجا ہے۔ تیری ہی طرح میں بھی یہی کہوں گا کہ میں یہاں اسلام قبول کرنے آیا ہوں اور میں بھی تیری طرح ہر جگہ یہی کہتا پھروں گا کہ ہلاکو خان اور منگول خلافتِ عباسیہ سے خوفزدہ ہیں اور وہ بغداد پر حملے کا ارادہ نہیں رکھتے اور یہ کہ منگولوں میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔''

درداغ نے کہا۔''بڑا اچھا خیال ہے۔ میں نے یہاں کے مدرسۂ مستنصریہ کے ایک لائق فائق استاد شمس الدین کا سہارا پکڑلیا ہے۔ میں انہی کے پائیں باغ میں رہتا ہوں اور استاد شمس الدین کی میری بابت امیر المومنین سے کچھ بات بھی ہوچکی ہے۔ میں خان محترم کا منصوبہ ہر وقت ذہن نشین رکھتا ہوں۔''

گوت نے کہا۔''درداغ! ہلاکو خان کہتا تھا کہ اگر کسی نے مجھے دھوکا دیا تو میں اس کو دھوکا دوں گا اور قبر کی گہرائیوں تک سے اس کو نکال لاؤں گا۔''

درداغ کو جھرجھری سی آگئی۔ نحیف سی آواز میں بولا۔ ''لیکن اس کو کوئی دھوکا دے گا ہی کیوں اور کس کی شامت آئی ہے جو ہلاکو خان سے غداری کرے گا۔''

گوت نے کہا۔''درداغ! معلوم نہیں کس طرح ہلاکو خان اور نصیر الدین طوسی کو تیری بابت یہ شبہ ہوگیا ہے کہ تو ان کے لیے کام نہیں کرے گا۔ اسی اندیشے کے پیشِ نظر مجھ کو یہاں بھیجا گیا ہے۔''

درداغ نے کہا۔''مجھ پر خواہ مخواہ شبہ کیا گیا ہے۔'' پھر پوچھا۔''گوت! تیرے پاس بغدادی درہم و دینار ہوں گے؟''

گوت نے جواب دیا۔''ہاں ہیں تو سہی، کیوں؟ کوئی خاص بات؟ کوئی خاص کام؟''

درداغ نے کہا۔''ہم دونوں اسی وقت دجلہ کے کنارے چلتے ہیں۔ وہاں مچھلی اور کباب والے بیٹھتے ہیں اور ان کے چاروں طرف خریداروں کا ہجوم ہوتا ہے۔ ہم دونوں اپنے چہرے مہرے اور خاص خدوخال کی وجہ سے دور ہی سے الگ نظر آتے ہیں۔ وہاں مچھلی اور کباب وغیرہ کھانے والے لوگ ہمیں دلچسپی سے دیکھیں گے۔ بس جب وہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہوجائیں گے تو میں اپنی تقریر شروع کردوں گا۔''

گوت کی سمجھ میں درداغ کی بات نہیں آئی مگر وہ اسی وقت سرائے سے نکلا اور دجلہ کے کنارے پہنچ گیا۔ دجلہ کے کنارے کباب، مچھلی، روٹی والے دکانیں سجائے بیٹھے تھے اور کھانے والوں کے ہجوم نے انہیں اپنے بیچ میں دبا رکھا تھا۔ ان دونوں کے پہنچتے ہی لوگوں نے انہیں دیکھنا اور چہ میگوئیاں کرنا شروع کردیں۔ ان دونوں نے پکی اور بھنی ہوئی مچھلیاں خریدیں اور مزے لے لے کر کھانا شروع کردیا۔ درداغ نے کہا۔''کیسی مزے کی مچھلیاں ہیں یہاں...... واہ واہ مزہ آگیا۔''

گوت نے کہا۔''میں نے ایسی مچھلی دنیا بھر میں نہیں دیکھی اور ان کا مزہ...... بس کیا کہیں واہ واہ۔''

آس پاس کے لوگوں نے ان دونوں کی باتوں میں دلچسپی لینا شروع کردی تھی۔ درداغ نے کہا۔ ''گوت! کیا خیال ہے، ہم منگولوں میں اسلام بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے۔''

گوت نے جواب دیا۔''ہاں یہ تو ہے۔ اسلام میں کوئی ایسی بات ہے ضرور جو دل و دماغ پر اپنا قبضہ جمالیتی ہے۔''

درداغ نے کہا۔''اس بات سے شاید ہی کوئی انکار کرسکے کہ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔ میں تو اس پر حیران ہو رہا ہوں کہ برقائی خان مسلمان ہوچکا ہے اور اب ہلاکو خان بھی اسی طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے یہاں تک سنا ہے کہ پہلے اس کا یہ ارادہ تھا کہ وہ خراسان ہی میں کسی مسلمان عالم کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلے لیکن پھر اس کا ارادہ بدل گیا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ ہلاکو خان نے کسی مسلمان سے پوچھا کہ اس وقت دنیا میں سب سے بڑا مسلمان کون ہے تب اس کو یہ بتایا گیا کہ بغداد کے حکمراں امیر المومنین مستعصم باللہ سے بڑا کوئی مسلمان نہیں۔ چنانچہ ہلاکو خان نے اعلان کردیا کہ وہ بغداد میں امیر المومنین کے دربار میں حاضری دے گا اور وہیں مسلمان ہوجائے گا۔''

گوت نے جواب دیا۔''یہی باتیں میں نے بھی سنی ہیں۔''

بغداد کے لوگ ان دونوں کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ کسی عمر رسیدہ مسلمان نے پوچھا۔''تم دونوں کون ہو؟''

گوت نے اس کو نہایت غور سے دیکھا، جواب دیا۔ ''ہم دونوں مسلمان ہیں۔''

بڑے میاں نے کہا۔ ''نہیں، میں یہ نہیں پوچھ رہا کہ اس وقت تم کون ہو کیا ہو۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مسلمان ہونے سے پہلے تم کیا تھے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''حضرت! ہم دونوں نسلاً منگول ہیں۔''

بڑے میاں نے کہا۔ ''بہت خوب! تو اب تم دونوں مسلمان ہو چکے ہو شاید؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''بحمد للہ۔''

ایک تیس پینتیس سالہ خوبرو جوان ان دونوں کے پاس کھڑے ہو کر مچھلی کھانے لگا، پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ منگولوں میں اسلام بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ہم جھوٹ کیوں بولیں گے۔ اگر ہلاکو خان جیسا کہ سننے میں آیا ہے مسلمان ہو گیا تو اس کے ساتھ لاکھوں منگول چشم زدن میں اسلام قبول کر لیں گے۔''

کسی طرف سے آواز آئی۔ ''لیکن میں نے تو یہ سنا ہے کہ ہلاکو خان نے امیر المومنین کو دھمکی آمیز خط بھی لکھا ہے۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ضرور لکھا ہوگا کیونکہ بادشاہوں اور حکمرانوں کے درباروں سے رسمی کارروائیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ہلاکو خان نے امیر المومنین کو جو کچھ بھی لکھا ہوگا رسمی طور پر لکھا ہوگا۔ ورنہ اس کا دل اسلام کی محبت سے سرشار ہے۔ جب میں ہلاکو خان کے بالکل قریب تھا تو میں نے سنا تھا کہ ہلاکو خان فرطِ عقیدت میں اپنی بیٹی کی شادی امیر المومنین کے بڑے صاحبزادے ابوبکر سے کرنے والا ہے۔''

دجلہ کے کنارے جو بھی یہ باتیں سن رہا تھا، خوش ہو رہا تھا۔ یہ دونوں اتنی باتیں کر کے خاموش ہو گئے۔ اب دوسرے اسی موضوع پر بحث مباحثہ کرنے لگے۔ ان سب میں خوب گرما گرم بحث ہونے لگی۔ کچھ کا خیال تھا کہ ہلاکو خان امیر المومنین کی عزت و احترام تو کرے گا مگر شاید اسلام نہ قبول کرے مگر دوسرے صاحب اس کو سختی سے مسترد کرنے لگے۔ انہوں نے فرطِ جوش میں کہا۔ ''اگر اسلام کی خوبیاں ہلاکو خان کے دل و دماغ پر حاوی ہو چکی ہیں تو کون ہے جو اس خونخوار انسان کو اسلام قبول کرنے سے روک سکے۔''

بڑے میاں نے کہا۔ ''خدایا! مجھے اس دن تک زندہ رکھ، جب ہلاکو خان اسلام قبول کرے گا۔''

یہ دونوں ان سب کو باتوں میں لگا کر وہاں سے چلے آئے۔ راستے میں گوت نے پوچھا۔ ''اب تو کہاں جائے گا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''استاد شمس الدین کے گھر لیکن مشکل تو یہ آن پڑی ہے کہ مجھے اپنے گھر کا راستہ ہی نہیں یاد آ رہا ہے میں اب جاؤں گا کہاں؟''

گوت نے اس کا مذاق اڑایا۔ ''یہ کیا بات ہوئی؟ تو اپنے گھر کا راستہ کیونکر بھول گیا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ میں اس گھر سے پہلی بار بدحواسی میں نکلا تھا۔ میں کوئی نشانی یا علامت ذہن میں محفوظ کیے بغیر چلتا رہا۔ بعد میں جب ذرا ہوش آیا تو میں اتنی دور پہنچ چکا تھا کہ وہاں سے اپنے گھر تک پہنچنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو چکا تھا۔''

گوت نے پوچھا۔ ''پھر اب کیا ہوگا؟''

درداغ نے کہا۔ ''لیکن تو کیوں پریشان ہے، تو اپنی سرائے میں واپس جائے گا، پریشان تو مجھ کو ہونا چاہیے۔''

گوت زور زور سے ہنسنے لگا، بولا۔ ''کیا اب بھی میں سرائے ہی میں ٹھہروں گا؟ ارے نہیں بھائی! میں تو تیرے ساتھ رہوں گا۔ اب ہم دونوں ایک ساتھ اپنی خدمات انجام دیں گے۔''

درداغ نے فکر مندی سے کہا۔ ''اب معلوم نہیں استاد شمس الدین تجھ کو میرے پاس رہنے کی اجازت دیں گے یا نہیں، میں اپنی طرف سے تو کوئی وعدہ کرنے سے رہا۔''

گوت نے تیوری بدل کر کہا۔ ''درداغ! تو ہے کس ہوا میں؟ مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں تیرے ساتھ رہوں۔''

درداغ پریشان یوں تھا کہ وہاں علیہ بھی رہتی تھی اور گوت خوامخواہ کباب میں ہڈی بن کر چپک جائے گا۔ بولا۔ ''گوت! چند دنوں کے لیے تجھے سرائے میں رہنا چاہیے۔ اس کے بعد جب میں استاد شمس الدین کو راضی کر لوں گا تو، تو میرے پاس چلے آنا۔''

گوت نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں خان محترم ہلاکو خان کے حکم کی تعمیل کروں گا۔''

درداغ نے ایک نیا عذر پیش کیا۔ ''اس وقت ایک اور مشکل بھی آ پڑی ہے۔ میں اپنا گھر بھول چکا ہوں۔ پتا نہیں اب میں گھر پہنچوں گا کس طرح؟''

گوت نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''درداغ! زیادہ اڑنے کی کوشش نہ کر...... تو جہاں رہتا تھا، اس کو میں تلاش کر لوں گا۔''

درداغ کو گوت پر غصہ آرہا تھا، ذرا تلخ لہجے میں بولا۔ ''گوت! میں اڑنے کی کوشش کیوں کروں گا؟''

گوت نے جواب دیا۔ ''پتا نہیں کیوں کرے گا مگر میں اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دم لوں گا۔''

درداغ نے ایک بار پھر خوشامد کی۔ ''گوت! میں تجھ کو کیونکر یقین دلاؤں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں۔''

گوت نے جواب دیا۔ ''میں بھی جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔''

دونوں دیر تک باتوں میں الجھے رہے۔ آخرکار گوت نے یہ فیصلہ کیا کہ جو کام کل کرنا ہے، وہ آج ہی اسی وقت ہونا چاہیے۔

درداغ نے گوت سے کہا۔ ''تو نے جب یہ فیصلہ ہی کرلیا ہے کہ جو کام تیرے سپرد کیا گیا وہ فوراً کیا جائے گا تو پھر میں کیا بولوں۔''

دونوں مکان کی تلاش میں چل پڑے۔ درداغ کے لیے مضحکہ خیز بات یہ بھی کہ اسے اپنے محلے کے نام اور محلِ وقوع کا کچھ پتا نہ تھا۔ وہ دونوں بغداد کے ایک بازار میں مارے مارے پھرتے رہے۔ گوت اپنے لباس اور اپنے حلیے کی وجہ سے ہر جگہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتا رہا۔ جس بازار میں یہ دونوں گئے تھے، وہ ٹھٹھیروں کا بازار تھا۔ ہر طرف برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ گوت بغداد کے مال و زر کا معترف اور مداح تھا۔ ایک جگہ برتنوں پر قلعی کا کام ہورہا تھا۔ گوت اور درداغ کھڑے ہوکر یہ کام دیکھنے لگے۔ دکاندار بھی انہیں بہت غور سے دیکھتا رہا پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور ان دونوں کے پیچھے بے تعلق بن کے کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر بعد گوت نے منگول زبان میں درداغ سے کہا۔ ''شہری زندگی میں آرام کتنا ہوتا ہے۔''

درداغ نے بھی منگول زبان میں جواب دیا۔ ''اور یہی آرام انسان کو کاہل اور بزدل بنا دیتا ہے۔''

گوت نے کہا۔ ''کچھ جانتا ہے خانِ اعظم چنگیز خان نے اس سلسلے میں کیا کہا تھا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''معلوم ہے، خانِ اعظم نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی کہ شہروں میں مت آباد ہوجانا اور یہ بھی کہ قراقرم کو مت چھوڑنا کیونکہ جو قراقرم اور اپنے خاندان کو چھوڑ کر دور دراز کے علاقوں اور شہروں میں جا بسے گا، اس کی مثال اس تیر جیسی ہوگی جو کمان سے نکل کر اونچی اونچی گھاسوں یا گہرے نیلے پانی میں جا گرا ہو...... بے تعلق، گمنام اور بے وقعت ہوکر۔''

دکاندار ان دونوں کی باتیں نہیں سمجھ پارہا تھا۔ اب اس نے ان کی باتوں میں مداخلت کی، درداغ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''جناب! یہ آپ دونوں کس زبان میں گفتگو کررہے ہیں؟''

گوت نے جواب دیا۔ ''اپنی مادری منگول زبان میں۔''

دکاندار نے گوت کی عربی زبان سے متاثر ہوکر پوچھا۔ ''کیا تم دونوں کو عربی زبان بھی آتی ہے؟''

گوت نے دکاندار کا مذاق اڑایا۔ ''اگر عربی زبان آتی نہیں ہے تو میں نے اس زبان میں جواب کس طرح دے دیا؟''

دکاندار گوت کے تلخ لہجے سے گھبرا کر رہ گیا، پوچھا۔ ''آپ دونوں کا بغداد آنا کس طرح ہوا؟''

گوت نے جواب دیا۔ ''گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر اور کس طرح؟''

درداغ نے گوت کو منگول زبان میں سمجھایا۔ ''خدا کے لیے یہاں اس طرح بات نہ کر، ہمیں ان کے دلوں میں جگہ بنانی ہے، انہیں اعتماد میں لے کر اپنا مقصد حاصل کرنا ہے۔''

گوت نے جواب دیا۔ ''ان سے کام بھی نکالنا ہے اور انہیں اعتماد میں لے کر مرعوب بھی کرنا ہے۔''

دکاندار نے وحشت زدہ سی کیفیت میں پوچھا۔ ''ارے تم دونوں کو یہ کیا ہوگیا ہے؟ اچھی خاصی عربی بولتے بولتے پھر اپنی زبان میں باتیں کرنے لگے، پتا نہیں ہمارے خلاف کوئی سازش کررہے ہو یا کچھ اور......''

درداغ نے کہا۔ ''نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں۔ میرا ساتھی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ بغداد کے لوگ کتنے مہذب اور خوش اخلاق ہیں۔ میں نے دنیا کا جتنا حصہ دیکھا ہے، ان میں بغداد سب پر فضیلت رکھتا ہے، ایک افضل شہر......''

گوت مسکرایا۔ منگول زبان میں کہا۔ ''حالانکہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی ابھی تک۔''

درداغ نے کہا۔ ''اجڈ انسان! میں عنقریب امیرالمومنین سے ملاقات کرنے والا ہوں۔ اگر یہاں کے لوگوں میں ہم بدنام ہوگئے اور امیرالمومنین تک کوئی ایسی ویسی بات پہنچ گئی تو پھر ہمیشہ ذلیل و خوار کرکے یہاں رکھا جائے گا۔''

گوت نے اکڑ کر جواب دیا۔ ''کون ہے وہ جو ہمیں ذلیل و خوار کرے۔ بغداد میں امیرالمومنین سمیت ابھی وہ

آدمی نہیں پیدا ہوا جو ہم سے تیوری بدل کر بات کر سکے۔''

دکاندار ان دونوں سے مرعوب بھی تھا اور ان کی دلیری سے متاثر بھی۔ بولا۔ ''صاحبان! آپ دونوں ہمارے مہمان ہیں۔ کیا آپ دونوں اسی وقت میرے ساتھ میرے گھر چلنا گوارا فرمائیں گے؟''

گوت نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں، میں تیرے ساتھ تیرے گھر ضرور چلوں گا کیونکہ کچھ دن مہمان بن کے کسی کے گھر پڑ رہنا ہمارا مقدر بن چکا ہے۔''

درداغ گوت کی باتوں سے تنگ آچکا تھا، بولا۔ ''گوت! میں کسی کا مہمان بننے کو تیار نہیں۔ ہاں اگر تم چاہو تو اس دکاندار کو شرفِ میزبانی بخش سکتے ہو۔''

دکاندار ان دونوں کو اپنی دکان کے اندر لے گیا اور انہیں نہایت عزت سے بٹھایا۔ پوچھا۔ ''آپ لوگوں کا فی الحال قیام کہاں ہے...... غالباً سرائے ہیں؟''

گوت نے جواب دیا۔ ''ہاں، میرا قیام تو سرائے میں ہے لیکن میرے ساتھی کا کسی اور جگہ۔''

ان دونوں کو دیکھنے کے لیے دکان کے آگے دس بارہ آدمی جمع ہو چکے تھے۔ گوت نے کہا۔ ''جناب والا! اگر ہم دونوں یہاں کچھ دیر اور رک رہے تو دکان کے باہر ہمارے شائقینِ دید جمگھٹا لگا دیں گے۔''

دکاندار نے ان دونوں کو اپنے ساتھ لیا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ دکاندار کا گھر بہت شاندار تھا۔ اس کے عظیم الشان پھاٹک پر دو دربان دربانی کر رہے تھے۔ دکاندار نے ان دونوں کو پاس بلا کر سمجھایا۔ ''کبھی چل پھر بھی لیا کرو۔''

دونوں نے گھبرا کر جواب دیا۔ ''بے شک بے شک۔''

دکاندار ان دونوں کو اپنے محل کے اندرونی حصوں میں لے گیا۔ ایک تخت پر خود بیٹھ گیا اور دوسرے تخت پر ان دونوں کو بٹھایا، بولا۔ ''ہاں جناب! اب آپ دونوں ذرا اپنا تعارف بھی کرا دیں۔''

گوت نے جواب دیا۔ ''ہمارا تعارف یہ ہے کہ ہم دونوں ہلاکو خان کے لشکر سے تعلق رکھتے ہیں۔''

دکاندار نے کہا۔ ''یہ تو کوئی تعارف نہ ہوا۔''

درداغ اب تک برداشت کرتا رہا تھا مگر اب بات ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی، دکاندار کو سمجھایا۔ ''بھائی میرے! بات یہ ہے کہ ہلاکو خان اور اس کے لشکر میں اسلام کا چرچا بہت زیادہ ہو رہا ہے۔ ہمارے لشکر میں مسلمان بھی ہیں، ان میں صوفی بھی ہیں اور مست الست رند بھی۔ مسلمان صوفی ہم منگولوں کے روبرو اسلام کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ اس تبلیغ کا یہ اثر ہو چکا ہے کہ ہلاکو خان مسلمان ہونے کو تیار ہے اور اسی مقصد سے وہ بغداد کی طرف چل چکا ہے۔''

دکاندار نے پوچھا۔ ''اور تم دونوں؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ہم دونوں اسلام قبول کرنے میں ہلاکو خان کو پیچھے چھوڑ دینا چاہتے ہیں اسی لیے بغداد میں پہلے آگئے۔''

دکاندار بہت خوش ہوا، بولا۔ ''میں تم دونوں کو بغداد میں دیکھ کر گھبرا گیا تھا کیونکہ یہاں یہ افواہ بھی پھیلی ہوئی ہے کہ منگول بغداد کو برباد کرنے آرہے ہیں اور خلافتِ عباسیہ کا زوال شروع ہو چکا ہے۔''

درداغ نے کہا۔ ''نہیں تو...... ایسی تو کوئی بات نہیں، افواہوں کا کیا، روز پھیلتی رہتی ہیں۔''

دکاندار نے کہا۔ ''آپ دونوں میرے مہمان رہیں اور جب ہلاکو خان آجائے تو اس سے ہماری سفارش فرما دیجیے گا۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ہلاکو خان عام انسانوں سے قطعی مختلف ہے، وہ سفارش وغیرہ کو پسند نہیں کرتا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو ہلاکو خان یا اس کے بیٹوں میں سے کوئی بھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

دکاندار کی جان میں جان آئی، کہنے لگا۔ ''ابھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ یہاں یہ افواہ پھیل گئی کہ ہلاکو خان نے اپنے پوتے کو اس بات پر بہت برا بھلا کہا ہے کہ وہ مسلمان کیوں ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ افواہ بھی پھیلی ہوئی ہے کہ ہلاکو خان نے امیر المومنین کو بہت سخت خط لکھ دیا ہے اور امیر المومنین اس کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں نے بھی یہ سنا تھا اور میں بہت جلد امیر المومنین سے ملاقات کرنے والا ہوں، وہاں میں یہ کوشش کروں گا کہ ہلاکو خان اور امیر المومنین کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کو دور کیا جائے۔''

دکاندار نے حیرت سے پوچھا۔ ''کون؟ تم امیر المومنین سے ملاقات کرنے والے ہو؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں امیر المومنین سے ملنے والا ہوں۔''

دکاندار نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ ''تب پھر تم میرا ایک کام بھی ضرور کر دینا۔''

درداغ دکاندار کی شکل دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو کون

سا کام؟

دکاندار نے کہا۔ ''میرے پڑوسی نے میرا ناک میں دم کررکھا ہے۔ اپنے گھر کی ساری گندگی میرے پھاٹک کے سامنے ڈلوادیتا ہے۔ اس پڑوسی نے چھ سات ماہ پہلے مجھ سے کچھ سامان قرض لیا تھا، میں جب اس کا تقاضا کرتا ہوں تو ہفتہ عشرے پر ٹال دیتا ہے۔ اس ہفتے عشرے میں چھ ماہ گزر گئے۔ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ میری طرف سے امیرالمومنین سے کہنا کہ میری رقم دلوادیں، بخدا میں تمہارا بے حد شکر گزار رہوں گا۔''

درداغ نے ازراہِ مذاق پوچھا۔ ''اور کچھ یا بس؟''

دکاندار نے جواب دیا۔ ''اور امیرالمومنین سے میری طرف سے یہ بھی کہنا کہ دربار کے کئی آدمی میری دکان سے کافی سامان ادھار لے جا چکے ہیں۔ جب میں ان سے اپنی رقم کا تقاضا کرتا ہوں تو وہ مجھے دھمکیاں دینے لگتے ہیں۔ تم امیرالمومنین سے کہنا کہ ایسے لوگوں کو دربار میں نہ گھسنے دیں اور میری رقم دلوادیں۔''

دکاندار جیسے ہی چپ ہوا، درداغ نے ازراہِ مذاق پھر سوال کیا۔ ''اور کچھ یا بس؟''

دکاندار نے کہا۔ ''اور یہ کہ امیرالمومنین کبھی مجھے بھی شرفِ باریابی بخشیں۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں یہ بھی کردوں گا اور کچھ؟''

دکاندار نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت تو بس اتنا ہی یاد آرہا ہے۔ امیرالمومنین کے پاس جانے سے پہلے تم مجھ سے ملتے جانا۔ اس وقت تک میں اور یاد کرلوں گا۔''

گوت کو دکاندار کی باتوں پر غصہ آرہا تھا، جل بھن کر بولا۔ ''کیا تو اسی لیے ہمیں اپنا مہمان بنا رہا ہے؟''

دکاندار گھگیانے لگا، بولا۔ ''نہیں تو ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

گوت نے درداغ سے کہا۔ ''تو اگر اپنی خیریت چاہتا ہے تو یہاں سے اسی وقت بھاگ۔ یہ آدمی ہے یا مصیبت۔''

دکاندار نے گوت کی خوشامد کی۔ ''نہیں بھائی ایسا غضب نہ کرنا۔ میں نے دنوں بعد تم رسا حضرات کو پایا ہے۔ اب اگر تم بھی میرا کام نہیں کرو گے تو کون کرے گا۔''

گوت نے جواب دیا۔ ''میں یہاں اپنے مسائل لے کر آیا ہوں، کسی اور کے کیا کام آؤں گا۔''

لیکن درداغ نے دکاندار کو سہارا دیا۔ ''بہر حال میں اپنی سی کوشش کر دیکھوں گا، آگے اللہ مالک ہے۔''

دکاندار نے ان دونوں کی بڑی خاطر مدارات کی۔

دونوں نے ایک رات دکاندار کے گھر میں بسر کی، دوسرے دن صبح وہ دونوں دکاندار کی مدد سے مدرسۂ مستنصریہ پہنچے کیونکہ استاد شمس الدین کا قیام اسی مدرسے کی ایک عمارت میں تھا۔ درداغ کو یہ سوچ کر بڑا افسوس ہوا کہ اس نے لوگوں سے مدرسۂ مستنصریہ کا پتا کیوں نہ پوچھا کیونکہ مدرسۂ نظامیہ کے بعد اور اس سے اعلیٰ مدرسۂ مستنصریہ دور دور تک شہرت رکھتا تھا۔ یہ مدرسہ خلیفہ عباسی مستعصم باللہ کے باپ خلیفہ مستنصر باللہ نے قائم کیا تھا۔

استاد شمس الدین نے درداغ کو ایک منگول اور دوسرے مقامی آدمی کے ساتھ اپنے سامنے دیکھ کر نہایت غصے سے پوچھا۔ ''یہ تو کہاں چلا گیا تھا؟ مجھے بلاوجہ پریشان کرڈالا۔ میں کل دن بھر اور شام رات گئے تک تیری تلاش میں سرگرداں رہا۔ تو نے حد کردی بے پروائی کی۔''

درداغ نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ''استادِ محترم! میں راستہ بھول گیا تھا۔''

استاد شمس الدین نے گوت اور بغدادی دکاندار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کون ہیں؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''یہ گوت میرا ہم قوم ساتھی ہے، یہ مجھے تلاش کرتا ہوا بغداد چلا آیا۔ اب یہ بھی مسلمان ہونا چاہتا ہے۔'' پھر دکاندار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ صاحب ہم دونوں کے محسن، برتنوں کے بازار کے ایک تاجر ہیں۔ انہوں نے ہمیں اپنے مکان میں ٹھہرایا، میزبانی کی اور اس وقت آپ کے پاس پہنچانے چلے آئے۔''

استاد شمس الدین نے گوت کو خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے دیکھا اور اسے خوش آمدید کہا۔ دکاندار کو تحسین و آفرین کی نظروں سے دیکھتے ہوئے خود بھی شکریہ ادا کیا، کہا۔ ''میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ یہ دونوں اس شہر میں اجنبی ہیں، حق کی تلاش انہیں یہاں کھینچ لائی ہے۔''

دکاندار نے جواب دیا۔ ''جناب! یہ دونوں میری دکان کے سامنے کھڑے بڑی دلچسپ باتیں کررہے تھے۔ میں نے انہیں غیرملکی اور غیر قومی سمجھ کر اپنے گھر میں پناہ دی اور اب......''

استاد شمس الدین نے دکاندار سے اخلاقاً کہا۔ ''امید ہے کہ اب آپ بھی یہاں تشریف لاتے رہیں گے۔''

دکاندار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''جناب!

اب تو آپ مجھے بلائیں یا نہ بلائیں، میں آتا رہوں گا کیونکہ جب سے مجھ کو یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ جوان اپنے امیرالمومنین سے ملاقات کرنے والا ہے، میں نے اس کے سپرد اپنے کئی کام کردیے ہیں۔ جب تک میں اس سے اپنے وہ کام پورے نہیں کرالوں گا، دم نہیں لوں گا۔''

استاد شمس الدین نے درداغ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔''امیرالمومنین سے کون اور کب ملنے جارہا ہے؟''

دکاندار نے درداغ کی طرف اشارہ کردیا۔''یہ اور کون؟''

استاد شمس الدین نے کہا۔''مجھے تو اس قسم کی کسی خبر کا کوئی علم نہیں۔''

درداغ سمجھ گیا کہ استاد شمس الدین خلیفہ سے ملاقات کی خبر کو عام نہیں کرنا چاہتے، چھپا رہے ہیں اس لیے دکاندار سے اپنا منہ چھپالیا۔

دکاندار نے گومگو حالت میں پہلے تو استاد شمس الدین کی طرف دیکھا، اس کے بعد درداغ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''تیرا کیا نام ہے؟''

درداغ نے اپنا نام بتادیا، دکاندار نے کہا۔''درداغ عجیب سا نام ہے تیرا۔ اچھا دو چار دن میں مجھ سے ملنا ضرور، میں تیرا انتظار کروں گا۔''

درداغ نے جواب دیا۔''میں ضرور آؤں گا۔ آپ میرا انتظار کیجیے گا۔''

جب دکاندار چلا گیا تو استاد شمس الدین نے درداغ کو ڈانٹا۔''تو نے اتنی بڑی بات اس غیر ذمے دار اجنبی سے کہہ کیوں دی؟ یہ پیٹ کے ہلکے اور چھچھورے لوگ چند دنوں میں پورے شہر میں یہ خبر پھیلا دیں گے اور جب یہ خبر امیرالمومنین تک پہنچے گی تو وہ ہماری بابت کیا سوچیں گے۔ کیا کہیں گے اور ہمارے خلاف کیسا قدم اٹھائیں گے، ہمیں کچھ پتا نہیں۔''

درداغ نے پشیمانی سے جواب دیا۔''میں شرمندہ ہوں استادِ محترم! مجھے معاف فرما دیجیے۔''

استاد شمس الدین نرم پڑ گئے، بولے۔''میں نہیں چاہتا کہ تو یہاں شرمندگی اٹھائے۔ یہاں کے لوگ بہت شاطر اور عیار ہیں۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہے گی۔''

درداغ نے ایک بار پھر یقین دلانے کی کوشش کی۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ آئندہ میں ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گا۔ اس بار معاف کردیجیے آئندہ خیال رکھوں گا۔''

استاد شمس الدین نے گوت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔''ہاں اب بتا، اپنے ہم قوم دوست کی بابت۔''

درداغ نے جواب دیا۔''استادِ محترم! یہ میرا دوست گوت ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ منگولوں میں اسلام کا بڑا چرچا ہے اور ہم لوگ تیزی سے اسلام کی طرف مائل ہوتے جارہے ہیں چنانچہ میرے دوست گوت نے بھی ہلاکو خان کا ساتھ چھوڑ دیا اور مجھ کو تلاش کرتا ہوا بغداد چلا آیا۔ خوش قسمتی سے یہ بھی مسلمان ہونا چاہتا ہے۔''

استاد شمس الدین نے گوت کو بڑی دلچسپی اور ہمدردانہ نظروں سے دیکھا اور کہا۔''مرحبا میرے دوست! تجھ کو اسلام مبارک ہو۔''

گوت نے آگے بڑھ کر استاد شمس الدین کے ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہا مگر استاد شمس الدین نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور کہا۔''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ لا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں)''

درداغ نے استاد شمس الدین سے درخواست کی۔ ''استادِ محترم! میرے دوست کا ابھی بغداد میں کوئی ٹھکانا نہیں اس لیے اسے بھی آپ کی توجہ درکار ہے۔''

استاد شمس الدین نے جواب دیا۔''فی الحال تو اس کو اپنے پاس ہی رکھ، پھر کوئی دوسرا انتظام بھی ہوجائے گا۔''

درداغ یہی نہیں چاہتا تھا، بولا۔''جیسا آپ کا حکم لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ہم دونوں کا کوئی مستقل انتظام ہونا چاہیے۔''

استاد شمس الدین نے جواب دیا۔''کل تجھ کو میرے ساتھ امیرالمومنین کے پاس چلنا ہے۔ میرا جی تو یہ چاہتا تھا کہ اپنے ساتھ گوت کو بھی لیتا چلوں لیکن اتنی عجلت میں ایسا نہیں ہوسکتا۔''

استاد شمس الدین نے ان دونوں کو پائیں باغ والے دو کمروں کے مکان میں پہنچا دیا۔

گوت نے ان کمروں کا بغور جائزہ لیا۔ درداغ نے کہا۔''دوست! کمرے تو بہت اچھے ہیں۔ تجھ کو استاد کی شکل میں ایک ہمدرد انسان خوب مل گیا ہے۔''

استاد شمس الدین جاچکے تھے۔ درداغ نے ازراہِ احتیاط منگول زبان میں بات شروع کردی، بولا۔''دوست! استاد شمس الدین بہت اچھے آدمی ہیں۔ ان کی نیکیوں اور اچھائیوں کے پیشِ نظر جی نہیں چاہتا کہ انہیں دھوکا دیا جائے، ان سے دھوکا کیا جائے۔''

گوت مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ میں طنز تھا، شرارت تھی، بولا۔''درداغ! خانِ محترم ہلاکو خان کا تیری بابت یہ خیال ہے کہ تو بغداد کی تہذیب اور اسلام کے

ہاتھوں مفتوح ہوجائے گا۔ میں سوچتا ہوں خانِ محترم نے کتنی سچی بات کہی تھی۔''

دروداغ نے گھبرا کر جواب دیا۔ ''گوت! ایسی کوئی بات نہیں...... تُو نے میری بات کا مفہوم نہیں سمجھا۔''

گوت نے جواب دیا۔ ''میں تو بس ایک ہی بات جانتا ہوں دروداغ...... ہمیں بغداد میں یہاں کے عام اور خاص آدمی کے ذہن میں بس ایک ہی بات بٹھانا ہے، وہ یہ کہ منگول تیزی سے اسلام کی طرف مائل ہورہے ہیں اور ہلاکو خان بھی مسلمان ہونا چاہتا ہے اور وہ بغداد میں محض اس لیے آرہا ہے کہ امیرالمومنین کے دستِ حق پر اسلام قبول کرے۔ اگر ہم لوگ اس افواہ کو یقین کی حد تک پھیلانے میں کامیاب ہوگئے تو خلیفہ ہماری طرف سے غافل اور مطمئن ہوکر رنگ رلیوں اور عیش وعشرت میں مشغول ہوجائے گا اور بغداد کو فتح کرنے میں خانِ محترم ہلاکو خان کو آسانی ہوجائے گی۔''

دروداغ کا دل رو رہا تھا، اس کو بڑا دکھ ہورہا تھا مگر وہ بے بس اور مجبور تھا۔ علی الصباح جب دروداغ سو کر اٹھا تو اس نے دیکھا، گوت گہری نیند سویا ہوا ہے اور اس کے خراٹے کمرے کے باہر بھی سنے جاسکتے ہیں۔ وہ اپنے بستر سے نکل کر باہر چلا گیا۔ یہاں سے اس نے علیہ کی کھڑکی کی طرف دیکھا، وہ کھلی ہوئی تھی اور شاید اس میں علیہ موجود بھی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا علیہ کے کمرے کے در پر پہنچ گیا، اس نے آہستہ آہستہ کئی بار دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور اندر سے ایک عورت نمودار ہوئی۔ اس نے دروداغ کو پہچان لیا اور اندر واپس چلی گئی، کچھ دیر بعد پھر واپس آئی اور دروداغ کو اندر بلا کر لے گئی۔

دروداغ بہت پریشان تھا، بولا۔ ''میں خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔''

عورت نے جواب دیا۔ ''بیگم صاحبہ فرما رہی ہیں کہ اندر آجائیں۔''

دروداغ نے چونک کر پوچھا۔ ''اندر آجاؤں؟ کیا تجھ کو واقعی یہ حکم دیا گیا ہے کہ مجھے اندر لے جائے؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''میں سچ عرض کررہی ہوں۔''

دروداغ کو اندر جانے میں پس وپیش تھا، بولا۔ ''میں اندر نہیں آؤں گا کیونکہ اس طرح میں استاد شمس الدین کے دل سے اپنا اعتماد ضائع کردوں گا۔''

اتنے میں علیہ خود دروازے پر آگئی، بولی۔ ''فضول باتوں میں وقت کیوں ضائع کررہا ہے تو...... اندر آجا، استاد شمس الدین کو میں سمجھالوں گی۔ تو...... فکر کیوں کرتا ہے۔''

دروداغ ہمت کرکے اندر چلا گیا۔ وہاں اس کو جس کمرے میں بٹھایا گیا تھا، اس میں بہت کم سامان رکھا گیا تھا۔ ایک چوکی جس پر جائے نماز بچھی تھی مگر اس کا اگلا ایک کونا الٹا ہوا تھا۔ ایک تسبیح جو جائے نماز کے بیچ میں رکھی تھی۔ کمرے کے سفید فرش پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ چاروں کونوں پر منقش لکڑی کی چھوٹی چھوٹی میزیں رکھی تھیں اور ان میزوں پر گلدان رکھے تھے۔ ان کے تازہ پھول یہ بتا رہے تھے کہ انہیں ہر روز علی الصباح بدل دیا جاتا ہے۔ چوکی کے آگے ایک آبنوسی میز پر قرآن پاک رکھا تھا۔

دروداغ فرش پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ علیہ اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی، اس نے خادمہ سے کہا۔ ''دیکھ، اگر استاد شمس الدین تشریف لائیں تو انہیں بھی یہیں لے آنا۔ ان سے بھی چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

دروداغ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''استاد شمس الدین کو آپ یہاں اس کمرے میں بلا رہی ہیں؟ کیا ان کے یہاں آنے کا امکان ہے؟''

علیہ نے جواب دیا۔ ''آنے کا امکان ہے بھی اور نہیں بھی۔ یہ بات میں نے اس لیے کہی کہ میری خادمہ کو اس بات کا احساس ہوجائے کہ میں نے تجھ کو اس کمرے میں بٹھا کر کوئی ایسا اخلاقی جرم نہیں کیا جس سے استاد شمس الدین کی نظر میں حقیر ٹھہروں۔''

دروداغ نے پوچھا۔ ''کیا استاد شمس الدین کو میرے یہاں آنے پر کوئی اعتراض نہیں؟''

علیہ نے ہنس کر جواب دیا۔ ''نہیں، استاد کو کوئی اعتراض نہیں کیونکہ انہیں تجھ پر اعتماد ہے۔''

دروداغ نے افسوس کیا۔ ''تب پھر میں بہت متاسف ہوں کہ میں آپ سے بلاوجہ لڑتا جھگڑتا رہا۔''

علیہ نے پوچھا۔ ''اچھا یہ بتا کہ یہ تیرے ساتھ اور کون آیا ہے؟''

دروداغ نے جواب دیا۔ ''میرا ہم قوم، میرا دوست گوت۔ وہ بھی اسلام سے اتنا ہی متاثر ہے جتنا خود میں۔ وہ بھی مسلمان ہوجانا چاہتا ہے اور بغداد والوں کو یہ بتانے آیا ہے کہ ہم منگولوں میں اسلام بہت زیادہ مقبول ہوتا جارہا ہے اور وہ دن زیادہ دور نہیں جب سارے ہی منگول مسلمان ہوجائیں گے۔''

علیہ نے دروداغ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور پوچھا۔ ''اچھا ایک بات تو بتا۔''

درداغ نے کہا۔ ”پوچھیے۔“

علیہ نے کہا۔ ”مگر ایک شرط ہے...... میرے سوال، میری بات کا جواب بھی کھرا اور سچا ہونا چاہیے۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”وعدہ...... میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی ہر بات کا سیدھا سچا جواب دوں گا۔“

علیہ نے پوچھا۔ ”یہ منگول اسلام پر ایک دم کس طرح مائل ہو گئے؟ اور یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ منگولوں کی پوری قوم اسلام پر مائل ہے مگر اسلام قبول کرنے والوں میں صرف دو آدمی ہی نظر آتے ہیں۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہے؟“

درداغ گھبرا گیا، بولا۔ ”یہ آپ کا واہمہ ہے، ورنہ کئی اور آنے والے ہیں اور ایک دن آپ خود بھی دیکھ لیں گی کہ اسلام کا جادو کس طرح سر چڑھ کے بولتا ہے۔“

علیہ خوشی سے کھڑی ہو گئی، بولی۔ ”اگر تیری باتوں میں سچائی ہے، حقیقت ہے تو میں تیری قدر کروں گی۔“

درداغ نے کہا۔ ”اب میرے ساتھ گوت کی معیت ہو گئی ہے جب تک یہ یہاں میرے پاس موجود ہے، آپ سر راہے گاہے بھی مجھے مخاطب نہ کیجیے گا۔“

علیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ سر راہے گاہے ملاقات کیسی ہوتی ہے؟ شاید میری تیری ایسی کوئی ملاقات ایک بار بھی نہیں ہوئی۔“

درداغ بھی ہنسنے لگا، بولا۔ ”میں نے یہ بات اس لیے کہی کہ میرا دوست گوت کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔“

علیہ نے جواب دیا۔ ”مجھ کو تیرے دوست سے کیا غرض، اس کو میری طرف سے منع کر دینا کہ اگر کہیں آمنا سامنا بھی ہو جائے تو وہ مجھ سے مخاطب ہونے کی جسارت نہ کرے کیونکہ میں ہر شخص کو منہ لگانا پسند نہیں کرتی۔“

دردداغ وہاں کچھ دیر اور رکا، علیہ نے کہا۔ ”میں گوت کی موجودگی میں کھڑکی کی طرف نہیں جاؤں گی، اس لیے تجھے جب بھی مجھ سے ملنا ہو، میرے پاس چلا آیا کر۔ میں تیرا انتظار کروں گی۔“

علیہ کی باتوں کے آخری فقرے نے دردداغ کا حوصلہ بڑھا دیا تھا اور وہ بھی اپنے آپ کو خوش قسمتوں میں شمار کرنے لگا۔ جب وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا تو اس نے گوت کو باہر اپنے انتظار میں کھڑا دیکھا، بولا۔ ”دردداغ! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس وقت تم کہاں چلے گئے تھے؟“

دردداغ نے ترشی سے جواب دیا۔ ”ہاں میں ایک ضروری کام سے چلا گیا تھا، کہاں گیا تھا؟ یہ میری ذات سے متعلق سوال ہے۔ میں اس کا جواب نہیں دیتا کیونکہ اس کا جواب......“

گوت نے اس کی بات کاٹ دی، بولا۔ ”یہاں ہم دونوں کی ذات کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہاں چند دنوں میں تو نے اتنا اثر رسوخ پیدا کر لیا ہے میں تو حیران ہوں۔“ پھر گوت نے علیہ کے کمرے کی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”دوست دردداغ! اس میں کون رہتا ہے؟ اس کھڑکی کے پیچھے۔ پائیں باغ سے ملحقہ عمارت میں؟“

دردداغ نے جواب دیا۔ ”گوت! ہم دونوں استاد شمس الدین کے مہمان ہیں۔ ہمیں اپنے کام سے کام رکھنا ہوگا۔ یہ جگہ مدرسۂ مستنصریہ کی ہے اور یہ حصہ استاد شمس الدین کو ملا ہوا ہے چنانچہ اس عمارت میں استاد ہی کا کوئی عزیز رشتے دار رہتا ہوگا۔“

گوت نے کہا۔ ”اس کا یہ مطلب ہوا کہ استاد شمس الدین سے تیری بھی رشتے داری ہو گئی ہے جبھی تو، تو اس عمارت میں بے تکلفی سے آتا جاتا رہتا ہے۔“

دردداغ نے برہمی سے کہا۔ ”دیکھ گوت! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑ جائے۔ میں اپنے محسن کی شان میں تیری گستاخیاں مزید نہیں برداشت کر سکتا۔“

گوت نے بھی برہمی سے زور زور سے پاؤں پٹخے، بولا۔ ”اور میں خود بھی تیری دوغلی اور دو رخی باتیں نہیں برداشت کر سکتا۔ ہم دونوں یہاں جس مقصد سے آئے ہیں، اسے پورا ہونا چاہیے۔ ہم نے بھی خانِ محترم ہلاکو خان کا نمک کھایا ہے۔ وہ ہمارا محسن ہے، میں بھی اپنے محسن کی شان میں تیری گستاخیاں برداشت نہیں کر سکتا۔“

دردداغ نے پوچھا۔ ”آخر تو چاہتا کیا ہے؟“

گوت نے جواب دیا۔ ”دردداغ! مجھے نہیں معلوم کہ اس کھڑکی کے اس پار کون رہتا ہے لیکن اندازہ یہی بتاتا ہے کہ وہاں کوئی حسین لڑکی یا عورت رہتی ہوگی اگر میرا اندازہ درست ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تو اس سے اچھی طرح واقف ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس میں میرا حصہ بھی ہونا چاہیے۔ وہ لڑکی یا عورت ہم دونوں کی مشترکہ ہونا چاہیے۔“

دردداغ گوت سے عاجز آچکا تھا، بولا۔ ”گوت! وہ لوگ مسلمان ہیں، یہاں اس طرح سوچنا درست نہیں ہے اور جو چیز میری نہ ہو، میں اس میں تیرا حصہ کس طرح مقرر کر سکتا ہوں۔“

گوت مسکرا رہا تھا، بولا۔ ”پھر ایسا کرو کہ تم بیچ سے

نکل جاؤ۔ میں اس لڑکی یا عورت سے خود رابطہ قائم کرلوں گا اور مجھے وہاں سے جو کچھ بھی ملے گا، میں اس میں تم کو بھی شریک کرلوں گا، نصفا نصف، آدھا آدھا۔''

درداغ نے گوت سے کنارہ کشی اختیار کرلی، بولا۔ ''تیری سمجھ میں جو آئے کر۔ میں تو چلا۔ مجھ کو جو کچھ بھی کرنا ہے، میں تنہا کروں گا۔''

گوت نے دوڑ کر اسے روک لیا، بولا۔ ''کہاں چلے؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم مجھ کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ گے۔ میں تم کو جانے ہی کب دوں گا۔ بات معاملے کی کرو۔ معاملہ طے کرو پھر جہاں چاہو چلے جاؤ۔''

درداغ اس مصیبت سے عاجز آچکا تھا، اس نے سوچا کہ کیوں نہ یہ ساری باتیں استاد شمس الدین کے گوش گزار کردی جائیں۔ پھر یہ سوچ کر سہم گیا کہ اس طرح وہ خود بھی ذلیل اور رسوا ہوجائے گا اور جب ہلاکو خان کو ان دونوں کی بابت یہ سب معلوم ہوگا تو وہ ان دونوں کو روئے زمین پر کہیں بھی نہ چھوڑے گا۔

درداغ نے گوت سے درخواست کی، بولا۔ ''میرے دوست! میرے پیشِ نظر اس وقت خلیفہ سے ملاقات ہے۔ میں وہاں تھوڑی دیر میں چلا جاؤں گا، تو اتنی دیر میں یہ فیصلہ کس طرح کرے گا کہ وہ یعنی کھڑکی کے اس پار جو کچھ بھی ہے تیرا اس سے تعارف اور رابطہ ہونا چاہیے؟''

گوت نے جواب دیا۔ ''درداغ! میں جو کچھ بھی کہوں، اس پر غور کرنا، مطلب واضح ہوجائے گا۔ میں دشمن کے شہر میں مقیم ہوں، یہاں کی ہر چیز میری اپنی ہے۔ کم از کم میں خود تو اسی طرح سوچتا ہوں۔''

درداغ نے بے بسی سے جواب دیا۔ ''جس طرح چاہو سوچو لیکن جب تک میں امیر المومنین سے مل کر واپس نہ آجاؤں تو یہیں رہے گا۔''

گوت نے کہا۔ ''میں نے بات مان لی، جا امیر المومنین سے مل کر واپس آجا۔''

درداغ نے دربار جانے کی تیاری کی، صاف لباس پہنا اور استاد شمس الدین کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

استاد شمس الدین نے درداغ کو ساتھ لیا اور خلیفہ کے قصر کی طرف روانہ ہوگئے۔ استاد شمس الدین نے راستے میں درداغ کو سمجھایا۔ ''دیکھ امیر المومنین تجھ سے بہت سارے سوالات کریں گے، ان سارے سوالوں میں ایک ہی روح کارفرما ہوگی۔ امیر المومنین منگولوں کی طرف سے بہت فکر مند اور خوفزدہ رہتے ہیں۔ تیرا کام یہ ہے کہ تو جو کچھ ہلاکو خان اور منگولوں کی بابت جانتا ہے، سب کچھ امیر المومنین کو بتا دینا۔''

درداغ نے اس کا وعدہ کرلیا۔ ان دنوں خلیفہ قصرِ خلد میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ دونوں جب قصرِ خلد کے ابتدائی حصے میں داخل ہوئے تو انہیں روک لیا گیا۔ ان سے مختلف قسم کے سوالات کیے گئے۔ انہوں نے ہر سوال کا نہایت موزوں اور مدلل جواب دیا۔ خلیفہ کے حاجب نے ان دونوں کی طرف سے مطمئن ہوجانے کے بعد انہیں خلیفہ کی خدمت میں پیش کردیا۔ اس وقت خلیفہ ترنم پیشہ خواتین میں گھرا بیٹھا تھا۔ اس نے ان دونوں کو بھی اپنے جام کی گردش میں شریک کرلینا چاہا لیکن ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی خود کو اس سعادت سے بہرہ ور کرنے کی کوشش نہیں کی پھر خلیفہ نے درداغ کو دل میں اتر جانے والی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ ''استاد شمس الدین! وہ منگول جس کا آپ نے ذکر کیا تھا کیا یہی نوجوان ہے؟''

استاد شمس الدین نے عرض کیا۔ ''جی بندہ پرور!''

خلیفہ نے ''ہوں'' کہہ کر ایک بار پھر درداغ کو غور سے دیکھا، خلیفہ کی مغنیائیں اس منگول کو ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھیں گویا وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہو۔ خلیفہ نے اشارہ کیا اور محفل راگ رنگ برخاست کردی گئی۔ اب خلیفہ درداغ کی طرف متوجہ ہوا، پوچھا۔ ''جب تو ہلاکو خان کے لشکر سے جدا ہوا، ہلاکو خان کے کیا ارادے تھے؟''

درداغ نے اپنی نظریں نیچی کر رکھی تھیں، اس نے جواب دیا۔ ''ہلاکو کے ارادوں کا کسی کو بھی پتا نہیں چلتا لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ اسلام سے بے حد متاثر ہے اور اپنے تایا زاد بھائی ..... کی طرح وہ بھی مسلمان ہونا چاہتا ہے اور اسی غرض سے وہ بغداد آنا چاہتا ہے۔''

خلیفہ نے کہا۔ ''مگر وہ اسلام قبول کرنے کے لیے بغداد کیوں آنا چاہتا ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''اس سلسلے میں صرف اتنا ہی عرض کرسکتا ہوں کہ ہلاکو خان نے ایک دن کسی مسلمان عالم سے پوچھا تھا کہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا مسلمان کون ہے؟ تو عالم نے جواب دیا کہ خلیفۃ المسلمین۔ بس اس کے بعد ہی ہلاکو خان نے بغداد آنے کا ارادہ کرلیا۔''

خلیفہ نے کہا۔ ''اگر خدا نے ہلاکو خان کے دل میں دینِ اسلام کی شمع روشن کردی ہے تو یہ ہم سب کی بڑی خوش قسمتی ہے۔ میں حیران ہوں کہ اگر ہلاکو خان مسلمان ہی

ہونا چاہتا ہے تو پھر اس نے ہمیں دھمکی آمیز خط کیوں لکھا ہے؟ اس نے اپنے خط میں بغداد کے دروازے کھول دینے کی درخواست نہیں کی، دھمکی دی ہے۔ آخر یہ کیوں؟ ایسا کیوں؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''اس کا صحیح جواب تو ہلاکو خان ہی کے پاس ہوگا مگر میں یہ کہوں گا کہ خط میں دھمکی نہیں دی گئی ہوگی، درخواست کی گئی ہوگی لیکن امیر المومنین کو اس میں دھمکی کا شائبہ نظر آتا ہوگا۔''

خلیفہ نے استاد شمس الدین سے پوچھا۔ ''استادِ محترم! آپ کا کیا خیال ہے؟''

استاد شمس الدین نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے درداغ صحیح کہہ رہا ہے۔''

خلیفہ نے پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ ہلاکو خان کی بیوی دوقوز مسیحی ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''آپ نے صحیح سنا ہے، دوقوز مسیحی ہے۔''

خلیفہ نے پوچھا۔ ''پھر ہلاکو مسیحیت کی طرف کیوں نہیں راغب ہوا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین! ہلاکو خان کے دل و دماغ پر عورتیں نہیں، خود اس کی اپنی حکومت ہے۔''

خلیفہ نے کہا۔ ''میں نے یہ بھی سنا ہے کہ دوقوز کے ساتھ اس کا اپنا چوبی چیپل بھی سفر کرتا رہتا ہے اور دوقوز نسطوری پادریوں اور عیسائیوں میں گھری رہتی ہے۔ کیا یہ سب بھی ہلاکو پر اثر انداز نہیں ہو رہے ہیں؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''اور آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہلاکو کے لشکر میں مسلمان بھی بہ کثرت ہیں۔''

خلیفہ نے ذرا غور و فکر کے بعد ایک نیا سوال کر دیا۔

''یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ مسیحی اور ہلاکو کی بیوی دوقوز شب و روز اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ منگول عساکر کو یروشلم کی آزادی کے لیے کام میں لایا جائے۔ مسیحی ہر قیمت پر یروشلم کو ہمارے اقتدار سے نکالنا چاہتے ہیں۔ کیا ہلاکو خان دوقوز اور مسیحی آوازوں پر ہمیشہ اپنے کان بند کیے رہے گا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں نے امیر المومنین کو بتا جو دیا کہ ہلاکو کے دل و دماغ آزاد ہیں۔''

خلیفہ لاجواب ہو چکا تھا۔ اسی وقت خلیفہ کو مطلع کیا گیا کہ وزیر ابنِ علقمی باریابی کے طالب ہیں۔ خلیفہ نے حاضری کی اجازت دے دی۔ وزیر نے اندر آتے ہی خلیفہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور پھر استاد شمس الدین اور درداغ کی طرف دیکھا۔

خلیفہ نے درداغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ابنِ علقمی! یہ ہے وہ منگول جو مسلمان ہونے کے لیے طول طویل فاصلہ طے کر کے یہاں تک آیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ منگولوں میں اسلام بہت زیادہ اثر انداز ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ خود ہلاکو خان بھی مسلمان ہونا چاہتا ہے۔''

ابنِ علقمی نے کہا۔ ''امیر المومنین! یہ عاجز تو پہلے ہی عرض کر چکا ہے کہ ہلاکو خان اور منگولوں سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم نے ان کے مقابلے کے لیے جتنی فوج اکٹھا کر رکھی ہے، وہ بے جا اسراف ہے، ایک قسم کا۔ میری ناچیز رائے میں ہمیں اپنی فوج کو کم کر دینا چاہیے اور اس صورت میں جو بچت ہو، اسے منگولوں کی مہمان نوازی اور تالیف قلب پر خرچ کر دینا چاہیے۔''

خلیفہ نے ابنِ علقمی کو اجازت دے دی۔ ''تو جتنی فوج کم کرنا چاہے، کم کر دے کیونکہ آج اس منگول نے یہ یقین دلا دیا ہے کہ ہلاکو خان ہم پر فوج کشی نہیں کرنا چاہتا۔ ادھر سے اطمینان ہو جانے کے بعد فوج پر فضول خرچ کرنا بے جا اسراف نہیں تو اور کیا ہے۔''

استاد شمس الدین نے عرض کیا۔ ''امیر المومنین کے علم میں یہ بات لانا ضروری ہے کہ گوت نامی ایک اور منگول بھی میرے پاس آچکا ہے، وہ بھی مسلمان ہو جانا چاہتا ہے۔''

خلیفہ کے چہرے پر بشاشت اور اطمینان نے ابنِ علقمی کو بشاش کر دیا، بولا۔ ''امیر المومنین کے حکم پر عمل کیا جائے گا۔''

خلیفہ نے ان دونوں کی خشک میوے سے تواضع کی اور انعام و اکرام سے نوازا۔ استاد شمس الدین کو ایک خلعت اور طیلسان عطا کی۔ ان کے علاوہ ایک تھیلی دینار کی بھی عطا کی۔ درداغ کو بھی ایک خلعت، دو تھیلیاں دینار کی اور ایک گھوڑا عطا ہوا۔

جب درداغ اور استاد شمس الدین واپس جانے لگے تو ابنِ علقمی ان دونوں کو کچھ دور چھوڑنے گیا۔ اس وقت اس نے ان دونوں سے کہا۔ ''آپ دونوں قصر کے باہر میرا انتظار کر لیجیے گا، مجھے آپ دونوں سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

خلیفہ نے پوچھا۔ ''ابنِ علقمی! وہ کس قسم کی باتیں ہیں جو تو سب کے سامنے نہیں کر سکتا۔''

ابنِ علقمی نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین نے تو

نہایت سادگی سے اس منگول کی باتوں پر یقین کر لیا لیکن میں اس سے جرح بحث کر کے یہ جاننا چاہوں گا کہ اس نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے اس میں سچائی کتنی اور جھوٹ کتنا ہے۔ اس کے بعد میں کسی نتیجے پر پہنچوں گا۔''

خلیفہ ابن علقمی کی باتوں سے بہت خوش ہوا، بولا۔ ''ابنِ علقمی کتنی عقل کی باتیں کرتا ہے۔ میں نے اس کو جو عزت اور مقام دے رکھا ہے، وہ غلط نہیں ہے۔ ابن علقمی اس کا مستحق ہے۔''

جب یہ دونوں شاہی قصر سے باہر نکلے تو ابن علقمی نے ان دونوں کو روک لیا۔ استاد شمس الدین کو خلیفہ یا اُس کے وزیر نے آج تک نہیں روکا تھا۔ استاد شمس الدین کو وزیر کی یہ بات بہت بری لگی، پوچھا۔ ''وزیر محترم! میرا خیال ہے کہ اس شخص درداغ سے جو کچھ پوچھنا تھا پوچھ لیا، اب اس کو اور تنگ کرنا بری بات ہے۔''

ابن علقمی نے بے رخی سے کہا۔ ''آپ پڑھانے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں لیکن میں خلافت عباسیہ کا ایک ذمے دار شخص ہوں۔ میں اس منگول سے تخلیے میں چند ضروری سوال کروں گا، اس کے بعد میں یہ فیصلہ کروں گا کہ اس شخص کی باتوں پر یقین کیا جائے یا نہیں۔''

استاد شمس الدین وزیر کے ناخوش گوار تیور دیکھ کر سہم گئے۔ وہ سیدھے سادے مصلحت اندیش انسان تھے۔ انہیں اپنی ملازمت خطرے میں محسوس ہوئی، بڑی عاجزی سے کہا۔ ''وزیر محترم! میں تو یہ چاہتا ہوں کہ یہ شخص جو دور دراز سے اسلام کی محبت میں بغداد چلا آیا ہے، خوانخواہ کی پریشانی نہ اٹھائے۔ آپ اس سے سوالات کریں مگر زیادہ وقت نہ لیں، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔''

ابن علقمی نے بے رخی سے جواب دیا۔ ''آپ کو کیا پتا کہ حکومت اور سیاست کیا ہوتی ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ یہ شخص ہلاکو خان کا جاسوس ہے اور یہاں کسی خاص مقصد سے بھیجا گیا ہے۔ جب تک میں خود مطمئن نہ ہو جاؤں، امیر المومنین کو کس طرح مطمئن کر سکتا ہوں؟''

استاد شمس الدین ڈر کر ایک طرف ہو گئے۔ ابنِ علقمی درداغ کو قصر کے ایک حصے میں لے گیا۔ یہاں تخلیہ میں ابن علقمی نے درداغ سے پوچھا۔ ''نوجوان منگول! سچ بتا تو بغداد کس مقصد سے آیا ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں اپنا مقصد بیان کر چکا ہوں۔''

ابن علقمی نے کہا۔ ''لیکن اگر میں یہ کہوں کہ تو اس مقصد سے نہیں آیا جو تو نے بیان کیا ہے، پھر؟''

درداغ نے اصرار کیا۔ ''لیکن میرا وہی مقصد ہے جو بیان کیا ہے۔''

ابن علقمی نے درداغ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ''کیا یہ درست نہیں ہے کہ تجھ کو ہلاکو خان نے بطورِ خاص یہاں بھیجا ہے؟ ہلاکو چاہتا ہے کہ تم لوگ کسی طرح خلیفہ کو یہ یقین دلا دو کہ اس پر منگولوں کی طرف سے حملہ نہیں ہوگا اور یہ کہ منگولوں اور ہلاکو خان پر اسلام تیزی سے اثر انداز ہوتا جا رہا ہے۔''

اب درداغ چور بن چکا تھا، ابن علقمی نے کہا۔ ''تو سب کو بے وقوف بنا سکتا ہے لیکن مجھے نہیں۔ میں نے تجھ کو بھی پہچان لیا ہے اور تیرے ساتھی گوت کو بھی۔ اب بتا تو کیا چاہتا ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں اب کیا عرض کروں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ جو کچھ میں کہتا ہوں، وزیر اس پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔''

ابن علقمی نے ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ ''تجھ کو بار بار یہی کہنا ہے کہ تجھے اسلام کی محبت دور دراز علاقوں سے کھینچ لائی ہے اور تجھ کو یہ بھی کہنا ہے کہ ہلاکو خان اور اس کی قوم مسلمان ہونے کو تیار ہے۔ تجھ کو ہر شخص کے سوالات کا یہی جواب دینا ہے۔ سمجھا میری بات یا نہیں؟''

درداغ چکرا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ابن علقمی کس قسم کی باتیں کر رہا ہے اور اس سے اس کا مقصد کیا ہے؟

ابن علقمی نے ایک بار پھر درداغ کو سمجھایا۔ ''پریشان نہ ہو میرے دوست! میں بھی ہلاکو خان کا دوست ہوں۔ جو ہلاکو خان کا دوست وہ میرا دوست اور جو میرا دوست وہ ہلاکو خان کا دوست۔'' پھر بطورِ خاص سرگوشی میں کہا۔ ''درداغ! ہلاکو خان نے تیری بابت مجھے مطلع کر دیا ہے۔ ہم پر کسی کی کوئی بات بھی چھپی ہوئی نہیں ہے اور خبردار جو آئندہ......''

درداغ روہانسا ہو گیا، بولا۔ ''جب آپ سب کچھ جانتے ہیں تو مجھے کیوں تنگ کر رہے ہیں؟''

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ''صرف اس لیے کہ امیر المومنین اور اس کے سادہ لوح بہی خواہوں کو بے وقوف بنایا جائے۔''

کچھ دیر بعد ابن علقمی نے درداغ کو یہ کہہ کر استاد شمس الدین کے حوالے کر دیا۔ ''یہ شخص سچا ہے اور اس نے جو کچھ کہا، صد فیصد سچ ہے۔ اس پر یقین کر لینا چاہیے۔''

استاد شمس الدین نے ناگواری سے کہا۔ ''کیا وزیر

نے اس کی سچائی کا امتحان لے لیا ہے؟''

ابن علقمی نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے اس کا امتحان لے لیا ہے۔ یہ اپنے امتحان میں پورا اترا ہے۔ بحمد اللہ خوب۔''

استاد شمس الدین درداغ کو اپنے ساتھ لے گئے اور ابن علقمی خلیفہ کو سمجھانے چلا گیا۔

☆☆☆

درداغ اپنے کمرے میں پہنچا تو گوت کو سوتا ہوا پایا۔ درداغ کی طبیعت قابو میں نہیں تھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اس سے نہ تو خوش تھا اور نہ ہی مطمئن۔ اس کو خلیفہ کی سادہ لوحی اور استاد شمس الدین کے بھولپن پر رونا آرہا تھا۔ کئی دن بعد اس کے سننے میں آیا کہ ابن علقمی نے پچھتر فیصد فوج میں کمی کر دی ہے۔

درداغ اور گوت نے استاد شمس الدین کی مہمان نوازی سے خوب خوب فائدہ اٹھایا لیکن درداغ نے استاد شمس الدین کو سمجھایا کہ وہ گوت کو الگ کر دیں کیونکہ اگر گوت اس گھر میں رہا تو کوئی نہ کوئی ہنگامہ ضرور اٹھ کھڑا ہوگا۔

اسی دوران میں دکاندار بھی آ گیا۔ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ درداغ امیر المومنین سے ملاقات کر چکا ہے، اس نے آتے ہی پوچھا۔ ''کیا تم نے امیر المومنین سے میری بابت پوچھا تھا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ میں امیر المومنین سے تیرے مسائل پر بات چیت نہیں کر سکا۔''

دکاندار نے اپنی پیشانی پکڑ لی۔ ''احسان فراموش! کیا یہ بدلہ دیا ہے تو نے میری رحم دلی، خوش اخلاقی اور انسانی سلوک کا۔''

درداغ نے کہا۔ ''افسوس کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اپنے سلوک اور احسان کا یوں چرچا کریں گے۔''

دکاندار نے پوچھا۔ ''اب کیا ہوگا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''اب ہوگا یہ کہ جب میں دوبارہ امیر المومنین کے پاس جاؤں گا تو آپ کی سفارش کر دوں گا۔''

دکاندار نے پوچھا۔ ''وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ دوبارہ کب تک جانا ہوگا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''کچھ پتا نہیں۔''

دکاندار کچھ دیر سوچتا رہا، پھر نہایت خوش اخلاقی سے کہا۔ ''لیکن جناب! اب دوبارہ ملاقات کے موقع پر نہ بھول جایئے گا۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''اب ایسی غلطی نہیں ہوگی۔''

دکاندار نے کہا۔ ''میری ایک گزارش ہے کسی وقت فرصت ہو تو میری دکان پر تشریف لے آئیں یا پھر گھر پر آ جائیں۔ وہیں عرض کروں گا۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں گھر پر آ جاؤں گا، کل یا پرسوں شام کو۔''

دکاندار نے کہا۔ ''بڑی مہربانی ہوگی۔ پھر وہیں بات ہو جائے گی ہم دونوں کی۔'' جاتے جاتے وہ بولا۔ ''اور ہاں اپنے دوسرے ساتھی کو اگر اپنے ساتھ نہ لاؤ تو بہتر ہے، مجھے وہ اچھا نہیں لگتا۔''

گوت نے اس کی آواز سن لی، دور ہی سے بولا۔ ''میں اچھا نہیں ہوں یعنی تو اچھا ہے۔ میں اس کے ساتھ ضرور آؤں گا۔ یہ تنہا کبھی نہیں آئے گا۔''

استاد شمس الدین نے دور سے دکاندار کو دیکھا تو اس کے پاس پہنچے اور پوچھا۔ ''خیریت تو ہے، اب کیسے آنا ہوا؟''

دکاندار نے اپنا رونا رو دیا۔ ''جناب! آپ کے مہمان نے تو میرے کیے کرائے پر پانی ہی پھیر دیا۔ یہ امیر المومنین سے مل بھی آیا اور میری سفارش نہیں کی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ کوئی کسی پر کس طرح اور کیوں احسان کرے؟''

استاد شمس الدین نے جواب دیا۔ ''جناب! آپ خود غور فرمائیں کہ درداغ اتنی معمولی سی سفارش اپنی اتنی اہم ملاقات میں کیونکر کرتا۔''

دکاندار نے حیرت سے اپنی دونوں آنکھیں کھول دیں، پوچھا۔ ''معمولی سی سفارش! یعنی یہ آپ کہہ کیا رہے ہیں؟''

استاد شمس الدین نے جواب دیا۔ ''میں نے جو کچھ کہا ہے درست کہا ہے۔ آپ کو اپنا مسئلہ خود سلجھانا چاہیے۔ اگر اس کو امیر المومنین تک پہنچانا ہی ہے تو خود پہنچ جایئے اس کو لے کر۔''

دکاندار استاد شمس الدین سے ناراض ہو گیا، بولا۔ ''تیری سمجھ میں میری باتیں نہیں آئیں گی۔ دیکھا جائے گا، دیکھ لوں گا۔''

وہ پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔ اس کی باتوں نے گوت کو سب سے زیادہ محظوظ کیا، بولا۔ ''افسوس کہ میں یہاں عارضی طور پر آیا ہوں، اگر کچھ اور رہنے کا ارادہ ہوتا تو اس دکاندار سے لطف اٹھاتا۔''

استاد شمس الدین نے دونوں کو سمجھایا کہ وہ بغداد میں کسی سے ربط ضبط نہ بڑھائیں کیونکہ یہ چھچھورے آدمی کسی وقت بھی ذلیل کر سکتے ہیں یا پھر نقصان پہنچا سکتے ہیں پھر استاد شمس الدین نے گوت کو اپنا یہ فیصلہ سنا دیا کہ اس کو بھی ابن علقمی سے ملنا ہے کیونکہ وزیر کو اس وقت تک کسی پر اعتبار نہیں آئے گا جب تک کہ وہ خود سوال جواب کے بعد مطمئن نہ ہو جائے۔ بات معقول تھی، گوت اسی وقت وزیر کے گھر جانے پر آمادہ ہو گیا۔

استاد شمس الدین نے گوت کو اپنے ایک سمجھ دار شاگرد کے ساتھ ابن علقمی کے گھر روانہ کر دیا۔ درداغ نے موقع پاتے ہی استاد شمس الدین کو سمجھانے کی کوشش کی، بولا۔ ”استادِ محترم! آپ میری ایک بات مانیں، گوت کو یہاں میرے پاس نہ ٹھہرائیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

استاد شمس الدین نے پوچھا۔ ”کیا کوئی خاص بات ہو گئی ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”جی ہاں، خاص بات ہی ہو گئی ہے، اسی لیے میں یہ درخواست کر رہا ہوں۔“

استاد شمس الدین بھی خاصے فکر مند تھے، بولے۔ ”درداغ! معلوم نہیں کیوں، ادھر میں خود بھی خاصا فکر مند ہوتا جا رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے، کیا ہونے والا ہے پتا نہیں۔“

درداغ نے کہا۔ ”خود میرے دل کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے۔ آپ گوت کو کہیں اور پہنچا دیجیے تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

استاد شمس الدین نے وعدہ کر لیا۔ ”اچھا اس کو آنے دو۔ اس کو کسی اور جگہ بھیج دوں گا۔“

استاد شمس الدین تو چلے گئے، درداغ کو علیہ کی یاد ستا رہی تھی۔ اس نے اس کھڑکی کی طرف بار بار دیکھا مگر علیہ نظر نہیں آئی۔ آخر وہ خود ٹہلتا ہوا علیہ کے در پر پہنچ گیا۔ اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی، اندر سے ایک بڑی بی نمودار ہوئیں۔ انہوں نے درداغ کو پہچان لیا تھا۔ شاید انہیں اس بات کی پیشگی اجازت ملی ہوئی تھی کہ درداغ آئے تو اسے مزید اجازت حاصل کیے بغیر ہی اندر بلا لیا جائے۔ بڑی بی اس کو اندر لے گئیں اور کمرے میں بٹھا کر علیہ کو مطلع کرنے چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد علیہ اس شان اور اس انداز سے اندر داخل ہوئی کہ وہ سرتاپا زرد پری بنی ہوئی تھی۔ زرد لباس، کمرے کے پردے زرد، پاؤں کی جوتی زرد، غرض ہر چیز زرد تھی۔ اس نے علیہ کو اور علیہ نے اس کو دیکھا،

گھری باتیں

☆ جب دوست ترقی کرے تو فخر سے کہو کہ وہ میرا دوست ہے اور جب دوست مشکل میں ہو تو فخر سے کہو کہ میں اس کا دوست ہوں۔

☆ اپنے دل کو ہرے بھرے درخت کے مانند رکھیں۔ امن سکون اور پیار کے پرندے خود بخود ہی اس پر اتر آئیں گے۔

☆ تم جب اولاد، رشتہ داروں اور دوستوں سے چڑنے لگو تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ تم سے ناراض ہے اور جب تم اپنے دل میں دشمنوں کے لیے رحم محسوس کرنے لگو تو جان لو کہ تمہارا خالق تم سے راضی ہے۔

☆ ہر ایک کی سنو اور ہر ایک سے سیکھو۔ کیونکہ ہر ایک سب کچھ نہیں جانتا لیکن ہر ایک کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہے۔

☆ وہ رشتے اور تعلق کبھی نہیں ٹوٹتے جن کی بنیاد سچائی اور خلوص پر ہوتی ہے۔

☆ اگر فلاح چاہتے ہو تو لوگوں کے عیبوں سے اس طرح غافل ہو جاؤ جس طرح سوتے وقت تم دنیا سے غافل ہو جاتے ہو۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاک پتن شریف

سنہری باتیں

☆ تحریر ایک خاموش زبان ہے اور قلم ہاتھ کی زبان ہے۔

☆ جن لوگوں کے ذہن میں اچھے خیالات آباد ہوں۔ وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔

☆ کسی کے اخلاق پر اعتماد نہ کرنا۔ جب تک اسے غصے کی حالت میں نہ دیکھ لو۔

☆ بہترین دعا الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی۔

☆ محبت بے شک اندھی ہے۔ اس کے باوجود اس کی آنکھیں بہت خوب صورت ہیں۔

☆ بوڑھے کی رائے جوان کی قوت سے بہتر ہے۔

☆ تم اپنا دل کسی کو دے سکتے ہو لیکن اس کی ملکیت سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

دونوں مسکرائے۔ درداغ نے کہا۔ ''علیہ! پتا نہیں کیا ہونے والا ہے، میں آنے والے لمحات سے خوفزدہ ہو رہا ہوں۔''

علیہ نے پوچھا۔ ''مگر کیوں؟ میں کیوں پریشان نہیں ہوں۔''

درداغ نے کہا۔ ''یہی سوال میں اپنے آپ سے کرتا رہتا ہوں کہ آخر جب کوئی اور پریشان نہیں ہے تو میں کیوں پریشان ہوں۔''

علیہ چپ ہوگئی، اس نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا ساری شرمساریاں علیہ ہی کے مقدر میں ڈال دی گئی ہوں۔

درداغ نے پوچھا۔ ''اچھا علیہ یہ تو بتا کہ......'' پھر کچھ احساس ہوگیا کہ اس کا طرزِ تخاطب معقول نہیں ہے، بولا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہاں میرے آنے جانے کی خبر استاد شمس الدین کو تو ہو ہی گئی ہے، انہوں نے اس سلسلے میں آپ پر کوئی پابندی تو نہیں لگائی؟''

علیہ نے جواب دیا۔ ''میں اس سلسلے میں بڑی خوش قسمت ہوں، مجھ پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگی۔''

درداغ نے ایک ٹھنڈی سانس لی، بولا۔ ''علیہ! میں اپنے انجام سے بہت خوفزدہ ہوں، کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ میرا انجام کیا ہوگا؟''

علیہ نے شرما کر سوال کر دیا۔ ''کس کا انجام؟ یہی سوال تو میں تجھ سے کرنے والی تھی کہ ہم دونوں کا انجام کیا ہوگا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''مجھے اپنا تو انجام نظر آرہا ہے کہ ایک نہ ایک دن استاد شمس الدین ہاتھ میں ایک ڈنڈا لے کر آئیں گے اور مجھ کو حکم دیں گے کہ میں پھر کبھی علیہ کے پاس ہرگز نہ آؤں۔''

علیہ نے آہستہ سے کہا۔ ''بالکل، میں نے اپنے انجام پر غور کیا تو اس میں جدائی یقینی نظر آئی۔''

درداغ نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ''علیہ! میں نے بڑی پریشانیاں اٹھائی ہیں۔ میں نے اپنا گھر چھوڑا، کنبہ چھوڑا، مذہب چھوڑا۔ ہلاکو خان کا لشکر اور اس کا ساتھ چھوڑا، ان ساری چیزوں کو چھوڑنے کے بعد میں نے آپ کو پایا تھا اور ایسا لگ رہا ہے کہ شاید ایک نہ ایک دن آپ کو بھی چھوڑنا پڑ جائے گا۔''

علیہ نے کہا۔ ''میں نے منگولوں کا بڑا نام سنا تھا اور میری یہ تمنا تھی کہ خدایا میری کسی منگول سے ملاقات کرا دے، میری دعا قبول ہوئی اور میں نے تجھ کو پا لیا لیکن میں یہ سوچ سوچ کر خوفزدہ ہوں کہ جب اس طرح کی قربتیں میسر آجاتی ہیں تو قسمت روٹھ جاتی ہے اور انسانی قلب آہ و سوزاں کا مرکز بن کر رہ جاتا ہے۔''

درداغ نے کہا۔ ''کیا اس کا کوئی حل نہیں نکل سکتا؟''

علیہ نے جواب دیا۔ ''میری عقل تو کام نہیں کر رہی۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں ان ملاقاتوں کو اپنے لیے اپنی خوش قسمتی کی معراج تصور کرتا ہوں۔''

علیہ نے اچانک گوت کی بابت سوال کیا، پوچھا۔ ''وہ کہاں چلا گیا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں نے اس کا تو انتظام کر دیا ہے۔ اس وقت وہ وزیر ابن علقمی کے پاس گیا ہوا ہے۔''

علیہ نے کہا۔ ''درداغ! اس میں وحشیوں جیسی سرکشی اور جسارت پائی جاتی ہے۔ جب تو استاد شمس الدین کے ساتھ قصرِ صدارت گیا ہوا تھا، وہ یہاں دروازے پر بڑی دیر تک دستک دیتا رہا۔ میری خادمہ کے بار بار منع کرنے کے باوجود وہ اپنی حرکت سے باز نہیں آیا۔ وہ زور زور سے یہی کہہ رہا تھا کہ لڑکی باہر آجاؤ۔ لڑکی دروازہ کھولو۔ یہ کیا بات ہے کہ درداغ تجھ سے ملے، ملاقاتیں کرے اور میں محروم رہوں لیکن میں نے دروازہ نہیں کھولنے دیا۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''کیا آپ نے اس واقعے کی خبر استاد شمس الدین کو دے دی تھی؟''

علیہ نے کہا۔ ''نہیں، محض اس خیال سے کہ اس میں تیرا نام بھی لیا جا رہا تھا۔''

درداغ خاموش ہوگیا۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر گوت کا کیا علاج کیا جائے۔ اس کی عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ علیہ کو اس کے فکرمند چہرے میں بلا کی دلکشی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس چہرے کو اسی کیفیت میں رکھنا چاہتی تھی بولی۔ ''کچھ لوگ ایسے ہیں جو معصومیت اور دلکشی سے یکسر محروم ہوتے ہیں۔ معصومیت نہ تو ان کے اندر ہوتی ہے نہ باہر...... اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے اندر اور باہر معصومیت ہی معصومیت ہوتی ہے۔ فکرمندی اور غصے میں ان کی معصومیت اور نکھر جاتی ہے۔''

درداغ نے پوچھا۔ ''مثلاً، یعنی؟''

علیہ نے جواب دیا۔ ''گوت میں معصومیت نام کی کوئی چیز موجود ہی نہیں اور ایک تو ہے کہ......''

علیہ کہنے کو تو یہ بات تقریباً کہہ گئی تھی مگر فوراً ہی شرمندگی نے اسے پریشان کر دیا۔ وہ درداغ کے سامنے سے چلی گئی۔ درداغ تنہا رہ گیا۔ وہ دیر تک اس کی واپسی کا

منتظر رہا لیکن جب وہ نہیں آئی تو اس نے سامنے سے گزرنے والی ایک خادمہ کو آواز دی اور اس سے کہا۔ ''علیہ سے کہو میں رکوں یا چلا جاؤں؟''

کچھ دیر بعد خادمہ یہ جواب لے کر آئی۔ ''ان کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے، وہ اس وقت نہیں مل سکیں گی۔''

درداغ کو شبہ گزرا کہ شاید اس کی کوئی بات علیہ کو ناگوار گزری ہے ورنہ وہ زندہ دل لڑکی یوں بیزاری سے اٹھ کر نہ چلی جاتی۔ وہ وہاں مزید نہیں ٹھہر سکا۔ جب وہ واپسی کے لیے باہر نکل رہا تھا، علیہ کی ایک خادمہ بھاگی بھاگی آئی اور درداغ سے کہا۔ ''بیگم صاحبہ فرما رہی ہیں کہ کل ضرور آیئے گا۔''

درداغ چلا آیا۔ بے قراری میں کمی تو آگئی تھی مگر وہ دور نہیں ہوئی تھی۔ وہ پھولوں کی روش پر چہل قدمی کرنے لگا۔ چہل قدمی کرتے کرتے اچانک اس کی نظر علیہ کی کھڑکی کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں علیہ کا چہرہ موجود تھا۔ درداغ اس چہرے کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ دیر تک، اس وقت تک جب تک وہ چہرہ موجود اور نظر آتا رہا۔

☆☆☆

گوت اور درداغ میں علیہ نے سخت اختلافات پیدا کردیے تھے۔ گوت برابر مصر تھا کہ اسے بھی علیہ سے ملنے کا موقع دیا جائے اور درداغ یہ کہتا تھا کہ اس کا علیہ پر کوئی اختیار نہیں۔ علیہ اگر گوت سے نہیں ملنا چاہتی تو یہ اس کی اپنی مرضی ہے لیکن گوت ہر بات سر پھرے انداز میں سوچنے کا عادی تھا، بولا۔ ''میرے یہاں دوسروں کی مرضی نہیں چلتی، میں صرف اپنی مرضی دیکھتا ہوں۔''

درداغ نے عاجز آکر پوچھا۔ ''گوت! ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟''

گوت نے ازراہِ مذاق جواب دیا۔ ''علیہ سے عشق کرنے۔''

درداغ نے کہا۔ ''میں سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں اور تم مذاق میں اڑا رہے ہو۔''

گوت نے جواب دیا۔ ''میں بھی سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں۔ تم اگر میری باتوں کو مذاق سمجھتے ہو تو سمجھتے رہو، میں خود اس کو مذاق نہیں سمجھتا۔''

درداغ نے کہا۔ ''ہم جس مقصد سے یہاں آئے ہیں، اس کو تو بھولے جا رہے ہیں۔ بس فروعات اور غیر متعلق باتوں میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔''

گوت نے بگڑ کر جواب دیا۔ ''درداغ! تو غیر متعلق باتوں میں الجھا ہوا ہے، میں نہیں...... میں ابنِ علقمی سے مل کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاید تجھ کو عنقریب واپس بلا لیا جائے اور تیری جگہ کچھ اور لوگ بھیج دیے جائیں۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''یہاں کوئی آئے کوئی جائے لیکن میں واپس نہیں جاؤں گا، یہ میرا ذاتی فیصلہ ہے۔''

گوت نے چونک کر درداغ کو گھورا، پوچھا۔ ''تیرا ذاتی فیصلہ؟ یہ کیا چیز ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ میرا ذاتی فیصلہ ہے۔ اب میں یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا۔''

گوت ہنسنے لگا۔ ''ہلاکو خان کے حکم اور مرضی کے سامنے بادشاہوں اور شہنشاہوں کے فیصلے اور مرضی کوئی حیثیت نہیں رکھتے، پھر تیری کیا مجال ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''بادشاہوں اور شہنشاہوں کو اپنے اقتدار اور اپنی حکومت کے چھن جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے وہ ہلاکو خان سے ڈرتے ہیں، خوفزدہ رہتے ہیں لیکن میں خالی ہاتھ خالی جیب انسان، میں اس سے کیوں ڈروں گا۔ میں اس سے نہیں ڈرتا۔''

گوت نے کہا۔ ''درداغ! شاید تیری زندگی کے دن پورے ہوچکے ہیں ورنہ ہلاکو خان کی یوں تذلیل نہ کرتا۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں زندگی سے بیزار ہوں اور جو زندگی سے بیزار ہوجائے، اس کے لیے ہلاکو خان کی کوئی حیثیت نہیں۔''

گوت نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو سن لو کہ ہلاکو خان کے کچھ اور آدمی آچکے ہیں۔ ابنِ علقمی نے ان سے میری ملاقات کرادی ہے لیکن اب وہ تجھ سے نہیں ملائے جائیں گے کیونکہ تو باغی ہوچکا ہے۔ میری ایک بات اور یاد رکھو۔''

درداغ کے چہرے پر پسینا نمودار ہوچکا تھا، پژمردہ سی آواز میں پوچھا۔ ''کون سی بات؟''

گوت نے جواب دیا۔ ''یہ کہ خبردار، اپنی زبان بند رکھنا۔ اس راز کو افشا نہ کرنا اور موت سے ڈرتے رہنا کیونکہ ہلاکو خان اپنے منحرفین اور پھر جانے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔''

درداغ نے کہا۔ ''وہ جو چاہے کرے، رہی راز والی بات تو میں خاموش رہوں گا۔''

گوت نے کہا۔ ''اب تیرا کام ختم اور میرا کام شروع۔ کل تک تجھ کو استاد شمس الدین کا عطا کردہ یہ ٹھکانا چھوڑ دینا پڑے گا کیونکہ یہ ٹھکانا جس مقصد کے لیے تجھ کو دیا گیا تھا، وہ پورا نہیں ہو رہا ہے۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ”یہ ٹھکانا مجھے استاد شمس الدین نے دے رکھا ہے اور وہی اس سے بے دخل کرسکتے ہیں۔“

گوت نے کہا۔ ”خیال تو تیرا درست ہے لیکن یہ غلط ہے کہ وہی تجھ کو بے دخل بھی کرسکتے ہیں۔ میں تجھ کو بے دخل کرسکتا ہوں، وزیر ابن علقمی تجھ کو بے دخل کرسکتے ہیں۔ تجھ کو بھی اور تیرے ساتھ استاد شمس الدین کو بھی۔“

درداغ نے بھی سختی سے جواب دیا۔ ”تو انتظار کس بات کا؟ کرادو ہم سب کو بے دخل۔“

گوت نے کہا۔ ”ہر کام اپنے وقت پر ہی اچھا لگتا ہے۔ یہ کام بھی اپنے وقت ہی پر ہوگا۔“

اس تلخ کلامی اور بدمزگی کے بعد کئی دن تک دونوں میں کشیدگی رہی۔ اس دوران ابن علقمی کے اشارے پر ان دونوں کو بغداد کے کئی ذمے دار لوگوں سے ملوایا گیا اور ان دونوں نے انہیں یہی یقین دلایا کہ منگولوں کی اکثریت اور خود ہلاکو خان اسلام کی طرف مائل ہوچکے ہیں۔ اس لیے بغداد والوں کو ان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں...... ان ملاقاتوں اور مجلسوں میں گوت نے تو بڑھ چڑھ کر حصہ لیا مگر درداغ کا لب ولہجہ کمزور رہا۔ گوت کو اس پر بھی اعتراض تھا۔

دکاندار نے ایک بار پھر ان دونوں کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ درداغ یوں ہی پریشان تھا۔ ان دونوں کو معاشی پریشانی نہیں تھی کیونکہ ہلاکو خان ان کی ضرورتیں پوری کررہا تھا اور ہلاکو خان کا سب سے بڑا نمائندہ ابنِ علقمی مملکتِ اسلامیہ کا سب سے بڑا عہدیدار تھا۔

گوت کی سرکشی یہاں تک بڑھی کہ اس نے استاد شمس الدین سے درخواست کی کہ اس کو درداغ سے الگ کوئی مکان دلوایا جائے لیکن استاد شمس الدین میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ وہ ان دونوں کے لیے رہائش کا الگ الگ انتظام کرتے، انہوں نے جواب دیا۔ ”میں آپ دونوں کے لیے جو کچھ کرسکتا تھا، کرچکا ہوں۔ مزید کے لیے میں امیر المومنین سے درخواست کروں گا۔ جیسے ہی اس کا انتظام ہوا آپ دونوں کو ادھر منتقل کردوں گا۔“

گوت نے کہا۔ ”لیکن اساد محترم! میں آپ ہی کے پاس اور ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ آپ درداغ کو کہیں اور منتقل کردیجیے۔“

درداغ نے کہا۔ ”میں یہیں رہوں گا۔ میں نے تجھ کو اپنے ساتھ رکھ کر بڑی غلطی کی۔“

گوت نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں کس نے کیا غلطی کی۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ فی الحال تو تجھ کو کہیں اور ٹھکانا کرلینا چاہیے اپنے لیے۔“

استاد شمس الدین نے دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”کیا تم دونوں مل جل کر نہیں رہ سکتے؟ اسلام وجۂ اتحاد نہیں بن سکتا کیا؟ اسلام اور مسلمانوں کے لیے یہ بات افسوس ناک ہے کہ جب تک تم دونوں نے اسلام نہیں قبول کیا تھا، ایک دوسرے کے دوست تھے لیکن مسلمان ہوتے ہی ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ آخر کیوں؟ کیا اسے بھی مسلمانوں کی بدقسمتی اور نکبت وادبار سے تعبیر کیا جائے؟“

گوت نے جواب دیا۔ ”میں نے ابھی تک اسلام کو باضابطہ قبول نہیں کیا ہے اور شاید یہی حال درداغ کا ہے۔ اس نے بھی باضابطہ اسلام نہیں قبول کیا۔ اگر اسلام قبول کیا ہوتا تو ہم نے اپنے نام بھی تبدیل کیے ہوتے۔“

استاد شمس الدین نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ابھی تک منگول بت پرست ہی ہو؟“

گوت نے جواب دیا۔ ”ہم لوگ بت پرست ہرگز نہیں کیونکہ ہمارے ہاں بت نہیں ہوتے۔ ہم جاودانی نیلے آسمان کو ماننے والے لوگ بت پرست کس طرح ہوسکتے ہیں۔ ہم اگر خدا پرست نہیں ہیں تو بت پرست بھی نہیں ہیں۔“

استاد شمس الدین اس وقت تو خاموش ہوگئے لیکن شب کو وہ درداغ کو دجلہ کے کنارے لے گئے۔ یہ جگہ مدرسۂ مستنصریہ کی پشت پر تھی۔ رات کے اندھیرے میں وہ دونوں ایک ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختے پر بیٹھ گئے۔ استاد شمس الدین نے کہا۔ ”درداغ! اس وقت میں تجھ سے بہت ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔ امید ہے کہ تو مجھ سے جھوٹ نہیں بولے گا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ کو مجھ سے جو کچھ پوچھنا ہے، پوچھیے۔“

استاد شمس الدین کی آواز میں بڑا کرب تھا، پوچھا۔ ”گوت نے تم دونوں کے اسلام کے بارے میں جو کچھ کہا اس سلسلے میں تو کیا کہتا ہے؟“

درداغ نے پوچھا۔ ”آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

استاد شمس الدین نے کہا۔ ”یہ کہ تم دونوں نے ابھی تک باضابطہ اسلام کیوں قبول نہیں کیا؟ اور یہ کہ تم دونوں مسلمان ہونا بھی چاہتے ہو یا نہیں؟“

درداغ نے ایک سرد آہ بھری، جواب دیا۔ ”استاد محترم! آپ کے اس سوال کا جواب نہایت تلخ ہے۔“

استاد نے تڑپ کر سوال کیا۔ ''یعنی؟ کیا تم دونوں مسلمان نہیں ہونا چاہتے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''نہیں، یہ بات بھی نہیں کیونکہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں مگر گوت مسلمان نہیں ہونا چاہتا۔''

استاد اور زیادہ تڑپ گئے، پوچھا۔ ''وہ کیوں؟ میں تیری اس وضاحت کا مطلب نہیں سمجھا۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''آپ اس کا مطلب بہ آسانی سمجھ بھی نہیں سکتے کیونکہ میں جو کچھ بتاؤں گا آپ کے خواب و خیال میں بھی وہ باتیں نہیں ہوں گی۔''

استاد شمس الدین نے پوچھا۔ ''درداغ! میں نے تیرے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا۔ میں تجھ سے بھی یہ امید نہیں کرتا کہ میرا برا چاہے گا یا مجھ کو کس طرح شرمندہ کرے گا۔ یہ معاملہ کیا ہے تو صاف صاف مجھے بتا دے۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''استادِ محترم! افسوس کہ ہم دونوں اور ہمارے جیسے اور کئی ہلاکو خان کے ہراول دستے ہیں۔ ان دستوں کا کام یہ ہے کہ امیر المومنین، ان کے ذمے دار امراء اور بغداد والوں کو نشہ پلا کر انہیں مدہوش کر دیں۔''

استاد نے پوچھا۔ ''وہ کس طرح؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ہلاکو خان نہایت ذہین انسان ہے۔ اس کو مسلمانوں کی ذہنی حالت کا خوب اندازہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ لوگ منگولوں کے مسلمان ہو جانے سے بہت خوش ہوتے ہیں چنانچہ اس نے ہمیں اس پر آمادہ کیا کہ بغداد میں داخل ہو کر اپنے مسلمان ہو جانے کا ڈھونگ رچائیں۔ اس سے امیر المومنین، ان کے امراء اور عام مسلمان بہت خوش ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب ہم بغداد میں یہ کہتے پھرتے ہیں کہ منگولوں کو اسلام نے بہت متاثر کیا ہے اور ہلاکو خان امیر المومنین کے دستِ حق پرست پر مسلمان ہونا پسند کرتا ہے تو بغداد میں اس کی بڑی خوشی منائی جاتی ہے۔ یہ خوشیاں اور خوش فہمیاں ان کے حق میں نشہ ہیں اور اس وقت جب یہ بتایا جاتا ہے کہ ہلاکو خان اپنی بیٹی کی شادی امیر المومنین یا ان کے صاحبزادے ابوبکر سے کرنا چاہتا ہے تو اس نشے میں کچھ زیادہ ہی اثر اور شدت پیدا ہو جاتی ہے۔''

استاد شمس الدین کو اپنے پاؤں تلے کی زمین سرکتی یا ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ غصے اور کرب کی ملی جلی آواز میں پوچھا۔ ''یہ تو جو کچھ کہہ رہا ہے کیا سچ ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں اتنا بڑا جھوٹ کس طرح بول سکتا ہوں؟''

استاد شمس الدین کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ ''یہ تو کیا کہہ رہا ہے درداغ! یہ میں نے کیا سنا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''استادِ محترم! میں یہ ساری باتیں آپ کو ہرگز نہ بتاتا اگر میری طبیعت اسلام کی طرف مائل نہ ہوتی۔ میں واقعی مسلمان ہو جانا چاہتا ہوں اس لیے میں آپ کو دھوکا نہیں دینا چاہتا۔ میں نے اصل حقیقت بیان کر دی۔ آپ اس پر یقین کریں یا نہ کریں۔''

استاد نے درشت اور بے مروتی کا لہجہ اختیار کیا۔ ''میں اس پر کس طرح یقین کر لوں کہ یہ جو کچھ تو نے بتایا ہے، درست ہے، سچ ہے۔ کیا پتا اس میں بھی جھوٹ شامل ہو؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میرے پاس وہ ذریعہ نہیں جس سے میں آپ کو یہ یقین دلا سکوں کہ میں نے آپ کو ابھی ابھی جو کچھ بتایا، اس کا ایک ایک حرف سچا ہے۔ اب میں آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ استادِ محترم! میں نے پڑھا لکھا ہے، میں نے علم حاصل کیا ہے۔ میری فطرت میں جو درندگی، سفاکی، عیاری، مکاری اور فریب دہی تھی، اس پر علم کی دبیز تہ جم چکی ہے۔ اب میں اتنی بے باکی اور دلیری سے جھوٹ نہیں بول سکتا جتنی بے باکی اور دلیری سے میری قوم کے لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ میں نے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ آپ اس فریب دہی اور جھوٹ کی مجھے جو سزا چاہیں دے سکتے ہیں۔''

استاد شمس الدین نے پوچھا۔ ''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہلاکو خان بغداد پر ضرور حملہ کرے گا۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ہاں، بغداد پر حملہ ضرور ہوگا۔ ہلاکو بغداد پر حملہ ضرور کرے گا۔''

استاد شمس الدین نے اپنا سر پکڑ لیا۔ دکھ ان کے ایک ایک انداز میں تھا، ایک ایک حرف اور ایک ایک بات میں تھا، بولے۔ ''وہ بغداد پر حملہ ضرور کرے گا اور یہاں امیر المومنین اور ابن علقمی نے پچھتر فیصد فوج بھی کم کر دی۔ ہمارا حشر کیا ہوگا، بغداد کا حشر کیا ہوگا؟''

درداغ نے سکوت اختیار کر لیا۔ اس کو حالات کی نزاکت اور خرابی کا پورا پورا احساس تھا۔ جو کچھ اور جس طرح ہو چکا تھا، اس کا درداغ کو بے حد افسوس تھا۔

استاد شمس الدین نے پوچھا۔ ''اب میں کیا کروں؟ امیر المومنین کو اس سانحے کی کس طرح اطلاع دوں؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''آپ مجھ کو امیر المومنین کے روبرو دوبارہ پیش کر دیجیے، میں جس طرح بن پڑے گا امیر المومنین کو بتا دوں گا۔''

استاد شمس الدین نے کہا۔ ”بس ایک صورت ہے۔ میں تجھ کو امیر المومنین کے پاس دوبارہ نہیں لے جاؤں گا کیونکہ ان پر ابنِ علقمی کا بڑا اثر ہے اور ابن علقمی ہلاکو خان سے ملا ہوا ہے۔“

درداغ نے کہا۔ ”افسوس تو اس بات کا ہے کہ اب میں گوت سے کٹ جاؤں گا اور گوت سے کٹ جانے کا یہ مطلب ہوگا کہ ہلاکو خان سے کٹ گیا اور وہ لوگ میرے جانی دشمن ہو جائیں گے۔“

استاد شمس الدین نے کہا۔ ”میری سمجھ میں ایک بات آرہی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ شہزادہ ابوبکر سے ملاقات کروں اور اسے ساری تفصیل بتا کے اس سے مشورہ لوں کہ اب کیا ہوسکتا ہے۔“

درداغ نے کہا۔ ”آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں لیکن اب میں آپ کے پاس نہیں رہنا چاہتا۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”نہیں، تو میرے پاس میرے ساتھ ہی رہے گا۔ ہاں گوت آج سے وہاں تیرے ساتھ نہیں رہے گا۔“

درداغ نے کہا۔ ”لیکن گوت کو اتنی آسانی سے نہیں نکالا جاسکتا۔ ابنِ علقمی اور ابن علقمی کی وجہ سے امیر المومنین اس کے ساتھ ہیں۔ اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ وہ ہم دونوں کو یعنی مجھ کو اور آپ کو...... دونوں کو نکلوا سکتا ہے۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”ہاں، ایسا ممکن ہے۔ وہ ابن علقمی کی مدد سے مجھ کو مدرسۂ مستنصریہ سے نکلوا سکتا ہے لیکن اگر میں نے شہزادہ ابوبکر کو اعتماد میں لے لیا تو وہ ایسا نہیں کرسکتا۔“

درداغ نے دجلہ کی سطح پر ایک بجرے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اندھیری رات میں ستاروں کی روشنی کام کررہی تھی اور بجرے پر جلنے والی شمعیں دور ہی سے ساحل کی طرف بڑھتی محسوس ہورہی تھیں۔ اس نے استاد شمس الدین کی توجہ بجرے کی طرف مبذول کرائی، اس نے کہا۔ ”استادِ محترم! دیکھیے وہ بجرا اپنی ہی طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔“

استاد نے کہا۔ ”درداغ! بھاگ چل...... مجھے ہر طرف سے بے اعتمادی کی بو محسوس ہورہی ہے۔“

وہ دونوں اٹھ کر وہاں سے اپنے گھر پہنچے۔ گوت درداغ کو دیکھتے ہی چیخا۔ ”درداغ! تو اپنا اعتبار کھوتا جارہا ہے۔ اس وقت تو کہاں سے آرہا ہے؟“

درداغ نے بڑا بامعنی جواب دیا۔ ”گوت! میں کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔“

گوت چونک پڑا۔ ”یعنی، کیا مطلب؟ کیا تو استاد شمس الدین سے سچ بولنے کی کوشش کررہا ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میری کوشش تو یہی ہے۔ آگے اللہ مالک ہے۔“

گوت نے نرمی اختیار کی۔ ”اگر تو نے ایسا کیا تو بہت برا ہوگا، اس میں ہم دونوں کا نقصان ہے۔“

درداغ نے کہا۔ ”میں کیا کروں، مجبور ہوگیا ہوں۔ تو نے جو روش اختیار کی ہے، اس کا مقابلہ کرنے کی یہی ایک صورت رہ گئی ہے۔“

گوت نے جواب میں کہا۔ ”دیکھ درداغ! میری بات مان، اگر تو نے یہ راز کھولا تو میں تجھ کو وزیر ابن علقمی سے کہہ کر یہاں سے نکلوا دوں گا۔ نہ صرف تجھے بلکہ استاد شمس الدین کو بھی مدرسے سے نکلوا دوں گا۔“

درداغ نے کہا۔ ”میں امیر المومنین سے ملنے والا ہوں۔ وزیر ابن علقمی خلیفہ سے بڑا تو نہیں ہے۔“

گوت نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ”تو ایسا نہیں کرسکتا۔ اگر تو نے ایسا کیا بھی تو ہمارے پاس اس کا بھی ایک توڑ ہے۔ تم دونوں کو منہ کی کھانا پڑے گی۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں تجھ کو آزادی اور اجازت دے رہا ہوں کہ جو سمجھ میں آئے کر اور جو میری سمجھ میں آئے گا میں کر گزروں گا۔“

گوت نے گویا آخری بار وضاحت چاہی۔ ”تو تو ہلاکو خان کا راز امیر المومنین اور دوسرے امرائے دربار کو بتا کر ہی دم لے گا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ میرا پختہ ارادہ ہے اور میں ایک بار جو ارادہ کرلیتا ہوں، اس سے پیچھے نہیں ہٹتا۔“

گوت نے آہستہ سے کہا۔ ”میں بھی خوب جانتا ہوں کہ سارا فتور اس لڑکی علیہ کا ہے۔ ہم دونوں کے اختلاف کا سبب علیہ ہے۔ میں صبح تک اس قصے کو ختم کردوں گا۔ اس لڑکی کو حاصل کرلوں گا۔ اس کے بعد دیکھوں گا کہ تو استاد شمس الدین کا اور مسلمانوں کا کیا ساتھ دیتا ہے؟“

گوت اسی وقت وزیر ابن علقمی کی طرف روانہ ہوگیا۔

ماخذات

تاریخ دولت فاطمیہ، رئیس احمد جعفری۔ تاریخ فاطمین مصر، ڈاکٹر زاھد علی۔ طبقات ناصری، منہاج سراج۔ الفخری، محمد علی ابن علی۔ نظام الملک طوسی، مولوی عبدالرزاق کانپوری۔ تاریخ اسلام، اکبر شاہ خان

تخلیق کوئی بھی ہو احساس کے بغیر ادھوری ہے... اور محبت جیسا احساس اگر درد بن کر لہو میں گردش کرنے لگے تو مصنف ہو یا مصور اپنے فن پاروں میں گویا جیتی جاگتی روح پھونک دیتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی لکھاری تھا جسے قلم کی نوک پر احساسات سے کھیلنے کا فن آتا تھا مگر زندگی کے حوالے سے خالی پن کا احساس اور بے رونقی کا زہر ہمیشہ اس کے دل میں پھانس بن کر چبھتا رہا۔

لفظوں کی بھیڑ میں محبت کی چاشنی سے دور ایک مصنف کا احوال



تنویر ریاض

خالی پن

پروفیسر چیڈوک کی خواہش تھی کہ ہم اسے ہال کہہ کر پکارا کریں۔ اس روز بھی وہ ہمیں اپنی کامیابی کا راز بتا رہا تھا۔ گو کہ وہ عاجزی اور انکساری کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن اس کی آواز میں غرور کی جھلک نمایاں تھی۔ کلاس میں موجود تمام طالب علم بالخصوص نئی آنے والی لڑکیاں بڑی توجہ اور انہماک سے اس کی تقریر سن رہی تھیں۔ وہ اپنے ڈیسک پر آگے کی طرف جھکا ہوا بڑے پُرجوش انداز میں بول رہا تھا۔ اس کی آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی ہو چکی تھی اور بولتے وقت اس کی ٹھوڑی میں گڑھا پڑ جاتا تھا۔

''دنیا کا سارا عظیم ادب محبت کے بارے میں یا اس کے بغیر ہے۔'' اس کی یہ بات سب کے سر پر سے گزر گئی۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے ناولوں میں محبت کی سچائی کے بارے میں لکھتا ہوں۔ اس کی تکلیف، بربادی اور اس کے ساتھ آنے والے خالی پن کو بیان کرتا

ہوں۔ یہی میری طاقت ہے، یہی میرا تحفہ ہے۔"
لڑکیاں اس کی دولت اور امارت سے مرعوب تھیں۔
اس کے افسانے ہر ایک کی زبان پر تھے۔ اس کے پینٹ ہاؤس اپارٹمنٹ کی بالکونی میں ہونے والی کاک ٹیل پارٹیاں، ہیمپٹن میں اس کا بیچ ہاؤس، فرانسیسی خادمہ فی فی، شوفر فرانز، ریڈ کارپٹ پریمیئر، ٹیلی ویژن انٹرویو، یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں کے خواب کے مانند ان کی نظروں میں سمایا ہوا تھا۔ ہال اپنے تین سب سے زیادہ فروخت ہونے والے ناولوں کا سودا ہالی وڈ کے پروڈیوسرز سے کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اسی لیے دوسرے پروفیسرز کی طرح اس کی راتیں بے خواب نہیں گزرتی تھیں اور نہ ہی اسے ریٹائرمنٹ کا خوف تھا، اس لیے اسے ہماری تربیت کرنے یا ہمارے ذہنوں کو کسی سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ جو کچھ اس کے پاس ہے، وہ ہمیں واپس کررہا ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کررہا ہے لیکن میں اس کی مہارت سے مرعوب ہوچکا تھا۔
میرے ساتھیوں میں جیری بھی تھا جو محض اس غرض سے اس کلاس میں آیا تھا کہ آسانی سے سی گریڈ حاصل کرسکے اور فٹ بال ٹیم میں اس کی جگہ برقرار رہے۔ اس نے ایک ناول شروع کررکھا تھا، جس کی کہانی ایک ایسے باپ کے گرد گھومتی تھی جو اپنے بچے کو کوڑے کے ڈھیر پر پڑا ہوا کارن بیف کھلا کر پالنا چاہتا تھا تاکہ بڑا ہوکر وہ ایک نامور اسکیٹنگ کا کھلاڑی بن سکے۔ اس نے ناول کا پہلا باب کلاس میں پڑھ کر سنایا تو ہال نے اس پر تبصرہ کرنے کے بجائے جیری کی حساسیت کی تعریف کی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور لڑکیاں آہستہ آہستہ کھسر پھسر کرنے لگی تھیں۔
میں اس کلاس میں ابھی تک ناکام تھا، خود کسی سرگرمی میں حصہ لیتا اور نہ ہی اپنے ساتھی طالب علموں کے کام پر تنقید کرتا۔ کلاس میں ہونے والی مشقیں بھی کچھ متاثر کن نہ تھیں۔ میری تحریر میں جذباتی عنصر کی کمی تھی۔ ہال کا کہنا تھا کہ میں تاریک گوشوں کے بارے میں لکھتا ہوں اور ان میں وہ شاعرانہ گونج نہیں جو پڑھنے والے کے دل کو چھولے۔ اس کا کہنا تھا کہ میں آتش فشانی کرتا ہوں جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے میری جنگ وجدل سے بھرپور اور پراسرار کہانیاں پسند نہیں تھیں۔ وہ چڑیلوں اور ڈراؤنے خوابوں پر لکھی گئی کہانیوں کو بھی مسترد کردیتا تھا اور جب میں نے جرائم سے متعلق کہانیاں لکھیں جن میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح اچھے لوگ محض مقروض ہونے، اپنی کسی حماقت یا خوب صورت عورتوں کی وجہ سے جرم کی راہ پر چل پڑتے ہیں تو اس کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ پھیل گئی۔
میرے سامنے والی سیٹ پر بیتھ موڑ بیٹھا کرتی تھی۔ میں سیمسٹر کے آغاز سے ہی اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ پہلے دن کلاس میں آئی۔ اس نے ایک اچٹتی نگاہ مجھ پر ڈالی اور اپنا مضمون پڑھنے کھڑی ہوگئی۔ تبھی سے ہم دونوں کے درمیان ایک غیر محسوس سا رشتہ قائم ہوگیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں اس پر فریفتہ ہوچکا ہوں لیکن اسے دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا۔ پورا سیمسٹر یونہی گزر گیا۔ اس نے کبھی میری حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ میری زندگی کا بہترین ادب محبت کی عدم موجودگی کے بارے میں ہوگا۔
میرا پہلا سال یونہی گزر گیا اور میں کوئی کام مکمل نہ کرسکا۔ مجھے پارٹیوں اور دوستوں سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے کیمپس سے باہر ایک اپارٹمنٹ میں منتقل ہونا پڑ گیا۔ میری مالکن مسز فریڈی بہت ہی نرم دل اور مہربان عورت ہے، وہ مجھے کیک اور بسکٹ بنا کر کھلاتی ہے اور اگر کبھی کرایہ دینے میں دیر ہوجائے تو تقاضا نہیں کرتی۔
میں اپنی تحریریں چوٹی کے رسالوں کو بھیجتا ہوں جنہیں ناقابلِ اشاعت قرار دے کر واپس کردیا جاتا ہے۔ بعض اوقات میرا میل باکس اس بری طرح بھر جاتا ہے کہ پوسٹ مین میرے مسودوں کے لفافوں کو ڈوری سے باندھ کر دروازے پر رکھ کر چلا جاتا ہے لیکن میں ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہوں اور اس یقین کے ساتھ لکھتا رہتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن میری کوئی تحریر کسی نہ کسی بڑے رسالے میں جگہ حاصل کرسکے گی۔ میری بے خوابی بڑھتی جارہی ہے لیکن اس کی بدولت مجھے مصروف رہنے کا بہانہ مل گیا ہے۔ میں نے لکھنے کے علاوہ جزوقتی کام بھی شروع کردیا ہے۔ میں ایک باربی کیو شاپ پر بیرا گیری کرتا ہوں اور کار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو آرڈر پر اسنیکس اور بیئر وغیرہ پہنچاتا ہوں۔ اس کے علاوہ ہفتے کے آخر میں ایک بار میں بھی بارٹینڈر کے فرائض انجام دیتا ہوں۔
یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اس لیے یہاں کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ میں تقریباً ہر شام بیتھ اور اس کے دوستوں کو مرکزی شاہراہ پر گھومتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ وہ مجھے پہچانتی نہیں یا پھر یوں ظاہر کرتی ہے جیسے وہ مجھے جانتی نہیں۔ جب اس کے بلند وبانگ قہقہے فضا میں گونجتے ہیں تو لگتا ہے جیسے وہ

مجھ پر ہنس رہی ہے۔ اس کے باوجود میں اس کا بہت خیال رکھتا ہوں اور اسے مچھلی کا ایک ٹکڑا زیادہ دے دیتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ اس کے گلاس کو بھی مشروب سے لبالب بھر دیتا ہوں۔ وہ منہ پھیر کر ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ شکریہ ادا کرتی ہے جیسے مجھ سے نہیں بلکہ کسی اور سے مخاطب ہو۔

ہماری تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لیے ہال نے تجویز پیش کی کہ وہ ہمارے درمیان ایک مقابلہ کروانا چاہتا ہے۔ سیمسٹر کے اختتام تک جو بھی کہانی بہترین قرار پائی، اس کے لکھنے والے کو ہال کے تینوں ناولوں کی دستخط شدہ کاپیاں انعام میں دی جائیں گی۔ میرے کلاس فیلوز نے مسکراتے ہوئے اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ وہ ہال سے اس طرح بات کرتے جیسے اس کی اولاد ہوں اور وہ بھی جواب میں ان کے ساتھ ایک باپ کی طرح ہی گفتگو کیا کرتا تھا۔

ان سب کے پاس اس کی کتابیں پہلے سے تھیں اور انہوں نے کلاس کے پہلے روز ہی اس کی میز کے گرد قطار میں کھڑے ہو کر ان ناولوں کی دستخط شدہ کاپیاں حاصل کر لی تھیں۔ وہ سب باری باری اس کے پاس آتے، وہ لڑکیوں کی کلائی تھامتا اور لڑکوں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے تھپکی دیتا، میں اپنی نشست پر بیٹھا یہ کارروائی دیکھتا رہا۔ وہ سب باری باری اپنا نام بتا رہے تھے۔ ہال نے ایک مرتبہ وہ سارے نام دہرائے پھر میری طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولا۔ ”اور تم کون ہو؟“

’اچھا سوال ہے۔‘ میں نے دل میں سوچا۔ ’کسی روز میں اس کا جواب ضرور دوں گا۔‘

☆☆☆

فینکی فریڈ کو یہ بات بالکل پسند نہیں کہ جب وہ اپنی کہانی پڑھ رہا ہو تو آگے بیٹھے ہوئے لوگ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت کریں۔ وہ میرے عقب میں کھڑا گلا صاف کر رہا تھا۔ اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا جس کی وجہ سے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ پھڑپھڑا رہے تھے۔ ہال نے اسے سمجھایا کہ وہ پُرسکون ہو جائے اور آرام سے اپنی کہانی پڑھے۔ وہ اسے یقین دلا رہا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کی کہانی سننے لگا۔ اس نے اپنے اونچے لہجے پر قابو پانے کے لیے کافی محنت کی تھی اور اب وہ نیویارک کا پیدائشی لگ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کہانی پڑھتے وقت اپنی جگہ پر رقص کر رہا ہو اور اس کا تین سو پاؤنڈ وزنی جسم اپنی سیٹ پر جھول رہا ہو۔ اس کی ایڑیاں دائیں بائیں ہو رہی تھیں اور اس دوران اس نے کئی بار میری کرسی کو بھی ٹھوکر ماری۔ وہ ہر شخص کو یہ سمجھانا چاہ رہا تھا کہ موٹے لوگ بھی محبت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ انہیں بچوں کی بھی خواہش ہوتی ہے۔ وہ صحیح وقت پر صحیح لفظ بول سکتے ہیں۔ کہانی پڑھتے پڑھتے اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں اسے تھپڑ مارنا چاہ رہا تھا۔ اسے اپنی طرف کھینچ کر جھنجوڑ کر پوچھنا چاہ رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ اسے یہ درد کس نے دیا؟ اس نے اپنے گیتوں یا بینجو کے بارے میں کچھ نہیں لکھا جو وہ بہت اچھا بجایا کرتا تھا۔ نہ ہی اس نے یہ بتایا کہ کس طرح اس کی ماں ہوٹلوں میں کھانا پکا کر چار پیسے کماتی تھی۔ اس کی بہن کیسے افغانستان میں ماری گئی۔ کس طرح اس کا باپ زہریلی خوراک کھا کر مر گیا تھا۔ کالج میں آنے کے بعد وہ یہ سب باتیں بھول گیا تھا۔ اپنے کلاس روم کے نرغے میں گھر کر اس کی شخصیت مسخ ہو چکی تھی اور بھول گیا تھا کہ وہ کون ہے۔ وہ تین سال پہلے میرے ہی کمرے میں رہا کرتا تھا لیکن اب بہت بدل گیا تھا۔

اب وہ اپنے مٹاپے کے بارے میں لکھ رہا تھا۔ اسے رنج تھا کہ لڑکیاں مٹاپے کی وجہ سے اسے پسند نہیں کرتیں۔ اس کی آواز سپاٹ تھی۔ وہ محبت کا متلاشی تھا لیکن کوئی لڑکی اسے پسند نہ کرتی تھی۔ انہوں نے اس کے اندر خوف اور شک بھر دیا تھا، اس کہانی کا انجام بھی بہت درد بھرا اور پُرسوز تھا۔

کلاس کی سبھی خوب صورت لڑکیاں اس دردناک انجام پر رونے لگیں، ہال دونوں ہاتھوں سے تالی بجانے لگا۔ جب یہ شور کم ہوا تو میں اپنی کرسی سے اٹھا اور ہماری نظریں چار ہوئیں۔ فینکی فریڈ مسکرا رہا تھا اور میں سوچنے لگا کہ کیا وہ کبھی اپنی بہن کی قبر پر جائے گا۔

اس ہفتے میں نے روزانہ بیتھ مور کو مختلف لڑکوں کے ساتھ دیکھا۔ وہ سب ہمارے برگر کے شوقین تھے۔ میں گاڑی میں ہی ان کا آرڈر سرو کرتا اور ہر بار میری نظریں بیتھ کے چہرے کا احاطہ کرنے لگتیں جو بڑے انہماک سے اپنے دوست کے ساتھ بڑی اداؤں سے پسنجر سیٹ پر بیٹھی برگر اور ڈرنک سے دل بہلا رہی ہوتی۔ میں اس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اس کے دوست سے کہتا۔ ”ہماری برگر شاپ پر آنے کا شکریہ۔ امید ہے کہ تم جلد ہی دوبارہ یہاں آؤ گے۔“ اس کا دوست اور بیتھ دونوں مجھے نظر انداز کر دیتے۔

میں اس کی کار کو پارکنگ لاٹ سے نکلتے اور بائیں جانب مڑتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ کار کی عقبی بتیاں مجھ سے

دور ہوتی جا رہی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے کار میری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ اس کے باوجود میری آنکھوں کے سامنے سرخ شعلے لپکتے محسوس ہوتے ہیں۔ میری نگاہ برابر والی عمارت کی کھڑکی میں جاتی ہے جہاں ایک عورت اپنے روتے ہوئے بچوں کو بہلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ میری طرف اس طرح دیکھتی ہے جیسے میں اس کا سارا درد سمیٹ لوں گا، میں بھی اسی انداز میں اس کی جانب دیکھتا ہوں۔ شاید ہمارا دکھ مشترک ہے۔ دونوں ہی محبت کو ترسے ہوئے ہیں۔

اگلے ہفتے بیتھ نے اپنے خاندان کی کہانی لکھی۔ اس نے اپنی زندگی کی کہانی کو کسی ڈرامائی رنگ کے بغیر کاغذ پر منتقل کر دیا۔ جب وہ کہانی پڑھ رہی تھی تو مجھے اس کی آواز میں اعتماد کی کمی محسوس ہوئی۔ وہ بہت سی باتیں دہرا رہی تھی۔ اس کے مکالمے غیر فطری تھے۔ وہ ان مکالموں کو ادا کرتے وقت آواز پر توجہ دینے کی کوشش کر رہی تھی خصوصاً جب اس نے اپنی ماں کے مکالمے بولے تو آواز کا مصنوعی پن سامنے آ گیا لیکن اس کی کہانی میں سچائی تھی۔ اس نے اپنے باپ کے بارے میں بتایا جو پولیس میں تھا اور تیس سال کی ملازمت کے بعد اب ریٹائر ہونے والا تھا۔ اس کے بوڑھے باپ کو آئے دن مجرموں اور سماج دشمن عناصر کے خلاف لڑنا پڑتا تھا جس کا بوجھ اٹھانا اب اس کے بس میں نہیں رہا تھا اس کا ایک بھائی بھی پولیس آفیسر تھا۔ اس کے ان دونوں کے ساتھ اچھے تعلقات نہیں تھے۔ وہ دونوں بہت زیادہ ڈرنک کرتے تھے اور اس کے والدین کے درمیان ہمیشہ جھگڑا چلتا تھا۔ عام طور پر اس کے بوڑھے باپ کو ہی پسپائی اختیار کرنا پڑتی اور وہ اپنی خفت مٹانے کے لیے اپنا کوئی کارنامہ بیان کرنا شروع کر دیتا۔ اس کا بھائی اپنی بیوی کو طلاق دے رہا تھا اور بیتھ کا تین سالہ بھتیجا سوچ رہا تھا کہ اب اس کا باپ گھر کیوں نہیں آتا۔

کہانی پڑھنے کے دوران کئی بار اس کی آواز بھرا گئی۔ ہال نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ پرسکون ہو کر کہانی پڑھے۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں معذرت کی اور گلا صاف کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں نے آہستہ آہستہ اس کی جانب سرکنا شروع کیا لیکن ہال مجھ سے پہلے ہی اس تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے بیتھ کا بازو پکڑا اور اسے گلے لگا لیا۔ وہ اس کے گلے سے لگ کر رونے لگی اور وہ اسے پچکارتے ہوئے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے ماتھے پر بوسہ دے دیا۔ میرے لیے یہ منظر ناقابل برداشت تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، میرے حلق سے ایک خاموش چیخ برآمد ہوئی اور ذہن کے تاریک گوشوں میں گم ہو گئی۔

ہال ہم سے کہتا۔ ”تمہیں اپنی سوچ کو تلاش کرنا چاہیے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔ وہ ناپائیدار اور شرمیلی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ تمہارے بلانے پر چھپ جائے اور جب تم ناامید ہو جاؤ تو اچانک ہی تمہیں حیران کر دے لیکن یہ تمہارا فرض ہے کہ اسے دریافت کرو۔“

میں اپنے خیالوں میں بسنے والی لڑکی کے بارے میں سوچتا تھا۔ وہ لڑکی جس پر میں پہلی بار فریفتہ ہوا تھا۔ شاید پہلی جماعت میں ساتھ پڑھنے والی وہ لڑکی جو میرے اردگرد منڈلاتی رہتی تھی اور جس کا نام اور چہرہ بھی میں بھول چکا ہوں۔

لکھنے کی مشق میرے اندر سرایت کر چکی ہے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ مجھ میں تبدیلی نظر آنے لگی۔ میرے خیالوں میں رہنے والی جو کوئی بھی ہے وہ اسے اچھی طرح جانتی ہے۔ میں یہ تصور کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ شوق، تخلیق اور کامیابی کے نام پر وہ کس قسم کی قربانی چاہتی ہے۔ ہال نے اپنی سوچ کو ایک نام دے رکھا ہے۔ وہ اسے پنڈورا کہہ کر بلاتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ بہت خوب صورت ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ”پنڈورا کسی مرد سے محبت نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ مجھ سے بھی نہیں لیکن وہ جانتی ہے کہ میں کون ہوں۔“

کیا بکواس ہے۔ میں نے سوچا اور یہ نام چرا لیا۔ پنڈورا...... تم میری سوچ ہو۔ ہم دونوں مل کر کام کریں گے۔ تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں لیکن جانتی ہو کہ میں کون ہوں۔

☆☆☆

مسز فریڈی نے مجھے بلا کر کہا کہ گھر کے عقبی حصے کی باڑ... مرجھا گئی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اس جھاڑ جھنکار کو صاف کر کے اسے نئے سرے سے ترتیب دیا جائے۔ وہ اتنی استطاعت نہیں رکھتی کہ کسی باہر کے آدمی کو بلا کر اس سے یہ کام کروایا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اسے میری مدد درکار ہے۔ اس نے مجھے مختلف اوزار دیے اور بتایا کہ کس طرح درختوں کو کاٹنا اور لکڑی کا ڈھیر لگانا ہے، اس کے بعد مجھے زمین کھود کر اس کی سطح کو ہموار کرنا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق مجھے یہ کام چار سے چھ ہفتوں میں مکمل کر لینا چاہیے تھا اور جس دن میں نے پہلا درخت گرا دیا تو وہ مجھے ایک عمدہ

سی پیسٹری بنا کر کھلائے گی۔ مسز فریڈی کا کہا ہوا میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ لہٰذا میں نے دوسرے دن سے ہی کام شروع کر دیا۔

میں کبھی بھی برگر ہاؤس کے فرنٹ کاؤنٹر پر نہیں بیٹھتا لیکن اس رات کسی وجہ سے ایسا کرنا پڑ گیا اور اسی روز فنگی فریڈ بھی وہاں آ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں چھپنے کی کوشش کرتا، اس نے مجھے دیکھ لیا حالانکہ ہم دونوں کے درمیان یہ آنکھ مچولی گزشتہ تین برس سے جاری تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی متعدد بار وہاں آ چکا تھا لیکن میں اسے دیکھ کر ہمیشہ اِدھر اُدھر ہو جایا کرتا تھا۔ وہ سیدھا میرے پاس آیا اور بولا۔ ”تم مجھے ایک منٹ دے سکتے ہو۔“

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس وقت کاؤنٹر پر کوئی گاہک نہیں تھا، میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔“

”تم کیا کر رہے ہو؟“ اس نے سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا۔

”دیکھ نہیں رہے، کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ہوں۔“

”نہیں۔“ وہ اُلجھتے ہوئے بولا۔ ”میرا مطلب ہے کہ تم کیا کر رہے ہو؟“

میں جانتا تھا کہ وہ کس بارے میں بات کر رہا ہے لیکن میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ ”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ تم اپنے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہو؟“ وہ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہیں شہر کے مختلف حصوں میں اس نوعیت کے کام کرتے دیکھا ہے۔ تم دن بہ دن دبلے ہوتے جا رہے ہو اور تمہاری آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ آخری بار کب پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا یا آخری بار کب تم پوری نیند سوئے تھے؟“

میں اس سے بھی زیادہ اچھے سوالات کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی ایک سوال داغ دیا۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اب تم بینجو کیوں نہیں بجاتے؟“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں بینجو نہیں بجاتا جبکہ ہمیں الگ ہوئے تین سال ہو چکے ہیں۔“

”اور اس تین سال کے عرصے میں تمہارا لہجہ بھی بدل گیا ہے، کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟“

اس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں اور پھر چہرہ سپاٹ ہو گیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہ رہا تھا لیکن میں پہلے بول پڑا۔ ”تم نے کبھی اس پر غور نہیں کیا ہو گا کہ لوگ تمہارے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ تمہیں ایک زمانہ جانتا ہے لیکن تمہیں اس کا کوئی خیال نہیں ہے۔“

”مجھے پروا ہے اور میں جو کچھ کرتا ہوں، اس کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دیتا۔“

ممکن ہے کہ یہ سچ ہو۔ ممکن ہے کہ میں بھی اسی کی طرح لوگوں کی پروا کرتا ہوں۔ میں واپس کاؤنٹر پر آیا۔ ایک تھیلے میں کچھ تازہ برگر اور فرائی فش ڈالی اور اسے پکڑاتے ہوئے بولا۔ ”ہماری برگر شاپ پر آنے کا شکریہ۔ امید ہے کہ تم جلد ہی دوبارہ آؤ گے۔“

☆☆☆

میں اپنے کام کے ساتھ ساتھ مسز فریڈی کے صحن کی صفائی بھی کر رہا تھا۔ روزانہ ٹنوں کے حساب سے مٹی اور کچرا اٹھاتا۔ اس مشقت کے باوجود نیند نہیں آتی تھی اور نصف شب کے بعد جاگنا میرا مقدر بن گیا تھا۔ میں نے اس شب بیداری کا فائدہ اٹھانے کے لیے سیکیورٹی گارڈ کی ملازمت تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ہمارے چھوٹے سے قصبے میں اس طرح کی ملازمت دستیاب نہ تھی۔ چنانچہ جب مجھے نیند نہ آتی تو میں باہر سڑک پر نکل جاتا اور اپنے علاقے میں یونہی بلامقصد گھومتا رہتا۔ پروفیسر چیڈوک کے گھر کے آگے سے بھی گزر ہوتا۔ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اس کے سامنے والے پورچ کو دیکھتا رہتا۔ میں ہال کو اپنے گھر کے روشن کمروں میں گھومتے ہوئے دیکھتا۔ اس کے گھر کی کھڑکیاں اور شیشے بے داغ تھے اور ان پر مٹی یا گندگی کا کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی خادمہ روزانہ ان کھڑکیوں کو صابن ملے پانی سے صاف کیا کرتی تھی۔

ہال کے دو گھر مین ہٹن اور لاس اینجلس میں تھے۔ اس کے علاوہ ساحل پر ایک کیبن بھی اس کی ملکیت تھا لیکن وہ سال کا بیشتر حصہ... ہمارے چھوٹے سے قصبے میں گزارتا تھا تاکہ اپنے علم سے یہاں کے طالب علموں کو فیض یاب کر سکے۔ اس رات بھی میرا اتفاقاً وہاں سے گزر ہوا لیکن نہ جانے کیوں آگے جانے کے بجائے اسی درخت کے نیچے رک گیا۔ میں سرد رات میں ایک مجسمے کے مانند ساکت کھڑا ہوا تھا۔ کمپیوٹر پر بیٹھنا یا ٹیلی فون سننا اور ٹی وی دیکھنا، ہال کے معمولات میں شامل تھا۔ اس وقت بھی وہ کوئی ڈی وی ڈی دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ اس کی اپنی ہی کوئی فلم ہے۔ اس نے نہ صرف ان فلموں کے لیے پسِ پردہ کنٹری کی تھی بلکہ ان میں مختصر رول بھی کیے تھے۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

میرا وجود تاریکی میں چھپ گیا تھا۔ میرے ذہن میں خیالات کی آندھی چل رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ کاغذ کے بجائے دماغ کی دیواروں پر کچھ لکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ مسز فریڈی کے عقبی صحن کا دوسرا درخت کب گرے گا اور کب وہ مجھے پیسٹری بنا کر کھلائے گی۔

دو بجے کے قریب بیتھ گلی کے کونے سے نمودار ہوئی اور سیدھی ہال کے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے اپنے آپ کو باڑ کے پیچھے چھپالیا۔ بیتھ نے بہت ہی خوب صورت سلور کلر کا لباس پہن رکھا تھا۔ میری انگلیوں میں جلن ہونے لگی۔ یہ جلن نہیں بلکہ بیتھ کو چھونے کی بے تابی تھی لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ یہ انگلیاں صرف ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ کو ہی چھو سکتی تھیں۔ بیتھ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی ہال کے گھر کے مرکزی دروازے تک گئی اور آہستہ سے اس پر دستک دی پھر اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر دروازے پر مکے برسانا شروع کردیے۔ اس کے بعد دونوں ہاتھ مسل کر اپنے سینے کے گرد لپیٹ کر کھڑی ہوگئی۔ اب اس کا رخ سڑک کی جانب تھا۔ شاید وہ جاننا چاہ رہی تھی کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی اور پریشان لگ رہی تھی۔ سردی کی وجہ سے اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

ہال دروازے پر آیا اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر میں فوراً سمجھ گیا کہ اسے بیتھ کا آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے سرگوشی میں سوال کیا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے کہ بیتھ کو دیکھ کر اسے خوشی نہ ہوئی ہو؟'' وہ کچھ بے چین اور ناراض سا نظر آرہا تھا۔ ان کے درمیان ہلکی سی جھڑپ ہوئی۔ ہال نے اسے اندر آنے کے لیے بھی نہیں کہا بلکہ ڈیوڑھی میں ہی کھڑے کھڑے اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے اپنے بازو سینے پر باندھ لیے تھے اور بار بار اپنا سر ہلا رہا تھا۔ بیتھ نے بھی اپنا سر ہلایا اور اس کے بعد ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہ ہوسکا۔ بے اختیار میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور رک گیا۔ میں اس کے لیے یہی کچھ کرسکتا تھا۔ اس سے زیادہ میرے بس میں نہیں تھا۔ وہ مجھے نہیں جانتی تھی۔ اس کے دل میں میرے لیے کوئی چاہت نہ تھی۔ میری محبت یک طرفہ تھی۔ مجبوراً مجھے پیچھے ہٹنا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ ہال نے انگلی سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور وہ اس کی جانب دیکھنے لگی۔ ہال نے بھی اس کے آنسوؤں سے تر چہرے پر نظریں جمادیں پھر نہ جانے کیا کہا کہ وہ نرم پڑگئی۔ ہال نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور وہ اس کے سینے میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔ وہ اسے گھر کے اندر لے گیا اور دروازہ آہستہ سے بند کردیا۔

دوسرے دن بیتھ کلاس میں نہیں آئی۔ میں نے دیکھا کہ ہال کے گال پر ایک ہلکی سی خراش تھی اور چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ ساری رات نہیں سو سکا ہے۔ یہ ہمارا آخری سال تھا اور بیتھ پورے ہفتے کلاس سے غائب رہی جبکہ ان دنوں کلاس میں کافی کام ہو رہا تھا، ہم اپنے اپنے پروجیکٹس مکمل کر رہے تھے اور ہمارے درمیان مقابلے بھی جاری تھے۔ جوڈی نے اپنے باپ کے بارے میں مضمون لکھا۔ میٹ نے اپنی ماں کو کہانی کا کردار بنایا۔ جارجی کو خلا اور سیاروں سے دلچسپی تھی۔ اس نے اپنے مضمون میں مختلف سیاروں کے بارے میں بتایا۔ اسی طرح کلاس کا ہر لڑکا اور لڑکی کسی نہ کسی موضوع پر لکھ رہے تھے۔ ہال ہر کہانی کے بارے میں تبادلہ خیال کرتا اور بتاتا کہ یہ فکشن ہے یا نہیں۔ اس نے سب لوگوں کی تحریریں سننے کے بعد مجھ سے پوچھا۔

''تم نے اس مقابلے کے لیے کچھ لکھا ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

اسے اس جواب کی توقع نہیں تھی اس لیے وہ تھوڑا سا حیران ہوا، اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ان میں میرے لیے نفرت اور حقارت کی جھلک واضح تھی۔ میں اس کے خیال میں ایک نالائق طالب علم تھا جس سے کسی قسم کی کارکردگی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں نے بھی ان باتوں کی پروا نہیں کی۔ اس لیے اس روز بھی اس کی طنزیہ مسکراہٹ اور نفرت آمیز نگاہوں کو برداشت کرگیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ کلاس میں دوسرے طالب علم بھی میرے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھتے تھے۔ اس کے باوجود میری کوشش ہوتی تھی کہ اپنی دلکشی برقرار رکھوں گو کہ اس سے مجھے کوئی مدد نہیں ملتی تھی۔

ہال نے ہاتھ پھیلائے اور میں نے اپنی کہانی اسے پکڑا دی۔ وہ اس کے صفحات پلٹنے لگا۔ وہ ایک کٹا پھٹا مسودہ تھا جسے میں نے کمپیوٹر پر نہیں بلکہ اپنے پرانے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کیا تھا جس کی حالت یہ ہوگئی تھی کہ اگر زور سے کی پر انگلی ماردو تو کاغذ میں سوراخ ہوجاتا تھا۔ اس مسودے کے تمام صفحات اسی طرح کے سوراخوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہال اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولا۔

''یہ تو بہت چھوٹا ہے۔''

''ہاں کیونکہ یہ ابھی مکمل نہیں ہوا۔''

''پھر تم نے اسے جمع کیوں کرایا؟''

"تم اسے ایک خاص نمونے کے طور پر دیکھ سکتے ہو۔"

اس نے اپنا سر میری طرف گھمایا اور مجھے گھورنے لگا۔ اس کے چہرے کی نرمی رخصت ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ایسے تاثرات نے لے لی تھی جن سے ناگواری جھلک رہی تھی۔ وہ گردن ٹیڑھی کرتے ہوئے بولا۔ "بہت خوب، تم اسے پڑھنا شروع کرو۔"

عام طور پر دوسرے طالب علم اپنی نشست پر کھڑے ہو کر اور ہال کی طرف منہ کر کے پڑھنا شروع کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس میں چلتا ہوا سامنے کی طرف گیا اور اس طرح کھڑا ہو گیا کہ میرے چہرے کا رخ کلاس کی طرف اور پشت ہال کی طرف تھی۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

"پروفیسر فریڈرک چاہتا ہے کہ ہم اسے "بل" کہہ کر پکاریں اور ہمیں بتاتا رہتا ہے کہ وہ اتنا عقل مند کیوں ہے۔ ایسا کہتے ہوئے اس کی آواز میں غرور جھلکنے لگتا ہے گو کہ اپنے طور پر وہ عاجزی اور انکساری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کلاس میں موجود طالب علم بالخصوص نئی آنے والی لڑکیاں بڑی توجہ اور انہماک سے اس کی تقریر سنتی ہیں......"

جتنی دیر تک میں مسودہ پڑھتا رہا۔ پوری کلاس دم سادھے خاموش بیٹھی رہی۔ وہ سب ہال کا ردِعمل جاننا چاہ رہے تھے لیکن اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ البتہ وہاں زردی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"دفتری اوقات میں کمرے میں آ کر مجھ سے ملو۔"

"بہت بہتر۔" میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

وہ کلاس ختم ہونے کے بعد آدھ گھنٹے اپنے دفتر میں بیٹھا کرتا تھا۔ میں نے اسے راہداری سے گزرتے دیکھا اور اس کے پیچھے ہو لیا لیکن جب میں اس کے دفتر کے دروازے پر پہنچا تو وہ بند ہو چکا تھا۔ گویا وہ چاہتا تھا کہ میں دستک دے کر اندر جاؤں۔ اسے قدم قدم پر چھوٹی چھوٹی فتوحات کی ضرورت تھی۔ میں بھی کسی سے کم نہیں ہوں۔ اگر وہ مجھے جھکانا چاہ رہا تھا تو میرے پاس بھی اس کا توڑ موجود تھا۔ لہٰذا میں دستک دیے بغیر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے اس کے پیروں میں اسپرنگ لگے ہوئے ہوں۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور دماغ میں طرح طرح کے خیالات سر اٹھانے لگے۔ غالباً وہ مجھے ڈرانے دھمکانے یا کسی اور ممکنہ سزا کے بارے میں سوچ رہا ہو گا۔ وہ اس وقت کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے غور کیا تو مجھے اس کی میز کی اوپر والی دراز کھلی ہوئی نظر آئی اور میں سوچنے لگا کہ وہاں کون سا ہتھیار ہو سکتا ہے۔ خط کا لفافہ کھولنے والی چھری، چوہے مار دوا یا اعشاریہ تین دو کا ریوالور...... اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں ایک چیک بک کے سوا کچھ بھی نہ ہو۔ میرا خیال تھا کہ ہال نے ایک چیک کے عوض کئی مشکلات سے جان چھڑائی ہے۔ وہ لوگوں کو خریدنے اور ان کا منہ بند کرنے کا فن جانتا تھا۔ اس نے چند لمحے میرے بولنے کا انتظار کیا۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ میں اس سلسلے میں کہاں تک جا سکتا ہوں۔ میں نے بھی اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ مجھے اس کے گھر کی بیل بجنے اور ہال کا انکار میں سر ہلاتے رہنا یاد آ گیا۔ کس طرح ہال نے بیتھ کے قریب پہنچ کر اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لیا اور گھر کے اندر لے گیا۔ میں اسے جان سے مار دینا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسی شخص نے بیتھ کو چھپا رکھا ہے یا پھر قتل کر دیا ہے۔

اس نے شکستہ آواز میں پوچھا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

"تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ میں کچھ چاہتا ہوں۔"

"اس دنیا میں ہر شخص کچھ نہ کچھ چاہتا ہے۔ کوئی بھی ایسا نہیں جس کا سینہ خواہشات سے خالی ہو۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "تم ایک مصنف ہو۔ اپنی فراست کو کام میں لا کر اندازہ لگانے کی کوشش کرو کہ میں کیا چاہتا ہوں۔"

ہال اپنی میز کی طرف بڑھا اور جونہی اس نے دراز کھولی تو میرا سینہ اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ اب وہ پستول نکال کر مجھ پر فائر جھونک دے گا لیکن ہتھیار کے بجائے اس کے ہاتھ میں نوٹوں کی ایک پتلی سی گڈی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ پانچ سو ڈالرز ہوں گے۔ اس کے لیے یہ ایک چھوٹی سی رقم تھی۔ اس نے وہ گڈی میری طرف پھینک دی لیکن میں نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ہماری نظریں ایک بار پھر چار ہوئیں۔ ہم ایک دوسرے کو خونخوار انداز میں گھور رہے تھے۔ مجھے اس کی آنکھوں سے شعلے لپکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ غالباً ایسی ہی کیفیت میری بھی تھی۔

میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا اور اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی۔ البتہ اسے تھوڑی بہت تکلیف ضرور پہنچا سکتا تھا اور یہ حرکت میں پہلے ہی کر چکا تھا۔ جب میں نے کلاس روم میں اپنی کہانی ختم کی تو محسوس کیا کہ کچھ نئی لڑکیاں اسے پہلے جیسی عقیدت اور محبت کے ساتھ نہیں دیکھ

رہی تھیں بلکہ ان کے انداز میں ایک طرح کی گستاخی نظر آرہی تھی۔ اس نے اپنی عظمت کا جو مینار تعمیر کیا تھا، میں نے اس میں سے ایک اینٹ نکال دی تھی۔ یہ گویا ابتدا تھی۔ افواہیں اور شکوک وشبہات کسی بھی انسان کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ ہال یہ بات اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ایک بار پھر دراز کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ''تمہیں کتنی رقم چاہیے؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میرے پاس اس سے بہتر تجویز ہے۔''

''مثلاً۔'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''میرے استاد ہونے کی حیثیت سے تم مجھے اپنے ایجنٹ اور ہالی وڈ کے کچھ لوگوں سے متعارف کروادو۔''

میں نے اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے وہ مسودہ نکالا جو میں اپنے ساتھ لے گیا تھا اور اسے پکڑا دیا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہ رہی۔ اس نے مسودہ پڑھنا شروع کیا۔ پہلا جملہ، پہلا پیرا، پھر پہلا صفحہ۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری جو بتدریج گہری ہوتی چلی گئی پھر اس نے ہنسنا شروع کیا اور اچانک ہی زوردار قہقہے لگانے لگا۔

میں سمجھ گیا، وہ خوفزدہ تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ خوفزدہ شخص نہیں دیکھا کیونکہ جو کچھ اس نے کمایا تھا، وہ اس سے چھننے والا تھا اور مجھے حیرانی اس بات کی تھی کہ کیا ایسا ہوسکتا ہے؟

''مبارک ہو۔'' وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ''تم جیت گئے۔''

دوسرے دن پوری کلاس کے سامنے ہال نے مجھے اپنی تین دستخط شدہ کتابیں، فلم کا ٹکٹ اور ایک انتہائی خوب صورت چھپا ہوا سرٹیفکیٹ پیش کیا جس میں مجھے پہلے سالانہ مقابلے کا فاتح قرار دیا گیا تھا۔ میرے کلاس فیلوز یہ دیکھ کر حیران وششدر رہ گئے۔ غالباً انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ میں یہ مقابلہ جیت سکتا ہوں پھر انہوں نے اپنی کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے بے دلی سے تالیاں بجانا شروع کردیں البتہ فریڈی میرے پاس آیا اور میرے گلے لگ گیا۔ جیری نے رونا شروع کردیا۔ باقی لوگوں کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ کسی کو بھی یہ کامیابی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

میں نے تعظیماً جھک کر ان کا شکریہ ادا کیا اور ایک مختصر تقریر کی اور ہال کے ساتھ ساتھ ان کا بھی شکریہ ادا کیا جن کی وجہ سے مجھے اس کامیابی کے لیے تحریک ملی۔ وہ سب پتھر کے بُت بنے میری تقریر سن رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ مجھ جیسا نکما طالب علم یہ مقابلہ کیسے جیت سکتا ہے۔

ہال کی سفارش نے فوراً ہی کام دکھا دیا۔ اسی روز سہ پہر میں اس کے ایجنٹ کا فون آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے میرا ناول پسند آیا، اس میں جذباتی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ وہ بہت تیز اور پھرتیلا ثابت ہوا اور ہفتے کے اختتام تک اس نے میرے تین پبلشر سے معاہدے کروا دیے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑے فلم اسٹوڈیو کے ساتھ فلم کی بات بھی مکمل ہوگئی۔ ہال کا ایجنٹ اب میرا ایجنٹ بن گیا تھا۔ وہ مجھے بے بی کہہ کر بلاتا اور ہمیشہ پیسوں کی بات کیا کرتا تھا۔ اب مجھے ہال کی کامیابی کا راز معلوم ہوا۔ وہ سب اس ایجنٹ کی وجہ سے تھی۔ وہ ہر بار فون کرکے یہی کہتا۔ ''بے بی! اب تمہاری باری ہے۔ تمہیں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنا ہے۔'' اس نے معاوضے کی جو رقم مجھے بتائی، وہ میرے تصور سے کہیں زیادہ تھی۔ میں نے ٹیلی فون اپنے سینے سے لگالیا اور دل کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کرنے لگا مگر وہاں کچھ نہیں تھا اور صرف ایجنٹ کی مہین آواز سنائی دے رہی تھی۔ ''بے بی، بے بی۔'' میں نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا شکریہ پنڈورا!''

اگلے روز میں بیتھ کے گھر مور ہاؤس کی جانب چل پڑا۔ مجھے اس کے والدین کے کرب کا اندازہ تھا، میں نے پورچ کی سیڑھیاں چڑھیں اور دروازے پر دستک دے کر انتظار کرنے لگا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے دوبارہ دستک دی اور کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد دروازہ کھل گیا۔ میرے سامنے اس کا باپ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے غصے اور دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کے خاموش ہونٹوں پر ایک ہی صدا مچل رہی تھی۔

''بیتھ کا کچھ پتا چلا؟'' ظاہر ہے اسے یہی سوال کرنا چاہیے تھا کیونکہ اس کی بیٹی گزشتہ دو ہفتوں سے لاپتا تھی۔

''کس لیے آئے ہو؟'' اس نے بلند آواز سے پوچھا جس میں ہلکا سا ارتعاش نمایاں تھا۔ میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا صرف اسے اپنی کہانی پکڑا دی۔ اس پر میرا نام نہیں لکھا ہوا تھا لیکن مجھے یوں لگا جیسے اپنی زندگی کی کمائی اسے دے رہا ہوں۔ وہ اس کہانی کے کرداروں کو پہچان لے گا۔ اس کی ساری زندگی ہر شخص اور ہر بات پر شبہ کرنے میں گزری ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اس کہانی کو میرے منہ پر دے مارے گا لیکن میری آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی جس نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اس نے تیوری چڑھائی اور میری کہانی کا پہلا جملہ پڑھنا شروع کیا۔ اس کی

بیوی بھی برابر میں آکر کھڑی ہوگئی اور اپنا سر میری جانب گھما دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے رو رہا ہوں لیکن اس کا یقین اس وقت آیا جب آنسوؤں نے میرے چشمے کے شیشوں کو دھندلا دیا۔ میں وہاں سے چلنے لگا تو بیتھ کے باپ نے آواز دے کر روکنے کی کوشش کی لیکن میں نہیں رکا اور لڑکھڑاتے قدموں سے بغلی سڑک کی جانب چلنے لگا۔

چھ دن بعد ٹیلی ویژن پر خبریں دیکھتے ہوئے مجھے ہال کا چہرہ نظر آیا۔ وہ اس دن کے مقابلے میں خاصا پُرسکون لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنے غصے پر قابو پانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ وہ شیرف کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جس نے اس کے کندھوں کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ بیتھ کے سیل فون کے بل سے تمام تفصیلات معلوم ہوگئی تھیں اور پولیس والوں نے وہ تمام پیغامات پڑھ لیے جو بیتھ نے ہال کو بھیجے تھے۔ ان کے ذریعے بیتھ اور ہال کے تعلق کی تمام تفصیل معلوم ہوگئی تھی۔ بیتھ جاننا چاہتی تھی کہ ہال اس سے کب شادی کرے گا اور ان کے ہونے والے بچے کا کیا نام رکھا جائے گا۔

میں باقاعدگی سے خبریں دیکھ رہا تھا۔ اس دوران ہال کا چہرہ کئی بار ٹی وی پر نظر آیا۔ وہ تھوڑا سا پریشان دکھائی دے رہا تھا جس سے اس کے چہرے کی وحشت میں اضافہ ہوگیا تھا لیکن اندرونی طور پر وہ بہت مضبوط تھا۔ اس نے اپنے اوپر لگائے جانے والے ہر الزام کو مسترد کر دیا اور کہا کہ وہ بیتھ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور اسے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ آخری بار صبح کے وقت اس کے پاس آئی تھی اور دو گھنٹے بعد چلی گئی تھی۔ اس بات کو ایک ہفتے سے زیادہ ہوچکا ہے۔ ہال نے قسم کھا کر کہا کہ اس نے بیتھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

پولیس نے اس پر جو الزامات عائد کیے، ان میں کوئی جان نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ ان دونوں کے درمیان استاد اور شاگرد کے رشتے میں دراڑ پڑ گئی تھی اور بیتھ کو شکایت تھی کہ ہال اس کے ساتھ نامناسب رویہ اختیار کر رہا ہے۔ وہ یہی شکایت لے کر اس کے پاس گئی تھی اور ہال کے کہنے کے مطابق دو گھنٹے بعد وہاں سے چلی گئی تھی بیتھ اٹھارہ سال کی ہوچکی تھی اور اپنے ہر عمل وفعل کے لیے خود مختار تھی۔ اگر ہال نے اس کے ساتھ تعلقات قائم کیے تو یہ کوئی جرم نہیں تھا...... اگر اس نے بیتھ سے شادی نہیں کی تو یہ بھی کوئی جرم نہیں تھا اور اگر اس نے بیتھ کے ہونے والے بچے کو اپنا نام دینے سے انکار کیا تب بھی اس پر کوئی فردِ جرم عائد نہیں کی جاسکتی تھی۔ پولیس یہ ثابت کرنے میں ناکام رہی تھی کہ بیتھ کی پراسرار گمشدگی میں ہال کا کوئی کردار تھا۔ اس لیے اسے زیادہ عرصہ قید میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ ہال نے بڑے بڑے وکیلوں کی خدمات حاصل کرلی تھیں اور وہ اپنے مضبوط دلائل کے ساتھ میدان میں موجود تھے۔ پولیس کو شبہ تھا کہ ہال منشیات کے دھندے میں بھی ملوث ہے اور وہ اس کے گھر کی تلاشی لینا چاہ رہی تھی لیکن ہال کے وکیل بڑے چوکنا تھے۔ انہوں نے پولیس کی ایسی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا، ہال پر کوئی الزام ثابت نہ ہوسکا تھا لہٰذا اسے رہا کر دیا گیا۔ البتہ اس کے لیے اس کالج میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس الزام کے بعد وہ کسی کو اپنا چہرہ دکھانے کے قابل نہ رہا تھا۔ گو پولیس اسے مجرم ثابت نہ کرسکی لیکن سب لوگوں کو یقین تھا کہ بیتھ کی گمشدگی میں اسی کا ہاتھ ہے۔ ہال کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ کسی دوسری یونیورسٹی یا کالج میں ملازمت اختیار کرسکتا تھا۔ البتہ یہ کوئی نہ جان سکا کہ بیتھ کہاں چلی گئی۔

اب میں اس حیثیت میں ہوں کہ ایک بہتر اپارٹمنٹ میں رہائش اختیار کرسکوں لیکن میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ میں یہیں رہ کر انتظار کرنا چاہتا ہوں۔ اسی کمرے کے تاریک گوشے میں کھڑکی کے پاس کھڑے ہوکر مسز فریڈی کے تاریک صحن میں جھانکتا رہتا ہوں۔ اس کے صحن کا کام جاری ہے۔ باڑ تقریباً مکمل ہوچکی ہے اور زمین کو بھی ہموار کیا جاچکا ہے۔

ہال کا کیریئر اب بھی آگے بڑھ رہا ہے لیکن پہلے والی بات نہیں رہی۔ میں نے اس کے قلعے میں کئی جگہ شگاف ڈال دیے ہیں۔ ایجنٹ مجھ سے جلد از جلد ایک نئی کتاب کا تقاضا کر رہا ہے۔ میں پسینے میں شرابور ٹائپ رائٹر پر جھکا اپنی تخلیق کی دیوی کو آواز دے رہا ہوں جو مجھے لکھنے کی تحریک دیتی ہے۔ وہ کبھی چھپتی ہے، کبھی شرماتی ہے اور کبھی غیر متوقع طور پر آکر مجھے حیران کر دیتی ہے۔

پنڈورا تاریکی میں میرے ساتھ انتظار کرتی ہے۔ میں ایک تباہ حال شخص ہوں اور جانتا ہوں کہ میری عظیم تخلیقات عورت کی محبت کے بغیر ہیں۔ میں بھی اسے نہیں بھلا سکتا اور نہ ہی اسے چھوڑ سکتا ہوں، جانتا ہوں وہ ہمیشہ میرے خیالوں میں آتی رہے گی۔ مجھ سے نفرت کرتی رہے گی۔ میری تنہا سرد راتوں کو اپنے تصوراتی وجود سے حرارت بخشے گی۔ وہ مجھے بہت یاد آتی ہے۔

میں اپنی کہانیوں میں محبت کی سچائی، اس کے درد، تنہائی اور اس کے ساتھ آنے والے خالی پن کے بارے میں لکھتا ہوں اور یہی میری کامیابی کا راز ہے۔



قسط:12

شیش محل

اسماء قادری

جہاں، پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربِ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ وخم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کردیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصّہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار وتحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان



گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ قیام پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جولیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کولیگ ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی ثنا بھی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جولیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیردار و سیاست داں دلدار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ دلدار آغا کانگریس سے تعلق رکھتا ہے۔ جولیٹ اپنے اخبار کی طرف سے دلدار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ دلدار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے انٹرویو کے بعد جولیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جولیٹ کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالت بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جولیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ ثنا اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ لٹی پٹی جولیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جوزفین حرکت قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جولیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جولیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بدمعاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق ربن دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جولیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جولیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ دلدار آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جلسے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جولیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جوزفین نے اس کے لیے ایک صندوقچی میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جولیٹ صندوقچی کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وہائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جوزفین اور ایک اجنبی مرد کی جوانی کی ہے۔ جوزفین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں ماضی میں ایک نواب خاندان کی گورنس کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔ دوران ملازمت جوزفین اور نواب زادہ اسد اللہ کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ادھر فاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر فاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہیں ان کی ملاقات سیٹھ بھاٹیہ سے ہو جاتی ہے۔ سیٹھ ربن دادا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق فاروق کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے شملہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں سیٹھ بھاٹیہ کی رہائش گاہ پر بطور مہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھاٹیہ کی بیٹی بملا سے ہوتی ہے جو بیوہ ہے۔ بملا اور فاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ ادھر طوائف زادی چاند بانو جو فاروق سے محبت کرتی ہے اور فاروق کے دل میں چاند بانو کی محبت نہ سہی مگر وہ چاند بانو کا دل سے احترام کرتا تھا، وہ شوٹنگ کی غرض سے شملہ جاتی ہے اور فاروق سے ملنے بھاٹیہ کی رہائشگاہ پہنچتی ہے۔ تاہم بملا اسے فاروق سے ملنے نہیں دیتی اور دل میں رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے مگر فاروق چاند بانو سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ادھر ربن دادا جولیٹ کی بربادی کے ذمے دار شخص کی کھوج میں رہتا ہے۔ تاہم جولیٹ اسے کچھ نہیں بتاتی۔ ربن دادا محلے کی ایک بیوہ ثریا بانو کی شادی کے انتظامات کرتا ہے۔ ثریا بانو کے پیچھے مجو دادا نامی غنڈا لگا ہوتا ہے جسے ربن دادا پہلے ہی سبق سکھا چکا ہوتا ہے۔ مجو دادا اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے دو غنڈوں کے ذریعے ربن کے ایک آدمی کو قتل کرا دیتا ہے تاہم ربن کے آدمی ایک مکان پر دھاوا بول کر وہاں تہلکہ مچا دیتے ہیں اور انہیں اب مجو کی تلاش ہوتی ہے۔ ربن جولیٹ سے ملاقات کے دوران کچھ سوالات کرتا ہے جس سے اسے جولیٹ کی زندگی تباہ کرنے والے کے بارے میں چھان بین کا موقع مل جاتا ہے۔ فاروق بھاٹیہ کی رہائش گاہ سے چہل قدمی کے لیے جنگل کی طرف نکلتا ہے اور اسے وہاں بملا ایک غنڈا صورت شخص کے ساتھ نظر آتی ہے جو اس سے کوئی کام لینا چاہتی ہے۔ ادھر ربن فاروق کو تشدد کا نشانہ بنانے کے ذمے دار ولیم کو اٹھوا لیتا ہے اور اب ولیم اس کے غیظ و غضب کا نشانہ بن رہا ہوتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

’’کون ہے تم اور ہم سے تمہارا کیا دشمنی ہے؟‘‘ الٹے لٹکے آدمی نے لرزیدہ لہجے میں ربن سے پوچھا۔

’’تم گورے تو سنا ہے نسلوں کا حساب کتاب رکھ کر چلتے ہو اور برسوں پہلے قوموں کی تقدیر کا فیصلہ کر لیتے ہو پھر

تیرے کو اتنی جلدی کیسے بھول گیا کہ تُو نے کس سے دشمنی پالی تھی۔ ایسے چھت سے الٹا لٹکنے کے بعد تو تیرے کو خود ہی یاد آ جانا چاہیے تھا۔ تو کیا سمجھ رہا تھا کہ تو اپنے شہزادے کو تھانے میں الٹا لٹکوا کر اس کا حلیہ بگاڑ دے گا اور اپن تیرے کو چھوڑ دے گا۔ تجھے اس کو لگے ایک ایک زخم کا بیاج کے ساتھ حساب دینا ہوگا سفید چمڑی والے سور۔ سرکاری دفتروں میں تیری افسری کا زور چلتا ہوگا لیکن ادھر کا افسر اپن ہے۔ اپن ربن دادا......''

''ربن دادا...... او ہ آئی سی۔'' الٹا لٹکا آدمی جو دراصل انگریز افسر ولیم تھا، اتنا ہی کہہ کر رہ گیا۔ یقیناً اسے یاد آ گیا تھا کہ اس نے فاروق کو کس طرح کے سلوک کا نشانہ بنایا تھا۔ فاروق کا جرم صرف اتنا تھا کہ زمرد بائی کے کوٹھے پر وہ عین اس وقت چاند بانو کے ساتھ موجود تھا جب انگریز افسر ولیم، مجو دادا کے ساتھ چاند بانو کا مجرا دیکھنے کی خواہش لیے وہاں پہنچا تھا۔ چاند بانو نے اس روز پیشگی ہی زمرد بائی کو آگاہ کر دیا تھا کہ وہ فاروق کی موجودگی میں محفل آرائی نہیں کرے گی لیکن مجو دادا اور ولیم کے لیے اس کا انکار قابل قبول نہیں ہوا اور انہوں نے کوٹھے پر ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ پھر جب انہوں نے چاند بانو کے انکار کی وجہ کے طور پر فاروق کو دیکھا تو مجو دادا خصوصاً آپے سے باہر ہو گیا۔ اس وقت اگر فاروق ولیم کو یرغمال بنا کر زمرد بائی کے کوٹھے سے نہ نکل جاتا تو مجو دادا اور اس کے ساتھی مل کر اس کی تکا بوٹی کر دیتے۔ بخشا بہرحال ولیم نے بھی نہیں تھا اور اپنے اختیارات کا فائدہ اٹھا کر فاروق کو تھانے میں الٹا لٹکوا کر تشدد کا نشانہ بنوایا تھا۔ سر کی وہ نازک چوٹ جس کا علاج اب بھی جاری تھا اسی تھانہ یاترا کی نشانی تھی۔ اس واقعے کے فوراً بعد اگر ولیم اپنے خاندان کے ساتھ انگلستان نہ چلا گیا ہوتا تو ربن فوراً حساب بے باق کر دیتا لیکن بھولا وہ بہرحال نہیں تھا اور اس کے آدمی مسلسل ٹوہ میں لگے رہے تھے کہ ولیم کب ہندوستان واپس آتا ہے۔ واپسی کے بعد اس کی نگرانی شروع کروا دی گئی تھی اور آج صبح جب ولیم صبح کی سیر کے لیے گھر سے نکلا تو ربن کے آدمیوں نے اسے اغوا کر لیا۔ بے ہوشی کی حالت میں بوری میں بند ولیم کب اس تاریک تہ خانے میں لایا گیا، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو سکی اور اب وہ چھت سے الٹا لٹکا ربن کے رحم و کرم پر تھا اور ربن کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس پر قطعی رحم نہیں کرنے والا۔

''یاد آ گئی نا تیرے کو اپنے سے دشمنی۔ اب بول تو تیار ہے اپنے کو حساب دینے کے لیے۔'' وہ ولیم سے مخاطب ہوا تب بھی اس کے لہجے میں سانپ پھنکار رہے تھے۔

''لک دادا...... تمہارا بوائے ہمارے ساتھ مس بی ہیو کیا تھا اس لیے ہم نے اسے اریسٹ کروایا تھا۔ تم اپنے لائر کے ساتھ جا کر اسے پولیس کسٹڈی سے نکال لیا تھا تو وہ بات ادھر ہی فنش ہو گیا تھا۔ اب تم کیوں اس بات کو اور چھیڑتا ہے۔'' ولیم کی سٹی گم تھی۔ الٹا لٹکے ہوئے اسے بولنے میں بھی مشکل پیش آ رہی تھی لیکن ربن کے تیور دیکھ کر وہ اپنے دفاع میں بولنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

''بات ایسے ختم نہیں ہوتی سفید چوہے۔ بات اس وقت ختم ہوگی جب اپن تیرے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گا جو اس روز تھانے میں اپنے بچے کے ساتھ ہوا تھا۔'' ربن نے خونخوار لہجے میں اسے جواب دیا اور اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ حرکت میں آ گئے۔ تہ خانے کی محدود فضا میں ولیم کی چیخیں گونجنے لگیں۔ ان چیخوں کے باہر نکلنے کے لیے وہاں کوئی روزن موجود نہیں تھا اس لیے ولیم کے لیے کوئی مدد آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

☆☆☆

''آج رات گیارہ بجے حویلی کے پائیں باغ میں ہم سے ملاقات کریں۔'' انگریزی زبان میں بے حد باریک لکھائی میں لکھے اس جملے کے آخر میں نواب زادہ اسد اللہ کا نام تحریر تھا۔ یہ جملہ عالیہ کی نوٹ بک پر تحریر تھا۔ عالیہ نے نوٹ بک گزشتہ روز دیے گئے ہوم ورک کو چیک کروانے کے لیے اس کے حوالے کی تھی۔ عالیہ کے بنائے جملوں کو چیک کرتی ہوئی جوزفین نے سب سے آخر میں درج یہ جملہ پڑھا تو بری طرح چونک گئی اور چور نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھا۔ عالیہ ابھی انگریزی سیکھنے کے بالکل ابتدائی مراحل میں تھی اور پہلے چھوٹے اور سادہ جملے لکھنا اور بولنا سیکھ رہی تھی اس لیے اس بات کا تو امکان نہیں تھا کہ وہ اسد اللہ کے تحریر کیے گئے اس جملے کو سمجھ سکی ہو۔ جملے لکھا بھی کچھ اس انداز میں تھا کہ کسی نو آموز کے لیے اسے پڑھنا دشوار ثابت ہوتا پھر بھی اسے عالیہ سے عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تو یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتی تھی کہ اسد اللہ نے یہ جملہ اس کی نوٹ بک پر لکھا کیونکر ہوگا۔

''آج صبح جب ہم آپ کے دیے ان جملوں کو بنانے کی مشق کر رہے تھے، اسد بھائی جان ہمارے کمرے میں تشریف لے آئے۔ انہوں نے ہم سے ہماری نوٹ بک لے کر دیکھی اور بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے آپ کی ٹیچر تو آپ کو بہت عمدہ پڑھا رہی ہیں اور کچھ دنوں میں ہی آپ

نے کافی سیکھ لیا ہے۔ لائیے ہم آپ کی ٹیچر کی اس کارکردگی پر ان کی تعریف تحریر کر دیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ اسد بھائی جان نے کیا لکھا ہے؟'' عالیہ کے پُراشتیاق لہجے میں ادا کیے الفاظ نے اسے اس کے سوال کا جواب دے دیا اور وہ خود پر قابو پا کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''اصل کمال آپ کی محنت اور شوق کا ہے نواب زادی صاحبہ...... آپ کے بھائی جان نے مجھے کریڈٹ دے دیا، بہرحال آپ میری طرف سے انہیں تھینکس کہہ دیجیے گا۔'' بولتے ہوئے وہ غیر محسوس انداز میں نواب زادہ اسد اللہ کے تحریر کردہ جملے پر قلم سے آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتی جا رہی تھی۔ حویلی میں انگریزی زبان سے گنتی کے چند لوگ ہی آشنا تھے اور ان کی عالیہ کی نوٹ بک تک رسائی کا بظاہر کوئی امکان بھی نہیں تھا لیکن اتفاقی حادثات کا امکان تو اپنی جگہ رہتا ہے، اس لیے اس نے مناسب سمجھا کہ احتیاطاً اس تحریر کو تلف کر دیا جائے۔ عالیہ نے اس کی اس حرکت کو نوٹ بھی کیا تو زبان سے کچھ نہیں بولی اور اس مکالمے کے بعد معمول کے مطابق پڑھائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جوزفین نے اپنی الجھن کا اظہار عالیہ کے سامنے نہیں ہونے دیا البتہ خود اپنے کمرے میں واپس آنے کے بعد بھی الجھی رہی۔ اظہارِ محبت کے بعد سے اسد اللہ نے لائبریری میں قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ اپنے معمول کے مطابق لائبریری جاتی تو کان اسد اللہ کے قدموں کی آہٹ پر ہی مرکوز رہتے لیکن مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا اور آج یہ پیغام مل گیا تھا۔

اصولاً اسے اس پیغام کو پڑھ کر خوش ہونا چاہیے تھا لیکن وہ الجھ گئی تھی۔ اسے اسد اللہ کی طرف سے چوری چھپے کی ملاقاتوں کا مطالبہ کرنے کی امید نہیں تھی اور ان کی طرف سے ایسا تقاضا ہوا تھا تو اس کے پیچھے یقیناً کوئی نہ کوئی سبب تھا۔ وہ ان کی اس خواہش کو رد نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن ڈر بھی لگ رہا تھا کہ کہیں کسی کو خبر نہ ہو جائے۔ اس حویلی میں آنے کے بعد اس نے زندگی میں پہلی بار سکھ اور آسودگی کے دن دیکھے تھے اور اسے اندازہ تھا کہ یہاں کے نازک مزاج مکین ذرا سی غلطی پر اسے حویلی بدر بھی کر سکتے ہیں لیکن ہر ڈر اور مصلحت پر محبت کی بے اختیاری ہمیشہ حاوی رہی ہے۔ جوزفین کے ساتھ بھی یہی ہوا اور وہ اسد اللہ کے دیے ہوئے وقت پر اس سے ملاقات کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

رات کے اس پہر حویلی میں سناٹے کا راج تھا۔ حویلی کے مکین اپنے آرام دہ بستروں پر پُرسکون نیند سوئے ہوئے تھے۔ صرف وہ تھی جو اسد اللہ کی پکار پر بے قرار ہو کر دبے قدموں باہر کی طرف جا رہی تھی۔ نیم تاریک راہداریوں سے گزرتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ہر قدم پر یوں لگتا تھا کہ ابھی کسی سے سامنا ہو جائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ بہ خیریت پائیں باغ میں پہنچ گئی۔ یہاں روشنی اور بھی کم تھی اور دن میں خوش نما منظر پیش کرنے والے باغ کے درخت اور پتے ہیبت ناک سایوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے میں کسی نے اس کے شانے پر پیچھے سے ہاتھ رکھا تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

''یہ ہم ہیں جوزفین۔ ڈریے نہیں۔'' اسد اللہ کی سرگوشی بالکل بروقت تھی پھر بھی اسے خود کو سنبھالنے میں چند لمحے لگے۔ بے حد رفتار سے بھاگتے دل اور اچھل پچھل سانسوں کے قابو میں آنے کے بعد ہی وہ اپنے قریب کھڑے اسد اللہ کا چہرہ دیکھنے میں کامیاب ہو سکی۔ روشنی کم ہونے کے باوجود اس کا چاند کی طرح چمکتا چہرہ نمایاں تھا۔

''ہم شرمندہ ہیں کہ آپ کو یہاں اس وقت آنے کی زحمت دی۔'' اس کا ہاتھ تھام کر ایک گوشے میں موجود سنگی بنچ تک لے جاتے ہوئے اسد اللہ نے معذرت کا اظہار کیا۔

''اور میں حیران ہوں کہ آپ کو اس کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟'' جوزفین نے فوراً ہی اپنی الجھن کو سوال کی صورت پیش کر دیا۔

''ہم نے کوشش کی تھی کہ خود کو قابو میں رکھ سکیں اور آپ کو کسی الجھن میں نہ ڈالیں لیکن دل کی بے تابی نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم یہ جسارت کر گزریں۔ ہمارے لیے ممکن نہیں رہا تھا کہ مزید آپ سے ملاقات کیے بغیر رہ سکیں۔'' نواب زادہ کی ٹھنڈی سانس بھر کر کہی گئی اس بات نے اسے چونکا دیا۔

''میں کچھ سمجھی نہیں نواب زادہ صاحب۔ کیا کوئی پرابلم ہے؟ آپ کچھ دن سے لائبریری نہیں آ رہے تھے تو میں سمجھی کہ کہیں بزی ہوں گے۔ میں نے لنچ اور ڈنر کی ٹائمنگ میں بھی آپ کو زنان خانے کی طرف آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔'' اس نے پریشانی سے استفسار کیا۔ اسد اللہ سے ملاقات نہ ہونے پر بے چینی تو اسے بھی تھی لیکن اس نے خود کو یہ سوچ کر تسلی دے لی تھی کہ اسد اللہ اتنی بڑی جاگیر کی دیکھ بھال میں باپ اور بڑے بھائی کا ہاتھ بٹاتے ہیں، یقیناً اسی سلسلے میں کوئی مصروفیت ہو گی لیکن یہاں تو کچھ اور آثار نظر آ رہے تھے۔ اسد اللہ کے جواب نے اس کے اندیشوں کی تصدیق کر دی۔ اسد اللہ نے اپنی والدہ نواب بیگم سے ہونے والی ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے اسے بتایا کہ ان کے

معمولی میل جول کو بھی حویلی کے کچھ مکین مشکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور اس کی والدہ کو خدشہ ہے کہ اگر بات بڑے نواب صاحب تک پہنچی تو انجام ان کی عشرت جہاں سے شادی بھی ہو سکتا ہے اور وہ اس عبرت ناک انجام سے بچنے کے لیے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فی الحال انہیں احتیاط سے کام لینا ہوگا اور کھلے بندوں ملاقات سے مکمل گریز کرنا ہوگا۔

''اور یہ خفیہ ملاقات...... اگر کسی کو اس کا علم ہو گیا تو شک یقین میں بھی بدل سکتا ہے۔'' جوزفین نے سب کچھ سننے کے بعد لرزیدہ لہجے میں اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔ اسے احساس تھا کہ اس سارے معاملے میں سب سے کمزور فریق وہی ہے اس لیے سب سے پہلے بجلی اسی پر گرے گی۔ ملازمت سے برطرفی تو شاید معمولی سزا ہوتی۔ اس کے ساتھ جانے کیا کچھ ہو سکتا تھا۔ اونچی دیواروں کے پیچھے ہونے والے بھیانک جرائم کی کچھ کہانیاں تو اس کے کانوں نے بھی سن رکھی تھیں اور وہ جانتی تھی کہ طبقاتی فرق نے ہمیشہ محبت کی راہ میں کانٹے بچھائے ہیں اور یہاں تو مذہب بھی جدا جدا تھے۔

''ہمارے خیال میں اگر ہم دونوں احتیاط سے کام لیں تو ایسا نہیں ہوگا۔ سب سے زیادہ احتیاط تو یہی کرنی ہوگی کہ کسی کو اپنا راز دار نہ بنایا جائے۔ حویلی کی کس ملازمہ کی حقیقی وفاداری کس کے ساتھ ہے، اس بارے میں ہم بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ آپس میں رابطے کے لیے کسی تیسرے فرد کا سہارا نہ لیا جائے اور جیسے آج ہم نے ایک سبیل نکالی ہے، اسی طرح آئندہ بھی ایسی ہی کوئی ترکیب استعمال کی جائے کیونکہ یہ طے ہے کہ ملاقات کیے بغیر تو اب کسی طور نہیں رہا جا سکتا۔'' نواب زادہ اسد اللہ کا لہجہ خمار آلود ہونے لگا اور وہ دھیمی آواز میں اسے اپنے دل کی بے تابی سے آگاہ کرنے لگا۔ یہ الفاظ اور یہ انداز اس نے کبھی لائبریری میں ہونے والی ملاقاتوں میں اختیار نہیں کیا تھا۔ شاید یہ خطرہ رہتا ہوگا کہ آتی جاتی کسی ملازمہ یا حویلی کے کسی مکین کو سن گن نہ مل جائے۔ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ لائبریری میں کتابوں کی موجودگی میں ہونے والی ملاقات اور رات کی تنہائی میں ہونے والی اس ملاقات میں فرق بھی بہت تھا۔ خود جوزفین پر فسوں ساطاری ہونے لگا اور وہ سارے اندیشوں اور خطرات کو پس پشت ڈال کر اسد اللہ کی پیار بھری سرگوشیوں میں گم ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

''ڈرائیور اور گاڑی دونوں ریڈی ہیں۔ کرشن نے کھانے کا ٹفن، واٹر کولر اور چائے کا تھرماس بھی گاڑی میں رکھوا دیا ہے۔ آئی ہوپ کہ آپ کا سفر اچھا گزرے گا اور آپ کسی شے کی کمی محسوس نہیں کریں گے۔'' فاروق، کیتھرائن اور گولو کے ساتھ ناشتے میں مصروف تھا جب بملا نے آکر اسے اطلاع دی۔ دھاری دار چست جرسی اور کھلے پائنچوں والی پینٹ میں بالوں کی اونچی سی پونی ٹیل بنائے آج پھر وہ بہت کم عمر اور نوجوان لڑکی کا تاثر دے رہی تھی۔ یہ اس کا کمال تھا کہ جب چاہتی نوعمر کالج گرل کے روپ میں ڈھل جاتی اور جب چاہتی حلیے کی ذرا سی تبدیلی کے ساتھ بھرپور پرکشش عورت نظر آنے لگتی اور ان دونوں ہی روپ میں وہ اچھی لگتی تھی، اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔

''شکریہ...... لیکن آپ نے بے کار ہی اتنا تکلف کروایا۔ کھانے وغیرہ کے اہتمام کی کیا ضرورت تھی۔ ہم چندی گڑھ پہنچ کر آرام سے ہوٹل میں بھی کھا سکتے تھے۔'' فاروق نے اسے جواب دیا تو اس کے لہجے میں ہلکی سی اجنبیت کی رمق تھی جسے بملا نے فوراً محسوس کر لیا اور آہستہ سے بولی۔

''لگتا ہے آپ ابھی تک مجھ سے ناراض ہیں۔ سفر پر جاتے ہوئے من میں ناراضی لے کر جانا اچھا نہیں ہوتا۔ آپ کہیں تو میں ایک بار پھر اس بات کے لیے آپ سے سوری کر لیتی ہوں جس کا آپ نے بُرا مانا ہو۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بھلا آپ سے ناراض ہو کر کیا کروں گا۔ ہم یہاں اتفاقاً ملے ہیں اور دوبارہ یہ اتفاق ہو، ضروری نہیں۔ بمبئی واپس جا کر میں اپنی دنیا میں مگن ہو جاؤں گا اور آپ اپنی مصروفیات میں گم ہو جائیں گی پھر بھلا ایسی باتوں کا کیا فائدہ۔'' فاروق اخلاقیات کے تقاضے ضرور نبھا رہا تھا لیکن لہجے کی اجنبیت بدستور برقرار تھی۔

''مجھے پورا وشواس ہے کہ ہم دوبارہ ضرور ملیں گے اور رہی ایک دوسرے کو بھولنے کی بات تو، میں تو آپ کو ہرگز نہیں بھولوں گی چاہے کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو جاؤں۔'' بملا کے لہجے میں کچھ خاص جذبات بول رہے تھے لیکن فاروق نے توجہ نہ دینا ہی مناسب سمجھا اور خاموشی اختیار کر لی۔ اسے اب بملا کی پراسرار شخصیت سے الجھن ہونے لگی تھی۔ ایک طرف وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب عورت تھی تو دوسری طرف مغرور اور ضدی بھی۔ فاروق اس انکشاف کو بھی نہیں بھول سکتا تھا کہ اس نے اپنے اس شوہر کو جس سے اس نے اپنے باپ کی مخالفت مول لے کر شادی کی تھی، کرائے کے قاتل کے ذریعے قتل کروا دیا تھا۔ وہ ایسی انتہا پسند عورت سے دور رہنا ہی مناسب سمجھتا تھا اس لیے


Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !
i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.
All Done
Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

اپنے رویّے میں خاصی تبدیلی پیدا کرلی تھی۔

''میرے خیال میں اب ہمیں روانہ ہوجانا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ڈاکٹر کے دیئے ہوئے ٹائم سے لیٹ ہوجائیں۔ کیوں کیتھی...... اب چلنا چاہیے نا؟'' بملا کو نظرانداز کرکے وہ کیتھرائن سے مخاطب ہوا۔ وہ اپنا ناشتا تقریباً ختم کرچکی تھی اور کوشش کررہی تھی کہ خود کو ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے مکمل لاتعلق ظاہر کرے اس لیے فاروق کے اچانک مخاطب کرنے پر تھوڑی سی سٹپٹا گئی لیکن پھر خود کو سنبھال کر بولی۔

''ناشتے کے بعد میں ایک بار پھر آپ کا چیک اپ کرلوں تو پھر چلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ناشتا کرچکا ہوں۔ تم فارغ ہوجاؤ تو میرے کمرے میں آجانا۔'' فاروق کرسی کھسکا کر کھڑا ہوگیا اور بملا کو مکمل نظرانداز کرتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔ کیتھرائن بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ فاروق کا چیک اپ کرنے کے بعد اسے مکمل فٹ قرار دیتے ہوئے اس نے سفر کے آغاز کا سگنل دے دیا تو وہ لوگ فوراً ہی وہاں سے روانہ ہوگئے۔ پیچھے بملا پر کیا گزری، فاروق نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ ایسی عورت جو اس سے وابستہ افراد کی عزت نہیں کرتی تھی اس رویّے پر کیسا محسوس کرتی ہے، اسے اس بات کی پروا نہیں تھی۔ خود کو ریلیکس رکھنے کے لیے وہ سیٹ کی پشت گاہ سے سر ٹکا کر آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ شملہ سے چندی گڑھ جانے والے گھن چکر راستے پر خود کو چکرانے سے بچائے رکھنے کے لیے یہ ایک اچھی ترکیب تھی۔ گولو اور کیتھرائن کو بھی اس نے ایسا ہی کرنے کو کہا تھا۔ گولو کو تو وہ یہیں چھوڑ کر جانا چاہتا تھا کہ آتے ہوئے بھی اس کی بہت بری حالت ہوگئی تھی لیکن گولو نہیں مانا۔ وہ تکلیف اٹھا سکتا تھا لیکن فاروق سے الگ رہنا اسے منظور نہیں تھا۔ مجبوراً فاروق اسے بھی ساتھ لے جارہا تھا۔ راستے بھر کیتھرائن اور گولو آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ فاروق آنکھیں موندے ان کی ساری باتیں سن رہا تھا لیکن اس نے خود اس گفتگو میں حصہ نہیں لیا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ ایک طرف وہ اپنے آج کے چیک اپ اور بمبئی واپسی کے حوالے سے متفکر تھا تو دوسری طرف اسے کمو کے قتل اور اڈے کی صورتِ حال کے حوالے سے بھی تشویش تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہاں بہت کچھ ہوا ہوگا اور اس تک بس مختصر خبریں ہی پہنچی ہیں۔ ایسے جولیٹ کو دیکھنے اور اس کا احوال جاننے کی بھی بے چینی تھی اور وہ بملا کی پراسرار شخصیت کے تانے بانے میں بھی الجھا ہوا تھا۔ اس کا دماغ چک پھیریاں کھاتے ہوئے کبھی ایک موضوع پر سوچتا تو کبھی دوسرے موضوع پر...... پورے راستے میں وہ دو چار بار ہی کیتھرائن اور گولو سے مخاطب ہوا۔ ایک آدھ بار گولو کو راستے کی خوفناکی سے تسلی دینے کے لیے اور یا پھر کیتھرائن کے خود کو چائے وغیرہ پیش کرنے پر۔

''فاروق بھائی، آپ نے تو اپن کو بور کردیا۔ کچھ بولتے ہی نہیں۔'' آخرکار گولو نے شکوہ کرہی دیا۔

''بور ہونے کی کیا بات ہے۔ میری جگہ کیتھی ہے تو تم سے باتیں کرنے کے لیے۔'' فاروق اس کے شکوے پر فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا اور نرمی سے بولا۔

''سسٹر کی بات الگ ہے اور آپ کی الگ۔ آپ ایسے چپ بیٹھے ہو تو اپن کو لگ رہا ہے کہ اپنے سے ناراض ہو۔'' گولو نے اپنی فطری سادگی سے اپنی دلی کیفیت کو بیان کیا تو فاروق ہنس پڑا اور بولا۔

''گولو بادشاہ! کس کی ہمت ہے کہ تم سے ناراض ہوسکے۔ تم اپنے بابا کے لاڈلے ہو اور اس سے شکایت کردی تو وہ میری کلاس لے لے گا۔'' فاروق کا اشارہ ربن کی طرف تھا۔

''لاڈلے تو آپ بھی ہو بابا کے اور بابا مجھ سے زیادہ آپ کی بات مانتے ہیں۔''

''نہیں، تمہاری بات کی زیادہ اہمیت ہے۔'' فاروق نے اس کی مخالفت کی۔

''نہیں، آپ زیادہ اہم ہو۔'' گولو نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا اور دونوں ایک دوسرے کو شدومد سے یقین دلانے لگے کہ کس کی اہمیت زیادہ ہے۔ کیتھرائن بیٹھی غیر جانبداری سے مسکراتی رہی۔ ڈرائیور بھی خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ ایسے میں سنائی دینے والی ایک زوردار آواز نے سب کو بری طرح چونکا دیا۔ ڈرائیور نے بھی ایمرجنسی میں بریک لگائے۔

''کیا ہوا ہے؟'' فاروق نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔

''ایکسیڈنٹ۔'' ڈرائیور نے جواب دیا اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلا۔ فاروق بھی فوراً حرکت میں آگیا۔ وہ اور ڈرائیور تقریباً ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جہاں ایک کار سڑک سے اتر کر الٹ گئی تھی اور اندر موجود سواریوں کی چیخیں اور آہیں سنائی دے رہی تھیں۔

''ہمیں ان کی مدد کرنی ہوگی۔'' فاروق نے کہا اور الٹی ہوئی کار کی طرف بھاگا۔ ڈرائیور نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ انہیں قریب پہنچ کر علم ہوگیا کہ گاڑی کی پچھلی نشستوں

پر دو خواتین موجود ہیں اور آگے ڈرائیور ہے۔ چیخنے اور کراہنے کی آوازیں خواتین ہی کی تھیں جبکہ ڈرائیور کی طرف بالکل خاموشی تھی۔ انہوں نے کار کے دروازے کھولنے کی کوشش کی۔ آگے کے دونوں دروازے جام ہو چکے تھے۔ پچھلی طرف سے صرف ایک دروازہ کھل سکا۔ اس کھلے دروازے سے انہوں نے اندر موجود خواتین کو کھینچ کر باہر نکالا۔ خواتین کی شکلیں دیکھنے پر فاروق بری طرح چونک گیا۔ وہ زمرد بائی اور چاند بانو تھیں اور دونوں ہی اچھی خاصی زخمی دکھائی دے رہی تھیں۔ چاند بانو کے چہرے کا بایاں حصہ بری طرح متاثر ہوا تھا اور ٹوٹنے والے شیشے کی کرچیاں رخسار میں دھنس گئی تھیں جبکہ زمرد بائی کی کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا اور وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں کراہ رہی تھی۔ چاند بانو بے ہوش نہیں ہوئی تھی لیکن سخت دہشت کا شکار تھی اور ابھی تک اس کے ہونٹوں سے چیخیں نکل رہی تھیں۔

''ڈرائیور تو مر گیا ہے۔'' خواتین کو باہر نکالنے کے بعد اگلی نشست پر موجود ڈرائیور کی طرف بڑھنے والے فاروق کے ڈرائیور نے اطلاع دی تو فاروق چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا اور خود زخمی ڈرائیور کی نبض چیک کی۔ نبض خاموش تھی۔ دیگر علاماتِ زندگی چیک کرنے پر بھی یہی نتیجہ نکلا کہ وہ بے چارہ زندگی کی بازی ہار چکا ہے۔ شاید ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں کوئی ایسی شدید اندرونی ضرب لگی تھی کہ وہ فوری طور پر مر گیا تھا۔

''مرنے والے کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے لیکن ان زخمی خواتین کو ہمیں فوراً اسپتال پہنچانا ہوگا۔'' فاروق نے فوری طور پر فیصلہ سنایا تو ڈرائیور نے بھی اس کی تائید کی۔ اس دوران میں گولو اور کیتھرائن بھی گاڑی سے نکل کر ان تک پہنچ چکے تھے۔ ان دونوں کی مدد سے زمرد بائی اور چاند بانو کو انہوں نے اپنی گاڑی میں منتقل کیا۔ کیتھرائن کے پاس اس کی میڈیکل کٹ تھی۔ وہ چلتی گاڑی میں ہی ان دونوں کو طبی امداد دینے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ زمرد بائی کی حالت زیادہ نازک ہے جبکہ چاند بانو بظاہر زیادہ زخمی نظر آنے کے باوجود اتنی خراب حالت میں نہیں تھی۔ کم از کم اس کی جان کو فوری خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب وہ قدرے پُرسکون بھی ہو گئی تھی اور چیخیں مارنے کے بجائے ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ زمرد بائی نے البتہ کراہنا بھی بند کر دیا تھا۔

''اس جگہ پر سڑک اتنی خطرناک تو نہیں ہے۔ سمجھ نہیں آ رہا کہ ان لوگوں کا ایکسیڈنٹ کیسے ہوا؟ لگتا ہے ڈرائیور نے کوئی غلطی کر دی تھی یا گاڑی میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔'' کسی کو بھی بطورِ خاص مخاطب کیے بغیر فاروق نے اس صورتِ حال پر تبصرہ کیا تو گاڑی چلاتا ڈرائیور چونکا اور پُرتفکر لہجے میں بولا۔

''نہیں، یہ ایکسیڈنٹ ڈرائیور کی غلطی سے نہیں ہوا۔ میں نے دیکھا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک بڑی گاڑی نے ان کی کار کو سائڈ ماری تھی اور کار کے لڑھک کر سڑک سے اتر جانے کے بعد تیزی سے آگے نکل گئی تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اس گاڑی والے نے جان بوجھ کر ان لوگوں کی کار کو ٹکر ماری تھی؟'' ڈرائیور کی بات پر فاروق کے کان کھڑے ہوئے۔

''مجھے ایسا ہی لگتا ہے کیونکہ وہاں سڑک اچھی خاصی چوڑی تھی اور وہ گاڑی والا چاہتا تو آرام سے اپنی گاڑی نکال کر لے جا سکتا تھا۔ پھر سائڈ لگنے کے بعد وہ ان کی ہیلپ کے لیے رکا بھی نہیں اور بھاگ گیا تو اس سے تو یہی لگتا ہے کہ اس نے جان کر سائڈ ماری تھی۔'' ڈرائیور نے اپنا تجزیہ پیش کیا تو فاروق بھی سوچ میں پڑ گیا اور بہت سے شکوک و شبہات اس کے دل میں جاگ اٹھے۔ اسے جنگل میں ہونے والی بملا اور گنیش کی ملاقات یاد آئی۔ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے سے اسے علم ہوا تھا کہ بملا نے گنیش کے ذریعے اپنے شوہر کو قتل کروایا تھا اور اب وہ کسی اور کی جان کے درپے تھی۔ کس کے؟ یہ فاروق کو پتا نہیں چل سکا تھا لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ بملا کا نیا شکار چاند بانو تھی۔ بملا چاند بانو کے حسن سے خوف زدہ تھی اور اسے اپنے اور فاروق کے درمیان رکاوٹ تصور کرتے ہوئے اس سے حسد میں بھی مبتلا تھی اس لیے بہت ممکن تھا کہ اس نے اپنی راہ کی رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی ہو۔

معاملہ جو بھی تھا فی الحال تو اسے زمرد بائی اور چاند بانو کو اسپتال پہنچانے کی جلدی تھی۔ اس نے ڈرائیور کو گاڑی مزید تیز چلانے کی ہدایت کی اور کیتھرائن سے انگریزی میں ان دونوں کا حال دریافت کیا۔ کیتھرائن نے پُرتشویش لہجے میں اسے زمرد بائی کے بارے میں آگاہ کیا۔ چاند بانو بھی بہت اچھی حالت میں نہیں تھی۔ اس کے زخموں میں شدید تکلیف ہو رہی تھی اور وہ نڈھال سی ہو کر بند آنکھوں کے ساتھ ہولے ہولے سسک رہی تھی۔ وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی لیکن ایسی حالت میں بھی نہیں تھی کہ کسی سے بات کر سکے۔ یہاں تک کہ اس نے فاروق کی موجودگی کا بھی نوٹس نہیں لیا تھا۔ ایک طرح سے وہ اپنے حواس گم کر چکی تھی

اور صدمے کی کیفیت میں تھی۔ اللہ اللہ کر کے راستہ ختم ہوا اور وہ لوگ اسپتال پہنچے۔ دونوں زخمی خواتین کو فوری طور پر اسپتال کے عملے نے طبی امداد دینی شروع کر دی۔ وہ لوگ ویٹنگ روم میں ہی موجود رہے۔

''آپ کے چیک اپ کا وقت ہو گیا ہے فاروق بھائی۔'' کچھ دیر بعد کیتھرائن نے فاروق کو اطلاع دی۔

''رہنے دو کیتھی! چیک اپ پھر کبھی ہو سکتا ہے۔ ابھی میرا یہاں رہنا ضروری ہے۔'' فاروق نے اسے جواب دیا۔ اس وقت اسے خود سے زیادہ زمرد بائی اور چاند بانو کی فکر تھی اور اس فکر میں وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ آج ہونے والے چیک اپ پر ہی اس کی بمبئی واپسی کا انحصار ہے۔ ڈرائیور کو اس نے اسپتال پہنچتے ہی پولیس اسٹیشن روانہ کر دیا تھا۔ وہ وہاں سڑک کے قریب مر جانے والے ڈرائیور کی لاش کار میں چھوڑ کر آئے تھے۔ پولیس کو اس بارے میں اطلاع دینی ضروری تھی۔ اس کام کے بعد ڈرائیور ان کا سامان ہوٹل میں پہنچاتا جہاں انہوں نے پہلے ہی کمروں کی بکنگ کروائی ہوئی تھی۔

''تم اور گولو چاہو تو ہوٹل چلے جاؤ۔ وہاں تم لوگ آرام بھی کر سکتے ہو۔'' کچھ توقف کے بعد اس نے کیتھرائن سے کہا۔

''اپن ادھر ہی ٹھیک ہے۔ آپ کے ساتھ ہی ہوٹل چلے گا۔'' کیتھرائن سے پہلے گولو نے جھٹ جواب دیا جس پر فاروق ایک ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو گیا۔ یہ اتنی بہت ساری محبتیں کبھی کبھی اسے بوجھل کر دیا کرتی تھیں اور وہ اپنے آپ کو جکڑا ہوا محسوس کرتا تھا۔ جیسے اس وقت چاند بانو کی بے لوث محبت نے اسے باندھ دیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ چاند بانو پر جو مشکل آئی ہے، اس کا سبب وہ خود بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے میں بھلا وہ اسپتال سے کیسے ہٹ سکتا تھا؟ کافی دیر کے انتظار کے بعد ایک نرس وہاں آئی۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسا درج تھا کہ وہ سب چونک اٹھے۔

''کیا بات ہے سسٹر! ہمارے مریضوں کی حالت کیسی ہے؟'' سب سے پہلے فاروق نے سوال کیا۔

''آئی ایم سوری سر۔ میرے پاس آپ کے لیے کوئی گڈ نیوز نہیں ہے۔'' نرس نے کہا اور پھر دھیمی آواز میں بتانے لگی۔ ''مس چاند بانو کے چہرے پر آنے والا زخم نازک ہے۔ شیشے کے بے شمار ٹکڑے جلد کے اندر تک دھنس گئے ہیں اور انہیں نکالنے کے لیے ابھی تک ڈاکٹرز آپریشن تھیٹر میں بزی ہیں لیکن ڈاکٹرز کا خیال ہے کہ ان کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' نرس اتنا کہہ کر ذرا سا رکی۔

''اور زمرد بائی......؟'' فاروق نے اس کی جھجک کو محسوس کر کے بے تابی سے پوچھا۔

''آئی ایم سوری۔ وہ ایکسپائر ہو چکی ہیں، ان کے سر پر لگنے والی چوٹ جان لیوا ثابت ہوئی۔ انٹرنل بلیڈنگ بہت زیادہ ہو گئی تھی اور برین کو بھی نقصان پہنچا تھا اس لیے ڈاکٹرز اپنی تمام تر کوشش کے باوجود انہیں نہیں بچا سکے۔'' نرس نے اس بار پروفیشنل لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے اسے اطلاع دی اور مزید بولی۔

''آپ ایڈمن آفیسر سے مل کر ڈیڈ باڈی حاصل کر سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے سسٹر!'' فاروق نے آہستہ سے جواب دیا اور سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ زمرد بائی سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن انسانیت کے رشتے سے اسے اس بھرپور عورت کے مرنے کا دکھ تھا۔ اس دکھ میں یہ احساس بھی شامل تھا کہ کہیں نہ کہیں اس کی موت کی وجہ خود اس کی اپنی ذات بھی ہے۔ اگر اس حادثے کے پیچھے بملا کا ہاتھ تھا تو وہ سمجھ سکتا تھا کہ بملا نے حسد اور جلن کے باعث چاند بانو کو ٹھکانے لگوانے کی کوشش کی تھی اور زد میں زمرد بائی بھی آ گئی تھی۔

''بی بریو فاروق بھائی۔ زیادہ ٹینشن لینے سے آپ کی اپنی طبیعت بھی خراب ہو سکتی ہے۔'' وہ سر تھامے یہ سب سوچ رہا تھا کہ کیتھرائن نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھایا۔ اس کی خواہش پر اب وہ اسے مستقلاً فاروق بھائی کہہ کر ہی پکارتی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم لوگ میرے لیے پریشان مت ہو اور یہاں بیٹھو۔ میں ذرا ایڈمن آفیسر سے مل کر آتا ہوں۔'' فاروق نے خود کو سنبھالا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ ایڈمن آفیسر سے ملاقات سے فارغ ہو کر دوبارہ ان کے درمیان موجود تھا۔

''کیا بات ہے، آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟'' کیتھرائن نے اس کے چہرے کے تاثرات بھانپ کر پوچھا۔

''وہ زمرد بائی کی ڈیڈ باڈی میرے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کیونکہ میرا بائی جی سے کوئی رشتہ یا تعلق نہیں بنتا۔'' اس نے بتایا پھر بولا۔ ''میں بمبئی میں دادا سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہی بالا خانے والوں کو یہاں بھجوا سکتا ہے۔ چاند بانو ہوش میں ہوتی تو ہمیں یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔'' اپنی بات کہنے کے بعد وہ رکا نہیں اور اس کے بعد کا خاصا وقت ان ہی معاملات کو

نمٹاتے ہوئے گزرا۔ وکیل اشوک پچن کے ذریعے ربن سے رابطہ کرنے اور سارے انتظامات کرنے میں کافی دیر لگی تھی۔ ربن نے شملہ میں مقیم فلم یونٹ سے بھی رابطہ کر کے اس حادثے کے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔ صورتِ حال واضح تھی کہ آج کی تاریخ میں کوئی چندی گڑھ پہنچ کر لاش وصول نہیں کرسکتا چنانچہ کیتھرائن نے پُرزور اصرار کر کے فاروق کو اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ دونوں باری باری اسپتال میں رکیں گے۔ فاروق کو اس کی یہ تجویز قبول کرنی پڑی اور وہ گولو کو اپنے ساتھ لے کر اسپتال سے ہوٹل روانہ ہوگیا۔ اس کی روانگی تک چاند بانو کا آپریشن مکمل ہو چکا تھا لیکن تکلیف کی شدت سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے غنودگی میں رکھا گیا تھا۔ تقریباً دو دن اسی طرح گزرے۔ شملہ میں مقیم ہدایت کار انیل کمار چندی گڑھ آیا تھا اور چاند بانو کا زخمی چہرہ دیکھ کر اس فکر میں مبتلا ہوگیا تھا کہ اب وہ اس کی فلم میں ہیروئن کا کردار کیسے ادا کرے گی؟ اسی کے ذریعے انہیں علم ہوا تھا کہ حادثے والے دن کسی تکنیکی مسئلے کی وجہ سے شوٹنگ کینسل کردی گئی تھی اور زمرد بائی چندی گڑھ گھومنے اور خریداری کرنے کے شوق میں چاند بانو کو اپنے ہمراہ لے کر نکلی تھی۔ ان کے اس پروگرام کا سب ہی کو علم تھا اس لیے باہر کے کسی بندے کا اس بات سے واقف ہونا ناممکن نہیں تھا۔

انیل کمار چند گھنٹوں بعد ہی اپنی مصروفیت کا بہانہ بنا کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کی آمد کے اگلے دن بمبئی سے کاجل، چاند بانو کا خاص ملازم اور اڈے کا ایک آدمی چندی گڑھ پہنچے۔ اڈے سے آنے والا آدمی وجے تھا۔ فاروق اس سے وہاں کا حال احوال لیتا رہا۔ اس نے ربن کی ہدایت کے مطابق اسے بس وہی کچھ بتایا جو اب تک ربن کی زبانی وہ فون پر سنتا رہا تھا۔ بہت زیادہ کریدنے کی فاروق کے پاس بھی مہلت نہیں تھی۔ اسے زمرد بائی کی لاش کے حصول میں کاجل اور اس کے ساتھ آئے ملازم کی مدد کرنا تھی۔ یہ مرحلہ بھی آخر کار نمٹ ہی گیا۔ سرد خانے میں رکھی لاش کو بمبئی لے جانے کے مشکل مرحلے سے گزرنے کے بجائے یہی مناسب سمجھا گیا کہ یہیں چندی گڑھ میں زمرد بائی کی تدفین کردی جائے۔ کوٹھے کی لڑکیوں کے علاوہ بھلا وہاں بمبئی میں زمرد بائی کا تھا بھی کون جس کے لیے اتنی پریشانی اٹھائی جاتی۔ چنانچہ وہ زمرد بائی جو ماضی میں یقیناً بے شمار دلوں کی دھڑکن رہی تھی، چار افراد کی موجودگی میں نہایت خاموشی سے سپردِ خاک کردی گئی۔ اس موقع پر آنسو بہانے کے لیے نہ تو وہ نواب زادہ موجود تھا جو کبھی زمرد بائی پر مرمٹا تھا اور اپنا سب کچھ اس پر لٹا دینے کو تیار تھا اور نہ ہی چاند بانو ہی ہوش میں تھی کہ اپنی اس ماں کو رخصت کرپاتی جو کبھی اسے بیٹی کہہ کر نہیں پکار سکی تھی۔

چاند بانو کی حالت خطرے سے باہر ہونے کے باوجود ڈاکٹرز زیادہ تر اسے مسکن دواؤں کے زیر اثر ہی رکھ رہے تھے۔ اس طرح وہ اسے تکلیف اور صدمے سے محفوظ رکھنے کے لیے کر رہے تھے۔ چاند بانو کے جسم کے کئی حصوں میں چوٹیں آئی تھیں لیکن سب سے خراب حال چہرے کا تھا۔ ڈاکٹرز نے بڑی جانفشانی سے اس کے رخسار میں چبھے شیشے کے ٹکڑوں کو نکال کر مرہم پٹی تو کردی تھی لیکن وہ اسے اس کا اصل چہرہ واپس کرنے سے قاصر تھے۔ وہ جو چاند بانو کہلاتی تھی اور چاند سے بھی زیادہ بے داغ حسن کی مالک تھی، اس کے حسن کو گہن لگ گیا تھا۔ فاروق کو اس کے اس نقصان کا بڑا صدمہ تھا اور اسے لگتا تھا کہ وہ چاند بانو کا سامنا نہیں کرسکتا۔ اس کے نقصان کے لیے خود کو ذمے دار سمجھتے ہوئے وہ اس سے سامنا کرنے میں شرمندگی محسوس کررہا تھا لیکن جب کاجل نے اسے چاند بانو کا پیغام دیا تو اسے اس کے سامنے جانا ہی پڑا۔ وہ بستر پر نیم دراز تھی اور فاروق اس کے چہرے کے دونوں رخ دیکھ سکتا تھا۔ دایاں رخ اب بھی تابناک اور دلکش تھا لیکن بائیں رخ کی بربادی نے ساری خوب صورتی کو نگل لیا تھا۔ وہ منتظر نظروں سے دروازے کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ فاروق نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں سرخی ہے۔ وہی سرخی جو شدتِ گریہ کی گواہ ہوتی ہے۔ جانے وہ اپنے کس نقصان پر زیادہ روئی تھی...... ماں کے چھن جانے پر یا حسن کو کھو دینے پر؟ فاروق اس کے بستر کے پائنتی یونہی نظریں جھکا کر کھڑا ہوگیا۔

”کیا ہم اتنے بھیانک لگ رہے ہیں کہ آپ ہماری طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کررہے؟“ چاند بانو کی پُرسوز آواز نے اس کے دل کو تڑپا دیا اور وہ چند قدم کا درمیانی فاصلہ طے کر کے تیزی سے اس کے قریب پہنچا اور اس کے دونوں ہاتھ تھام کر بولا۔

”ایسا سوچیے گا بھی نہیں۔ آپ میرے لیے اب بھی وہی چاند بانو ہیں جسے میں نے پہلی بار نانا کے باڑے پر دیکھا تھا اور حیران رہ گیا تھا کہ خدا کسی کو اتنا بھی نوازتا ہے۔“

”پر اب تو ہم وہ چاند بانو نہیں رہے ہیں۔ اب تو ہمارا حسن داغ دار ہوگیا ہے۔“

”ظاہری حسن کی کیا اوقات ہے۔ اصل خوب صورتی

تو انسان کی روح کی ہوتی ہے اور آپ کی روح آج بھی خوب صورت ہے۔'' فاروق نے اسے جواب دیا تو وہ اداسی سے مسکرادی اور بولی۔

''ہم جس بازار کے باسی ہیں، وہاں ظاہری خوبصورتی پر ہی سارا کاروبارِ زندگی چلتا ہے۔ روح کیا ہے اور اس پر کیا گزرتی ہے، یہ جاننے کی تو کسی کو فرصت ہی نہیں ہوتی۔ بہرحال ہم نے قدرت کے اس فیصلے کو قبول کرلیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہیں گے کہ ہمیں اپنے نقصان پر دکھ نہیں ہوا۔ آج صبح ہم آئینہ دیکھ کر سخت صدمے کا شکار ہو گئے تھے اور اتنے دکھی تھے کہ زمرد بائی کی موت کے غم سے بھی زیادہ اپنی بدصورتی کا غم کھائے جارہا تھا لیکن پھر ہمیں خیال آیا کہ وہ اوپر والا تو بہت رحیم و غفور ہے۔ وہ بھلا ہمارے ساتھ زیادتی کیونکر کرسکتا ہے۔ اس نے تو ایک طرح سے ہمارے ساتھ بھلا ہی کیا ہے۔ آپ سے ملنے کے بعد ہماری دلی خواہش تھی کہ اب کوئی دوسری نظر ہمیں نہ دیکھے۔ ہم نہ تو محفل آرائی کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی فلموں میں کام کرنے میں ہماری خوشی تھی۔ اب موجودہ حالات میں ہم دونوں ہی باتوں سے محفوظ ہو گئے ہیں۔ ہمارے دل کو اطمینان ہو گیا ہے کہ آپ ہمیں دیکھیں نہ دیکھیں، اب کوئی دوسرا ہماری طرف نہیں دیکھے گا۔'' چاند بانو کی محبت نے ہمیشہ اسے حیران کیا تھا۔ وہ اس کی محبت کی شدت پر دنگ رہ جاتا تھا۔ اب بھی وہ جس زاویے سے سوچ رہی تھی، وہ انوکھا تھا لیکن اسی زاویہ خیال نے ہی اسے بکھرنے سے بچالیا تھا۔ اس کی باتیں سن کر فاروق کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

''آپ کس جہاں کی لڑکی ہیں چاند بانو! اس طرح سے کب کوئی اس دنیا میں کسی کو چاہتا ہے۔ آپ کی چاہت نے تو میرے روئیں روئیں کو مقروض کرڈالا ہے۔''

''بے فکر رہیے۔ ہم اس قرض کی واپسی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔'' چاند بانو اپنی کھنکتی ہوئی آواز میں کہہ کر مسکرائی تو فاروق کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس کی مسکراہٹ کی شوخی آج اس کے چہرے پر رنگ نہیں بکھیر رہی تھی بلکہ وہ عجیب بھیانک اور خوف ناک لگ رہا تھا۔

''ایکسیڈنٹ کے بارے میں آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ کیسے ہوا؟ آپ نے اس گاڑی کے ڈرائیور کو دیکھا تھا جس نے آپ کی گاڑی کو ٹکر ماری؟'' وہ یکدم ہی موضوعِ گفتگو بدل کر اس سے پوچھنے لگا حالانکہ ابھی تو اس نے چاند بانو سے زمرد بائی کی تعزیت بھی نہیں کی تھی۔

''بالکل دیکھا تھا۔ عجیب بدتہذیب آدمی تھا۔ ہمارے شملہ سے روانہ ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی ہم نے اسے دیکھا تھا۔ شکل سے ہی غنڈا لگ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے سیٹی بجائی تھی اور آنکھ بھی ماری تھی لیکن پھر وہ ہماری گاڑی سے دور رہا تو ہم نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ دوبارہ ہم نے اسے ایکسیڈنٹ سے ذرا پہلے دیکھا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ دوبارہ ہمارے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرے گا لیکن پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ ہماری گاڑی کو زوردار جھٹکا لگا اور گاڑی سڑک سے اتر کر الٹ گئی۔ اس کے بعد تو ہم دہشت سے اپنے ہوش وحواس ہی کھو بیٹھے تھے۔ آپ کی زبانی سنی تفصیلات سے بعد میں کاجل نے ہمیں آگاہ کیا۔ ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہماری زندگی بچانے کے لیے اتنی زحمت کی۔''

''زحمت کیسی۔ یہ تو میرا فرض تھا چاند بانو۔ افسوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ بائی جی کی زندگی نہیں بچائی جاسکی۔'' اس نے پورے خلوصِ دل سے کہا۔

''جب اس دنیا میں کسی کی سانسیں پوری ہو جائیں تو بچانے والوں کی ساری تدبیریں بے کار چلی جاتی ہیں۔ وہ بھی چلی گئیں اور شاید یہ اچھا ہی ہوا ورنہ ہمارا یہ روپ انہیں ہم سے زیادہ دکھی کرتا۔ انہوں نے ماں سے زیادہ ہمیں نائیکا بن کر پالا تھا اور ایک نائیکا کے لیے گہنائے ہوئے حسن کو دیکھنے سے بڑھ کر کوئی صدمہ نہیں ہوتا۔'' اس کے حزنیہ لہجے میں ڈھیروں محرومیاں اور دکھ بول رہے تھے۔ باپ تو ان کی دنیا کی لڑکیوں کو یوں بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوتا لیکن ماں کے پاس رہ کر ماں سے محروم رہنے کا غم یقیناً گہرا تھا۔ بہت سوں کی طرح اسے بھی علم تھا کہ وہ زمرد بائی کی بیٹی ہے لیکن کیا تھا کہ زمرد بائی خود اپنی زبان سے یہ حقیقت تسلیم کر کے اسے خوشی دے دیتی۔ فاروق اس کی کیفیت محسوس کرسکتا تھا لیکن کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جن پر کچھ بولا نہیں جاسکتا، سو وہ بھی لب بستہ رہا اور قدرے توقف کے بعد چاند بانو سے پوچھا۔

''اس بدمعاش کا حلیہ بتا سکتی ہیں آپ ہمیں؟''

جواب میں چاند بانو نے جو حلیہ بیان کیا، وہ گنیش سے بہت قریب تھا۔ فاروق اپنی مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔ اب کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ اس روز اس نے بملا اور گنیش کے درمیان ہونے والی جو گفتگو سنی تھی، اس میں چاند بانو کی تقدیر کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن ابھی اللہ کو چاند بانو کی زندگی منظور تھی سو ایک ایسے راستے پر جہاں سے بہت کم گاڑیاں

گزرتی ہیں، وہ لوگ عین حادثے کے وقت ہرگز بھی نہ پہنچ پاتے۔ بہرحال اس بات سے بملا کو معافی نہیں مل سکتی تھی اور فاروق منتظر تھا کہ اس سے حساب لے سکے۔

☆☆☆

گورے افسر ولیم کا اغوا اور پھر نیم جاں حالت میں ایک اسپتال کے سامنے پایا جانا معمولی واقعات نہیں تھے۔ ڈاکٹرز کی جدوجہد نے ولیم کی زندگی تو بچالی تھی لیکن دماغی حالت معمول پر نہیں تھی۔ سر پر لگائی جانے والی ضربوں نے اس کے حواس چھین لیے تھے۔ خود پر بیتی کو سنانا تو دور کی بات، وہ اپنا آپ بھی بھول گیا تھا۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور اس کی کیا حیثیت ہے۔ اس کی بہکی بہکی باتیں اور حرکتیں اسے نیم پاگل ثابت کر رہی تھیں اور ڈاکٹرز یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ اگر اس کی ایسی حالت رہی تو اسے جسمانی طور پر صحت مند ہوجانے کے بعد دماغی امراض کے اسپتال میں منتقل کر دیا جائے۔ ولیم کی اس حالت کی خبر اوپر تک گئی تھی۔ اگر پہلے والے حالات ہوتے تو اپنے ایک افسر کی اس حالت پر انگریز سرکار پورے ہندوستان کو تہس نہس کر ڈالتی لیکن آج کل ہندوستان میں ان کے لیے حالات سخت مخدوش تھے۔ ہندوستان میں ان کی حکمرانی کی بساط لپیٹی جارہی تھی۔ جگہ جگہ احتجاج، جلسے جلوسوں اور ہنگامہ آرائی کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک طرف ہندوستان کے باسی انگریز حکمرانوں سے ہندوستان چھوڑ دینے کا مطالبہ کر رہے تھے تو دوسری طرف مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کشمکش جاری تھی۔ مسلمانوں کی طرف سے علیحدہ وطن کے مطالبے نے شدت پکڑ لی تھی اور ردعمل میں ہندوؤں کی جارحانہ کارروائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ بلوا، دنگا، فساد سب ہی کچھ جاری تھا اور حکومت کو حالات پر قابو پانے میں مشکل پیش آرہی تھی۔

ربن کی نظریں ان سارے حالات کو غور سے دیکھ رہی تھیں اور اسے یقین تھا کہ ان حالات میں انگریز حکومت اپنے ایک معمولی افسر کی خاطر حرکت میں آنا پسند نہیں کرے گی۔ یوں بھی اس کے ساتھیوں نے سارا کام اتنی صفائی سے کیا تھا کہ کہیں ان کے ملوث ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں تھا۔ فاروق کی واپسی سے قبل یہ کام نمٹانے کے بعد ربن اب جولیٹ والا معاملہ نمٹانے کے لیے تیار تھا۔ اپنی اب تک کی کوشش کے نتیجے میں اس کے سامنے دلدار آغا کا نام آچکا تھا۔ اس نے آغا کے متعلق جو معلومات حاصل کی تھیں، ان کے مطابق وہ ایک عیاش طبع شخص تھا اور شراب وشباب دونوں ہی کا بے حد شوقین تھا۔ ان معلومات کی روشنی میں ربن اسے جولیٹ کا مجرم سمجھ لینے میں حق بجانب تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کی ڈیوٹی لگادی کہ سب سے پہلے اس ڈرائیور کو تلاش کریں جو جولیٹ کے لیے تحائف وغیرہ لے کر آیا کرتا تھا۔ امکان یہی تھا کہ آغا پنجاب سے اپنے ساتھ ڈرائیور لانے کے بجائے سسرالی ملازمین سے استفادہ کرتا رہا ہوگا اس لیے پہلے موتی والا خاندان کے ملازمین میں اسے تلاش کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ حکمتِ عملی کامیاب رہی اور اس کے آدمی ڈرائیور کو تلاش کر کے اس کے سامنے لے آئے۔

''نام کیا ہے رے تیرا؟'' ربن نے سر سے پیر تک اسے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''لکشمن دادا...... اپن کو لکشمن کہتے ہیں۔ اپنے سے کیا گلتی (غلطی) ہوگئی مائی باپ، جو تمہارے آدمی یوں اپنے کو اٹھا کر لے آئے۔'' ڈرائیور کی اس کے سامنے گھگی بن گئی تھی۔ خود کو بمبئی کے ایک دادا کے سامنے پا کر وہ سخت خوف زدہ ہوگیا تھا۔

''پچھلے دنوں تیرا اپنے علاقے میں بہت آنا جانا لگا ہوا تھا۔ کس چکر میں تو اپنے محلے میں آتا تھا، جلدی بک ورنہ ابھی تیری زبان گدی سے پکڑ کر کھینچ لوں گا۔'' ربن نے اپنے لب ولہجے سے اسے اور بھی خوف زدہ کیا۔

''اپن اپنی ڈیوٹی کرنے آتا تھا دادا۔ ماں کی سوگند اپن نے کبھی ادھر ادھر آنکھ بھی نہیں اٹھا کر دیکھا۔ جس کام سے آتا تھا کر کے سیدھا واپس لوٹ جاتا تھا۔'' ربن کے سوال کا جواب دینے سے زیادہ اس کا سارا زور اپنی صفائی پیش کرنے پر تھا۔ شاید اسے لگ رہا تھا کہ وہ انجانے میں کوئی غلطی کر بیٹھا ہے جس کی جواب دہی کے لیے اسے یہاں بلوایا گیا ہے۔

''کیا ڈیوٹی کرنے کو تو ادھری آتا تھا اپنے کو صاف بول۔'' ربن زور سے دہاڑا تو وہ دہل کر رہ گیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''اپنے سے کوئی گلتی ہوگئی ہے تو اپنے کو شما کردو۔ اپن صرف نوکر جات ہے۔ ادھر سے صاحب لوگ مس جولیٹ کو جو پھول اور گفٹ بھجواتا تھا، اپن دینے آتا تھا۔ اپن کا اس لفڑے میں کوئی دوش نہیں تھا۔ اپن صرف اپنی ڈیوٹی کرتا تھا۔'' ڈرائیور کو کچھ کچھ اندازہ ہوگیا تھا کہ اس سے اصل میں کیا جاننے کی کوشش کی جارہی ہے، اس لیے اب اس سلسلے میں اپنی پوزیشن کلیئر کرنے لگا۔

''تمہارا صاحب کون ہے؟'' ربن نے اس سے دریافت کیا۔

''سیٹھ موتی والا اور کون؟ تمہارا آدمی اپنے کو ادھر ہی سے تو اٹھا کر لایا ہے۔''

''تو کیا سیٹھ موتی والا جولیٹ کو پھول اور تحفے بھجواتا تھا؟'' ربن اس کے جواب پر چونکا۔

''نہیں نہیں...... وہ تو سیکریٹری صاحب اپنے کو ادھر بھیجتا تھا۔'' ڈرائیور نے زور زور سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اس کی تردید کی۔

''کون سیکریٹری؟'' ربن نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے نرمی سے دریافت کیا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈرائیور اس کے سامنے بوکھلاہٹ کا شکار ہے اس لیے ڈھنگ سے جواب نہیں دے پا رہا۔

''سیٹھ کے جنوائی دلدار آغا کا سیکریٹری۔ وہ اپنے کو ادھر چیزیں دے کر بھیجتا تھا کہ مس جولیٹ کو بولنا آغا صاحب نے بھجوایا ہے، پر پہلی بار کے بعد مس صاحبہ نے کبھی کوئی چیز نہیں لیا۔ وہ بہت غصہ کرتی تھی اور چیزیں اٹھا کر پھینک بھی دیتی تھی۔'' اب وہ بالکل صحیح ٹریک پر چل رہا تھا اور وہ معلومات فراہم کر رہا تھا جو ربن کے اب تک کے اندازے کی تصدیق کر رہی تھیں۔

''ادھر سے لڑکی کو اٹھوا کر کدھر رکھوایا تھا تمہارے سیٹھ کا جنوائی؟''

''کیا بولا دادا! اپن سمجھا نہیں۔'' ڈرائیور کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''کیوں اپن فارسی میں پوچھا ہے کیا؟ ادھر اپنے محلے سے لونڈیا اٹھوائی تھی تیرے مالکوں نے۔ تو ان کے لیے ڈرائیوری کرتا ہے، تیرے کو کیسے خبر نہیں ہے؟'' ربن نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ اتنی زور سے اس کے منہ پر رسید کیا کہ اس کا ہونٹ پھٹ گیا۔

''ماں کی سوگند اپن بالکل سچ بولتا ہے دادا! اپن کو یہ اغوا وغوا کے لفڑے کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اپن بس اتنا ہی کیا، جتنا ابھی تم کو بولا۔'' ڈرائیور نے ہونٹ سے بہتا خون ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے روہانسی آواز میں جواب دیا۔ ربن جیسا زیرک انسان اس کے لہجے کی سچائی کو پرکھ سکتا تھا پھر بھی لہجے میں سختی سمو کر غصے سے بولا۔

''تیرے سیٹھ کے پاس جو نیلی موٹر ہے، اسے تو نہیں چلاتا تو کون حرام کا جنا چلاتا ہے؟''

''نہیں دادا! تم کو کوئی گلتی (غلطی) لگی ہے۔ اپنے سیٹھ کے پاس کوئی نیلی موٹر نہیں ہے۔''

ڈرائیور کے جواب سے واضح ہو گیا کہ دلدار آغا نے جولیٹ کے اغوا کے معاملے کو خفیہ رکھنے کے لیے اتنی احتیاط کی تھی کہ سسرالی گاڑی اور ملازمین دونوں سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ بڑے تعلقات والا آدمی تھا۔ کہیں اور سے گاڑی اور بندے حاصل کر لینا اس کے لیے کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ یہ سب کرتے ہوئے اسے یقین ہوگا کہ اس تک کوئی رسائی حاصل نہیں کر سکے گا۔ جولیٹ جیسی غریب طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کے لیے ویسے بھی کون اتنی زحمت کرتا۔ دلدار آغا نے احتیاط کی بھی ہوگی تو اپنی بیوی اور سسرالیوں کی نظر سے محفوظ رہنے کے لیے لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس نے بہت غلط جگہ ہاتھ ڈالا ہے اور ربن اب اس کی گردن ناپنے کے لیے پہنچنے ہی والا ہے۔

''ابھی تیرے کہے کو سچ مان کر اپن تیرے کو جانے کی اجازت دیتا ہے، پر ادھر ہوئی بات کی کہیں بھاپ بھی نکالی تو اپن تیرے کو زمین میں گاڑ دے گا۔ سمجھ گیا نا؟...... چل پھوٹ ادھر سے۔'' لکشمن سے وہ جو جاننا چاہتا تھا جان چکا تھا چنانچہ اسے دھمکا کر وہاں سے رخصت کر دیا۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتا اور زبان بندی کا یقین دلاتا ہوا وہاں سے کھسک لیا۔

''اب کیا کرنے کا ہے دادا؟'' لکشمن کے جانے کے بعد رامو نے پُرتشویش لہجے میں ربن سے دریافت کیا۔ ساری گفتگو کے دوران وہ وہیں موجود تھا لیکن دخل اندازی کو غیر ضروری جانتے ہوئے خاموش رہا تھا۔

''وہی جو کرنا چاہیے۔ وہ جولی کا عاشق ابھی چنڈی گڑھ میں بیٹھا ہے۔ جاز آتی دن نہیں لگیں گے اسے بمبئی واپس آنے میں۔ چاند بانو اور زمرد بائی والا لفڑا نہیں ہوتا تو وہ اب تک ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کروا کر بمبئی کے لیے نکل چکا ہوتا۔ اس لفڑے کے بہانے اپنے کو تھوڑی سی مہلت اور مل گئی ہے۔ اپن اس سے فائدہ نہیں اٹھایا تو شہزادے کے سامنے نظر جھک جائے گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے دادا پر معاملہ بہت بڑے جاگیردار اور سیاست دان کا ہے پھر وہ ہے بھی پنجاب کا...... ادھر بمبئی کی بات ہوتی تو اپنے لیے آسان ہوتا، پر پنجاب جا کر کچھ کرنے میں گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔ ادھر اپنی دوستی یاری بھی تو نہیں ہے۔'' رامو بدستور تشویش کا شکار تھا۔ ایک طرح سے وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ بمبئی اور آس پاس کے شہروں میں تو پھر بھی ان کا زور تھا۔ یہاں تک کہ وہ کلکتہ بیاہ کر گئی ثریا بانو کی وہاں اپنی دوستی کی بنیاد پر اس کی دیکھ بھال کر وا رہے تھے اور وہاں کے اڈے والوں نے نظر رکھی ہوئی تھی کہ مجو دادا یا

اس کے ساتھی ثریا بانو کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں لیکن پنجاب کے کسی علاقے میں ان کے لیے کافی مشکل ہو جاتی مگر ربن اس سب کو کہاں خاطر میں لانے والا تھا۔ بگڑ کر بولا۔

''تیرا ان ساری باتوں سے مطلب کیا ہے؟ کیا تو اپنے کو ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ اپن مجرم کا نام سامنے آجانے پر بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہے۔''

''نہیں دادا! اپن کا یہ مطلب نہیں ہے، بس اپن تو یہ بولتا ہے کہ تھوڑا سنبھل کر چلنا ہوگا۔'' رامو اس کا موڈ سمجھ کر جلدی سے صفائی دینے لگا۔

''جب ہاتھ پیر چلائیں گے تو دیکھ لیں گے کدھر کیسے چلنا ہے۔ ابھی تو اپنے کو زیادہ نصیحت مت کر، اپن کا مغز گرم ہو رہا ہے۔'' ربن کے اس جواب پر رامو نے خاموشی اختیار کر لی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس نے ربن کو ٹوک کر غلطی کی ہے۔ ربن فاروق کے معاملے میں جذباتی تھا اور اس کی خاطر کسی بھی خطرے کو خاطر میں نہیں لا سکتا تھا۔

''چلم تازہ کر دے سجو...... بالکل مزہ نہیں دے رہی۔'' ماحول تبدیل کرنے کے لیے اس نے سجو کو آواز لگائی۔ سجو فوراً ہی حاضر ہو گیا۔ اصل میں وہ پہلے ہی اس طرف آرہا تھا۔

''باہر تھانے سے سپاہی آیا ہے دادا۔ بولتا ہے بڑی خبر لایا ہے۔'' اس نے پہلے پیغام دیا اور پھر حقے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''اندر بلا لے اسے۔'' رامو نے ربن کے چہرے پر آمادگی دیکھتے ہوئے اجازت دی تو سجو حقے سمیت باہر نکل گیا۔ اگلے ہی لمحے تھانے سے آیا سپاہی ان کے روبرو تھا۔

''کیا خبر لایا ہے سنتری بادشاہ؟'' رامو نے ہی اس سے دریافت کیا۔

''بہت بڑی خبر ہے دادا! سنتے ہی میں نے ادھر دوڑ لگائی ہے۔ سمے بہت کم ہے، کب کیا ہو جائے نہیں معلوم۔''

''ڈھنگ سے کچھ بتائے گا بھی یا پہیلیاں ہی بجھواتا رہے گا۔'' سپاہی کے انداز سے ظاہر ہو گیا تھا کہ حقیقتاً وہ کوئی اہم خبر لے کر آیا ہے چنانچہ رامو نے بے چین ہو کر اسے ڈپٹا۔

''آپ نے گورے افسر ولیم کے بارے میں تو سنا ہوگا دادا۔ اسے کسی نے اغوا کر لیا تھا اور پھر بعد میں وہ زخمی حالت میں ملا تو اس کی کھوپڑی ہی الٹ گئی تھی۔ ڈاکٹروں اور پولیس نے بہت زور مارا کہ وہ اپنی ایسی حالت بنانے والوں کا نام بتا دے پر وہ نہ بتا سکا۔ اب ایک مخبر نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو خبر دی ہے کہ ادھر والوں کا ولیم سے کوئی پھڈا چل رہا تھا۔ اس نے کسی بات پر غصے میں آکر ربن دادا کے چہیتے فاروق استاد کو تھانے میں الٹا لٹکوا کر خوب ٹھکائی لگوائی تھی۔ خبر دینے والے کا خیال ہے کہ ربن دادا نے اپنے چہیتے فاروق کا بدلہ لینے کے لیے ولیم صاحب کا یہ حال کیا ہے۔ ادھر ربن دادا کو اریسٹ کرنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اس لیے میں سیدھا ادھر دوڑا آیا۔'' سپاہی بولتے ہوئے بار بار ربن کو چور نگاہوں سے دیکھتا جا رہا تھا چونکہ ابھی تک ربن نے اپنی زبان نہیں کھولی تھی، اس لیے سپاہی کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اس سے براہِ راست مخاطب ہو۔ وہ رامو ہی سے مخاطب تھا۔ اس کی دی اطلاع نے رامو کے چہرے کی رنگت بدل دی تھی لیکن ربن ہنوز اسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔

''خبر پکی ہے نا یا تو انٹ شنٹ سن کر دوڑا آیا ہے؟'' رامو کو اور کچھ نہیں سوجھا تو سپاہی پر ہی الٹ پڑا۔

''بالکل پکی خبر ہے مائی باپ۔ کسی بھی سمے پولیس پارٹی ادھر چھاپا مارنے کو پہنچ جائے گی۔ آپ مجھے شما کرو اور یہاں سے جانے کی اجازت دو۔ اگر کسی نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو میری نوکری چلی جائے گی۔'' سپاہی نے گھگیا کر بولتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ رامو کے سامنے جوڑ دیے۔

''اسے جانے دے رامو!'' ربن نے اپنی خاموشی کو توڑتے ہوئے رامو کو اشارہ بھی دیا تو اس نے اپنے بٹوے میں سے چند بڑے نوٹ نکال کر سپاہی کو تھمائے اور اس کے روانہ ہوتے ہی خود ربن کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیا سوچتے ہو دادا۔ ادھر سے نکلنے کی کرو۔ گورے افسر کا معاملہ ہے۔ پولیس آئی تو خالی ہاتھ نہیں جائے گی۔''

''اپن بھی یہ بات جانتا ہے، اسی واسطے ٹک کر بیٹھا ہے۔ ابھی اپن ادھر سے غائب ہو گیا تو وہ سالے ادھر جو ہاتھ لگا، اسے ہی اٹھا کر لے جائیں گے۔ اپن اپنے پر آئی دوسرے پر نہیں ڈال سکتے۔'' ربن نے گمبھیر لہجے میں اسے جواب دیا۔ اتنی دیر میں وہ بہت کچھ حساب کتاب لگا چکا تھا، اسے یقین تھا کہ پولیس کو مخبری کرنے والا انجو دادا خود یا اس کا کوئی گرگا ہوگا کیونکہ وہی لوگ تھے جو جانتے تھے کہ ولیم نے فاروق کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اور ربن اس سلوک کا بدلہ لینے کے لیے کیا کر سکتا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو دادا۔ کیا تم گرفتاری دینے کو تیار ہو؟'' رامو کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''ہاں رے۔ کچھ دن ادھر ہی حوالات میں بیٹھ کر مفت کی کھا پی لیں گے۔ ادھر تو سسرے ہر وقت دس لفڑے رہتے ہیں۔'' ربن کا انداز بے نیازانہ تھا۔

''نہیں دادا! یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ تم پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو وہ تمہیں لمبے چکر میں ڈال دیں گے اور ادھر بہت کام تمہیں ہی کرنے ہیں۔ ابھی تو تم پنجاب جا کر آغا سے حساب کرنے کی بات کر رہے تھے۔ تم حوالات میں جا بیٹھے تو یہ کام کون کرے گا؟'' راموں نے اس کی کمزوری پر ہاتھ رکھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے رے، پر ادھر کا کیا ہوگا۔ سالے پولیس والے تو جس کو من کرے گا، اٹھا کر لے جائیں گے۔'' ربن تشویش کا شکار تھا۔

''اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔ اپن ابھی آدمی بھیج کر وکیل صاحب کو بلوا لیتا ہے۔ وکیل انگریزی قانون کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ پولیس والوں کو بتا دے گا کہ ایک کی جگہ دوسرے آدمی کو گرفتار نہیں کر سکتے۔ انگریزی قانون میں تو گرفتاری کے لیے کاغذ بھی چاہیے ہوتا ہے۔ پولیس والے لائے بھی تو تمہارے نام کا کاغذ لائیں گے اور بنا کاغذ کے وکیل کسی دوسرے کو لے جانے نہیں دے گا۔ اپنا وکیل کیسا ہوشیار آدمی ہے، تمہیں بھی اس کی خبر ہے۔'' راموں ایسے ہی اس کا نائب نہیں تھا۔ اسے ربن کو رام کرنے کے بہت گر آتے تھے۔ ربن کو اس کی باتوں نے متاثر کیا اور بالآخر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اسی پل مانی نامی ایک لڑکا گھبرایا ہوا پھولی سانسوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ وہ لڑکا علاقے کے داخلی راستے پر پہرے داری پر مامور تھا۔

''پولیس کی گاڑی اس طرف آ رہی ہے۔ پیچھے ایک تانگا بھی دیکھا ہے اپن نے۔'' اس کی دی اطلاع سنسنی خیز تھی۔ گاڑی اور تانگے دونوں میں سوار ہو کر پولیس والوں کے یہاں پہنچنے کا مطلب تھا کہ وہ خاصی تعداد میں ہیں اور اڈے اور اس کے اطراف کے علاقے کو گھیرے میں لے کر کارروائی کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہوگا کہ یہاں پہلے ہی خبر پہنچ چکی ہے اس لیے وہ اطمینان اور سست روی سے آ رہے تھے۔

''تم نکلو دادا...... اور مانی تو جا کر وکیل بابو کو بلا لا۔'' راموں نے پہلے ربن اور پھر اطلاع لے کر آنے والے لڑکے سے کہا۔ ربن نے بھی مزید تاخیر نہیں کی اور کمان سے نکلے تیر کی طرح اڈے سے نکلا۔ اس کا رخ گلی کے باہر کے بجائے اندر کی طرف تھا۔ سامنے سے جانے میں پولیس والوں کے ہاتھ آنے کا خطرہ تھا۔ پیچھے سے وہ بند گلی کے سرے پر موجود دیوار پھاند کر آسانی سے فرار ہو سکتا تھا۔ پیچھے کا اسے معلوم تھا کہ راموں اچھی طرح سب انتظام سنبھال لے گا اور تھا بھی ایسا ہی۔ اس کے نکلتے ہی راموں نے ہدایات جاری کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، اس نے دوسرا حکم علاقے میں اِدھر اُدھر پہرا دیتے اپنے آدمیوں کے لیے جاری کیا تھا۔ ان سب کو ہدایت جاری کی گئی تھی کہ پولیس والوں کے سامنے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی بھی قسم کی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر خاموشی سے اپنی جگہ دبک جائیں۔ اسے وکیل اشوک کے یہاں تک پہنچنے کی مہلت درکار تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اس دوران پولیس والے اندھی کارروائی نہ کر سکیں۔ مانی کا اسے پتا تھا کہ وہ بھی بند گلی کی دیوار پھاند کر یہاں سے نکلا ہوگا اور دوسری طرف موجود گلیوں کے جال سے گزر کر جلد اشوک چمن تک پہنچ جائے گا۔ اشوک کے پاس موٹر کار تھی، وہ صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کر کے فوری طور پر اپنی موٹر میں روانہ ہوتا تو چند منٹوں میں یہاں پہنچ جاتا۔ اتنی دیر میں وہ تدبر سے پولیس والوں کا اڈے پر استقبال کر کے انہیں الجھائے رکھ سکتا تھا۔ اس موقع پر اشتعال کے بجائے دھیمے پن سے پیش آنے کی پالیسی ہی پولیس والوں کے رویے میں نرمی لا سکتی تھی اور ربن کی سنگت میں بہت سے گر سیکھ لینے والا راموں پوری طرح سے ان سے نمٹنے کو تیار تھا۔

☆☆☆

''یوں چھپ چھپ کر کب تک ملتے رہیں گے نواب زادہ صاحب! مجھے آپ سے اس طرح ملنا اچھا نہیں لگتا۔ میں نے اپنی لائف میں کبھی کوئی کام چوری چھپے نہیں کیا۔ کبھی ایسا ٹائم ہی نہیں آیا۔ بہت سیدھی سادی اور صاف لائف تھی میری۔ پڑھائی، گھر کے کاموں میں مام کی ہیلپ کرنا اور جوزف...... بس ان تین چیزوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا میری لائف میں۔ میں اپنے سارے دکھ سکھ جوزف سے شیئر کر لیتی تھی اور ریلیکس ہو جاتی تھی لیکن آپ کے اور اپنے ریلیشن کے بارے میں، میں اسے بھی کچھ نہیں بتا پائی۔ کیسے بتاؤں؟ وہ کہے گا جوزفین تم تو کبھی ایسی لڑکی نہیں تھیں جو چوری چوری کسی مرد سے ملتی ہے۔ تم تو محلے کی سب سے ڈیسنٹ اور سوبر لڑکی تھیں پھر میں اسے کیا جواب دوں گی کہ جوزف لو (Love) میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان رائٹ اور رانگ کو چھوڑ کر بس اپنے لور (Lover) کی بات مانتا چلا جاتا ہے۔'' نواب زادہ اسد اللہ سے جوزفین کی خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ کسی بھی طرح اسے ملاقات کا وقت اور جگہ بتا دیتا تھا اور جوزفین کچے دھاگے سے بندھی ٹھیک وقت پر اس جگہ پہنچ جاتی تھی۔ حالانکہ ہر بار ہی اسے بہت ڈر لگتا تھا اور دل بری طرح دھڑکتا رہتا تھا کہ کہیں کسی کو

خبر نہ ہوجائے۔ آج بھی وہ بہت پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی چھت پر بنے اس کمرے میں پہنچی تھی جہاں کسی کا آنا جانا نہیں تھا اور کبھی کبھار اسد اللہ ہی دن کے اوقات میں وہاں جا بیٹھتا تھا۔ اس کی اسی عادت کے باعث کمرے کی باقاعدگی سے صفائی کی جاتی تھی اور کمرا آراستہ و پیراستہ تھا۔ چھت پر جانے کے لیے مردانہ و زنانہ دونوں حصوں میں الگ الگ زینے تھے اس لیے ان کی خفیہ ملاقات کے لیے یہ کمرا سب سے آئیڈیل جگہ قرار پائی تھی لیکن بہرحال یہ واحد جگہ نہیں تھی۔ وہ دونوں احتیاطاً جگہ بدل بدل کر ملتے تھے اور اتنی بڑی حویلی میں انہیں کوئی نہ کوئی جگہ مل ہی جاتی تھی لیکن جوزفین ایک طرف لڑکی ہونے کی وجہ سے اور دوسری طرف اپنی کم حیثیتی کے باعث اس صورتِ حال پر زیادہ خوف زدہ رہتی تھی اسی لیے آج اسد اللہ کے سامنے اپنے خوف اور ناپسندیدگی کا کھل کر اظہار کر رہی تھی۔

''ہم ان سب باتوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جوزفین! ہمیں احساس ہے کہ یہ سچویشن آپ کو ڈسٹرب کر رہی ہے لیکن دوسری طرف ہم مجبور بھی ہیں کہ آپ سے ملے بغیر رہ نہیں پاتے۔ جو دن آپ سے ملے بغیر گزرتا ہے، یوں لگتا ہے کہ اس دن ہم سانس ہی نہیں لے پا رہے۔ عجب جان کنی سی طاری ہوتی محسوس ہوتی ہے ہمیں اپنے اوپر...... لیکن آپ کو یہ ملاقاتیں اتنی ہی ناگوار خاطر ہیں تو ہم آپ کی خاطر خود پر یہ جبر بھی کر سکتے ہیں۔ آپ کہتی ہیں تو اب ہم آپ کو ملاقات کے لیے فورس نہیں کریں گے اور ہم پر جو گزری خود ہی سہہ لیں گے۔''

نواب زادہ اسد اللہ نے اس کی باتوں کو بہت سنجیدگی سے سنا اور اپنی لاچاری و مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے بالآخر فیصلہ سنا دیا لیکن اس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اس نے یہ فیصلہ نہایت مجبوری میں اور صرف جوزفین کی خاطر کیا ہے اور جوزفین بھی وہی عام سی عورت تھی جو محبت میں اپنا سب کچھ لٹا دینا گوارا کر لیتی ہے لیکن محبوب کی پیشانی کا ایک بل نہیں سہہ پاتی۔ چنانچہ تڑپ کر بولی۔

''میں نے آپ سے یہ تو نہیں کہا ہے کہ مجھ سے نہ ملا کریں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کے لیے یہ بہت تکلیف دہ ہے۔ میں خود بھی آپ سے ملے بغیر سکون سے نہیں رہ پاتی لیکن مجھے ڈر لگتا ہے کہ اگر کسی کو علم ہو گیا تو طوفان آجائے گا اور ہم دونوں ہی اپنا اپنا مقام کھو بیٹھیں گے۔''

''ہم خود بھی اس بات کو سمجھتے ہیں لیکن عشرت جہاں کی نسبت طے ہو جانے تک مجبور ہیں کہ حویلی میں کسی کے سامنے آپ سے شادی کی خواہش ظاہر نہیں کر سکتے۔ اگر عالیہ، اختر سے منسوب نہ ہوتیں تو بھی اتنا مسئلہ نہیں تھا لیکن ہم ڈرتے ہیں کہ ہماری عجلت عالیہ کی برسوں سے طے نسبت ٹوٹنے کا سبب نہ بن جائے۔ امی جان نے بھی اسی وجہ سے ہمیں احتیاط کرنے کی ہدایت کی ہے اور وہ خود شدومد سے اس بات کی خواہش مند ہیں کہ عشرت جہاں کی نسبت کہیں طے پا جائے۔ آپ دعا کریں کہ انہیں اپنے اس مقصد میں جلد کامیابی حاصل ہو جائے اور ہماری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو جائے۔''

اسد اللہ اس کے سامنے اپنی وہی مجبوریاں دہرا رہا تھا جن کا اس سے پہلے بھی بہت بار اظہار کر چکا تھا۔ جوزفین نے اس بار اس پر مزید دباؤ ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے خیال آ گیا تھا کہ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے کیوں اسد اللہ پر دباؤ ڈال رہی ہے اور انہیں بار بار ان کی مجبوری دہرانے پر مجبور کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ خود ہی بڑی خوبی سے موضوعِ گفتگو بدل گئی اور چند لمحوں میں ہی وہاں کا ماحول تبدیل ہو گیا۔ اب وہاں نہ تو ایک فریق کے وسوسوں کا بوجھل پن تھا اور نہ ہی دوسرے فریق کی وضاحتوں کی دھند۔ کچھ تھا تو بس دو محبت کرنے والے اور ان کی محبت کی وہ بے قراری و بے چینی جو ایک دوسرے میں گم ہو کر ہی قرار پاتی ہے۔ انہیں بھی بہت دیر تک ہوش نہیں رہا کہ ان دونوں کے سوا بھی اس کائنات میں کچھ ہے۔ بہت دیر گزرنے کے بعد جب رات اپنے آخری مراحل میں تھی، جوزفین کو ہی خیال آیا۔

''اب مجھے چلنا چاہیے نواب زادہ صاحب! کچھ دیر بعد صبح کی روشنی نمودار ہو جائے گی اور ملازمائیں جاگنا شروع ہو جائیں گی۔ مجھے کسی کے جاگنے سے پہلے اپنے کمرے میں پہنچ جانا چاہیے۔'' وہ قدرے بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی تو اسد اللہ کو بھی ہوش آیا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جوزفین کو واپس چلے جانے کی اجازت دینے پر مجبور ہو گیا۔ جوزفین زنانہ حصے میں جانے والا زینہ دبے قدموں اتر کر نیچے پہنچی تو اس کے پیروں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ نیم روشن برآمدے میں اکاّ بیگم بالکل سامنے کھڑی تھیں اور آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے اسے مسلسل گھورے جا رہی تھیں۔

''آپ...... آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں اکاّ بیگم؟'' اپنے خشک لبوں کو زبان سے تر کر کے بوکھلائی ہوئی جوزفین نے ان سے دریافت کیا۔

''یہ سوال تو ہمیں آپ سے کرنا چاہیے کہ آپ رات

کے اس پہر اپنے کمرے کے بجائے اوپر چھت پر کیا کر رہی تھیں؟ یہ وقت تو آرام کا ہے۔'' اکا بیگم کی دھیمی آواز میں بھی رعب و دبدبہ تھا۔ انہیں حویلی کی ملازماؤں میں جو ممتاز حیثیت حاصل تھی، اس کا انہیں پوری طرح احساس تھا اور وہ اپنی برتری کا اظہار اپنے اندازِ گفتگو کے علاوہ بھی ایک ایک ادا سے کرتی نظر آتی تھیں۔

''مجھے نیند نہیں آرہی تھی تو ایسے ہی ہوا خوری کے لیے چھت پر چلی گئی تھی۔'' اس نے فوری طور پر سوجھنے والا بہانہ تراشا۔

''نیند نہیں آرہی تھی تو سروری سے کہتیں۔ وہ آپ کے سر میں اتنی زبردست مالش کرتی کہ آپ کو خود بخود ہی نیند آجاتی۔''

''میں نے اتنی رات کو اس کی نیند خراب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔'' اکا بیگم کو جواب دیتے ہوئے اس کی ہتھیلیاں پسیجنے لگی تھیں۔

''اتنی رات کو اپنے کمرے سے باہر نکلنا بھی مناسب نہیں ہے۔ آپ کی اپنی ذات شکوک کی زد میں آسکتی ہے۔ آپ یہاں اجنبی ہیں، بہتر ہے احتیاط سے کام لیں۔'' اسے سپاٹ لہجے میں نصیحت کر کے اکا بیگم راستے سے ہٹ گئیں لیکن اس کے اپنے قدم من من بھر کے ہو چکے تھے۔ وہاں سے اپنے کمرے تک کا راستہ اس نے کیسے طے کیا، یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔

☆☆☆

''بڑی دیر لگا دی رے رامو۔ اپن کب سے ادھر تیری راہ دیکھتا ہے۔'' رامو کی صورت دیکھتے ہی ربن نے اس سے شکوہ کیا۔

''بس دادا، پولیس والوں سے جان چھڑانے میں ہی اتنا سے لگ گیا۔ سالے جان کو ہی آگئے تھے۔ وکیل بابو ٹیم پر نہیں پہنچتا تو بڑی مشکل ہو جاتی اپنے کو۔ وہ...... کا بچہ انسپکٹر وکرم بھی آنکھیں متھے پر رکھ کر آیا تھا۔ سالے کو یاد ہی نہیں تھا کہ ادھر اڈے سے اس کا حقہ پانی چل رہا ہے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا تھا...... کی اولاد۔'' رامو نے انسپکٹر وکرم کے لیے بے دریغ گالیوں کا استعمال کرتے ہوئے اپنے تاخیر سے پہنچنے کا سبب بتایا۔ وہ اس وقت اپنے اس ٹھکانے پر تھے جہاں اچھو نام کا بے آسرا بوڑھا ربن کی مہربانی سے اپنا بڑھاپا سکون سے گزار رہا تھا۔

''گوروں کے آگے سب کی میا مرتی ہے رے۔ وہ حرام کا جنا وکرم بھلا کیا بیچتا ہے۔ تو اپنے کو بتا سب خیر تو ہی

نا۔ پولیس والے کسی لونڈے کو اپنے ساتھ تو نہیں لے گئے؟'' انسپکٹر وکرم کے بدلے رویّے پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے اپنے آدمیوں کے بارے میں دریافت کیا۔

''ابھی تک تو سب ٹھیک ہے۔ وکیل بابو کے آنے سے پہلے پولیس اڈے پر پہنچ گئی تھی۔ اپن نے خود دروازہ کھلوا کر پولیس والوں کو اڈے کے اندر بلوایا۔ آتے ہی سالے تمہارا پوچھتے تھے۔ اپن بولا کہ دادا اڈے پر نہیں ہے اور کدھر گیا ہے یہ اس کے سوا بھگوان ہی جانے۔ اپنے میں سے تو کسی میں دم نہیں ہے کہ اس سے اس کے آنے جانے کا حساب مانگ سکے کہ کدھر جاتا ہے اور کب واپس آئے گا۔ اپنا جواب سن کر سالے فوں فوں کرنے لگے۔ اپن کو دھمکی دیے کہ اگر دادا کا پتا نہیں دیا تو تیرے کو ہتھکڑی لگا کر لے جائیں گے۔ اپن بولا کہ لے چلو اپنے کو چلنے سے انکار نہیں۔ وہ وکرم...... بولا کہ اپنے پاس پکی اطلاع ہے کہ دادا ادھر اڈے پر ہی ہے۔ تو شرافت سے اسے ہمارے سامنے پیش کر دے۔ اپن بولا ابھی تھوڑے ٹیم پہلے دادا ادھر تھا پر اب نہیں ہے۔ تم لوگ چاہو تو پورے اڈے کی تلاشی لے لو۔ سالے سب ادھر سے ادھر دندنانے لگے۔ تمہاری تلاش میں الماریاں اور صندوق تک کھول کر دیکھ ڈالے۔ فرش پر سے دریاں اور چاندنیاں اٹھا کر خفیہ تہ خانے کا راستہ ڈھونڈتے رہے۔ ان کا بس چلتا تو اڈے کی ساری اینٹیں اور فرش اکھاڑ ڈالتے پر اچھی رہی کہ اتنی دیر میں ہی مائی وکیل بابو کے ساتھ پہنچ گیا۔ قسمت سے وکیل بابو کی جورو کا بھائی ولایت سے آیا ہوا تھا۔ وہ اسے بھی اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا کر لے آئے۔ وکیل بابو آتے ہی پولیس والوں پر چڑھ دوڑے کہ کیسے بغیر وارنٹ کے انہوں نے کسی کی چار دیواری میں پاؤں دھرے۔ انسپکٹر وکرم اور اس کے ساتھ آئے دوسرے افسر نے بڑا زور مارا کہ تمہیں ولیم کی حالت کا ذمے دار ٹھہرا کر گرفتاری کے لیے آنے کا کارن بتا سکیں پر وکیل بابو نے ایک نہیں سنی۔ بولے تم ربن دادا پر جو الزام لگاتے ہو پہلے اس کا ثبوت لاؤ اور ساتھ میں اس کی گرفتاری کا وارنٹ تبھی پھر کوئی بات کرنا اور اس سے بھی یاد رکھنا کہ الزام دادا پر ہے تو صرف دادا کی ہی بات کرنا، ادھر کسی اور کو تنگ کرنے یا تھانے لے جانے کی اجازت نہیں ہوگی اسے۔ سالا وکرم اور اس کے ساتھ آیا بندہ بڑے سٹپٹائے۔ بولے مجرم تک پہنچنے کے لیے اس کے ساتھیوں سے تفتیش تو کرنی ہوگی۔ وکیل بابو نے کہا کہ ضرور کرو، پر پہلے قانونی کارروائی پوری کر رکھنا۔ اس کے سالے نے بھی یہ پولیس والوں کی خوب خبر لی۔ ویسے تو اپنے وکیل بابو بھی کم نہیں ہیں، پر ہو سکتا تھا کہ گورے افسروں کا حکم پورا کرنے کے واسطے پولیس والے تھوڑی اڑی کرنے کی کوشش کرتے پر ولایت سے آئے انگریز افسر کے سامنے تو سالوں کو منہ کی کھا کر جانا پڑی۔'' رامو نے اختصار سے ساری کتھا سنا ڈالی۔ وہ پولیس والوں کے ناکام واپس جانے پر خاصا مسرور نظر آ رہا تھا لیکن سب سن کر بھی ربن کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آئی اور وہ سنجیدگی سے بولا۔

''پولیس والوں کے نامراد جانے پر خوش نہ ہو رامو۔ یہ حرام کے جتنے بڑے کمینے ہوتے ہیں۔ ابھی سامنے سے کسی کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکے تو بعد کو خاموشی سے کبھی بھی، کہیں سے بھی کسی کو اٹھا لے جائیں گے۔ تو اڈے کے سارے آدمیوں کو بول دے کہ جا زتی ادھر ادھر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب اڈے کے پاس ہی رہیں اور ٹولیاں بنا کر رہیں تاکہ کوئی آسانی سے گھیر نہ سکے۔ اپنے کو آغا سے حساب کے لیے ادھر سے نکل کر جانے کا نہیں ہوتا تو اپن بھی اپنے آدمیوں کو خطرے میں نہیں ڈالتا اور خود پولیس سے نمٹتا، پر ابھی مجبوری ہے۔ اپن کو آغا کی گردن ناپنے کا جلدی ہے۔'' ربن نے بے بسی سے ہاتھ مسلے۔

''تم فکر نہ کرو دادا...... ابھی اپن ایک دم ہوشیار ہی ہے۔ پولیس والوں کی جاتی (ذات) کا اپنے کو بھی پتا ہے۔ سالے منہ کی کھا کر جانے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑے ہیں۔ اڈے کے آس پاس ہی منڈلاتے پھر رہے ہیں۔ اپن ادھر کے لیے نکلا تو بھی ایک سادہ والا اپنے پیچھے لگا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے جل دے کر اپن ادھر آیا ہے۔''

رامو کی دی اطلاع سے ظاہر تھا کہ پولیس والے شدت سے ربن کے متلاشی ہیں اور اس بار اسے کوئی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس صورتِ حال نے ربن کی تشویش میں اضافہ کر دیا اور اسے اندازہ ہوا کہ اس کا بمبئی سے باہر نکلنا بھی اتنا آسان ثابت نہیں ہوگا۔ پولیس کا کچھ معلوم نہیں تھا کہ ریلوے اسٹیشن پر بھی منڈلا رہی ہو اور اسے دیکھتے ہی چھاپ لے۔

''تو ادھر فاروق کو تار ڈلوا دے کہ ابھی آنے کی جلدی نہ کرے۔ ادھر تھوڑا حالات ٹھیک ہو جائیں تو پھر اسے واپس بلوا لیں گے۔ ادھر ہی آ کر کہاں خوار ہوتا پھرے گا۔ اچھا ہے وہیں آرام سے رہے۔''

''ٹھیک ہے دادا، اپن تار ڈلوا دے گا پر ادھر فاروق استاد کا کچھ پتا نہیں ہے کہ رکنے کو راضی ہو یا نہ

ہو۔ اسے ادھر لوٹنے کی بہت بے چینی ہے۔'' رامو بے یقینی کا شکار تھا۔

''تو تار ڈلوا دتے آگے جو ہوگا دیکھ لیں گے۔'' ربن نے اسے جواب دیا۔

''تمہارا کب ادھر سے نکلنے کا ارادہ ہے؟ ٹکٹ وکٹ کا بندوبست کرنا ہے تو بولو۔'' رامو نے اس کے آگے کے پروگرام سے آگاہی چاہی۔

''وہ سب اپن خود دیکھ لے گا۔ ادھر اچھو کے پاس جو لونڈا ہے ٹکٹ تو وہ بھی لا دے گا۔ تو اب ادھر مت آنا۔ پولیس والوں کو کوئی موقع دینا ٹھیک نہیں ہے۔ تو اپنی جگہ پر ٹک کر بیٹھ۔ اپنے پیچھے تجھے ہی دونوں اڈوں کی نگرانی کرنی ہے اور ہاں دیکھ ذرا ایک کام کرنا۔ ذرا ڈھول بیٹھ جائے تو اس حرام کے جنے وکرم کو اٹھوا لینا۔ اپن کو لگتا ہے مجو دادا یا اس کے کسی بندے سے اس کا جوڑ ملا ہوا ہے۔ اس تک جو خبریں پہنچ رہی ہیں، ان کو پہنچانے والا مجو کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔ اپن مجو کو بہت چھوٹ دے دیے ہیں۔ تو اس پلیسے وکرم کے حلق میں ہاتھ ڈال کر اس سے اگلوانا کہ مجو کس بل میں گھس کر بیٹھا ہوا ہے۔ اب مجو کا کہانی بھی جلدی ختم کر دینے کا ہے۔'' اس کا دماغ ہر طرف دوڑ رہا تھا اور وہ اسی حوالے سے رامو کو ہدایات بھی دیتا جا رہا تھا۔ اس کی اور رامو کی ملاقات کا مقصد بھی یہی تھا۔ رامو کو علم تھا کہ ربن اڈے سے نکل کر سیدھا اسی ٹھکانے پر آیا ہوگا جب ہی آئندہ کے لیے ہدایات لینے یہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ وہاں سے رخصت ہوا تو ربن نے ملازم لڑکے کو ٹکٹ اور کچھ دیگر سامان کی خریداری کے لیے بھیج دیا۔ لڑکا ڈیڑھ دو گھنٹے میں اس کی مطلوبہ اشیا لے کر پہنچ گیا۔ ربن نے سب چیزیں دیکھ کر اپنا اطمینان کیا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ جلد سونے کے لیے لیٹ گیا۔ علی الصباح اسے سفر کے لیے نکلنا تھا۔ ملازم نے اس کی ہدایت پر صبح صبح روانہ ہونے والی ٹرین میں اس کے لیے بکنگ کروائی تھی۔ صبح جب وہ اچھو کے ساتھ ناشتا کر کے وہاں سے نکلا تو بالکل بدلا ہوا انسان تھا۔ بدھ بھکشوؤں کے مخصوص لباس میں، ماتھے پر لکیریں کھینچے ٹرین میں سوار ہوتے بوڑھے کو دیکھ کر کون سوچ سکتا تھا کہ وہ بمبئی کا مشہور دادا ربن ہے۔ وہ پولیس والوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے جل دے کر بڑی صفائی سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

اپنے گلے میں موجود طلائی زنجیر میں پروئے خوب صورت لاکٹ کو دیکھتے ہوئے جوزفین کی آنکھوں میں انوکھی چمک تھی اور اس چمک کے آگے لاکٹ میں جڑے ہیرے کی چمک ماند پڑ رہی تھی۔ محبت کے تجربے سے گزرتی وہ آج کل خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنی مختصر زندگی میں غربت و افلاس اور شدید جدوجہد دیکھی تھی۔ اس کے طبقے کے لوگوں کو زندگی سے اپنا ناتا جوڑے رکھنے کے لیے بڑا کشٹ اٹھانا پڑتا تھا۔ ایسے میں نواب سلیم اللہ کی یہ حویلی تو اس کے لیے کوئی ونڈر لینڈ ثابت ہو رہی تھی۔ قیمتی لباس، ایک وقت میں میز پر سجے انواع و اقسام کے کھانے، پرتعیش کمرا...... یہ سب اسے پہلے کب میسر آیا تھا۔ نواب سلیم اللہ سے ملنے والی تنخواہ تو خرچ کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی اور ساری ضروریات ایسے ہی پوری ہو جاتی تھیں۔ اس قدر آسودگی میں نواب زادہ اسد اللہ کی محبت بھی مل گئی تو وہ خود کو دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی تصور کرنے لگی۔ خوش قسمتی کے اس احساس میں ڈوبی وہ غریب محلے سے آئی لڑکی بھلا محلاتی سازشوں سے کہاں واقف تھی۔ ہاں اس رات اکا بیگم سے اچانک سامنا ہو جانے پر کچھ خوف زدہ ضرور ہو گئی تھی لیکن بعد میں اسد اللہ کے دلاسوں نے اسے سنبھال لیا اور وہ اسد اللہ کی اس بات سے متفق ہو گئی کہ اکا بیگم سے وہ سامنا محض اتفاق تھا ورنہ اگر ان پر حقیقت کھل گئی ہوتی تو حویلی میں ایک طوفان آ جاتا۔

خاموشی کو امن سمجھنے والوں کو اندازہ نہیں تھا کہ اس خاموشی کے پیچھے بہت بڑا طوفان چھپا ہوا ہے اور کوئی ہے جو بہت خاموشی سے ان کی محبت پر شب خون مارنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اپنے تئیں وہ بہت احتیاط سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے لیکن نہیں جانتے تھے کہ کچھ خفیہ نگاہیں مسلسل ان کی نگرانی کر رہی ہیں۔ کل شب بھی انہوں نے ایسی ہی ایک ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات میں اسد اللہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ جاگیر کا انتظام دیکھنے کے لیے کچھ دنوں کے لیے اپنی زمینوں پر جا رہا ہے اس لیے کچھ عرصہ اسے جدائی برداشت کرنی ہوگی۔ محبت میں جدائی سہنا سب سے زیادہ کٹھن ہوتا ہے لیکن بہرحال دنیا کا کاروبار بھی نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ناچار انہیں ایک دوسرے سے رخصت لینی پڑی۔ اسد اللہ کے پیچھے جوزفین کا سارا دن اپنے معمول کے مطابق گزرا لیکن وہ ایک کمی سی محسوس کرتی رہی اور اب شب بسری کے لیے بستر پر لیٹی اس کی دی نشانی سے ہی دل کو بہلا رہی تھی۔ یہ لاکٹ بے شک بہت قیمتی تھا لیکن جوزفین کے لیے اس کی اصل اہمیت اس لیے تھی کہ اسد اللہ نے خود اپنے ہاتھوں سے اسے یہ لاکٹ پہنایا تھا۔ وہ اس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



لاکٹ پر اسد اللہ کے لمس کو محسوس کر سکتی تھی اور بے جان وبے بو پتھر میں اسد اللہ کی محبت کی حرارت اور خوشبو کو پا سکتی تھی۔ گلے میں پڑے ہوئے لاکٹ سے کھیلتے ہوئے اس کے ہونٹ آپ ہی آپ مسکرا رہے تھے۔ دروازے پر دی جانے والی دستک نے اسے اپنے خیالوں سے باہر نکالا۔

''آجاؤ۔'' اس نے جلدی سے لاکٹ کو گریبان کے اندر چھپایا اور دستک دینے والے کو اندر آنے کی اجازت دی۔ حسب توقع سروری دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں دھلے ہوئے استری شدہ کپڑوں کا بنڈل تھا۔

''معاف کیجیے گا مس صاحب، آپ کی نیند خراب ہوئی۔ میں بس آپ کے یہ جوڑے رکھنے کو آئی تھی۔ اکا بیگم نے مجھے باورچی خانے کا کام سمیٹنے پر لگا دیے تھے۔ اس واسطے تھوڑی دیر ہو گئی۔'' الماری کھول کر کپڑے اندر رکھتی ہوئی سروری کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

''کوئی بات نہیں سروری۔ میں ابھی سوئی نہیں تھی اس لیے میری نیند بھی خراب نہیں ہوئی۔ تم شرمندہ نہ ہو۔'' جوزفین نے نرمی سے اس سے کہا تو وہ پلٹ کر بہت عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو سروری؟'' جوزفین کو اس کے انداز پر حیرت ہوئی۔

''آپ بہت اچھے ہیں مس صاحب۔'' سروری نے بڑی بے ساختگی سے اس کی تعریف کی۔

''اچھی تو تم بھی بہت ہو۔ میرا اتنا خیال رکھتی ہو۔ سچ تمہاری وجہ سے مجھے بہت آرام ہے۔'' جوزفین نے مسکراتے ہوئے پوری سچائی سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''سروری کہاں کی اچھی بری ہے۔ سروری تو بس حکم کی غلام ہے۔ جو حکم ملے میرے کو پورا کرنا پڑتا۔ میرے کو میری غلطیوں کے لیے مجبور سمجھ کر معافی دے دینا۔ آپ مجھے معاف کر دیں گے نا مس صاحب؟'' اس کا لہجہ اب بھی عجیب وغریب تھا لیکن جوزفین سمجھ نہیں سکی اور ہنس کر بولی۔

''کیا بات ہے سروری، آج بڑے عجیب موڈ میں ہو...... کہیں اکا بیگم سے زیادہ ہی ڈانٹ تو نہیں پڑ گئی؟'' جواب میں سروری زبان سے کچھ نہ بولی اور سر کو زور سے نفی میں جنبش دے کر وہاں سے جانے لگی۔

''بات سنو سروری! اگر ہاضمے کا کوئی چورن وغیرہ ہو تو مجھے دے دو۔ رات کے کھانے کے بعد سے طبیعت کچھ بے چین ہے شاید کھانا زیادہ ہی ہو گیا تھا۔'' اس نے جاتی ہوئی سروری کو آواز دے کر اس سے کہا تو وہ سر کو ہلکی سی جنبش دے کر باہر نکل گئی اور تھوڑی دیر بعد ہی اسے چورن کی ایک ڈبیا دے گئی۔ جوزفین نے ڈبیا میں موجود چورن کی تھوڑی سی مقدار پھانکی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

گزشتہ رات اسد اللہ سے ملاقات کے لیے جانے کے باعث وہ بہت کم نیند لے سکی تھی اور آج دوپہر میں بھی آرام کرنے کے بجائے کتب خانے میں وقت گزارا تھا اس لیے اصولاً آج اسے جلد نیند آجانی چاہیے تھی لیکن نیند اس سے روٹھی ہوئی تھی۔ ایک طرف دل و دماغ پر اسد اللہ کی یاد نے یلغار کر رکھی تھی تو دوسری طرف طبیعت کا بھاری پن بھی بے چین کر رہا تھا۔ عجیب متلی کی سی کیفیت تھی۔ ایک گھنٹے بعد اس نے تھوڑا سا چورن اور پھانکا اور کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔ آخرکار اسے اپنی طبیعت میں تھوڑی بہتری محسوس ہوئی اور وہ دوبارہ سونے کے لیے بستر پر آگئی۔ اس بار تھوڑی سی کوشش پر ہی نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور وہ اتنی گہری نیند سوئی کہ صبح معمول کے مطابق وقت پر نہیں جاگ سکی۔ اپنے دیر سے اٹھنے پر وہ ہڑبڑا سی گئی اور سرہانے لگی گھنٹی بجا کر سروری کو کمرے میں بلایا۔

''تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں سروری...... اتنی دیر ہو گئی۔ بچے پڑھنے کے لیے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ کتنا برا لگے گا میرا اتنی لیٹ انہیں پڑھانے کے لیے جانا۔ آپا بیگم الگ ناراض ہوں گی۔ انہوں نے پہلے دن ہی مجھے بتا دیا تھا کہ یہاں پر ہر کام کے اوقات مقرر ہیں اور مجھے بھی اس پابندی پر عمل کرنا ہوگا۔'' سروری کو اس کی کوتاہی پر ڈانٹتی تو وہ خاصی پریشان ہو رہی تھی۔

''آپ پریشان نکو ہو مس صاحب۔ میں اکا بیگم کو صبح اچ بتا دی تھی کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور انہوں نے آپا بیگم سے آپ کی چھٹی کے لیے بات کر لیے تھے۔ اس واسطے اچ میں آپ کو آرام سے سوتے رہنے دی۔ آپ بولو آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ ناشتے میں آپ کیا کھائیں گے؟''

اس کی پریشانی کے جواب میں سروری نے کمال اطمینان سے اسے تسلی دی تو اس کے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے اور اس نے گہری سانس لیتے ہوئے بیڈ کراؤن سے اپنا سر ٹکا لیا۔ طبیعت کا بوجھل پن اب بھی برقرار تھا اور وہ بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔ اس لیے سستی سے بولی۔

''ناشتے واشتے کو رہنے دو۔ میں پہلے نہاؤں گی تاکہ طبیعت فریش ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں غسل خانہ تیار کر دیتی ہوں۔'' سروری نے حکم کی تعمیل کی اور الماری سے کپڑے وغیرہ

نکالنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے جوزفین کو غسل خانہ تیار ہونے کی اطلاع دی۔ جوزفین نہا کر نکلی تو سروری تازہ پھلوں کے رس کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضر ہوگئی۔ جوزفین نے اس کا شکریہ ادا کیا اور گلاس لبوں سے لگایا۔ ابھی اس نے مشکل سے آدھا گلاس ہی پیا ہوگا کہ اس کے کمرے کا دروازہ زوردار آواز سے کھلا۔ اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں آپا بیگم، عالیہ اور نواب بیگم موجود تھیں۔ ساتھ ہی سروری اور اکا بیگم بھی مؤدبانہ انداز میں نظر آرہی تھیں۔ اس پوری فوج کو دیکھ کر اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا اور وہ بوکھلا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

"آپ لوگ یہاں...... کوئی کام تھا تو مجھے بلوالیا ہوتا۔" حیران پریشان وہ بس اسی قدر کہہ سکی۔

"نکو بی بی۔ تم جیسے فنکاراں تو قدر کرنے کے لائق ہوتے ہیں اس لیے ہم تمہیں زحمت نہیں دیے اور خود یہاں چلے آئے تاکہ تمہیں تمہاری فنکاری کی داد دے سکیں۔" آپا بیگم کے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار تھی البتہ ان کے ساتھ آئی دیگر خواتین لب بستہ کھڑی ہوئی تھیں۔

"ج...... جی۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں سمجھ نہیں پارہی۔" جوزفین مزید بوکھلاہٹ کا شکار ہوگئی۔

"ابھی سب سمجھ آجائے گی۔ اکا بیگم اور سروری آپ دونوں کمرے کی تلاشی لیجیے۔" اسے کڑوے لہجے میں جواب دیتے ہوئے آپا بیگم نے اپنی ملازماؤں کو حکم سنایا۔ اس حکم پر دونوں فوراً حرکت میں آگئیں اور کمرے کی ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگیں۔

"پلیز مجھے بتائیں تو کہ یہ سب کیا ہے اور آپ لوگ کیا تلاش کر رہے ہیں؟" اس اٹھا پٹخ پر جوزفین نے ہراساں ہو کر دہائی دی۔

"صاحب زادی عالیہ کے وہ زیورات تلاش کر رہے ہیں جو رات تم نے بہت چالاکی سے چرا لیے تھے اور اب شاید یہاں سے فرار کی ترکیبیں سوچ رہی تھیں۔" آپا بیگم نے کاٹ دار لہجے میں اسے جواب دیا تو اس کا بدن سنسنا اٹھا اور وہ چیخ کر بولی۔

"آپ مجھ پر غلط الزام لگارہی ہیں۔ میں نے کوئی چوری نہیں کی ہے۔"

"اچھا تو پھر وہ کیا ہے؟" آپا بیگم نے طنز سے اشارہ کیا۔ اس نے ان کے اشارے کی سمت دیکھا۔ اکا بیگم الماری سے تہ کیے ہوئے کپڑے نکال کر ان کی تہ کھول رہی تھیں اور ایک دوپٹے میں لپٹی سرخ مخملی پوٹلی سامنے آکر اسے منہ چڑا رہی تھی۔

"کھولیے اس پوٹلی کو۔" آپا بیگم نے جلالی لہجے میں حکم دیا تو اکا بیگم نے پوٹلی کے منہ پر بندھی ریشمی ڈوری کی گرہ کھول کر اسے بستر پر الٹ دیا۔ کئی قیمتی زیورات نکل کر بستر پر بکھر گئے۔ جوزفین نے حیرت سے ان زیورات کو دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ صاحب زادی عالیہ کے زیورات ہیں۔ کل شام ہی جب وہ حسب معمول عالیہ کو پڑھانے اس کے کمرے میں گئی تھی تو عالیہ اپنے سامنے یہ زیورات بکھرائے بیٹھی تھی۔ اس نے زیورات جوزفین کو دکھاتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کی والدہ نواب بیگم نے اسے اس کی شادی پر دینے کے لیے یہ زیورات بنوائے ہیں۔ جوزفین نے دل کھول کر ان خوب صورت و قیمتی زیورات کی تعریف کی تھی۔ تعریف سن کر عالیہ خوش ہوگئی تھی اور پھر ان زیورات کو سمیٹ کر اس کے سامنے ہی الماری میں رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد حسب معمول جوزفین نے اسے پڑھانا شروع کردیا۔ دوران پڑھائی عالیہ اپنی والدہ کے بلاوے پر کچھ دیر کے لیے کمرے سے باہر بھی گئی تھی اور شاید یہیں سے جوزفین کے لیے شک کی بنیاد پڑی تھی۔

"اب آنکھیں پھاڑے کیا دیکھ رہی ہو۔ صاحب زادی عالیہ نے سادگی میں تمہیں اپنے اتنے قیمتی زیورات دکھائے تو تمہاری نیت خراب ہوگئی اور موقع پاتے ہی تم نے انہیں چرا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اگر عالیہ کو بروقت زیورات کی چوری کا علم نہ ہوجاتا تو یقیناً تم کسی بہانے سے انہیں لے کر یہاں سے فرار ہوجاتیں۔" آپا بیگم اس پر الزامات کی بوچھاڑ کررہی تھیں۔ طبیعت کی خرابی کے باعث وہ پہلے ہی نڈھال تھی، اتنے بڑے الزام کو سن کر اس کا سر اور بھی بری طرح چکرانے لگا۔

"میں نے یہ جیولری چوری نہیں کی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیسے میری الماری میں آگئی۔" کمزور آواز میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اس کی نظر سروری پر پڑی۔ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر اس نے نظریں چرالیں۔ یکدم ہی جوزفین پر بہت کچھ منکشف ہوگیا۔ رات سروری کا اس کے کپڑے لاکر رکھنا اور خود کو مجبور ظاہر کرتے ہوئے بلاوجہ ہی معافی طلب کرنا، بے معنی نہیں تھا۔ اس حویلی میں اس کے خلاف باقاعدہ ایک سازش تیار کی گئی تھی اور شاید اس سازش میں حویلی کی ساری کرتا دھرتا خواتین شامل تھیں۔ سازش کی وجہ وہ خود بھی جانتی تھی۔ اس نے اس اونچی حویلی میں رہنے والے نواب زادے سے محبت کی تھی اور یہاں بسنے کے

خواب دیکھنے لگی تھی۔ حویلی والوں کے لیے وہ مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کے مانند تھی چنانچہ انہوں نے اسے حویلی بدر کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اس مقصد کے لیے وہ موقع چنا گیا تھا جب صاحب زادہ اسد اللہ حویلی میں موجود نہیں تھا۔ صورتِ حال کو سمجھ کر اس کے ہاتھ پاؤں اور بھی ٹھنڈے پڑ گئے۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور اس انجام سے بچنے کے لیے اس کے پاس کوئی تدبیر نہیں تھی۔

''سروری......'' اس کے لرزاں وجود پر ایک قہر بھری نظر ڈالتے ہوئے آپا بیگم نے ملازمہ کو پکارا اور پھر حکم صادر کیا۔

''اس لڑکی کا سارا سامان باندھ کر اس کے حوالے کرو اور اسے حویلی کے دروازے سے باہر چھوڑ آؤ۔ اس حویلی میں کسی چور کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' بے رحمی سے حکم صادر کرنے کے بعد وہ وہاں رکی نہیں اور گردن اکڑائے باہر نکل گئیں۔ جوزفین کے اندر اب اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ اپنے قدموں پر کھڑی ہو سکے چنانچہ بستر کے کنارے پر ٹک گئی اور رحم طلب نظروں سے عالیہ اور نواب بیگم کی طرف دیکھنے لگی۔ عالیہ تو نظر چرا کر فوراً ہی کمرے سے باہر چلی گئی لیکن نواب بیگم اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہیں اور پھر ایک گہری سانس لے کر بولیں۔

''ہمیں افسوس ہے لیکن ہم آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ کو اپنے کیے کی سزا بھگتنی ہوگی اور فوراً اس حویلی سے جانا ہوگا۔ یہاں آپ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' نواب بیگم کے ادا کیے جملے معنی خیز تھے۔ شاید وہ اسے بتا رہی تھیں کہ اسد اللہ سے محبت کرنے کے جرم کو معاف نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اسے اس حویلی میں جگہ مل سکتی ہے۔ جوزفین کا دل چاہا کہ وہ خوب چیخ چیخ کر ان سب کی سازش کو بے نقاب کرے اور اعلان کر دے کہ اسد اللہ کے واپس آنے تک وہ یہاں سے نہیں جائے گی لیکن نواب بیگم کے اگلے جملوں نے اسے اپنی اس خواہش کا گلا گھونٹ دینے پر مجبور کر دیا، وہ کہہ رہی تھیں۔

''آپا بیگم تو آپ کو چوری کے الزام میں پولیس کے حوالے کر دینے کی خواہش مند تھیں لیکن ہمیں آپ کی کم عمری پر ترس آگیا اور ہم نے بہ مشکل انہیں اس بات پر راضی کیا کہ آپ کو محض ملازمت سے برخاست کر دینے پر اکتفا کر لیا جائے۔ اس سے پہلے کہ ان کا مزاج مزید برہم ہو اور وہ دوبارہ اپنا فیصلہ بدل لیں، بہتر ہوگا کہ آپ یہاں سے روانہ ہو جائیں۔'' اسے مشورہ دینے کے بعد انہوں نے بھی کمرا چھوڑ دیا۔ اس عرصے میں سروری خاموشی سے اس کا سامان باندھتی رہی تھی اور آپا بیگم کھڑی نگرانی کر رہی تھیں۔ اپنے ساتھ ہونے والے اس سلوک پر جوزفین کی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن کسی سے کچھ بھی کہنا بیکار تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اس سازش کے اہم مہرے سروری سے بھی کوئی شکایت نہیں کی اور اسے اپنا سامان باندھتے ہوئے دیکھتی رہی۔

''چلیں مس صاحبہ! میں آپ کو حویلی کے بیرونی دروازے پر چھوڑ آتی ہوں۔'' سامان باندھ چکنے کے بعد سروری نے اس سے دھیمی آواز میں کہا تو وہ کسی معمول کی طرح کھڑی ہوگئی اور سروری کے ساتھ چل پڑی۔ زنان خانے سے حویلی کا بیرونی پھاٹک خاصے فاصلے پر تھا۔ یہ فاصلہ طے کرتے ہوئے اسے یاد آیا کہ جب وہ اس حویلی میں داخل ہوئی تھی تو ایک شاندار گاڑی میں سوار تھی اور اس گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ خود نواب زادہ اسد اللہ نے سنبھال رکھی تھی۔ چند ماہ قبل ملنے والی اتنی عزت کے بعد وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اس حویلی سے یوں نکالی جائے گی کہ اس پر چوری جیسے قبیح فعل کا الزام ہوگا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ الزام محبت کا تاوان ہے اور اس نے یہ تاوان بغیر کسی احتجاج کے بہت خاموشی سے ادا کر دیا تھا اور اب یہ دیکھنے کی منتظر تھی کہ نواب زادہ اسد اللہ محبت کے امتحان سے کیسے گزرتے ہیں۔ اگر وہ سچے تھے تو انہیں یقین ہونا چاہیے تھا کہ جوزفین پر لگا الزام جھوٹا ہے۔ اس یقین کی صورت میں ہی وہ ہر مشکل سے گزر کر اس تک پہنچ سکتے تھے۔

''آپ بولیں مس صاحبہ تو آپ کو تانگے میں اسٹیشن تک چھڑوا دوں۔'' سروری کی آواز نے اسے خیالات کے ہجوم سے نکالا۔

''اسٹیشن...... اسٹیشن پر کیوں؟'' اس نے حیرت سے ایسے پوچھا جیسے سروری نے کوئی انوکھی بات کہہ دی ہو۔

''آپ کو بمبئی واپس جانا ہوگا اور ادھر جانے کو ریل گاڑی تو اسٹیشن سے ہی ملیں گی نا......!'' اس کی حیرت پر سروری نے کچھ حیرانی سے وضاحت کی۔

''بمبئی واپس جانا ہوگا......نہیں، میں نواب زادہ اسد اللہ سے ملے بغیر بمبئی واپس نہیں جاؤں گی۔ میں یہیں حیدر آباد میں رہوں گی۔'' منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا اور اس فیصلے کے ساتھ ہی اسے وہ مشفق خاتون صبیحہ بیگم یاد آئیں جو حیدر آباد آتے ہوئے اس کی ہم سفر تھیں اور جنہوں نے بڑے خلوص سے اسے پیشکش کی تھی کہ اگر اسے نواب سلیم اللہ کی حویلی میں ملازمت نہ ملے تو وہ نواب فراست بیگ کی کوٹھی پر چلی آئے۔ صبیحہ بیگم نواب

بیگ کی حویلی میں برسوں سے ملازم تھی اور ملازمین میں ان کی جو عزت اور مقام تھا، اس کی بنیاد پر انہیں یقین تھا کہ ان کی سفارش پر جوزفین کو نواب فراست بیگ کے ہاں کوئی نہ کوئی ملازمت ضرور مل جائے گی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اسد اللہ کی واپسی تک وہ صبیحہ بیگم کے پاس جا کر رہ لے گی۔

''آپ کیا بول رہے ہیں مس صاحبہ! میرے کو بالکل سمجھ نہیں آ رہی۔ کیا ریلوے اسٹیشن نہیں جانے کا ہے؟'' اس کی بڑبڑاہٹ سے اندازہ لگاتے ہوئے سروری نے پوچھا۔

''تھینک یو سروری! مجھے تمہاری خدمت کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے جہاں جانا ہوگا، خود چلی جاؤں گی۔'' اس نے سروری کے ہاتھ میں موجود بیگ جھپٹا اور قدرے تلخ لہجے میں کہہ کر باقی رہ جانے والا چند قدم کا فاصلہ طے کر کے حویلی کے پھاٹک سے باہر نکل گئی۔ اس کے اس عمل پر سروری جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی جبکہ جوزفین باہر نکل کر پیدل ہی ایک سمت چل پڑی تھی۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے سواری مل گئی۔ صبیحہ بیگم کا دیا ہوا پتا اس کے پاس محفوظ تھا لیکن اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور کوچوان کو نواب فراست بیگ کا نام بتا دینا ہی کافی ثابت ہوا۔ فراست بیگ کی حویلی میں صبیحہ بیگم نے خوشگوار سی حیرت کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور بڑی محبت سے گلے لگایا۔ وہ جواب تک کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالے ہوئے تھی، ان کی محبت بھری بانہوں کے حصار میں آتے ہی سارے حوصلے چھوڑ بیٹھی اور کسی بھربھری دیوار کی طرح ڈھتی چلی گئی۔

☆☆☆

ربن نے تو احتیاط کے پیشِ نظر رامو کو ہدایت کر دی تھی کہ فاروق کو واپس نہ آنے کا تار بھیج دے لیکن فاروق تار کے پہنچنے سے قبل ہی واپسی کے لیے چل پڑا تھا۔ چاند بانو پر کیے گئے قاتلانہ حملے نے اس کے دل و دماغ میں آگ سی لگا دی تھی اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس سازش کے ذمے داروں کو ان کے انجام تک پہنچائے بغیر دم نہیں لے گا۔ اس فیصلے کو کر چکنے کے بعد اس نے شملہ جا کر اپنا سامان لینا تک گوارا نہیں کیا تھا اور چنڈی گڑھ سے ہی واپسی کی ٹرین میں سوار ہو گیا تھا۔ شملہ سے سامان لانے کی ذمے داری اس نے اڈے سے آنے والے دونوں افراد کو سونپ دی تھی اور خود گولو اور کیتھرائن کے ساتھ عازمِ سفر ہوا تھا۔ چاند بانو کی طرف سے اسے یوں فکر نہیں تھی کہ اب اس کے پاس کاجل اور ملازم خاص موجود تھا۔ وہ دونوں اس کی دیکھ بھال اچھی طرح کر سکتے تھے۔ رقم کا بندوبست اس نے کر دیا تھا اور ساتھ ہی چنڈی گڑھ کے اڈے پر بھی کہہ آیا تھا کہ ان لوگوں کی خبر گیری کرتے رہیں۔

چنڈی گڑھ کے اڈے والوں سے شملہ جاتے وقت ان لوگوں کا اچھا یارانہ ہو گیا تھا اور وہ پہلے ہی دیدہ و دل فرش راہ کیے بیٹھے تھے کہ واپسی میں وہ لوگ یہاں آئیں گے تو ان کی مہمان داری کریں گے۔ مہمان بننے سے تو فاروق نے وقت کی قلت کے باعث معذرت کر لی البتہ منو پہلوان کو پیشکش کی کہ وہ چاہے تو اس کے ساتھ بمبئی چل سکتا ہے۔ منو پہلوان جو پہلے ہی سے بمبئی دیکھنے کا خواہش مند تھا فوراً راضی ہو گیا اور اپنے چاچا سے اجازت لے کر سامان باندھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ ریل گاڑی کے ایک ڈبے میں سوار اب وہ چاروں بمبئی کی سمت سفر کر رہے تھے۔ منو پہلوان اس سفر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ گولو اور کیتھرائن بھی اس کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے لیکن فاروق پر خاموشی طاری تھی۔ اس کا دماغ چاند بانو کے لیے سلگ رہا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ اس کا انتقام لیے بغیر سکون نہیں پا سکے گا۔ اس کا دل تو یہ چاہتا تھا کہ یہاں سے سیدھا بملا کے پاس پہنچے اور اس سے حساب کتاب کرے لیکن پھر اس نے سوچا کہ بملا سے حساب کتاب کرنے سے قبل گنیش کی گردن ناپی جائے اور اس سے ساری سچائی اگلوا کر پہلے اپنے شکوک اور اندازوں کی تصدیق کر لی جائے تو پھر مع ثبوت بملا سے حساب کرے گا۔ گنیش تک پہنچنے کے لیے اس کا بمبئی پہنچنا ضروری تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اپنے تئیں ''کام'' نمٹا لینے والا گنیش واپس شملہ جانے کے بجائے سیدھا بمبئی پہنچے گا۔ بمبئی بھاٹیہ سیٹھ کا ٹھکانا تھا اور گنیش بھاٹیہ سیٹھ کے لیے ہی کام کرتا تھا۔

''فاروق بھرا! آؤ کچھ روٹی ٹکر کر لو۔'' کھڑکی کے قریب بیٹھا وہ آسمان کے آنچل پر ٹکے ستاروں کو یونہی خالی نظروں سے دیکھتا اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ پہلوان کی آواز نے اسے چونکایا۔

''تسی تو لگدا اے ساڈے نال ہو ہی نہیں۔ کدھر کھوئے ہوئے ہو؟'' منو پہلوان نے اپنی پتھر جڑی انگوٹھیوں سے بھرے ہاتھ کو لہراتے ہوئے اس سے شکوہ کیا۔ اپنے بھاری جثے پر ریشمی رنگین لباس چڑھائے وہ اس سفر کے دوران خاصا خوش نظر آ رہا تھا اور اس کی یہ معصومانہ خوشی دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ چنڈی گڑھ کے اڈے کی گدی پر بیٹھنے والا وہ دادا ہے جس کا زور پورے شہر میں چلتا ہے۔ اصل میں موہن داس عرف منو ابھی اتنا زیادہ تجربہ کار

نہیں تھا اور اس کے پیچھے اس کے چاچا کپل داس کا دماغ چلتا تھا۔ کپل داس اس بھتیجے کی پشت پر تھا اور اسے اس کی طاقت اور پھرتی کا درست طور پر استعمال کرنا سکھاتا رہتا تھا۔

"میں یہیں ہوں یار۔ بس زیادہ بولنے کی عادت نہیں ہے اور سفر میں خاموشی سے باہر کا نظارہ کرنا اچھا لگتا ہے اس لیے تم ایسا محسوس کر رہے ہو۔" فاروق نے اس کی دل جوئی کے لیے وضاحت کی۔

"کوئی گل نئیں جیسی تہاڈی خوشی ویسے رہو، پر کچھ کھانا پینا تو کرلو۔ خالی پیٹ تو کچھ وی چنگا نئیں لگدا ہے۔" منو بشاشت سے ہنسا اور ایک بار پھر اسے کھانے کی دعوت دی تو اس نے انکار نہیں کیا اور ان تینوں کے قریب آبیٹھا۔

اس گفتگو کے دوران کیتھرائن دستر خوان لگا چکی تھی۔ وہ معاملہ فہم لڑکی تھی اور فاروق کے مزاج کو کافی حد تک سمجھ چکی تھی اس لیے اسے غیر ضروری طور پر ڈسٹرب کرنے سے گریز کرتی تھی۔ اب بھی اس نے نہایت خاموشی سے کھانا لگایا تھا۔ فاروق کھانا کھانے بیٹھا تو اسے بے ساختہ ہی بمبئی سے اپنا روانہ ہونا یاد آیا۔ اس روز چاند بانو بطورِ خاص اسے رخصت کرنے اسٹیشن پر آئی تھی اور اس کے بازو پر امام ضامن باندھا تھا۔ وہ اپنے ساتھ انواع واقسام کے کھانوں سے بھرا توشے دان بھی لے کر آئی تھی اور دورانِ سفر ان کھانوں کی لذت نے خوب لطف دیا تھا۔ اب وہ واپس بمبئی جا رہا تھا تو بھی وقتِ رخصت چاند بانو سے مل کر آیا تھا لیکن اس حال میں کہ وہ بے چاری اسپتال کے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ کاش اس نے بھی کوئی امام ضامن چاند بانو کے بازو پر باندھا ہوتا۔

بہت حسرت سے سوچتے ہوئے وہ اپنے ساتھیوں کا ساتھ دینے کے لیے کھانا زہر مار کرنے لگا۔ کھانے سے فراغت کے بعد وہ ایک بار پھر کھڑکی کے ساتھ والی نشست پر جا بیٹھا۔ باہر اندھیرے میں دیکھنے کو کیا دھرا تھا۔ سارے مناظر تو اس کے اپنے ذہن میں جمے ہوئے تھے۔ وہ ادھر ادھر کی سیکڑوں باتیں بیک وقت سوچتا رہا۔ اس کے ساتھی بھی کچھ دیر بعد اپنے اپنے مشاغل ترک کر کے سونے کے لیے لیٹ گئے۔ اسے کافی دیر بعد بیت الخلا جانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اپنی جگہ سے اٹھا۔ باہر قدم رکھتے ہی اسے اپنے پیچھے ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ وہ بہت تیزی سے پلٹا اور یہ پھرتی ہی اس کے کام آگئی ورنہ چمکتا ہوا چاقو کا پھل اس کی پشت میں اتر چکا ہوتا۔ جس جگہ وہ موجود تھا، وہاں روشنی بہت کم تھی پھر بھی اس نے حملہ آور کو شناخت

کرلیا۔ وہ ماجد علی تھا۔ اس شخص سے ان کی چنڈی گڑھ جاتے ہوئے ریل میں ہی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بمبئی سے شکنتلا نامی ایک نوعمر امیر زادی کو ورغلا کر اس کے قیمتی زیورات سمیت اسے چنڈی گڑھ لے جا رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ چنڈی گڑھ پہنچ کر شکنتلا کے زیورات ہتھیا لے گا اور اسے کسی کے ہاتھ بیچ دے گا لیکن ربن کے درمیان میں پڑنے سے وہ اپنے اس ارادے میں ناکام رہا۔ بعد میں اس نے چنڈی گڑھ میں بھی شکنتلا کو تنگ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ایک بار پھر منہ کی کھانی پڑی تھی اور اسے منو پہلوان اور اس کے چاچا کپل داس نے اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے تھانے میں بند کروا دیا تھا۔ وہاں سے یہ شخص شاید کسی طرح ساز باز کر کے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا، فاروق وغیرہ کو اس نے چنڈی گڑھ میں دیکھا ہوگا تو اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی ہوگی اور اس آگ کو بجھانے کے لیے ہی اس وقت وہ فاروق پر حملہ آور ہوا تھا۔

فاروق نے اس کے پہلے حملے سے بچ جانے کے بعد نہایت چابکدستی سے اپنی جیب میں ہمہ وقت پڑا رہنے والا چاقو باہر نکال لیا تھا لیکن چاقو نکال لینے کے باوجود اس نے ماجد علی پر اس کا استعمال نہیں کیا۔ اس کی تیز نگاہوں نے ماجد علی کے چاقو تھامنے کے انداز کو دیکھ کر بھانپ لیا تھا کہ اس شخص کو چاقو سنبھالنے کا ہنر نہیں آتا اور نہ ہی وہ اس کی چاقو زنی کے آگے ٹھہر سکتا ہے۔ ایسے اناڑی پر اپنے چاقو کا استعمال کرنے کے بجائے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے یونہی قابو کیا جائے۔ اس نے ماجد علی کے دوسرے وار سے قبل ہی تیزی سے اپنی لات چلائی جس کے نتیجے میں وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا لیکن گرنے کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری اور نیچے پڑے پڑے ہی ہاتھ میں موجود چاقو فاروق کو کھینچ مارا۔ فاروق نے بروقت جھکائی دے کر خود کو اس کے وار سے بچایا۔ چاقو آواز کے ساتھ نیچے گرا۔ فاروق کو اندازہ تھا کہ شور کی آواز سوتے ہوئے مسافروں کو جگا دے گی۔ اس نے اپنا نکالا ہوا چاقو واپس جیب میں ڈال لیا۔ یوں بھی ماجد علی اب نہتا تھا اور وہ اس سے ہتھیار کے بغیر بھی نمٹ سکتا تھا۔ چاقو رکھ کر اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے ماجد علی کو اپنے گھونسوں کی زد پر رکھ لیا۔ اپنے بچاؤ کی کوشش کرتے ہوئے اس نے بھی دو چار الٹے سیدھے ہاتھ چلائے اور ساتھ ساتھ بلند آواز میں دھمکیاں بھی دیتا رہا۔ اس کی دھمکیوں میں جان سے ماردوں گا اور چھوڑوں گا نہیں تجھے...... جیسے جملے واضح تھے۔ اس کی

مسلسل تواضع کے دوران فاروق نے اپنے اردگرد لوگوں کی آوازوں کو سنا اور اپنے ہاتھوں کی رفتار دھیمی کر لی۔

''چھوڑنا نہیں...... کو۔ بھرکس نکال دو...... کا۔'' اسے اپنی پشت پر منو پہلوان کی جوش بھری آواز سب سے واضح طور پر سنائی دے رہی تھی جو بڑے فراٹے سے ماجد علی کے لیے اعلیٰ پائے کی گالیوں کا استعمال کر رہا تھا۔

''اسٹاپ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔'' سب آوازوں کے بیچ سنائی دینے والی یہ آواز ریلوے گارڈ کی تھی۔ فاروق نے اس آواز کو سن کر اپنے ہاتھ روک لیے اور پیچھے ہٹ گیا۔ مقابلے کی ناکام کوشش کرنے والا ماجد علی بھی فوراً فرش پر ڈھے گیا۔

''یہ کیا ہو رہا تھا مسٹر...... یہ کیسا ہنگامہ تھا؟'' گارڈ نے قریب آکر سخت لہجے میں فاروق سے دریافت کیا۔

''اس شخص نے چاقو سے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ شاید کوئی اچکا ہے جو مسافروں کو لوٹنے کے لیے ٹرین میں سوار ہو گیا ہے۔'' فاروق نے مہذب لب ولہجے میں گارڈ کی بات کا جواب دیا۔ ردِعمل میں ماجد علی اسے ننگی ننگی گالیاں دینے لگا۔ اس کی کیفیت دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ اس شخص پر کوئی جنون سا طاری ہے۔ اس کے انداز واطوار سے قطعی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ایک اسکول ٹیچر ہے۔ اصل میں ایک طرف وہ شگفتگا کے باپ سے اپنی بہن کی موت کا انتقام لینا چاہتا تھا تو دوسری طرف ایک بڑی رقم کے حصول کا خواب دیکھ رہا تھا۔ ربن اینڈ کمپنی کی مداخلت سے اس کے دونوں ہی مقاصد پورے نہیں ہو سکے اور الٹا اسے حوالات کی ہوا کھانی پڑی اس لیے وہ ضرورت سے زیادہ ہی بدکا ہوا تھا۔

''آپ لوگ اپنے ٹکٹ چیک کروائیں۔'' گارڈ نے بیک وقت فاروق اور ماجد علی کو حکم دیا۔ گولو نے فوراً ٹکٹ لا کر پیش کر دیے۔ وہ فرسٹ کلاس کے مسافر تھے۔ گارڈ نے اپنے ہاتھ میں موجود تیز روشنی والی ٹارچ کی روشنی میں ان کے ٹکٹوں کا جائزہ لیا اور ماجد علی سے ایک بار پھر ٹکٹ دکھانے کا تقاضا کیا۔ وہ ٹکٹ پیش نہیں کر سکا۔ شاید اس کی ٹکٹ خریدنے کی استعداد ہی نہیں تھی۔ اس کا حال بھی خاصا ابتر نظر آ رہا تھا۔ ملگجا لباس، بڑھی ہوئی شیو، سنولائی ہوئی رنگت، وہ کہیں سے بھی تو خوش شکل ماجد علی دکھائی نہ دیتا تھا۔ حالانکہ پہلی بار ملاقات ہونے پر وہ انہیں خاصا خوش رو اور نفاست پسند نوجوان دکھائی دیا تھا۔

''تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔'' ماجد علی کے ٹکٹ پیش نہ کرنے پر گارڈ نے اس سے سخت لہجے میں کہا۔ وہ فاروق کو کینہ توز نظروں سے دیکھتا ہوا اس حکم پر کھڑا ہو گیا اور قدم آگے بڑھائے لیکن پھر اس نے ایک ایسی غیر متوقع حرکت کی کہ اس کی امید فاروق تو کیا، کسی کو بھی نہیں تھی۔ اس نے یکدم ہی فاروق کو زوردار دھکا دیا اور پھر اس سے چمٹ کر رہ گیا۔ ایک تو اس کی حرکت غیر متوقع تھی، دوسرے وہ جنون کی سی کیفیت میں تھا اور اس کیفیت میں آدمی کی طاقت عام حالات کے مقابلے میں کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ فاروق اس کے ساتھ لڑھکتا ہوا چلتی ہوئی ریل گاڑی کے کھلے دروازے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس صورتِ حال پر کئی لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ماجد علی کے ارادے صاف ظاہر تھے۔ وہ فاروق کو چلتی ہوئی ریل گاڑی سے نیچے دھکیل دینا چاہتا تھا۔ فاروق نے بھی اس بات کو بھانپ لیا اور دروازے کی چوکھٹ میں پاؤں اڑا کر خود کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنے کے ساتھ بری طرح چمٹے ہوئے ماجد علی کو اپنے سے الگ کرنے کے لیے زور لگانے لگا۔ اسے اس کام میں اس لیے بھی مشکل پیش آ رہی تھی کہ ماجد علی صرف اسے دھکیل ہی نہیں رہا تھا بلکہ جنگلی جانور کی طرح بے دریغ دانتوں کا استعمال کرتے ہوئے جگہ جگہ کاٹتا بھی جا رہا تھا۔ فاروق کا ایک ہاتھ اس کی گرفت میں تھا جبکہ دوسرے ہاتھ سے وہ اپنے دفاع کی کوشش کر رہا تھا۔ چلتی ٹرین کے کھلے دروازے پر کھڑے ہو کر یہ جدوجہد کرنا آسان نہیں تھا۔ فاروق نے ماجد علی کی وحشت کو قابو میں کرنے کے لیے اس کے سر کے بالوں کو اپنی گرفت میں لے کر جھٹکا دیا لیکن اس میں تو کسی جن کی روح سمائی ہوئی تھی۔ جواب میں وہ درندے کی طرح غرایا اور اپنی گرفت میں موجود فاروق کی کلائی کو بھنبھوڑ کر رکھ دیا۔ فاروق نے بلبلا کر اس کو ایک اور زوردار جھٹکا دیا اور یہ وہ پل تھا جب ان دونوں ہی کا توازن بری طرح بگڑ گیا۔ فاروق کا دروازے کے فریم میں پھنسا پاؤں اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور اسے لگا کہ وہ اڑ کر ٹرین سے باہر جا گرے گا لیکن اللہ کی مہربانی سے دروازے کا ہینڈل بروقت اس کے ہاتھ کی گرفت میں آ گیا اور وہ خود کو گرنے سے بچانے میں کامیاب ہو گیا، البتہ ماجد علی ایسا نہیں کر سکا اور ایک وحشیانہ سی چیخ کے ساتھ اڑتا ہوا کھلے دروازے سے باہر نکلا۔ فاروق نے بے ساختہ ہی اپنے دوسرے ہاتھ سے اسے تھام کر گرنے سے بچانے کی کوشش کی لیکن وہ جس تیزی سے باہر نکلا تھا، وہ رفتار فاروق کی کوشش کو ناکام بنا گئی اور ماجد علی کے لباس کا کوئی حصہ ذرا کی ذرا اس کے ہاتھ کی گرفت میں آکر فوراً ہی چھوٹ گیا۔ اس کوشش میں

دروازے کا ہینڈل تھامے فاروق کو بھی ایک زوردار جھٹکا لگا اور یوں محسوس ہوا کہ وہ اپنا توازن کھو کر خود بھی نیچے جا گرے گا لیکن اس نے ہینڈل پر سے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں ہونے دی اور ایک بار پھر دروازے کی چوکھٹ میں پاؤں ٹکانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس موقع پر عالم اضطراب میں آگے بڑھ کر آجانے والے منو نے اسے سہارا دیا تو وہ دروازے سے ہٹ کر اندر آنے میں کامیاب ہوگیا۔ اسی وقت آہستہ ہوجانے والی ریل گاڑی بھی رک گئی۔

اصل میں گارڈ نے ماجد علی کو فاروق کو باہر دھکیلتے دیکھ کر زنجیر کھینچ دی تھی۔ برق رفتاری سے چلتی ٹرین کو رکنے میں کچھ وقت لگتا ہے اور یہ چند سیکنڈ ہی ماجد علی کی زندگی کا فیصلہ کر گئے تھے۔ ٹرین رکتے ہی فاروق، گارڈ اور منو سمیت کئی افراد نے نیچے چھلانگ لگائی۔ گارڈ کے پاس تیز روشنی والی ٹارچ تھی۔ اس کی راہنمائی میں سب بدنصیب ماجد علی کی کھوج میں نکل کھڑے ہوئے۔ انہیں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اندیشوں کے عین مطابق انہیں ماجد علی کا دریدہ جسم پٹری پر پڑا مل گیا۔ وہ بہت بری طرح کچلا گیا تھا اور ناک نقشہ مٹ جانے کے علاوہ اس کے کئی اعضا بھی الگ ہوگئے تھے۔ دیکھنے والوں کو اس لرزہ خیز منظر پر اپنی آنکھیں بند کرلینی پڑیں۔ دو چار کی تو سسکاریاں بھی نکل گئیں۔

اب وہاں صرف ان کے ڈبے کے مسافر نہیں تھے بلکہ زنجیر کھینچے جانے پر صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے آنے والے عملے کے افراد اور آوازوں پر دوسرے ڈبے سے برآمد ہونے والے پُرتجسس مسافر بھی شامل ہوگئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ویرانہ انسانی آوازوں سے بھر گیا۔ ہر کوئی حقیقت حال جاننے کی کوشش کرتا ہوا اپنے اپنے طور پر تبصرے بھی کررہا تھا۔ ساری صورتِ حال کے چشم دید گواہ ریلوے گارڈ نے ایک طرف لے جاکر عملے کے افراد کو مختصراً صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اس کے بعد وہ لوگ اپنی کارروائی نمٹانے لگے۔ مسافروں کو واپس ان کے ڈبوں میں بھیجا گیا۔ فاروق اور اس کے ساتھی بھی اپنی جگہ پر واپس بھیج دیے گئے اور ان کی نگرانی کے لیے ایک گارڈ بھی مقرر کردیا گیا۔ اس کے بعد شاید انہوں نے ماجد علی کے دریدہ جسم کے ٹکڑوں کو اکٹھا کیا ہوگا لیکن اس کارروائی کو دیکھنے کے لیے کسی مسافر کو باہر رکنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ انتظار کا بوجھل مرحلہ بھی بالآخر گزر ہی گیا اور ویرانے میں کھڑی ریل گاڑی ایک بار پھر حرکت میں آگئی۔ اس دوران میں کیتھرائن نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ

فاروق کی مرہم پٹی کر ڈالی تھی۔ جہاں جہاں ماجد علی نے کاٹا تھا، وہاں جراثیم کش دوا لگانے کے ساتھ اس نے فاروق کو ایک گولی بھی کھانے کے لیے دی تھی۔ پیش آنے والے حادثے نے اسے بری طرح متاثر کیا تھا لیکن زبان سے کچھ بھی کہے بغیر وہ تندہی سے اپنی ڈیوٹی پوری کرتی رہی تھی۔ ہراساں سا گولو فاروق کے ساتھ جڑ کر بیٹھا ہوا تھا جبکہ منو پہلوان کا بھی چہکنا بند ہو چکا تھا۔ ماجد علی کی ہولناک موت نے ان سب کو ہی اپنی اپنی جگہ متاثر کیا تھا۔

''قانونی کارروائی کے لیے آپ کو آنے والے اسٹیشن پر اترنا ہوگا مسٹر فاروق! آپ کے ساتھی چاہیں تو اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔'' گاڑی چلے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ عملے کے افراد میں سے آکر ایک شخص نے انہیں آگاہ کیا۔ فاروق اس حکم پر ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ صورتِ حال کے مطابق یہ حکم غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ تو بس یہ سوچ رہا تھا کہ جانے اس پر بمبئی کے راستے کیوں بند ہیں۔ وہ جتنا بمبئی واپس جانے کے لیے تڑپ رہا تھا، رکاوٹیں تھیں کہ کھڑی ہی ہوتی جارہی تھیں۔

☆☆☆

نواب فراست بیگ کی حویلی میں صبیحہ بیگم کا سرونٹ کوارٹر اس کے لیے آج کل جائے پناہ بنا ہوا تھا۔ صبیحہ بیگم اس کی بالکل ایسی خاطر مدارت کر رہی تھیں جیسی اپنی بیٹی رئیسہ کی میکے آمد پر کرتی تھیں۔ ان کی محبت اور خلوص نے جوزفین کو یہ حوصلہ دیا تھا کہ اس نے اپنے سارے حالات بلا کم و کاست انہیں کہہ سنائے تھے۔ سب سن کر انہوں نے یہی رائے دی تھی کہ یقیناً نواب سلیم اللہ کی حویلی کی کرتا دھرتا خواتین کو اس کی اور اسد اللہ کی محبت کا علم ہو گیا تھا اور انہوں نے نہایت چالاکی سے سازش کا جال بچھا کر اسے حویلی سے نکالنے کا بندوبست کر دیا تھا۔ انہوں نے جوزفین کو دبے لفظوں میں اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا تھا کہ اگر وہ خود کو کسی طرح چوری کے الزام سے بری کروانے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے تو اس کا اسد اللہ کی زندگی میں شامل ہونا کارِ محال ہوگا۔ اسد اللہ کو بے پناہ خاندانی دباؤ کے سامنے اس سے دست بردار ہونا ہی پڑے گا لیکن جوزفین کو اسد اللہ کی محبت پر اعتبار تھا۔ ہر محبت کرنے والے کی طرح وہ یقین رکھتی تھی کہ اسد اللہ پوری دنیا کو چھوڑ سکتا ہے لیکن اسے نہیں۔ صبیحہ نے بھی سوچا کہ چلو لڑکی قسمت آزمالے تاکہ آئندہ کبھی اسے کوئی پچھتاوا نہ ہو اور یہ حسرت نہ رہ جائے کہ وہ نواب زادہ اسد اللہ کی محبت کو آزمائے بغیر ہی

واپس لوٹ گئی تھی۔ انہوں نے اسے تسلی دی تھی کہ وہ جب تک چاہے یہاں اطمینان سے رہ سکتی ہے۔ وہ اپنے طور پر معلوم کرواتی رہیں گی کہ اسد اللہ جاگیر سے واپس لوٹ کر آگئے ہیں یا نہیں۔

حقیقتاً صبیحہ بیگم نے اسے بے حد سہارا دیا تھا اور وہ پورے آرام سے ان کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی لیکن اس کی طبیعت کا اضطراب اسے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ بار بار اپنی بے عزتی کو یاد کر کے آنکھیں بھر آتی تھیں۔ مستقبل کے خدشات بھی اپنی جگہ تھے۔ وہ سارا دن یقین اور بے یقینی کے درمیان ڈولتی رہتی تھی۔ صبیحہ بیگم حویلی کے باورچی خانے میں بننے والے بہترین کھانے خوان میں سجا کر اس کے سامنے لاکر رکھتیں لیکن اس سے کچھ کھایا ہی نہیں جاتا تھا۔ سینے پر جیسے کوئی بوجھ سا دھرا رہتا تھا۔ وہ بہت مشکل سے ہی چند لقمے زہر مار کر پاتی تھی۔ اس وقت بھی صبیحہ بیگم اسے کھانے کا خوان دے کر زنان خانے سے آنے والے پیغام پر بڑی بیگم صاحبہ کی خدمت میں گئی ہوئی تھیں۔ بڑے سے خوان میں خاص ترکیب سے سکھائے گئے گوشت کے تلے ہوئے لمبے اور پتلے پارچے، بگھارے بینگن، گوشت، لوکی اور دال سے تیار کردہ دالچہ، بگھارے چاول اور لوکی کا حلوا موجود تھا۔

جوزفین کا حیدرآباد آمد کے بعد ان کھانوں سے تعارف ہوا تھا اور اس نے انہیں اتنا لذیذ پایا تھا کہ شوق میں خود کئی چیزیں پکانا سیکھ لی تھیں۔ اس کے دل میں بڑا ارمان تھا کہ اسد اللہ سے شادی کے بعد وہ خود اپنے ہاتھوں سے یہ کھانے تیار کر کے انہیں کھلائے گی۔ بے شک حویلی میں بے شمار ملازمائیں تھیں لیکن ایک محبت کرنے والی وفادار بیوی کے ہاتھ سے پکا ہوا کھانے میں اسد اللہ کو جو لطف آتا، اس کا تو کسی سے کوئی مقابلہ ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کے ان خوابوں کو شرمندۂ تعبیر ہونا تھا یا نہیں، اس کا فیصلہ تو مستقبل ہی میں ہونا تھا ابھی تو اس کا یہ حال تھا کہ اپنی پسند کی ساری نعمتیں سامنے ہونے کے باوجود کچھ کھانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ جو باسی روٹی کے ساتھ بغیر بگھاری دال بھی رغبت سے کھا لیتی تھی، پُرتکلف کھانے کی طرف بھی راغب نہیں ہو پارہی تھی حالانکہ اشتہا بڑھانے کے لیے اس کھانے کے ساتھ طرح طرح کے اچار، چٹنیاں اور سلاد بھی خوان میں سجے ہوئے تھے۔ اسے صبیحہ بیگم کی میزبانی اور خلوص کا خیال نہ ہوتا تو اس خوان کو یوں ہی واپس لوٹا دیتی۔ اب بھی کافی دیر خوان سامنے رکھے ایسے ہی بیٹھی رہی پھر خیال آیا کہ

صبیحہ بیگم بڑی بیگم صاحبہ کی خدمت سے واپس لوٹیں گی تو سب کچھ یونہی دیکھ کر ناراض ہوں گی، چنانچہ دل پر جبر کرتے ہوئے ایک پلیٹ میں اپنے لیے تھوڑا سا کھانا نکالا اور منہ میں لقمہ رکھا۔ پہلے دو لقموں کو وہ کسی نہ کسی طرح حلق سے نیچے اتارنے میں کامیاب بھی ہوگئی لیکن تیسرے لقمے پر اسے بہت زور کی ابکائی آئی اور ابکائیاں لیتے ہوئے وہ پیٹ پکڑ کر دہری ہوگئی۔

''اوئی ماں۔ یہ کیا ہوگیا تمہارے کو۔ اچانک طبیعت کیوں خراب ہوگئی؟'' صبیحہ جو اسی وقت اندر آئی تھیں، گھبرا کر اس کی طرف لپکیں اور ہولے ہولے اس کی پیٹھ سہلانے لگیں لیکن اس کی ابکائیوں کا سلسلہ نہ تھما اور وہ اٹھ کر غسل خانے کی طرف بھاگی۔ معدے میں موجود خوراک کی قلیل مقدار کو الٹ کر واپس آنے میں اس کی طبیعت نڈھال ہوگئی اور وہ پسینا پسینا ہوتی زرد چہرے کے ساتھ بستر پر گرنے کے انداز میں لیٹ گئی۔ صبیحہ بیگم آنکھوں میں تشویش اور فکر سموئے اسے دیکھتی رہیں اور پھر نزدیک آکر فکرمندی سے پوچھنے لگیں۔

''کیا ہوگیا بٹیا......؟ طبیعت خراب تھی تو میرے کو بولتے۔ میں حکیم صاحب سے تمہارے کو دوا منگوا کر دے دیتی۔''

''آپ فکر مت کریں خالہ جان۔ میری طبیعت ٹھیک ہے بس کچھ دنوں سے ذرا بوجھل پن ہے اور کھانا کھانے کا دل نہیں چاہتا۔ اب بھی زبردستی کھانے کی کوشش کی تو الٹی آگئی۔'' جوزفین نے نحیف آواز میں اپنے تئیں انہیں تسلی دینے کی کوشش کی لیکن ان کے ماتھے پر فکرمندی سے کچھ اور لکیریں پڑ گئیں۔ انہوں نے جوزفین کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس سے اس کی کیفیت کے بارے میں چند ایک سوالات مزید کیے اور پھر ایک گہرا سانس لے کر بولیں۔

''میرے کو بدگمانی ہوئی ہے تو اللہ مجھے معاف کرے پر آثار سے لگتا ہے کہ جوانی کے جذبات میں تم اور نواب زادہ صاحب حد سے گزر گئے اور اب اس کا نتیجہ سامنے آنے کو ہے۔''

صبیحہ بیگم کی بات کے جواب میں جوزفین زبان سے کچھ نہ کہہ سکی اور نظریں جھکالیں۔ اس کی یہ جھکی نظریں ہی جواب تھیں۔ اس خاموش اعتراف پر صبیحہ بیگم کے چہرے پر بیک وقت رنج اور غصے کے تاثرات ابھرے تاہم انہوں نے زبان سے کوئی سخت بات نہیں نکالی اور افسوس سے بولیں۔ ''تم اپنی نادانی میں خود کو بڑی مصیبت میں پھنسا لیے۔ ان حالات میں تو تمہارا نواب زادہ صاحب سے ملنا اور ضروری ہوگیا ہے، پر ان کے گھر والے تمہارے کو ڈھیل دینے کو تیار نہیں ہیں۔ انہوں نے تمہارے پر حیدرآباد کی زمین تنگ کرنے کا پورا انتظام کر کے بیٹھے ہیں۔ تمہارے کو معلوم ہے ابھی بڑی بیگم صاحب مجھے کیوں بلائے تھے۔ انہوں تمہارے بارے میں بات کرنے کو بلائے تھے۔ نواب سلیم اللہ کی حویلی سے کوئی آکر ان کو بتا کو گیا کہ تمہارے کو وہاں سے چوری کے الزام میں نکالے ہیں اور ادھر کوئی تمہارے کو اپنے کنے رکھتا ہے تو اپنی ذمے داری پر رکھے۔ ایسا نہ ہو کہ کل کلاں کو تم ادھر بھی چوری چکاری کریں اور بعد میں یہاں والے شکایت کا دفتر کھولیں کہ نواب صاحب کی حویلی سے کسی نے ہوشیار اچ نہیں کیا تھا۔ بیگم صاحب مجھے صاف بولے کہ صبیحہ تمہاری یہاں بڑی عزت ہے۔ اس لڑکی کو یہاں رکھ کر تم اپنی عزت گنوانے کا انتظام کیوں کرتے ہیں۔ اس کو یہاں سے چلتا کرو۔ اب تم بولو کہ اس حکم کے بعد میں تمہارے کو کیسے ادھر رکھ سکتی ہوں۔ میں بہت شرمندہ ہوں بیٹی پر میری بھی مجبوری ہے۔ برسوں نواب فراست بیگ کا نمک کھایا ہے۔ بیگم صاحبہ کا حکم نہ مان کر اس عمر میں اپنے دامن پر داغ نہیں لگا سکتی۔ رہنے کو ٹھکانے کا مسئلہ نہیں۔ داماد نیک ہے، میں رئیسہ بانو کے گھر میں بھی جاکر پڑ سکتی ہوں پر اول تو داماد کے گھر رہنا اچھا نہیں لگتا، دوسرے حویلی سے اپنی وفاداری نبھانا چاہتی ہوں۔ تمہارے واسطے میں اتنا اچ کر سکتی ہوں کہ تمہارے بمبئی واپس جانے کا بندوبست کردوں اور جب نواب زادہ اسد اللہ واپس آئیں تو انہیں تمہارے حالات سے آگاہ کردوں بلکہ تم ایسا کرنا کہ ان کے نام سے چٹھی لکھ کر مجھے دے جانا۔ میں وہ چٹھی ان کے حوالے کردوں گی۔'' صبیحہ بیگم نے ایک ہی سانس میں بیگم فراست بیگ کا حکم، اپنی مجبوری اور مسئلے کا ممکنہ حل اسے بتا ڈالا۔ جوزفین توجہ سے ان کی ایک ایک بات سنتی رہی۔ کم عمری کے باوجود وہ خاصی باشعور تھی اور صبیحہ بیگم کی ہر بات کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی چنانچہ اس عارضی ٹھکانے کے چھن جانے کا سن کر بھی حواس باختہ نہیں ہوئی اور تحمل سے بولی۔

''میں آپ کی سب باتیں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں خالہ جان۔ اب میں خود بھی یہاں رہ کر آپ کے لیے مسئلہ بننا پسند نہیں کروں گی۔ آپ میرے بمبئی واپس جانے کا انتظام کریں اتنی دیر میں، میں نواب زادہ صاحب کے نام خط لکھتی ہوں۔''

''جیتی رہو بیٹی۔ اللہ مشکلوں کو آسان کرے۔ میری کسی بات سے دل دکھا ہو تو معافی دے دینا۔'' صبیحہ بیگم

اسے گلے لگا کر کہتے ہوئے آبدیدہ ہوگئیں۔

''معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔ شرمندہ تو میں ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو تکلیف اٹھانا پڑی۔ آپ کی محبت اور خلوص کو تو میں ساری زندگی یاد رکھوں گی۔ اپنی مام کی ڈیتھ کے بعد میں نے آپ میں ان کے جیسی خوشبو فیل کی ہے۔'' جوزفین ان کے دونوں ہاتھ تھام کر رو پڑی۔ صبیحہ بیگم نے بھی جذباتی ہوکر اس کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔

☆☆☆

فاروق وغیرہ کو جس جگہ ضروری کارروائی کے لیے ریل سے اتارا گیا، وہ کوئی بڑا شہر نہیں تھا۔ اس اسٹیشن پر ریل تقریباً آٹھ دس منٹ رکی تھی۔ زیادہ پُرہجوم اسٹیشن نہیں تھا لیکن صاف ستھرا اور مختلف اسٹالوں سے سجا ہوا تھا۔ یہاں اتر کر کئی مسافروں نے اپنی ضرورت کی اشیا خریدی تھیں۔ فاروق اور اس کے ساتھیوں کو بھی اجازت مل گئی تھی کہ وہ کچھ کھانا پینا چاہیں تو کھا سکتے ہیں البتہ ایک پولیس اہلکار ان کے ساتھ ساتھ رہے گا۔ فاروق نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ گولو اور منو اس کے اشارے پر کھانے پینے کا سامان خریدنے لگے۔ خود وہ ایک انگریزی اخبار خرید لایا۔ ویٹنگ روم میں بیٹھ کر ان لوگوں نے پیٹ پوجا کی اور ساتھ ہی فاروق اخبار بینی بھی کرتا رہا۔ اخبار کانگریسی نظریات کا حامی معلوم ہوتا تھا اس لیے اس میں چھپنے والا اداریہ اور خبریں ہندو برادری کے نظریات کی عکاسی کر رہی تھیں۔ اداریے میں ہندوستان میں مقیم مسلمانوں کے لیے بہت سخت زبان استعمال کی گئی تھی اور ان ناانصافیوں کو خاطر میں لائے بغیر جن کے باعث مسلمان علیحدہ وطن کا مطالبہ کر رہے تھے، مسلمانوں کو غدار قرار دیا گیا تھا۔ خبروں سے فاروق کو یہ بھی علم ہوا کہ دو دن قبل وہاں کانگریس کا ایک جلسہ بھی منعقد ہوا تھا۔ اس جلسے میں جس قسم کی تقریریں کی گئی تھیں، اس کا بھی اخبار کے طرزِ تحریر سے اندازہ ہو رہا تھا۔ فاروق جس ماحول میں رہ رہا تھا، وہاں اس قسم کے معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں لی جاتی تھی لیکن وہ ایک تعلیم یافتہ اور باشعور انسان ہونے کی حیثیت سے ان حالات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا اور اس کا شعور گواہی دے رہا تھا کہ تاریخ کا کوئی بڑا واقعہ ظہور پذیر ہونے کو ہے حالات جس رخ پر جا رہے تھے، ان سے ہر شخص ہی متاثر ہوتا، چاہے وہ ان سارے معاملات میں ملوث ہوتا یا خود کو لاتعلق رکھتا۔

ملکی حالات پر دل میں فکرمند ہوتا ہوا وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ سب کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ اس نے بھی جلدی جلدی اپنی چائے ختم کی پھر وہ اپنے ساتھ موجود پولیس اہلکار کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

مقامی تھانے میں ان سب کے بیانات ریکارڈ کیے گئے۔ ڈیوٹی افسر نے فاروق سے بہت سے سوالات کیے۔ اس کے سوالات میں زیادہ زور اس بات پر تھا کہ وہ ماضی میں ماجد علی اور اس کے درمیان کسی قسم کے تعلق کے بارے میں کھوج لگا سکے لیکن فاروق اپنے ابتدائی بیان پر قائم رہا اور ماجد علی سے مکمل ناآشنائی ظاہر کرتے ہوئے اسے ایسا لٹیرا قرار دیا جو دھوکے سے اسے لوٹنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کے بیان کی تائید و تصدیق کی۔ ماجد علی سے شناسائی ظاہر کرنے میں الجھنوں میں اضافہ ہو جاتا۔ ابھی تو گواہان اس بات کی تصدیق کر سکتے تھے کہ ماجد علی اپنے ہی جنون میں اتفاقاً چلتی گاڑی سے نیچے گر گیا۔ کسی قسم کی شناسائی کے اظہار کی صورت میں پولیس اس اتفاقی حادثے کو قتل قرار دینے پر اپنا زور لگا دیتی۔ الزام سے تو خیر وہ بچ ہی نکلتے لیکن وقت خراب ہوتا۔ ویسے ہی ریلوے انتظامیہ نے انہیں یہاں اتار کر ایک طرح سے ان کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ وہ کہیں بھاگے نہیں جا رہے تھے۔ بمبئی پہنچ کر بھی یہ سارا قضیہ چھیڑا جا سکتا تھا لیکن شاید ایک آدمی کی جان چلے جانے پر وہ لوگ حواس باختہ ہو گئے تھے اور پہلے قریبی اسٹیشن پر ہی اپنی جان چھڑا لینی مناسب سمجھی تھی۔

ماجد علی کی موت نے خود فاروق کے اعصاب کو بھی متاثر کیا تھا اس لیے وہ بھی کوئی اعتراض کیے بغیر اس اجنبی جگہ پر اترنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ ضابطے کی کارروائی نمٹانے اور ان کے رہائشی پتے نوٹ کر لینے کے بعد انہیں تھانے سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ انہوں نے معلومات حاصل کر کے ایک مسافر ہوٹل کا رخ کیا۔ بمبئی جانے کے لیے اب انہیں کل ہی ٹرین ملتی۔ تھانے میں انہیں یقین دہانی کروائی گئی تھی کہ کل انہیں یہاں سے جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔ ڈیوٹی افسر سے ہونے والی فاروق کی گفتگو نے ان کی الجھن کو بڑھنے نہیں دیا تھا۔ وہ فاروق کے اندازِ گفتگو اور انگریزی دانی سے متاثر ہوا تھا، اسی وجہ سے اس کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آیا تھا اور اس کے رویے سے بھی یہ ظاہر تھا کہ اس نے ان لوگوں کو یہاں اتارے جانے کو ایک غیرضروری فعل سمجھا تھا۔ انسان کے ساتھ دنیا میں کئی بار ایسے واقعات پیش آتے ہیں جب وہ اپنے ساتھ ہونے والے عمل کو غیرضروری خیال کرتا ہے لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان غیرضروری افعال

کے ذریعے ہی قدرت کوئی اہم کام سرانجام دلوانا چاہتی ہے۔ ان کا یہاں رکنا بھی کچھ ایسا ہی ثابت ہوا۔ ہوٹل پہنچ کر پہلے تو انہوں نے نہادھو کر اپنے لباس تبدیل کیے پھر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد سیر کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اتفاق ہی تھی، وہ اس انجان علاقے میں اتر گئے تھے اور اب انہیں یہاں کل تک کا وقت بھی گزارنا تھا تو بہتر تھا کہ کوفت کے عالم میں ہوٹل میں پڑے رہنے کے بجائے ذرا یہاں گھوم پھر کر ہی دیکھ لیا جائے۔

بمبئی جیسے بڑے شہر کے باسیوں کے لیے یہ جگہ بہت چھوٹی تھی لیکن صاف ستھری اور سادگی سے بھرپور ہونے کی وجہ سے انہیں اچھی لگ رہی تھی۔ لوگوں کے لباس اور بول چال سے انہیں اندازہ ہوگیا کہ یہاں ہندو اور مسلم آبادی ملی جلی ہے۔ گھومنے پھرنے کے دوران میں انہیں لوگوں سے گفتگو کرنے اور ان کی آپس کی بات چیت سننے کا موقع بھی ملا اور انہوں نے محسوس کرلیا کہ فضا میں تناؤ کی سی کیفیت ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کھنچاؤ سا موجود ہے۔ یقیناً یہ دو دن پہلے ہونے والے جلسے اور آزادی کی تحریک کے اثرات تھے۔ ان حالات میں وہ ہندو، مسلمان اور عیسائی یکجا ہوکر گھومتے شاید ان لوگوں کو عجیب لگ رہے ہوں لیکن انہیں اس بات کی پروا نہیں تھی۔ ان کے درمیان ہر شے سے بڑھ کر ان کے باہمی خلوص اور محبت کا رشتہ تھا۔

ملکی حالات پر افسوس کرتے ہوئے انہوں نے رات کا کھانا ایک ڈھابے پر کھایا اور پیدل ہی اپنے رہائشی ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ چھوٹا علاقہ تھا، کوئی بمبئی نہیں جہاں راتیں بھی جاگتی ہیں اس لیے واپسی میں انہیں زیادہ تر راستے خالی اور سنسان ملے۔ البتہ رہائشی علاقوں سے گزرتے ہوئے انہوں نے مردوں کو دو دو تین تین کی ٹولیوں میں جاگتے ہوئے ضرور پایا۔ ان کا انداز پہرا دینے والا تھا اور ایسا یقیناً حالات کی وجہ سے تھا۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے بلوؤں کی خبریں سننے میں آرہی تھیں۔ اختلافات نفرت کا روپ دھار چکے تھے اور یہ نفرت خون بہانے پر اتر آئی تھی۔ اس ساری صورتِ حال پر افسوس کرتے ہوئے وہ لوگ ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ ایک نسوانی چیخ سن کر رک گئے۔ چیخ گھٹی گھٹی سی تھی لیکن اس میں ایک تڑپ سی تھی اور یوں لگ رہا تھا کہ کوئی چیخنے والی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی آواز بلند ہونے سے روک رہا ہو۔

”چیر کر رکھ دو سالے کو۔ جندہ (زندہ) نہ جانے پائے ایہاں (یہاں) سے۔“

ایک مرد کی غصے میں بھری لیکن دبی ہوئی آواز سنائی دی تو اس بار انہیں اندازہ ہوگیا کہ آوازیں اسی گھر سے آرہی ہیں جس کے سامنے وہ رکے ہوئے ہیں۔ کان لگا کر سننے پر انہیں چند مزید ایسی آوازیں بھی سنائی دیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دو تین افراد آپس میں گتھم گتھا ہیں لیکن وہ منہ سے کوئی آواز نہیں نکال رہے تھے۔

”اکبر کو جانے دو باپو۔ میں تمہاری بنتی کرتی ہوں۔“ لڑکی کی منت بھری رندھی ہوئی آواز میں کہا گیا فقرہ سن کر وہ لوگ مزید چونک گئے۔ شاید لڑکی کے منہ پر رکھا ہاتھ ہٹ گیا تھا اور اب وہ چیخنے کے بجائے منت سماجت کر رہی تھی۔

”دور ہوجا تو میری نظروں کے سامنے سے۔ اس مسلّے سے عشق لڑا کر تو نے سارا دھرم بھرشٹ کر ڈالا ہے۔ تیرے کارن میری برادری میں ناک کٹی تو تیرا کھون (خون) کر ڈالوں گا۔“ غصے کے باوجود مرد نے اپنی آواز کو زیادہ بلند نہیں ہونے دیا تھا اگر وہ اس مکان کے بالکل سامنے نہ کھڑے ہوتے تو انہیں یہ سب سنائی بھی نہ دیتا۔

”میری جان لے لو پر اسے چھوڑ دو۔ دیکھو اسے خود بھی تمہاری عجت (عزت) کی کتنی چنتا ہے۔ اتنی مار کھا رہا ہے پر منہ سے ایک آواج (آواز) نہیں نکال رہا۔“ لڑکی گویا بلبلا رہی تھی۔

”تو اس کا منہ بند کرتی ہے یا نہیں سرسوتی! اب یہ بولی تو میں اسے ہمیشہ کے لیے کھاموش (خاموش) کر ڈالوں گا۔“ مرد کی غراہٹ میں سفاکیت تھی۔ فاروق بے ساختہ ہی لکڑی کی اس کھڑکی کی طرف بڑھا جس کے پٹ تو بند تھے لیکن درمیان میں موجود درزوں سے اندر جھانکا جاسکتا تھا۔ اندر جھانکنے پر صورتِ حال زیادہ واضح ہوگئی۔ کمرے میں جلتی لالٹین کی روشنی میں اس نے ایک درمیانی عمر کی عورت کو نوعمری قبول صورت لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے بولنے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا۔

”بھگوان کے لیے چپ کر جا پارو، کیوں اپنی جان کی دشمن بنی ہے۔“ عورت زبان سے بھی لڑکی کو خاموش رہنے کی نصیحت کر رہی تھی لیکن فاروق کی توجہ ان ماں بیٹی پر سے ہٹ چکی تھی اور وہ کمرے کے بائیں جانب کے منظر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ تقریباً پارو کا ہی ہم عمر ایک نوجوان لڑکا تھا جو پیٹھ کے بل فرش پر لیٹا ہوا تھا اور کم و بیش اسی کی عمر کے دو لڑکے ہاتھوں میں ڈنڈے سنبھالے بلاتکلف اس پر برسانے میں لگے ہوئے تھے۔ زمین پر گرا لڑکا اپنے ہاتھوں اور پیروں پر ان کے وار سنبھال رہا تھا اور

صاف لگتا تھا کہ بہت تکلیف میں ہے لیکن تکلیف کے باوجود اس کے منہ سے کوئی چیخ نہیں نکل رہی تھی۔ لڑکے کے کمال ضبط نے فاروق کو متاثر کیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا چنانچہ اپنے ساتھیوں کی طرف پلٹا اور گولو کو مخاطب کر کے بولا۔

''تم کیتھرائن کو لے کر ہوٹل پہنچو۔ میں اور موہن تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔''

''لیکن فاروق بھائی......'' گولو نے اعتراض کرنے کی کوشش کی جسے فاروق نے ناکام بنا دیا اور زبان سے ایک بھی لفظ نکالے بغیر اسے ہاتھ کے اشارے سے وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ اب گولو کے پاس مزید وہاں رکے رہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کیتھرائن کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

''ہمیں لڑکے کی مدد کرنی ہوگی۔ ورنہ یہ لوگ اسے جان سے مار دیں گے۔'' کھڑکی سے ذرا دور ہٹ کر اس نے سرگوشی میں منو سے کہا تو اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا...... فاروق نے پہلے کھڑکی کی چوکھٹ پر اور پھر چھجے پر پیر جمائے اور اگلی چھلانگ میں چھت پر پہنچ گیا۔ منو ذرا بھاری تن و توش کا مالک تھا لیکن وہ بھی اسی طریقے پر عمل کرتے ہوئے مکان کی چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ چھت کچی تھی اور اس سے نیچے جانے کے لیے لکڑی کا زینہ بھی موجود تھا۔ وہ دونوں احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے زینے سے نیچے پہنچ گئے اور اس کمرے کا رخ کیا جہاں سارا ڈراما جاری تھا۔ اصل میں وہ مکان کا پچھلا کمرا تھا اور وہ لوگ درحقیقت مکان کے سامنے سے نہیں بلکہ اس کی پشت والی گلی سے گزرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ مکان اچھا خاصا بڑا تھا اور کھلے صحن کی دوسری طرف مکان کے سامنے کے رخ پر بھی کمرے وغیرہ بنے دکھائی دے رہے تھے۔ فاروق نے منو کو اپنے پیچھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا۔ اس کی اچانک آمد نے کمرے میں موجود تمام نفوس کو بری طرح چونکا دیا۔ ڈنڈے برساتے لڑکوں کے ہاتھ بھی حیرت سے رک گئے۔

''کون ہو تم؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہاں گھسنے کی؟'' سب سے پہلے اسی آدمی نے غصے سے پوچھا جو پارو نامی لڑکی سے گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ ڈنڈے برساتے لڑکوں کو بھی ہدایات جاری کر رہا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جس کے سر کے بال درمیان سے اڑ چکے تھے اور اطراف میں بالوں کی جھالر سی لٹک رہی تھی۔

''میں خدائی فوجدار ہوں اور کہیں بھی کسی پر ظلم ہوتے دیکھ کر بیچ میں کودے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' فاروق نے ادھیڑ عمر آدمی کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا تو، تو اس لفنگے کا یار ہے اور اس کی مدد کے لیے آیا ہے۔ رام، شام بیٹے پہلے اس کی ہڈیاں توڑ دو پھر اکبر کا حساب کرتے ہیں۔'' وہ آدمی اپنے گھر میں کھڑا تھا اور اس کے دو نوجوان بیٹے ہاتھوں میں ڈنڈے تھامے اس کے ساتھ موجود تھے۔ ایسے میں اس نے خالی ہاتھ آنے والے فاروق سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اطمینان سے بیٹوں کو حکم دیا لیکن یہ حکم دیتے ہوئے بھی اس کی آواز بلند نہیں ہوئی تھی۔ فاروق اس کی مجبوری کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ چوری چھپے ملنے آئے ہوئے بیٹی کے عاشق کو سبق تو سکھانا چاہتا تھا لیکن اسے اس بات کی بھی فکر تھی کہ آس پاس والوں کو خبر نہ ہو اور اس کی عزت سلامت رہے۔ خود فاروق کی بھی ایسی کوئی خواہش نہیں تھی لیکن وہ اکبر نامی اس نوجوان لڑکے سے بھی ہمدردی محسوس کر رہا تھا جو یقیناً دیدارِ یار کے لیے آگ کے دریا میں کود گیا تھا۔ رام اور شام نامی وہ لڑکے اکبر کو جس بے دردی سے مار رہے تھے، اس سے تو یوں لگ رہا تھا کہ وہ اس کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ رات کی تاریکی میں اکبر کو خاموشی سے قتل کر کے کہیں گاڑ دیا جاتا تو اس کے پچھلوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اکبر کی تنہائی اور بے بسی نے اسے اس کی مدد پر مجبور کیا تھا اور وہ پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کے لیے یہاں موجود تھا۔

رام اور شام نے باپ کا حکم پاتے ہی اس پر حملہ کر دیا۔ وہ دو مختلف سمتوں سے اس پر حملہ آور ہوئے تھے لیکن فاروق بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ ربن کا تربیت یافتہ تھا۔ اس نے نا صرف لڑکوں کا وار روکا بلکہ دائیں جانب سے آنے والے کی کلائی تھام کر اس زور سے موڑی کہ وہ کراہ کر رہ گیا اور اس کے ہاتھ سے ڈنڈا نکل گیا۔ وہ ڈنڈا فاروق نے جھپٹ لیا اور بائیں طرف سے دوبارہ حملہ آور ہوتے لڑکے کے ڈنڈے پر ضرب لگائی۔ لڑکے نے ڈنڈا ہاتھ سے نہیں چھوڑا لیکن اس کا رخ ضرور بدل گیا۔ فاروق نے اسے موقع دیے بغیر دوسری ضرب اس کے کولہے پر لگائی۔ ضرب لگاتے ہوئے اس نے خیال رکھا تھا کہ اس کی شدت زیادہ نہ ہو، اس کے باوجود لڑکا بلبلا کر رہ گیا۔ بھائی کو مار کھاتا دیکھ کر پہلے ہی اپنا ڈنڈا گنوا دینے والا جوش میں آگیا اور پیچھے سے آکر فاروق کے ساتھ چمٹ گیا۔ فاروق

نے اپنے بائیں ہاتھ کی کہنی پیچھے لے جا کر اس کی پسلیوں پر ضرب لگائی تو وہ ڈکرا کر پیچھے گرا۔ بیٹوں کی درگت بنتے دیکھ کر آدمی خود بھی درمیان میں کود پڑا لیکن اس موقع پر منو نے کمرے میں انٹری دی اور اگلے ایک آدھ منٹ میں وہاں کوئی ان سے مقابلہ کرنے کے لائق نہیں رہا تھا۔ پارو نامی لڑکی اور اس کی ماں سرسوتی اس صورت حال پر حیران پریشان ایک دوسرے سے چمٹی سسکیاں لیتی رہیں جبکہ مار کھا کھا کر ادھ موا ہو جانے والا اکبر بھی ایک کونے میں سمٹا آنکھیں پھاڑے سب کچھ دیکھتا رہا۔ سب کچھ اتنی تیزی اور خاموشی سے ہوا تھا کہ عورتیں تک اپنی فطرت کے مطابق چیخ و پکار نہیں مچا سکی تھیں۔

"تم لوگ کون ہو بھائی؟" آخر اکبر نے ہی ہمت کی اور سراسیمہ لہجے میں فاروق اور منو سے بیک وقت دریافت کیا۔ اس کی حیرانی اور سراسیمگی فطری تھی۔ یقیناً اس کا زندگی میں پہلی بار ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا جنہوں نے اتنی قلیل مدت میں تین افراد کو لمبا لٹا دیا تھا، وہ بھی ایسی تکنیک سے کہ ان تینوں میں سے نہ تو کوئی زخمی ہوا تھا اور نہ ہی کسی کی آواز نکلی تھی۔ اصل میں فاروق نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے ربن کے سکھائے چند ایسے داؤ استعمال کیے تھے کہ جسم کے مخصوص حصوں پر لگنے والی مخصوص انداز کی ضربوں نے انہیں فوری طور پر بے ہوش کر دیا تھا۔ امید تھی کہ دو سے تین گھنٹوں کے اندر وہ تینوں بہ آسانی ہوش میں آجائیں گے۔

"ہمارے بارے میں سوال جواب بعد میں کر لینا پہلے یہاں سے نکلو۔ جان بچانے کا یہ جو موقع ملا ہے، اسے ضائع کرنے کا ارادہ ہے کیا؟" فاروق نے ڈپٹنے کے انداز میں کہا تو وہ گڑبڑا کر کھڑا ہو گیا لیکن اس کی حرکت کے انداز سے ظاہر تھا کہ اسے شدید تکلیف ہو رہی ہے۔ منو نے از خود آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا جبکہ فاروق دونوں خواتین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئی تھیں اور اپنے گھر کے مردوں کے قریب بیٹھی انہیں ہلا جلا کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دونوں ماں بیٹی کی آنکھوں سے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔ شاید انہیں لگ رہا تھا کہ ان تینوں کے ساتھ کچھ غلط ہو گیا ہے۔ فاروق بڑی عمر کی خاتون سے مخاطب ہوا اور نرمی سے بولا۔

"پریشان مت ہوں خالہ جی! یہ لوگ صرف بے ہوش ہیں اور تھوڑی دیر میں خود ہوش میں آجائیں گے۔ آپ لوگوں کو جو تکلیف پہنچی، اس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں لیکن اس لڑکے کی جان بچانے کے لیے یہ سب کرنا میری مجبوری بن چکی تھی۔"

"اس ناس پیٹے کو کھود (خود) اپنی جندگی (زندگی) کی چنتا نہیں ہے تو کوئی اس کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ کتنا سمجھایا تھا اسے کہ پارو کو بھول جائے پر اس نے پارو کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ادھر یہ حال ہے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک دیش میں رہنے کو راجی (راضی) نہیں ہیں اور یہ چلا ہے کہ برہمن کی لڑکی سے عشق لڑانے۔ ابھی تم نے بچا لیا ہے پر کب تک بچے گا۔ پارو کے پتا جی بھی اس کی جان لے کر چھوڑیں گے۔" عورت نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے خفا سے لہجے میں کہا تو فاروق جواباً سر کو محض تفہیمی جنبش دے کر رہ گیا۔ کچھ بولنے کے لیے تو تھا ہی نہیں اس کے پاس۔

"ہم اب چلتے ہیں۔" اس نے ذرا کی ذرا لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے بولتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔ منو اور اکبر اس کے ساتھ تھے۔ اس بار انہوں نے گھر کا سامنے والا دروازہ استعمال کیا۔ پارو ماں کو وہیں چھوڑ کر ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

"اپنا خیال رکھنا اکبر۔" جانے کس فکر میں اس نے اکبر سے یہ جملہ کہا۔

"میری فکر نہ کر پارو۔ میں ٹھیک ہوں۔" اکبر نے ہر عاشقِ صادق کی طرح اپنی تکلیف کو چھپاتے ہوئے اسے تسلی دی اور فاروق کے اشارے پر اس کے پیچھے لپکا۔ پیچھے پارو نے آہستہ سے دروازہ بند کر لیا۔

"کیا ارادہ ہے نوجوان۔ کہو تو تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ دیتے ہیں۔" باہر نکل کر فاروق نے اس سے دریافت کیا۔

"میں آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔" اکبر نے جواب دیا۔ یقیناً اسے اپنے ان اجنبی ہمدردوں کے بارے میں تجسس تھا اور وہ یہ تجسس دور کرنے کے لیے ہی ان کے ساتھ جانا چاہتا تھا۔

"جیسی تمہاری مرضی۔" فاروق نے اس کے فیصلے سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

"آپ لوگوں نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" منو کے سہارے سے چلتے ہوئے اس نے اپنا تجسس دور کرنے کی کوشش کی۔

"ہم مسافر ہیں۔ بمبئی جا رہے تھے کہ راستے میں مجبوراً یہاں اترنا پڑا۔ سوچا آئے ہیں تو یہاں کی سیر کر لی جائے۔ ابھی گھوم گھام کر واپس اپنے ہوٹل جا رہے تھے کہ وہاں سے گزرتے ہوئے اندر کی سچویشن کا اندازہ ہوا اور تمہارے لیے ہمدردی محسوس کر کے تمہاری مدد کرنے پہنچ

گئے۔'' فاروق نے اس کی بات کا جواب دیا۔

''بڑے نیک دل لوگ ہیں آپ۔ ورنہ یہاں تو خون کے رشتے کسی کو مصیبت میں دیکھ کر مدد کے لیے نہیں آتے، الٹا منہ موڑ لیتے ہیں۔'' اکبر نے دکھی سے لہجے میں کہا تو فاروق کو محسوس ہوا کہ اس کے اندر کوئی کہانی چھپی ہوئی ہے۔ اس نے تسلی دینے کے انداز میں اس کے شانے کو تھپکا اور بولا۔

''یہ دنیا اتنی بھی بری نہیں ہے دوست۔ یہاں دونوں طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ بس یہ قسمت کی بات ہے کہ کس کا واسطہ کس سے پڑتا ہے۔ تم اگر چاہو تو ہمیں اپنے بارے میں تفصیل سے بتا سکتے ہو۔ ہم سے جس حد تک ہوسکا، تمہاری مدد ضرور کریں گے۔''

''بہت شکریہ بھائی جان لیکن آپ نے ابھی تک مجھے اپنا نام تو بتایا نہیں۔'' اکبر نے مہذب لہجے میں کہا۔ اپنے اندازِ گفتگو سے وہ پڑھا لکھا اور اچھے خاندان کا فرد لگتا تھا۔

''میرا نام فاروق ہے اور یہ میرے دوست موہن داس ہیں۔ انہیں ہم پیار سے منو بھی کہتے ہیں۔ میرے دو ساتھی ہوٹل میں بھی ہیں۔ ان سے وہاں پہنچ کر تمہاری ملاقات ہوجائے گی۔ باقی کی بات چیت بھی ہم وہیں چل کر کرلیں گے۔ ہوٹل آنے ہی والا ہے۔'' فاروق نے اس سے کہا تو اس نے تابعداری سے سر ہلا دیا۔ اب اس نے خود کو منو کی گرفت سے بھی آزاد کروا لیا تھا اور بغیر سہارے کے چل رہا تھا۔ یقیناً چلتے رہنے سے اس کا خون رواں ہوگیا تھا اور اب وہ چلنے میں پہلے جیسی تکلیف محسوس نہیں کررہا تھا۔ اس کے کپڑوں کی حالت مناسب نہیں تھی۔ گریبان پھٹ گیا تھا اور ایک دو جگہ خون کے دھبے بھی تھے، اس لیے پارو کے گھر سے نکلتے ہی منو نے اپنی چادر اسے اُڑھا دی تھی۔ راستے میں پہرا دینے والوں سے بھی واسطہ پڑنے کا امکان تھا اس لیے ضروری تھا کہ اکبر کا حلیہ مشکوک نظر نہ آئے۔ یہ تو فاروق اور منو نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ پہرا دینے والے خاموشی سے پہرا دے رہے ہیں اور راہ چلتے کسی فرد سے کوئی تعرض نہیں کررہے۔ اصل میں یہ پہرے داری محض اپنی حفاظت کی غرض سے تھی اور خوف زدہ لوگوں کو فکر تھی کہ کہیں ان پر حملہ نہ ہوجائے۔ حملے جتھوں کی صورت میں کیے جارہے تھے اس لیے اِکادُکا آدمیوں سے کسی کو کوئی خوف تھا بھی نہیں۔

وہ لوگ ہوٹل پہنچے تو گولو اور کیتھرائن نے سکون کا سانس لیا۔ فاروق کی ہدایت پر کیتھرائن نے اکبر کا معائنہ کیا۔ ڈنڈوں کی ضربات نے اس کے سارے جسم خصوصاً ہاتھ پیروں پر نیل ڈال دیے تھے۔ کہیں کہیں سوجن بھی آنا شروع ہوگئی تھی لیکن اچھی بات یہ تھی کہ اس کی کوئی ہڈی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ ایک آدھ جگہ سے کھال پھٹنے سے خون بہہ کر جم گیا تھا۔ کیتھرائن نے جمے ہوئے خون کو صاف کرکے مرہم وغیرہ لگایا اور ساتھ ہی درد رفع کرنے والی گولیاں بھی کھانے کو دیں۔ گولو ہوٹل کے باورچی خانے تک جاکر ایک گلاس ہلدی ملا نیم گرم دودھ اور چائے بنوا کر لے آیا تھا۔ اس وقت ہوٹل کا باورچی خانہ بند ہوجاتا تھا لیکن ایک بیرے نے بھاری ٹپ کی پیشکش پر یہ فرمائش پوری کردی تھی۔

''ہاں تو میاں اکبر...... سناؤ اپنی داستان۔ ہم سب ہمہ تن گوش ہیں۔'' اکبر کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس اور ان کے پاس گرما گرم چائے کی پیالیاں آئیں تو فاروق نے ہلکے پھلکے لہجے میں اکبر سے فرمائش کی۔ وہ بھی تیار ہی بیٹھا تھا کہ کوئی ہمدرد ملے اور اپنی داستان سنائے چنانچہ فوراً ہی شروع ہوگیا۔

''میں ان لوگوں میں سے ہوں جو پیدا ہی ذرا سخت قسمت کے ساتھ ہوتے ہیں۔ میری زندگی کا پہلا المیہ میرے والد اور والدہ کی شادی تھا۔ والد کی حسن پرست فطرت نے والدہ کو بطور شریکِ حیات پسند نہیں کیا اور وہ میری پیدائش کے بہ مشکل چھ ماہ بعد تک ہی انہیں برداشت کرسکے۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ اس وقت تک میرے دادا حیات تھے اور دادا کی موجودگی میں والد کی ہمت نہیں تھی کہ ان کے دوست کی بیٹی کو گھر بدر کرسکیں۔ دادا نہیں رہے تو انہوں نے خود مختاری کا فائدہ اٹھا کر سب سے پہلے ناپسندیدہ بیوی سے جان چھڑائی اور طلاق کے دو ماہ بعد ہی دوسری شادی بھی کرلی۔ والدہ میرے ساتھ اپنے میکے میں بھائی کے در پر رہنے پر مجبور ہوگئیں۔ وہاں ہم ماں بیٹے کے ساتھ وہی سلوک ہوا جو مجبور اور ناپسندیدہ لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ میری دل گرفتہ والدہ اس صورتِ حال کو زیادہ طویل عرصے برداشت نہیں کرسکیں اور جب میں صرف سات سال کا تھا تو ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد ماموں اور ممانی نے چاہا کہ مجھے میرے والد کے پاس بھجوا دیا جائے لیکن اس عرصے میں میرے والد کی تین مزید اولادیں ہوچکی تھیں اور انہیں میری قطعی ضرورت نہیں تھی چنانچہ انہوں نے میرا ماہانہ خرچہ دینے کے وعدے کے ساتھ ماموں کو مجھے اپنے گھر میں ہی رکھنے پر راضی کرلیا۔ میں نہیں جانتا کہ انہوں نے یہ وعدہ کس حد تک

نبھایا کیونکہ ماموں آئے دن مجھے یہ طعنے دیتے رہتے تھے کہ میرا باپ وعدے کے باوجود میرا خرچہ پابندی سے نہیں بھجوا رہا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ والد کے وعدے کے بعد ہی سے مجھے تعلیم کے لیے اسکول بھیجا جانے لگا تھا اور والد کی زندگی تک یہ سلسلہ جاری رہا جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ میرے والد نے اپنا وعدہ نبھایا ہوگا، ورنہ ماموں اپنے ذاتی خرچے پر ہرگز مجھے تعلیم نہیں دلواتے، جیسا کہ والد کے انتقال کے بعد ہوا کہ میں اپنی خواہش کے باوجود آگے تعلیم جاری نہیں رکھ سکا اور ماموں نے مجھے اپنے ایک دوست کی دکان پر بٹھا دیا۔ دکان کریانے کی تھی اور مردوں کے علاوہ عورتوں کا بھی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ پاروتی بھی اپنے گھر کا سودا لینے کبھی اکیلی اور کبھی اپنی ماں کے ساتھ آتی تھی، بس وہیں سے ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت کی شمع روشن ہوئی اور ہم مذہب کا فرق بھول کر ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ کسی طرح پارو کی ماں پر یہ بات کھل گئی اور اس نے اس کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی۔ میں بڑی مشکل سے پارو کی ایک سہیلی کے ذریعے اس سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوسکا اور کبھی کبھار رات میں چھپ چھپا کر اس کے گھر اس سے ملنے جانے لگا۔ جس رات مجھے جانا ہوتا تھا، پارو کی سہیلی سے اسے پیغام بھیج دیتا تھا اور وہ میرے لیے پچھلی طرف کا دروازہ کھلا رکھتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا لیکن پارو کے باپ کی آنکھ کھل گئی اور پھر آگے جو کچھ ہوا، وہ سب تو آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی تھا۔'' اکبر نے ایک سانس میں ہی اپنی پوری داستان کہہ سنائی۔ جسے سن کر فاروق کے ماتھے پر ذرا سی شکنیں پڑیں پھر وہ تحمل سے بولا۔

''دیکھو اکبر...... سب باتیں اپنی جگہ لیکن یہ جو تمہارا پارو والا سلسلہ ہے، اسے میں آگ سے کھیلنے کے مترادف قرار دوں گا۔ مذہب کا فرق بہت بڑی بات ہوتی ہے جسے نظر انداز کرنا دونوں فریقین کے لیے ممکن نہیں ہوتا پھر آج کل تو فضا بھی ایسی ہوگئی ہے کہ ہندو ویسے ہی مسلمانوں کی جان کے درپے ہو رہے ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر آج ہم دخل اندازی نہ کرتے تو پارو کے گھر والے تمہیں قتل کر کے چپکے سے تمہاری لاش ٹھکانے لگا دیتے۔ مذہب کا فرق نہ بھی ہوتا تو کسی لڑکی سے یوں رات کی تاریکی میں اس سے ملنے کے لیے جانا کوئی مناسب عمل نہیں ہے۔ یہ تو لڑکی کو بدنام کرنے والی بات ہے اور جسے چاہا جائے اس کی عزت کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں فاروق بھائی لیکن میں کیا کرتا۔ پارو کو دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کی اتنی بے قراری ہوتی تھی کہ میں یہ راہ اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا، پر یقین جانیے گنتی کی ان چند ملاقاتوں میں، میں نے رات کی تنہائی کا فائدہ اٹھا کر کبھی اسے چھونے کی کوشش تک نہیں کی۔ مجھے اس کی عزت کا کتنا خیال ہے اس چیز کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ جب اس کے بھائی مجھے بے دردی سے مار رہے تھے تو میں نے اپنے ہونٹوں سے ایک چیخ تک بلند نہیں ہونے دی کہ کہیں آواز سن کر کوئی محلے دار وہاں نہ آجائے اور پارو کی بدنامی ہو۔'' اکبر نے اپنی صفائی پیش کی۔

''میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ پارو سے خفیہ ملاقاتیں تمہاری غلطی ہے۔ تمہاری پارو سے محبت پر میں اعتراض نہیں کروں گا کہ یہ انسان کے اختیار سے باہر کی بات ہے۔ دل کس پر آجائے کچھ معلوم نہیں ہوتا لیکن باقی معاملات میں خود کو قابو میں رکھنا پڑتا ہے۔ تم یہی سوچو کہ تمہاری اس محبت کا کوئی خوش کن انجام نہیں ہوسکتا۔ نہ پارو کے گھر والے اسے اجازت دیں گے کہ وہ ایک مسلمان سے شادی کرلے اور نہ ہی تمہیں تمہارا مذہب ایک ہندو لڑکی سے شادی کی اجازت دیتا ہے تو پھر معاملات کو اس حد تک آگے لے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بے اختیاری میں ایک غیر مذہب کی لڑکی سے محبت ہوگئی ٹھیک ہے لیکن باقی تو تمہیں خود پر قابو رکھنا چاہیے تھا۔ تمہارے پاس تو اپنا گھر تک نہیں ہے، خود ماموں کے گھر میں رہتے ہو۔ اگر کسی طرح لڑکی کو بھگا کر بھی لے آئے تو اسے رکھو گے کہاں؟'' فاروق اسے تلخ حقائق کا احساس دلا رہا تھا۔

''ان ساری باتوں کے بارے میں، میں نے بھی سوچا تھا بھائی جان اور پارو کو بھی احساس دلایا تھا۔ وہ بولی کہ میں تمہاری خاطر مسلمان ہو جاؤں گی۔ پھر تم مجھے یہاں سے لے چلنا۔ ہم دونوں کہیں اور کسی دوسرے شہر میں جا کر رہ لیں گے۔ مجھے پارو کی یہ تجویز اچھی لگی۔ آج کل میں پیسے جوڑنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ تھوڑی رقم جمع ہو جائے گی تو میں اور پارو یہ شہر چھوڑ دیں گے۔'' اکبر نے اسے اپنے مستقبل کے پروگرام سے آگاہ کیا۔

''آج جو کچھ ہوا ہے، اس کے بعد تو تمہیں یہ موقع نہیں ملے گا۔ پارو کے باپ بھائی سب تمہیں جانتے ہوں گے۔ آج ہم تمہیں وہاں سے بچا کر لے آئے ہیں۔ وہ لوگ پھر کسی اور دن موقع دیکھ کر تمہیں گھیر لیں گے۔ آج کے بعد

تمہارا اس شہر میں رہنا خود تمہارے لیے خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' فاروق نے اسے خطرے سے آگاہ کیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن میں فوری طور پر شہر کیسے چھوڑوں؟'' اکبر پریشان نظر آنے لگا۔

''اگر رقم کا مسئلہ ہے تو اس سلسلے میں، میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔ میری طرف سے اتنا انتظام ہوجائے گا کہ سفر کے علاوہ کچھ عرصہ کسی دوسری جگہ قیام کے اخراجات پورے ہوجائیں۔ آگے تو تم جوان آدمی ہو اپنے لیے کچھ نہ کچھ کرہی لوگے۔'' فاروق نے اس کم عمر نوجوان کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کرتے ہوئے اسے پیشکش کی۔

''آپ کا بہت شکریہ بھائی جان۔'' اس کی پیشکش پر اکبر کھل اٹھا۔ ''لیکن میں نے پارو کے ساتھ اس جگہ کو چھوڑنے کا عہد کیا ہوا ہے۔ میں اسے چھوڑ کر یہاں سے نہیں جاسکتا۔''

''اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہو تو کیسے لے جاؤ گے۔ کیا اس سے رابطے کا کوئی ذریعہ ہے؟'' فاروق نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں کوشش کروں تو اس کی سہیلی کے ذریعے رابطہ ہوسکتا ہے۔'' اکبر کے انداز میں دبا دبا جوش تھا۔ ظاہر ہے وہ پہلے ہی پارو کے ساتھ یہ شہر چھوڑنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اب ایک سبیل پیدا ہوئی تو اس کو تو خوش ہونا ہی تھا۔

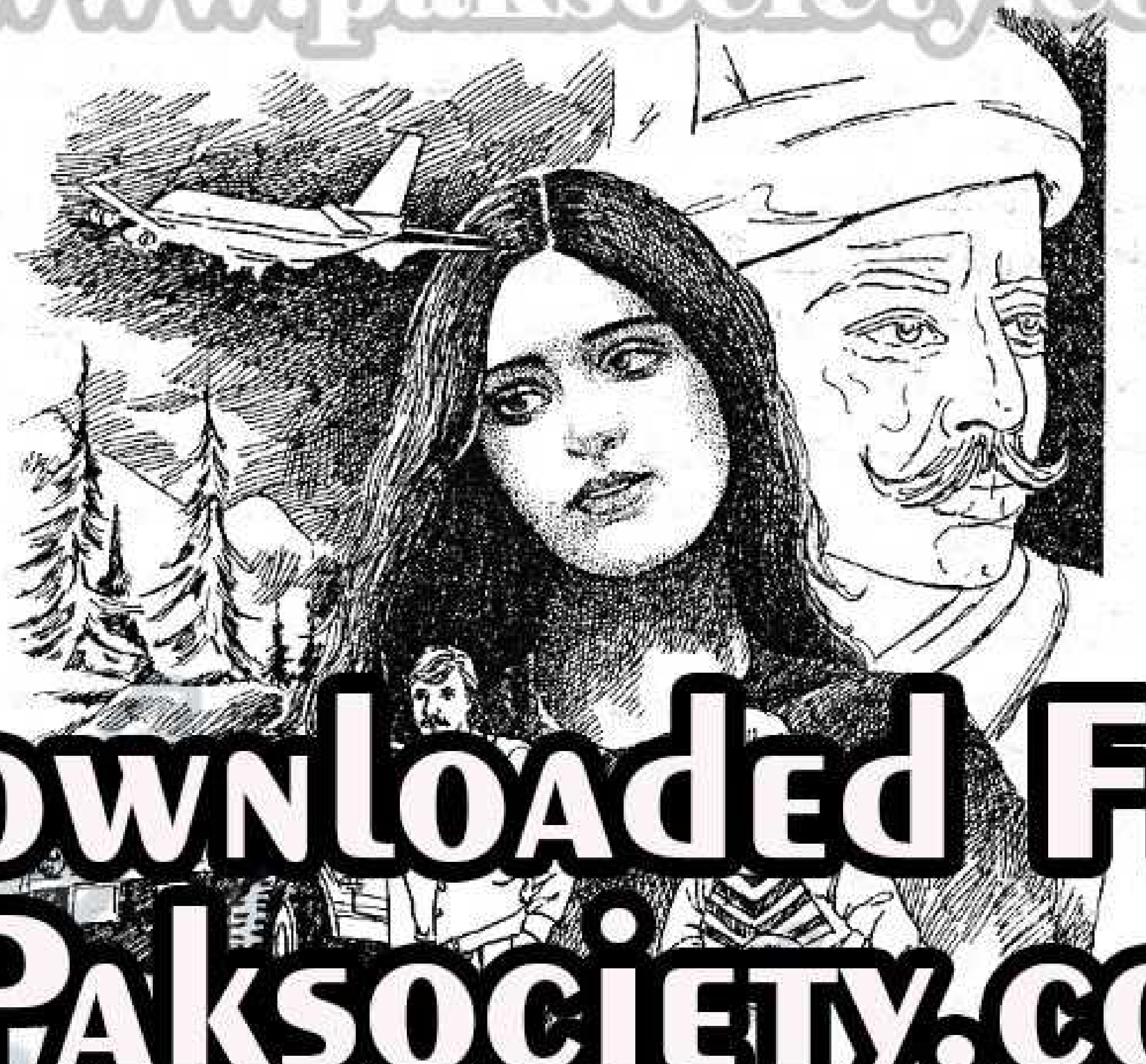
''ٹھیک ہے۔ ہم کل دوپہر تک یہاں ہیں۔ اس دوران میں اگر تم کچھ کرسکتے ہو تو کرلو۔'' فاروق نے اسے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ یہ اس کا جولیٹ کے ہجر میں تڑپنے والا دل تھا جس نے اسے اس فیصلے پر آمادہ کیا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ اگر وہ دو چاہنے والوں کو ملانے کے لیے کچھ کرسکتا ہے تو ضرور کرے گا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ بھائی جان۔ آپ کے اس احسان کے بدلے میں ساری زندگی آپ کا غلام بن کر رہوں گا۔'' اکبر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''مجھے کسی کو غلام بنانے کا کوئی شوق نہیں۔ تم خوش رہو، میرے لیے یہی کافی ہوگا۔'' فاروق نے اس کے شانے کو دھیرے سے تھپکا۔ اس کے بعد وہ سب سونے کے لیے اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔ تھکن نے سب کو فوراً ہی سلا دیا البتہ اکبر کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ صبح وہ ناشتا کیے بغیر ہی وہاں سے روانہ ہوگیا۔ واپس آیا تو کچھ خوش اور کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ اس کے پاس ایک گٹھڑی بھی تھی۔ فاروق کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وہ بتانے لگا کہ ماموں کے گھر سے اپنے کپڑے اور ضرورت کی چیزیں لے آیا ہے۔ ماموں نے خود اسے اپنے گھر سے دفعان ہونے کا حکم سنایا تھا کیونکہ پاروتی کے باپ بھائی اسے تلاش کرتے ہوئے ماموں کے گھر پہنچ گئے تھے اور انہیں بہت دھمکیاں دی تھیں۔ انہوں نے اعلان کردیا تھا کہ اکبر جہاں بھی دکھائی دیا، اسے جان سے ماردیں گے۔ اکبر چھپ چھپا کر وہاں سے نکلا تھا کہ کہیں راستے میں کسی جگہ ان لوگوں سے مڈبھیڑ نہ ہوجائے۔ لڑائی جھگڑے سے ڈرنے کی بات نہیں تھی لیکن جب وہ شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کرچکا تھا تو اچھا تھا کہ یہ وقت سکون سے گزر جائے۔ وہ پارو کی سہیلی کو اس تک اپنا پیغام پہنچانے میں بھی کامیاب ہوگیا تھا اور اب یہ پارو پر تھا کہ وہ ریلوے اسٹیشن تک کس طرح آتی ہے۔ ساری بات سن کر فاروق نے اسے دلاسا دیا اور ہدایت کی کہ اب وہ ہوٹل سے باہر نہ نکلے۔ اکبر نے اس کی ہدایت پر عمل کیا لیکن سارا وقت مضطرب رہا۔ اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے فاروق اور اس کے ساتھیوں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ فاروق اور منو تھانے جاکر باقی کی کارروائی نمٹا آئے اور دوپہر کے کھانے کے بعد اسٹیشن کے لیے روانہ ہوگئے۔ اسٹیشن پہنچ کر تو اکبر کا اضطراب انتہا کو پہنچ گیا اور وہ بے قراری سے پارو کی راہ تکنے لگا لیکن اس کا دور دور تک کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ان کی مطلوبہ گاڑی پلیٹ فارم پر آرکی۔ فاروق کے ساتھیوں نے سامان اندر رکھوایا اور ماسوائے فاروق کے وہ سب اندر بھی جابیٹھے۔

''وہ آئی کیوں نہیں۔ اس کے بغیر میں کیسے یہاں سے جاسکتا ہوں۔'' اکبر دیوانہ وار ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ اسی وقت گاڑی نے وسل دی۔ فاروق نے اکبر کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ جواب میں اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ اسی دم چادر میں لپٹی ایک لڑکی تیزی سے اکبر کی طرف بڑھی۔ اکبر بھی اسے دیکھ کر بے قراری سے چند قدم آگے بڑھا لیکن فاروق کی نظریں ان دونوں کے بجائے پیچھے دکھائی دیتے پارو کے باپ اور بھائیوں پر تھیں۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں



وصیت

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

خونی رشتے بے شک ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں مگر... اس کے باوجود سب کی بنیادی حقوق جدا جدا ہوتے ہیں جن کی ادائیگی یا وصولیابی میں کسی کو رکاوٹ ڈالنے کا کوئی اختیار نہیں ہے مگر جب... انہی رشتوں سے ایک دوسرے کو بلیک میل کرنے کی نوبت آجائے تو ہر رشتے پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ یہی حال ان باپ اور بیٹے کا تھا جن کے درمیان صرف حقوق کی جنگ تھی... جس کا اختتام گھمنڈ کے ٹوٹ جانے پر ہوا۔ اس ایک وصیت نے جانے کتنے لوگوں کو نصیحت کردی کہ حق تلفی کتنی بڑی تباہی کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔

دل کے ٹکڑے کرنے والے کے ہاتھوں دل کے ٹکڑے کی پامالی کا نوحہ

''نثار ٹریڈرز'' کا دفتر شارع فیصل پر واقع ایک کثیر المنزلہ کمرشل بلڈنگ کے تین فلورز پر محیط تھا۔ نثار احمد خان جو اس فرم کے روح رواں تھے، ایک ٹھیٹ کاروباری شخص تھے۔ ایک اور ایک دو کے بجائے ''گیارہ'' کرنے کی دھن ہر وقت ان کے سر پر سوار رہتی تھی۔ وہ پینتالیس، پچاس کے پیٹے میں بڑی با اثر اور پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ صحت بھی قابلِ رشک تھی۔ البتہ کنپٹیوں پر سرمئی مائل سفیدی اڈ آئی تھی۔

وہ اندرونِ سندھ کے بااثر وڈیروں کی رائس اور فلور ملوں سے اناج کی خرید و فروخت کیا کرتے تھے۔ ان میں چھوٹے زمینداروں کی ملوں کا بھی اناج شامل ہوتا تھا۔ جو بڑے ہیوی ٹرالرز اور ٹرکوں میں آیا کرتا تھا۔ ان کے دفتر کا پورا گراؤنڈ فلور گودام کے لیے مخصوص تھا جبکہ فرسٹ اور سیکنڈ فلور پر ان کا عملہ کام کرتا تھا۔ فرسٹ فلور پر ان کا ایک بڑا شاندار آفس تھا۔ ایسا ہی ایک شاندار آفس سیکنڈ فلور پر بھی تھا جو ان کے اکلوتے بیٹے افتخار احمد کا تھا۔ افتخار ایک ہونہار، ذہین اور خوبرو نوجوان تھا مگر اپنے باپ سے بالکل مختلف تھا۔ اپنے باپ سے کاروبار کی سوجھ بوجھ ضرور لی تھی مگر ان کی طرح اس نے اپنے اعصاب پر دولت جمع کرنے کا جنون سوار نہیں ہونے دیا تھا۔

یوں تو نثار احمد کو اپنے بیٹے افتخار سے کوئی شکایت نہ تھی کیونکہ ان کے بیٹے نے حسبِ منشا نہ صرف ان کا کاروبار سنبھال رکھا تھا بلکہ ان کے شایانِ شان کاروبار کو وسعت دینے میں بھی کوشاں تھا لیکن پچھلے چند روز سے دونوں باپ بیٹے کے درمیان ایک غیر محسوس خلیج پیدا ہونے لگی تھی۔ نثار احمد بنیادی طور پر حاکمانہ مزاج کے مالک اور انا پرست تھے اور معیارِ زندگی کے بارے میں ان کے کچھ اصول تھے۔ ان سے انحراف کرنے والے کو وہ ذرا بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے، چاہے وہ ان کی اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا دونوں باپ بیٹے کے درمیان پیدا ہونے والی غیر محسوس خلیج کی بھی ایک یہی وجہ تھی۔ باپ کے سخت اور کڑے اصول بیٹے سے متصادم ہونے لگے تھے۔

نثار احمد نے اس سلسلے میں اگرچہ بیٹے سے بحث کرنے یا الجھنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر اس کا حل انہوں نے اور ہی سوچ رکھا تھا۔ ان کے بیٹے سے ایک غلطی ہوگئی تھی جو بیٹے کے نزدیک غلطی نہ تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنے شاندار آفس میں بڑی سی ساگوان کی میز کے عقب میں ریوالونگ چیئر پر بیٹھے ازحد پریشان اور متفکر نظر آرہے تھے۔ ان کے سامنے چار پانچ کرسیاں رکھی تھیں اور ایک گوشے میں انتہائی قیمتی صوفہ سیٹ اور درمیان میں شیشے کے ٹاپ والی میز موجود تھی۔ وسیع و عریض آفس کے پہلو میں ایک اور بھی کمرا تھا جو گیسٹ روم کے طور پر کبھی کبھار ہی مستعمل ہوتا تھا۔

نثار احمد کرسی کی پشت پر اپنا سر ٹکائے چھت کو گھور رہے تھے۔ وہ واقعی پریشان تھے اور ان کی پریشانی کی واحد وجہ ان کا بیٹا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کی نظروں کے سامنے ایک اور چہرہ بھی گردش کر رہا تھا اور انہیں اس شخص پر بری طرح طیش آرہا تھا۔ جس کی وجہ سے آج انہیں اتنی پریشانی اٹھانی پڑ رہی تھی۔ اس شخص کا چہرہ چشمِ تصور میں ابھرتے ہی نثار احمد کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں اور دانت بھنچتے چلے گئے۔ وہ شخص ان کے گودام کا انچارج قادر بخش تھا۔

نثار احمد کو اب پچھتاوا ہو رہا تھا کہ کاش وہ اس مارِ آستین کو اپنے ہاں گودام میں کیپر نہ رکھتے پھر اچانک انہیں اپنے بیٹے پر بھی غصہ آنے لگتا۔ تب جھنجلاہٹ میں خود کلامی کے انداز میں زیرِلب بڑبڑاتے۔

''اس میں بھلا قادر بخش کا کیا دوش۔ ایسی گندی مکھیاں تو شکر پر منڈلاتی ہی ہیں۔ انسان میں خود عقل ہونی چاہیے کہ وہ کیا کر رہا ہے؟''

انہوں نے انٹرکام پر اپنی سیکریٹری سے رابطہ کیا۔

''شبانہ...... مشتاق صاحب کو ذرا بھیجو میرے پاس۔''

''جی بہتر سر!'' سیکریٹری شبانہ کی مترنم و مؤدبانہ آواز ابھری۔

اس کے بعد نثار احمد نے ایک جانب رکھے نفیس قسم کے سگار بکس سے ایک فرنچ سگار نکالا اور اس کا کونا توڑ کر طلائی میوزیکل لائٹر سے اسے سلگایا اور پھر ایک گہرا کش لے کر دھواں اگلتے ہوئے لچھے دار مرغولوں پر اپنی نظریں جما دیں۔

ذرا دیر بعد تقریباً چالیس سالہ مشتاق احمد ان کے کمرے میں سامنے کی کرسی پر موجود تھا۔ وہ جنرل منیجر تھا۔ چہرے مہرے سے خاصا جہاندیدہ اور زمانہ شناس نظر آتا تھا۔ اس نے کتھئی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔

''جی سر!'' اس نے باس کے گمبھیر چہرے پر اپنی منتظر نگاہیں مرکوز رکھتے ہوئے ہولے سے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''تم نے اس کام کا کیا کیا؟'' نثار احمد نے ایک گہرا کش لیتے ہوئے اپنے منیجر سے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

''سر! میں نے بات کرلی ہے۔ بس وہ آتا ہی ہوگا۔'' پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ''مگر سر! میرا مطلب ہے کہ آپ اس سے بات نہ ہی کریں تو بہتر ہوگا۔''

''نہیں...... مجھے ہی اس کمینے آدمی سے بات کرنی پڑے گی۔''

''ویسے سر میرا خیال ہے کہ وہ ایک گھٹیا اور نیچ انسان ہے۔ میں ہی اس سے بات کرلوں تو اچھا ہے۔ آپ نے مجھے ساری بات سمجھا تو دی ہے۔'' منیجر نے کسی خیال کے تحت کہا کیونکہ نثار احمد کے چہرے پر کھنڈی ہوئی نفرت مزید گہری

ہو گئی تھی۔ انہوں نے خفیف سا آگے جھک کر سگار کی راکھ سنگِ مرمر کی ایش ٹرے میں جھاڑی اور پھر تلخ لہجے میں بولے۔ ''بات مجھے ہی کرنی پڑے گی۔ وہ ایک انتہائی لالچی اور کمینہ فطرت شخص ہے مگر ایک بات کا خیال رکھنا مشتاق......''

''جی سر!'' مشتاق فوراً مستعدی سے بولا۔

''اس کمینے کو افتخار سے ہرگز نہ ملنے دینا۔''

''جی بہتر سر! میں ابھی ریسیپشن پر ایک آدمی مقرر کیے دیتا ہوں۔ وہ قادر بخش کو دیکھتے ہی سیدھا اسے میرے کمرے میں لے آئے گا اور پھر میں آپ کو مطلع کر کے اس کو ادھر لے آؤں گا۔''

''نہیں، مجھے مطلع کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اسے اپنے ساتھ فوراً ہی ادھر لے آنا۔'' نثار احمد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ پھر جب مشتاق ان سے اجازت لے کر اپنی کرسی سے اٹھنے لگا تو اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ وہ ایک لمحے کو رکا اور پھر ہولے سے باس سے مخاطب ہو کر بولا۔

''سر! اگر قادر بخش پھر بھی نہ مانا تو......''

اپنے جی ایم کی بات نثار احمد کو کڑوی ضرور لگی تھی مگر مشتاق ان کا ایک بااعتماد اور قابل ملازم تھا۔ وہ بعض سنجیدہ معاملات میں اس پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مشتاق کو کسی بھی حساس معاملے پر بلا روک ٹوک اپنی رائے کا اظہار کرنے کی کھلی آزادی دی تھی۔

''پھر کوئی اور طریقہ سوچنا پڑے گا۔'' چند ثانیے کی خاموشی کے بعد نثار احمد نے اپنے سر کو پُرخیال انداز میں جنبش دیتے ہوئے کہا اور مشتاق اپنے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ لیے اثبات میں سر ہلاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

یہ دو تنگ و تاریک کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا۔ کہنہ سالی کے سبب شکستہ صحن کی چار دیواری کا پلاستر کہیں کہیں سے اکھڑ چکا تھا۔ صبح کی خوشگوار دھوپ صحن میں پھیلنے لگی تھی۔ ایک کونے میں لگے میونسپلٹی کے نلکے کے گرد زمین پر ایک بائیس، تیئس سالہ دبلی پتلی لڑکی برتن دھو رہی تھی۔ وہ سانولے رنگ کی مگر ایک پُرکشش اور رکھ رکھاؤ والی لڑکی تھی۔ وہ لڑکی جس کا نام طوبیٰ تھا ایک چوکی پر بیٹھی دیگچی مانجھ رہی تھی۔ وہاں نزدیک ہی ایک غسل خانہ تھا۔ جدھر اس کی ماں مکھاں کپڑے دھو رہی تھی۔ دن کے دس بجے کا وقت تھا۔ اندر کمرے میں ایک چالیس، پینتالیس سالہ خاصا فربہی مائل شخص دیوار پر نصب ایک چھوٹے سے آئینے کے سامنے کھڑا سیٹی پر دھن بجاتے ہوئے جھک کر کنگھا کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے سفید رنگ کی کھڑکھڑاتی ہوئی اجلی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ یہ قادر بخش تھا مکھاں کا شوہر اور طوبیٰ کا باپ۔ انداز میں خاصا بےفکرا پن تھا۔ اسی دوران میں کسی کام سے جب اس کی بیوی مکھاں اندر کمرے میں آئی تو فوراً آئینے سے ہٹ کر اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''اری...... پتا ہے آج مجھے سیٹھ نثار احمد نے بلایا ہے اپنے آفس میں!''

اس کی بیوی مکھاں جس کے چہرے پر از حد تھکن کے آثار تھے، یکدم جیسے خوش ہو کر بولی۔ ''اچھا! کیا وہ اب تجھے دوبارہ نوکری پر رکھنے والے ہیں؟''

''اوں...... ہونہہ...... سارا مزہ کرکرا کر دیا۔'' قادر بخش منہ بسور کر بولا۔ ''اری...... اب اس پھٹیچر سی نوکری میں کیا رکھا ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ سیٹھ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ وہ مجھے ایک بڑی رقم دینے والا ہے۔ پر میں سوچ رہا ہوں کہ اس موٹے مرغے سے وہ موٹی رقم لوں یا پھر اس سے سونے کی انڈے دینے والی مرغی لینے کے لیے بہ ضد رہوں۔ تو بھی کبھی کوئی مشورہ دے دیا کر۔'' وہ حریصانہ لہجے میں اپنے بدہیئت ابلے ہوئے دیدے گھما کر مکاری سے بولا۔

مکھاں اپنے شوہر کے عجیب سے لہجے پر الجھی ہوئی نگاہوں سے اسے تکنے لگی جبکہ قادر بخش نے ایک بے ہنگم سا قہقہہ لگایا اور جیب سے سستے برانڈ کا ایک سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اس سے سگریٹ نکالا اور اپنے کالے موٹے ہونٹوں میں دبالیا۔ پھر ماچس نکال کر دیا سلائی دکھائی اور ایک گہرا کش لے کر بڑی خوش فکری کے ساتھ دھواں فضا میں اگل دیا۔

مکھاں کے چہرے پر تلخی کی ایک غیر محسوس شکن ابھری۔ جیسے وہ اپنے شوہر کی اصل بات کا مطلب سمجھ چکی ہو۔ لہٰذا وہ خاموشی سے سر جھٹک کر کچھ کہے بنا کمرے سے نکل گئی۔ قادر بخش بڑے مزے سے سگریٹ مٹھی میں دبائے کش لگاتا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے جب صحن سے گزرنے لگا تو ایک لمحے کو رک کر اس نے برتن دھوتی ہوئی اپنی بیٹی طوبیٰ کی طرف دیکھا۔ پھر قدرے جھک کر اپنی بیٹی کو مخاطب کر کے بولا۔

''طوبیٰ بیٹی...... آج میں بڑا خوش ہوں۔ بول تیرے لیے آج بازار سے کیا لے کر آؤں؟''

طوبیٰ نے خاموش نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا پھر سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''نہیں ابا...... میں نے کچھ نہیں منگوانا، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

''ارے واہ۔ یہ کیا بات ہوئی بیٹی! آج مجھے بہت

سے روپے ملنے والے ہیں۔ میں تیرے لیے کچھ نہ کچھ تو ضرور لے کر آؤں گا۔''

قادر بخش خوشی سے پھولے نہیں سمار ہا تھا پھر جیسے خود ہی فیصلہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اچھا...... تیرے لیے کوئی اچھا سا سوٹ لیتا آؤں گا۔''

یہ کہہ کر جب وہ جانے لگا تو طوبیٰ نے اچانک باپ کو پکارا۔ ''ابا۔''

قادر بخش کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدم یکدم رک گئے۔ وہ بیٹی کی طرف مڑا۔ طوبیٰ کے ملیح چہرے پر ناگواری کھنڈ آئی تھی۔ وہ باپ سے بولی۔ ''ابا! یہ تو بتاؤ...... یہ اتنے روپے تمہیں کہاں سے ملنے والے ہیں؟''

قادر بخش بیٹی کی بات سن کر معنی خیز انداز میں مسکرایا پھر اکڑ کر بولا۔ ''بس! ملنے والے ہیں کہیں سے۔ تجھے آم کھانے سے مطلب ہونا چاہیے۔''

''اماں بتا رہی تھیں کہ آپ کو سیٹھ صاحب نے بلوایا ہے آج اپنے دفتر۔''

بیٹی کی یہ بات سن کر قادر بخش ذرا چونکا پھر مختصراً بولا۔ ''ہاں۔''

''ابا...... سیٹھ صاحب نے آپ کو وہاں کیوں بلوایا ہے؟ انہوں نے تو آپ کو نوکری سے بڑا بے عزت کر کے نکالا تھا۔'' طوبیٰ نے دانستہ لفظ ''بے عزت'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے اندر کی کسی تلخی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ قادر بخش کے حلق میں بیٹی کے جواب پر کڑواہٹ سے اتر آئی پھر وہ جیسے جان چھڑانے والے انداز میں زچ ہو کر بولا۔

''اب مجھے کیا پتا۔ جاؤں گا تو پتا چلے گا کیوں بلوایا ہے مجھے۔''

''مجھے معلوم ہے ابا!...... اور آپ بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ سیٹھ صاحب نے آپ کو کیوں بلایا ہے۔'' طوبیٰ نے باپ کی طرف دیکھ کر اچانک سرد لہجے میں کہا۔

قادر بخش کے چہرے کی ساری شادمانی یکلخت بھاپ بن کر اڑ گئی۔ سرد خشونت بھری نظروں سے بیٹی کو گھورتے ہوئے جھنجلا کر بولا۔ ''جانتی ہو تو پھر...... میں کیا کروں...... کم بخت سارا مزہ کرکرا کر کے رکھ دیا۔''

پھر وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا گھر سے نکل گیا۔ اس کے باہر جاتے ہی کھاں جو قریب ہی صحن میں موجود تھی، بیٹی سے بولی۔ ''بیٹی! اپنے باپ سے مت الجھا کر۔ اس کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔''

''مگر...... امی!...... ابا جو کر رہے ہیں وہ درست نہیں۔ ابا کی ان حرکتوں سے مجھے شرم آتی ہے اور میں خود کو اپنی ہی نگاہوں میں بہت چھوٹا محسوس کرنے لگتی ہوں۔''

''چل چھوڑ بیٹی! جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تو اپنے اوپر اتنا بوجھ نہ لے۔ موسی آئی تھی خالہ نذیرن کے کپڑوں کا پوچھنے...... سی دیے ہوں تو مجھے دیے دینا۔ میں خود دے آؤں گی جا کر۔'' ماں نے کہا۔ طوبیٰ نے خاموشی سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

طوبیٰ نے بی اے کیا تھا۔ اس کی ماں سلائی کڑھائی کرتی تھی۔ یہی ہنر اس نے اپنی بیٹی طوبیٰ کو بھی منتقل کیا تھا۔ اب وہ بھی اپنی ماں کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ باپ کو نوکری سے نکالے جانے کے بعد طوبیٰ نے ماں کے ساتھ باقاعدہ محلے والوں کے کپڑے سلائی کرنے کا کام سنبھال لیا تھا۔ موسی ایک پچاس سالہ خاتون تھی۔ وہی اکثر و بیشتر محلے کے گھروں سے بغیر سلے کپڑوں کا گٹھڑا اٹھا کر سلنے کے لیے کپڑے یہاں لاتی تھی اور ماں بیٹی سے اپنا ''کمیشن'' کھرا کرتی تھی۔

پچھلے کچھ روز سے طوبیٰ ذہنی پریشانی کا شکار تھی۔ اس پر مستزاد...... باپ کی مشکوک سرگرمیوں نے اسے اور بھی پریشان کر رکھا تھا۔ اپنے باپ قادر بخش کی لالچی اور حریصانہ طبیعت سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ آج سیٹھ صاحب نے اسے کیوں اپنے پاس بلایا تھا اور اس کے باپ کو روپے ملنے کی کیوں اتنی مسرت ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

آج دفتر آتے آتے افتخار کو دیر ہو گئی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ گھر سے نکلتے وقت حسب معمول اس کی والدہ نے نصیحت سے نوازا تھا۔ شاید بیگم نثار کو بھی دونوں باپ بیٹوں کے درمیان رفتہ رفتہ حائل ہونے والی خلیج کے مزید کشادہ ہونے اور کسی بھی وقت بدمزگی کا ادراک ہونے لگا تھا۔ اس لیے انہوں نے افتخار احمد کو نصیحت سے نوازتے ہوئے کچھ زیادہ ہی وقت لے لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب افتخار احمد اپنے آفس پہنچا تو اس کے ذہن میں والدہ کے تفکر آمیز جملوں کی گردان ہو رہی تھی۔

''افی بیٹے! اپنے ڈیڈی کے ساتھ الجھنے کی کوشش مت کرنا۔ میں انہیں جانتی ہوں، وہ غصے کے کتنے تیز ہیں۔ کوئی بھی انتہائی فیصلہ کرنے کے عادی بھی۔''

افتخار کو ماں کی بات میں گہری تشویش محسوس ہوئی

تھی۔ تاہم جواباً اس کے چہرے پر تلخ سی مسکراہٹ عود آئی تھی پھر اس نے پھیکے پن سے کہا۔ "مام! اگر ڈیڈ کو آپ جانتی ہیں کہ وہ غصے کے کس قدر تیز اور انتہائی فیصلے کرنے کے کس قدر عادی ہیں تو یقیناً میرے بارے میں بھی انہیں معلوم ہوگا کہ مجھ پر ان کا کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوتا کیونکہ میں بھی ان کا بیٹا......"

"تم کیا سمجھ رہے ہو۔ کیا تمہارے ڈیڈ نے تمہیں اپنے فیصلے سے باز رکھنے کے لیے مجھے "فیڈ" کیا ہے؟" بیگم نثار احمد کے لہجے میں ممتا بھرا درد تھا۔

ایک ثانیے کے لیے افتخار کا دل تو ضرور پسیجا مگر وہ اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا۔ پھر بڑے رسان کے ساتھ مسکرا کر بولا۔ "او ہو۔ آپ نے غلط اندازہ لگایا ہے مام۔ مجھے آپ کے دکھ کا پوری طرح اندازہ ہے۔ آپ...... آپ...... شوہر اور بیٹے کے درمیان "سینڈوچ" بن کر رہ گئی ہیں لیکن مام......" افتخار قدرے توقف کے بعد گہری سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "آپ جانتی ہیں کہ ڈیڈ مجھے کیش کرانا چاہتے ہیں۔ انہیں میرے جذبات، احساسات کی ذرہ برابر پروا نہیں۔ اسے بھی وہ صرف "بزنس گڈز" کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں اور میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔ اس لیے کہ میں قیدی نہیں ہوں اور نہ ہی ان کا سب آرڈینیٹ...... مام! آئی ایم ہز چائلڈ...... اے سن...... انہیں میری درخواست پہنچادیں کہ کاروبار کو آفس تک ہی محدود رکھیں دیٹس اٹ۔"

وہ اتنا جذباتی ہوگیا تھا کہ اس کی آنکھیں روئی روئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ بیگم نثار کے سفید چہرے پر آنسو امڈ آئے...... وہ ایک چالیس سالہ پُروقار خاتون تھیں۔ رنگت صاف اور اجلی تھی۔ ان کے نقش موٹے مگر جاذب نظر تھے۔ پچھلے کئی روز سے وہ واقعی مجازی خدا اور بیٹے کے درمیان جاری سرد جنگ میں پس کر رہ گئی تھیں۔

افتخار اپنے آفس میں آکر ریوالونگ چیئر پر گر سا گیا۔ ابھی اسے بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔

"یس۔"

اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا۔ ایک دبلی پتلی قبول صورت لڑکی اندر داخل ہوئی۔ "السلام علیکم سر!" یہ نوشین تھی اس کی سیکریٹری۔

"وعلیکم السلام، کیا حالات ہیں؟" سلام کا جواب دیتے ہوئے افتخار نے نوشین کے چہرے پر نظر ڈالی۔

غور طلب

☆مقدر ایک اٹل حقیقت ہے، اس سے منحرف ہوجانے سے مقدر کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔

☆زندگی ایک خوش رنگ تتلی کے مانند ہے جو اکثر کانٹوں میں الجھ جاتی ہے۔

☆بہت سارے ایسے دکھ جن کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے، اکثر ہمارے اپنوں کے دیے ہوتے ہیں، جن سے ناتا توڑنا ناممکن ہوتا ہے۔

☆اپنوں کی غلطی کو معاف کردینے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

☆جو لوگ معمولی بات پر روٹھ جاتے ہیں۔ ان سے دوستی رکھنے سے بہتر ہے کہ کسی بچے سے دوستی کرلی جائے۔

☆قرض سے بچیں کہ یہ دن کی ذلت اور رات کا غم ہے۔

☆مصیبت سے مت گھبراؤ کہ ستارے اندھیرے میں ہی چمکتے ہیں۔

☆روشنی کرنا چاہتے ہو تو سنو، دیے کی تہ میں تیل جلتا ہے۔

☆مشکلات انسان کی روح کی آزمائش ہیں۔

☆کمزوریوں میں سب سے بڑی کمزوری مایوسی ہے۔

☆جب زندگی گزر رہی ہوتی ہے تو ہم اس کی طرف نہیں دیکھتے اور جب گزر جاتی ہے تو پھر اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔

☆رینگنے کی ساری زندگی سے صرف ایک لمحہ پرواز کا بہتر ہے۔ اگر روٹی عقل سے حاصل ہوتی تو دنیا کے بے وقوف بھوکے مرجاتے۔

☆ایک پیسا ایک لاکھ نہیں ہوتا مگر ایک لاکھ میں سے ایک پیسا نکال دیں تو وہ ایک لاکھ نہیں رہتا۔

☆پاگل اور عقل مند دونوں بے ضرر ہوتے ہیں۔ صرف نیم پاگل اور نیم عقل مند خطرناک ہوتے ہیں۔

وزیر محمد خان، ہنگل ہزارہ

''سر! آپ کی طبیعت......''

''نوشین!'' افتخار نے اس کی بات کاٹی۔ اس کا انداز تنبیہی تھا جسے سمجھتے ہوئے نوشین جلدی سے بولی۔

''جی، جی سر! سوری......وہ......قادر بخش کو آج آفس بلایا ہے باس نے......'' اس اطلاع پر افتخار کو ایک جھٹکا سا لگا اور حلق میں کڑواہٹ سی اترنے لگی پھر وہ چند ثانیے خاموشی کے بعد بولا۔

''مس نوشین......تم قادر بخش کو ڈیڈ کے کمرے تک نہ جانے دینا بلکہ اسے میرے پاس سیدھا لے آنا۔'' اس کی بات سن کر نوشین کے چہرے پر الجھن سی طاری ہوگئی۔

''خاموش کیوں ہوگئیں تم؟'' خاموشی کے طویل وقفے کو جلد پاٹنے کی خاطر افتخار نے اپنی سیکریٹری کی طرف دیکھا۔ جواباً نوشین گومگو کی سی کیفیت میں مبتلا ہوگئی۔

''جی سر! وہ دراصل......'' اس نے جلدی سے بولنے کی کوشش کرنی چاہی مگر الفاظ حلق میں اٹک سے گئے۔

افتخار اس کے چہرے کی طرف بھانپتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ''کیا بات ہے مس نوشین کوئی مسئلہ ہے؟''

''یس سر! بات یہ ہے کہ قادر بخش نامی شخص کو سب سے پہلے آپ کے ڈیڈ کے کمرے میں حاضر خدمت کرنے کی سختی سے تاکید پہلے ہی کر دی گئی ہے۔'' بالآخر نوشین نے اصل بات بتادی۔ اس کی بات پر افتخار چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک لمحے کو اس کا چہرہ جوش سے سرخ ہوگیا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس خارج کر کے جیسے اپنے اندر کا غبار نکالا مگر اب اس کی کشادہ پیشانی پر الجھن زدہ شکنیں نمودار ہو چکی تھیں۔ خاصی دیر تک وہ کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں گاڑے کسی خیال میں کھویا رہا۔ پھر اس کے بعد اس نے نوشین کے چہرے کی طرف دیکھا اور اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''مس نوشین! کیا تم میرا ایک کام کر سکتی ہو؟''

''یس سر! آپ حکم کریں۔'' نوشین نے تھوک نگلتے ہوئے جیسے بہ دقت تمام کہا۔ شاید اس نے افتخار کے مخصوص اندازِ تخاطب سے اندازہ لگانے کی سعی کی تھی کہ وہ اس سے کیا ''کام'' لینا چاہتا ہے۔

''دیکھو! تم کسی طرح قادر بخش کو ڈیڈ کے پاس جانے سے پہلے یہاں میرے پاس لے آؤ۔'' افتخار نے کہا۔ ''تمہارا یہ کام دفتری فرائض سے ہٹ کر سہی لیکن تمہیں اس کام کا انعام دیا جائے گا۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی۔

نوشین اب کچھ زیادہ ہی نروس ہوگئی تھی مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی اضطراری کیفیت پر قدرے قابو پاتے ہوئے کہا۔

''سر! میں یہ کام کرنے کی کوشش کروں گی۔ آ......آپ کا کام ہوجائے، بس یہی میرا انعام ہے۔''

افتخار نے بہ غور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ نوشین کی ذہانت کا وہ معترف تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی سیکریٹری نوشین اپنی فطری ذہانت اور ہوشیاری کے بل بوتے پر اس کا یہ کام بڑی کامیابی سے کر دے گی۔ البتہ اس کی گھبراہٹ اور قدرے مضطربانہ انداز سے افتخار نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ اسے شاید باس اور بگ باس کے درمیان پسنے میں ذرا تردد ہو رہا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد افتخار نے ہولے سے مسکرا کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔

سیکریٹری کے جانے کے بعد افتخار نے ایک گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی۔

چند ثانیے وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق رہا پھر اچانک ایک خیال سے اس نے دوبارہ انٹر کام پر اپنی سیکریٹری نوشین سے رابطہ کیا۔

''جی سر!'' دوسری طرف سے نوشین کی کھنکتی ہوئی آواز ابھری۔

''دیکھو نوشین! اگر تم قادر بخش کو میرے پاس لانے میں ناکام ہو جاتی ہو تو پھر تمہیں فوری طور پر ایک دوسرا کام کرنا ہوگا۔''

''جی سر! میں سن رہی ہوں۔''

''تم ایسا کرنا جب قادر بخش ڈیڈ سے مل کر جانے لگے تو تم اسے میرے پاس لے آنا۔'' افتخار نے اسے نئی ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

نوشین نے نہایت مستعدی کے ساتھ اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''جی بہتر سر! میرا خیال ہے یہ کام تو میں بہ آسانی انجام دے ہی لوں گی۔ تاہم میری پہلی کوشش یہی ہوگی کہ......''

''اوکے، اوکے!'' افتخار نے قدرے بیزاری سے اس کی بات کاٹتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے چہرے پر اب گمبھیرتا چھا رہی تھی جس میں الجھن کے ساتھ پریشانی کا عنصر بھی غالب تھا۔ اس نے کرسی کے پشتے پر اپنا سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں تو اس کے ذہن کی اسکرین روشن ہوگئی جہاں ایک دلکش چہرہ رقصاں تھا۔

☆......☆......☆

دفعتاً سامنے دھرے بزر کی گھنٹی بجی۔ نثار احمد جو اس

وقت بے چینی سے کسی کے منتظر تھے قدرے چونک کرانہوں نے اسپیکر آن کیا۔

''سر...... لاڑکانہ سے وڈیرے بابل خان کا فون ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' دوسری طرف سیکریٹری شبانہ کی مترنم آواز گونجی۔

''بات کراؤ۔'' نثار احمد نے گمبھیر لہجے میں کہا پھر انہوں نے قریب رکھے ہوئے کارڈلیس سیٹ سے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

''ہالو بابا۔ سیٹھ صاحب! بابل خان بولتا پڑا ہے...... ادھر لاڑکانہ سے۔''

اس طرف سے بھاری بھرکم لہجے والی گونج دار آواز ابھری۔

''ہاں سائیں! حکم کریں، نثار احمد بات کررہا ہوں۔'' نثار احمد نے کاروباری خوش خلقی کا مظاہرہ کیا۔

''اڑے بابا حکم کیا کرنا ہے۔ ہمارا ایک آدمی آرہا ہے، پیمنٹ کی کیا پوزیشن ہے۔ میرا مطلب ہے کہ آپ ایک ٹرک کے بجائے دونوں ٹرکوں کی یکمشت پیمنٹ کردیں تو وڈی مہربانی ہوگی۔ اچانک روپوں کی ضرورت پڑگئی ہے۔ آگے جیسے تمہاری مرضی بابا۔'' لہجے کے اختتام پر روایتی رعونت کا عنصر غالب تھا۔

''ارے نہیں...... نہیں...... بابل سائیں آپ کا حکم سرآنکھوں پر...... میرا اصول ہے کہ ہم کاروبار سے زیادہ تعلقات کو اہمیت دیتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ کام ہوجائے گا۔'' نثار احمد نے نہ چاہتے ہوئے بھی خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا۔

''وڈی مہربانی بابا!...... کبھی آؤ نا...... آپڑاں گوٹھ گھمائیں آپ کو...... آج کل تلور اور بھٹ تیتروں کا موسم ہے۔ کوئی شکار وکار ہی ہوجائے بابا۔'' وڈیرے بابل نے کھرکھراتی آواز میں خوشی کا اظہار کیا۔

''ہاں...... سائیں:...... ضرور...... ضرور۔ آپ کی مہمان نوازی کے تو ہم دل سے قائل ہیں۔ میں ابھی آپ کا کام کیے دیتا ہوں۔'' جواباً سیٹھ نثار نے گویا جان چھڑاتے ہوئے کہا اور پھر چند اختتامی کلمات کے تبادلے کے بعد انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔

ان کی توجہ اس وقت پوری طرح قادر بخش والے معاملے پر مرکوز تھی۔ وہ اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کررہے تھے۔ حتیٰ کہ اس دوران کوئی کاروباری ملاقات بھی انہیں گراں گزر رہی تھی۔ ان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک کمتر درجے کے شخص کو اتنی اہمیت دینے پر مجبور تھے۔

سنہری باتیں

☆لوگوں کے لیے آپ تب تک اچھے ہیں، جب تک آپ ان کی امید کو پورا کریں اور سبھی لوگ تب تک اچھے ہیں جب تک آپ ان سے کوئی امید نہ رکھیں۔

☆انسان کے کردار کی دو ہی منزلیں ہیں، دل میں اتر جانا یا دل سے اتر جانا۔

☆دنیا کو جیتنا چاہتے ہو تو آواز میں نرمی پیدا کرو، کسی کو پانے کی تمنا مت کرو بلکہ اس قابل ہوجاؤ کہ لوگ آپ کو پانے کی تمنا کریں۔

☆آپ زندگی کو ہر معنوں میں جیت سکتے ہیں، بشرطیکہ آپ دو چیزوں سے بچیں۔ ایک یہ کہ آپ اپنے آپ کا موازنہ دوسروں سے نہ کریں، دوسرے، دوسروں سے کسی قسم کی توقعات وابستہ نہ کریں۔

☆اگر آپ اپنی مسکراہٹ استعمال نہیں کررہے ہیں، تو پھر آپ کی مثال اس شخص کی ہے جس کے بینک میں ملین ڈالرز ہیں مگر اس کے پاس کوئی چیک بک نہیں ہے۔

☆اچھا دوست جتنا بھی برا بن جائے۔ اس سے کبھی دوستی مت توڑنا کیونکہ پانی چاہے جتنا بھی گندا ہوجائے آگ بجھانے کے کام آتا ہے۔

مسکراہٹیں

☆ایک بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ دو چیزیں صرف واقفیت والوں کو ملتی ہیں۔ (1) سموسے کے ساتھ زیادہ چٹنی (2) گول گپوں کے ساتھ دوسری بار کھٹا پانی۔

☆ایک آدمی بازار سے گزر رہا تھا۔ ایک تصویر اسے بہت پسند آئی۔ تصویر کسی بہادر سپاہی کی نظر آرہی تھی۔ اس نے دکاندار سے پوچھا۔ ''کتنے کی ہے؟'' دکاندار نے جواب دیا۔ ''پچاس روپے کی'' اس آدمی کے پاس اڑتالیس روپے تھے وہ واپس چلا گیا اور دوسرے دن پچاس روپے لے کر پھر دکان پر پہنچا تو دیکھا وہ تصویر بک چکی ہے۔ ایک روز وہ اپنے دوست کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ وہی تصویر ہال میں ٹنگی ہے، اس نے دوست سے پوچھا۔

''یہ تصویر کس کی ہے؟'' دوست نے کہا۔ ''ہمارے دادا کی ہے۔'' اس پر اس آدمی نے کہا۔

''دو روپے کم پڑ گئے تھے۔ ورنہ آج یہ ہمارے دادا ہوتے۔''

مرسلہ: اختر شاہ عارف، جہلم

آج انہیں احساس ہو رہا تھا کہ کبھی کبھی بے حیثیت لوگ کس قدر اچانک اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ انہوں نے دانت پیس کر سوچا۔ یہ سب ان کے ناخلف بیٹے افتخار کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ غصے سے تلملانے لگے۔ ادھر انتظار تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ تاہم انہوں نے انتظار کے ان جان لیوا لمحات کو پاٹنے کے لیے اکاؤنٹنٹ جواد مرزا سے انٹرکام پر رابطہ کیا اور اسے وڈیرے بابل خان کے نام پچپن لاکھ کا ''کراس ڈرافٹ'' بنانے کی ہدایت کی پھر مشتاق سے بات کی۔ ''کیا ہوا، یہ مردود ابھی تک نہیں آیا؟'' ان کے لہجے سے اضطراب آمیز پریشانی مترشح تھی۔

''سر! میں اس کا منتظر ہوں...... جیسے ہی آئے گا میں......'' مشتاق کی آواز درمیان میں گھٹ گئی کیونکہ دوسرے ہی لمحے سیٹھ نثار نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

''گودام نمبر دو کی کیا پوزیشن ہے؟ مال نکل رہا ہے...... یا اتنا ہی ہے؟''

مشتاق احمد...... نثار ٹریڈرز کا ایک زیرک جی ایم اور سیٹھ نثار احمد کا قابلِ اعتماد آدمی تھا۔ اسے باس کی مضطربانہ پریشانی کا احساس تھا۔ اس لیے جلدی سے بولا۔ ''سر! مال نکل رہا ہے...... مگر ہم اگلے چھ ماہ تک نیا مال بھرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔''

''یار! ابھی ابھی وڈیرے بابل خان کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا، دوٹرکوں کی یکمشت پیمنٹ کر دو اور مال بھی ذرا جلدی اٹھانے کی کوشش کرو۔ کیا کریں بات ماننا ہی پڑتی ہے۔ کبھی کبھی کاروبار میں اصول سے ہٹ کر بھی تو سوچنا پڑتا ہے۔'' سیٹھ نثار کا تکدر اب کچھ کم ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہے سر! میں پھر مال جلد نکالنے کی کوشش کرتا ہوں...... اور...... سر ایک منٹ......'' معاً مشتاق کی چونکتی ہوئی آواز ابھری...... سیٹھ نثار ذرا ٹھٹکے۔ پھر دوسرے ہی لمحے مشتاق نے جوشیلی آواز میں انہیں مطلع کیا۔

''سر! وہ مردود آگیا ہے۔''

''لے آؤ...... لے آؤ...... اسے فوراً میرے پاس۔''

اس اطلاع پر سیٹھ نثار احمد کے منہ سے بے ربط انداز میں الفاظ برآمد ہوئے۔ تاہم انہوں نے قریب رکھے کانچ کے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر حلق تر کیا پھر خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

تھوڑی دیر گزری تھی، مشتاق، قادر بخش کو لے کر اندر داخل ہوا۔ قادر بخش مکارانہ انداز میں دانت نکالتا ہوا میز کے قریب آیا۔ سیٹھ نثار کی طرف دیکھ کر جھٹ سے سلام کرتے ہوئے مکارانہ فروتنی سے بولا۔

''سلام سیٹھ صاحب!...... یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے اس خادم کو یاد کیا۔ کیا میں بیٹھ جاؤں؟''

پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ڈھٹائی سے اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

سیٹھ نثار گویا دانتوں تلے اپنا غصہ دبائے اس کی طرف گھورے جا رہے تھے پھر جیسے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر قادر بخش کی طرف دیکھ کر انتہائی نخوت سے بولے۔

''تمہیں میں نے بیٹھنے کو نہیں کہا۔ کھڑے ہو جاؤ اور اپنی اوقات میں رہو سمجھے۔'' قادر بخش یکدم بدکا اور کھڑا ہو گیا۔ مشتاق پریشان سا ہو گیا اسے شاید دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اگر خبیث قادر بخش اپنی بات پر اڑ گیا تو اچھی خاصی بدمزگی ہو جائے گی۔ کیونکہ وہ سیٹھ صاحب کے غصے سے واقف تھا۔ ادھر سیٹھ نثار قادر بخش کو ایک لمحے کے لیے بھی وہاں برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس نے میز کی دراز سے ایک لفافہ نکال کر قادر بخش کی طرف اچھالا جسے اس نے یوں پھرتی سے جھپٹ لیا جیسے اگر وہ چھوٹ گیا تو گویا قیامت ہی آجائے گی۔ اس نے حریصانہ نظروں سے لفافے کو کھول کر اس میں موجود رقم کا اندازہ لگایا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ اس کی مطلوبہ رقم نہیں ہے، پھر اس سے پہلے کہ وہ سیٹھ سے کچھ کہتا اسے سیٹھ نثار کی زہر آلود آواز سنائی دی......

''یہ نوٹ لو اور دفع ہو جاؤ...... اور تین دنوں کے اندر اندر اپنی بیٹی طوبیٰ کی شادی کا انتظام کرو، سمجھے...... جاؤ اب......''

قادر بخش کے بشرے پر اب اچانک ناگواری کے تاثرات ابھر آئے تھے اور پھر جیسے وہ اپنی اوقات دکھاتے ہوئے بولا۔

''سیٹھ صاحب! ذرا آرام سے...... یہ ضرور ہے کہ میں آپ کا ملازم رہ چکا ہوں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ مجھ سے اس لہجے میں بات کریں۔''

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ سیٹھ نثار کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ ادھر مشتاق کو صاف نظر آنے لگا کہ اب یہاں کافی ہنگامہ ہونے والا ہے مگر وہ دوسرے ہی لمحے حیرت زدہ رہ گیا جب خلافِ توقع سیٹھ نثار احمد نے اپنی غیظ آلود کیفیت پر قابو پاتے ہوئے معتدل لہجے میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا...... اچھا...... ٹھیک ہے کوئی بات کہنی ہے اور؟''

سیٹھ نثار کا لہجہ نرم پڑتے ہی قادر بخش کی باچھیں پھر مکارانہ انداز میں پھیل گئیں۔ نوٹوں کی گڈی والا لفافہ اس

نے بے پروائی سے تھام رکھا تھا۔

''سیٹھ صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آج کل بھلا ان تھوڑے سے روپوں میں کون اپنی بیٹی کو عزت سے بیاہ سکتا ہے۔''

سیٹھ نثار نے پھر غصے سے دانت پیسے..... مگر مصلحتاً خود پر قابو پانے کی سعی کرتے ہوئے بولے۔ ''پورے پانچ لاکھ روپے ہیں، تمہاری اوقات سے بھی کئی گناہ زیادہ..... اور کیا چاہیے تمہیں؟''

''سیٹھ صاحب..... بات صرف میری بیٹی کی شادی کی تو نہیں ہے نا۔ آپ کے بیٹے کا بھی تو معاملہ ہے۔ اس حساب سے تو آپ نے اس معاملے کو ٹھنڈا کرنے کی بہت ہی کم قیمت لگائی ہے۔ میری بیٹی کو نہیں، اپنے بیٹے کو ہی دیکھ لیں۔''

''بکواس بند کرو..... اپنی۔'' سیٹھ نثار غصے میں دہاڑے۔ ''اپنی گندی زبان سے میرے بیٹے کا نام مت لو۔ وہ انمول ہے، بکاؤ مال صرف تم لوگ ہوتے ہو۔ آخر آ گئے نا اپنی بیٹی کی قیمت لگانے۔''

''سیٹھ صاحب..... آپ بھول رہے ہیں، میں نے اپنی بیٹی کی قیمت نہیں لگائی، آپ نے اپنے بیٹے کی قیمت لگائی ہے..... وہ بھی بہت کم..... یہ پکڑیں اپنے روپے۔''

قادر بخش کو بھی غصہ آ گیا اور اس نے رقم کا لفافہ بڑی بے اعتنائی کے ساتھ سیٹھ نثار کے سامنے اس کی بڑی سے میز پر اچھال دیا۔ ادھر مشتاق کی حالت پتلی ہونے لگی وہ جانتا تھا کہ قادر بخش کے اس طرح ناراض ہو کر چلے جانے سے سیٹھ صاحب پھر کرب میں مبتلا ہو جائیں گے۔

جب قادر بخش نوٹوں کا لفافہ پھینک کر واپس جانے لگا تو مشتاق احمد نے فوراً اسے روکتے ہوئے معاملہ فہمی سے کہا۔ ''قادر بخش! تمہیں ایسا رویہ زیب نہیں دیتا۔ آخر کو سیٹھ صاحب تمہارے باس رہ چکے ہیں، ان کی بات مان لو۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔''

''آں..... نہیں..... منیجر صاحب، صرف میرا فائدہ نہیں، سیٹھ صاحب کا بھی فائدہ ہے۔'' جواباً قادر بخش نے مکاری سے کہا۔

''بولو..... کتنے پیسے اور چاہئیں تمہیں؟'' بالآخر سیٹھ نثار نے اپنی ابلتی کھولتی کیفیت پر بہ دقت تمام قابو پاتے ہوئے قادر بخش سے پوچھا۔

''صرف دس لاکھ۔'' قادر بخش نے بڑے آرام سے کہا۔ سیٹھ نثار کا چہرہ مارے طیش کے سرخ ہو گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی سخت جواب دیتے، جنرل منیجر مشتاق نے پھر مداخلت کرتے ہوئے قادر بخش سے فی الحال پیچھا چھڑانا مناسب سمجھا اور کہا۔

''اچھا..... اچھا ٹھیک ہے قادر بخش! تم ابھی جاؤ۔ ہم دو ایک روز میں سوچ کر تمہیں بتا دیں گے۔ تم ایسا کرنا پرسوں ٹھیک اسی وقت آ جانا۔ چلو اب جاؤ۔'' اس کی یہ بات سن کر قادر بخش کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی پھر وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

''اسے اب ختم کروانا ہی پڑے گا۔ یہ گلے کو آنے لگا ہے اب۔'' قادر بخش کے کمرے سے نکلتے ہی سیٹھ نثار نے غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے پھنکار کر کہا۔

''ارے سیٹھ صاحب! چھوڑیں..... کیوں آپ اپنی ساکھ خراب کرنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مطلوبہ رقم اس کے منہ پر مار ہی دیں تو بہتر ہے۔'' مشتاق احمد نے معاملہ فہمی سے کہا۔ ''اب دیکھیں نا سیٹھ صاحب! اس دو ٹکے کے آدمی کے پیچھے آپ کو کس قدر پریشانی کا سامنا ہو رہا ہے۔ آپ کاروباری میٹنگز میں بھی پارٹیز سے صحیح طرح ڈیل نہیں کر پا رہے ہیں۔ کئی بڑی بڑی ڈیلیں آپ کے ہاتھ سے نکل چکی ہیں۔ کل پھر آپ کی ایک پارٹی سے اہم میٹنگ ہے۔''

مشتاق نے کاروباری اعداد و شمار کی زبان میں سیٹھ صاحب کو سمجھایا تو وہ بے اختیار ایک طویل سانس لے کر خاموش ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

نوشین کی اولین کوشش یہی تھی کہ وہ قادر بخش کو باس کے کمرے میں جانے سے قبل ہی افتخار کے پاس لے جائے مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ قادر بخش کے ساتھ مشتاق تھا۔ تاہم وہ تاک میں رہی اور جیسے ہی قادر بخش واپس جانے لگا، اس نے لپک کر اس کے قریب جا کر ہلکی سی سرگوشی میں کچھ کہا۔ قادر بخش کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سیکنڈ فلور پر واقع سیٹھ نثار احمد کے بیٹے افتخار احمد کے شاہانہ آفس روم میں موجود تھا۔ اس نے بلاکم و کاست اپنے اور سیٹھ نثار کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا۔

''ہوں.....'' افتخار احمد نے قادر بخش کی بات غور سے سننے کے بعد پُرخیال انداز میں ہنکاری بھری۔ تاہم اس کی تیز نظریں اپنے سامنے کرسی پر براجمان قادر بخش کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ افتخار احمد کو بھی قادر بخش سے اتنی ہی سخت نفرت تھی جتنی کہ اس کے باپ سیٹھ نثار کو تھی مگر کسی اہم وجہ کے باعث افتخار اسے ''برداشت'' کرنے پر مجبور تھا۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

''اچھا تو ڈیڈ نے تمہیں اس کام کے پانچ لاکھ روپے کی آفر کی تھی۔'' چند ثانیے خاموشی کے بعد افتخار نے قادر بخش سے کہا۔ ''اور اگر یہ کام نہ کرنے کے میں تمہیں دس لاکھ دوں تو!''

''او جی...... دس کی تو میں نے ڈیمانڈ کی تھی آپ کے ڈیڈ سے...... ان کی پانچ لاکھ والی آفر کو تو میں ٹھکرا چکا ہوں۔'' وہ شاطرانہ انداز میں مکاری سے بولا۔ ''اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگلی ملاقات میں وہ مجھے دس لاکھ دے دیں گے۔''

''پندرہ لاکھ۔'' افتخار نے اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھا۔

''اوہ...... پھر مجھے اور کیا چاہیے۔ سودا پکا۔'' قادر بخش یکدم خوشی سے پھول گیا۔ حرص و طمع کی چمک سے اس کا مکروہ چہرہ مزید بد ہیئت نظر آنے لگا تھا۔

''کل تم میرے پاس آجانا...... مگر اپنا حلیہ بدل کر تاکہ کوئی تمہیں پہچانے نہیں۔'' افتخار احمد نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ قادر بخش خوشی خوشی لوٹ آیا۔

وہ مکاری اور ہوشیاری کے ساتھ دونوں مال دار باپ بیٹے کو ''ڈبل کراس'' کرنے میں مصروف تھا۔ درحقیقت اس کا منصوبہ بھی یہی تھا کہ بیک وقت دونوں باپ بیٹے سے رقم کھینچ لے۔

جب وہ ''نثار ٹریڈرز'' کے دفتر سے نکل کر باہر آیا تو بے حد مسرور تھا۔

☆......☆......☆

آج صبح سے ہی دھوپ کی حدت نسبتاً کم اور موسم خوشگوار تھا۔ ایک معروف چوراہے کے ایک اچھے ریستوران کے فیملی کیبن میں وہ دونوں موجود تھے۔ ان دونوں کے آگے چائے کے خالی برتن دھرے تھے۔ بسکٹ وغیرہ کی پلیٹیں جوں کی توں تھیں۔ ان دونوں نے انہیں ہاتھ لگانا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ دونوں کے چہروں پر گمبھیر تاثرات تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دونوں کسی اہم فیصلے پر پہنچنے کے بعد اب اس پر بہ زبانِ خموشی اپنے اپنے تئیں غور کر رہے تھے۔ یہ دونوں افتخار اور طوبیٰ تھے۔

ایک دوسرے کی دھڑکن تھے دونوں...... ان کے طبقاتی تفاوت کے باوجود محبت کا بیج کب پھوٹا اور کب دلوں کو تسخیر کرتا ہوا تناور درخت بنا، اس کی تیز رفتاری کا دونوں کو اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ کب بے نشاں مسافتوں کو منزل نصیب ہوئی۔ کب خوابوں کو تعبیریں نصیب ہوئیں اور کب دلوں کا دینا ناگزیر ٹھہرا۔ اس کا انہیں پتا ہی نہ چلا۔

محض ایک لمحاتی اور اتفاقی ملاقات، بلکہ آمنا سامنا ہونے پر وہ دونوں آنکھوں کے راستے ایک دوسرے کے حریم دل میں جاگزیں ہو گئے تھے۔ پیاسی نگاہوں کو نخلِ امید میسر آنے لگا تو دونوں نے پُرغرور انداز میں سوچا تھا اور دل کو تاویلیں دے ڈالیں کہ قربتیں، نزدیکیاں...... لمحوں یا صدیوں کی کب محتاج ہوتی ہیں؟ بعض مرتبہ دو دل برسوں تک ساتھ رہتے ہوئے بھی آپس کے فاصلے گھٹانے کی تگ و دو میں عمر گزار دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کم عرصے میں یہ دونوں یک جان دو قالب ہو گئے تھے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب قادر بخش نثار ٹریڈرز میں نیا نیا گوڈاؤن کیپر بھرتی ہوا تھا۔ طوبیٰ چند ایک بار اپنے باپ قادر بخش کے ساتھ وہاں آئی تھی۔ ان دنوں اس نے بی اے فائنل کا امتحان دیا تھا مگر افتخار اور طوبیٰ کا باقاعدہ آمنا سامنا اس وقت ہوا تھا جب طوبیٰ ایک ریسپشنسٹ کی پوسٹ کے لیے انٹرویو دینے آئی تھی۔ یہ انٹرویو بہ ذاتِ خود افتخار نے لیا تھا۔

یوں تو اور بھی لڑکیاں انٹرویو کے لیے آئی تھیں مگر طوبیٰ میں جانے کیا بات تھی کہ افتخار کا دل اسے دیکھ کر بے اختیار اس کی تمنا کرنے لگا۔ وہ اسے ذہین اور سمجھدار لڑکی محسوس ہوئی تھی۔ اگرچہ قادر بخش نے افتخار احمد کے یہ گوش گزار کر دیا تھا کہ طوبیٰ اس کی بیٹی ہے لیکن انٹرویو کے دوران طوبیٰ نے یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ قادر بخش کی بیٹی ہے۔

افتخار نے سب سے آخر میں اس سے پوچھا تھا۔

''مس طوبیٰ! ایک آخری بات بتائیں کہ یہ جاب آپ خالصتاً اپنی مرضی کے تحت کرنا چاہتی ہیں یا آپ کے والد قادر بخش جو ہمارے ہی دفتر میں کام کرتے ہیں، اس میں ان کی مرضی کا زیادہ دخل ہے؟'' یہ کہتے ہوئے افتخار نے بہ غور طوبیٰ کے ملیح چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

اس نے محسوس کیا کہ طوبیٰ کے چہرے پر ایک لمحے کو عجیب سا رنگ آکر گزر گیا۔ تاہم وہ دھیرے سے نظریں قدرے جھکا کر بولی۔ ''جی سر! اس میں میری مرضی کا بھی ایک حد تک دخل ہے۔ ویسے سر! ایک گزارش ہے میری آپ سے۔''

''جی بولیں؟'' افتخار کے لہجے میں پورا خلوص اور آنکھوں میں اشتیاق جھلک رہا تھا۔

''سر! مجھے خوشی ہوگی کہ میرا انٹرویو غیر جانبدارانہ اور عام کینڈیڈیٹ کی حیثیت سے لیا جائے۔ دراصل میں ابو کی سفارش لے کر کسی اور اپنے سے زیادہ قابل امیدوار کا حق نہیں

مارنا چاہتی۔ ورنہ یہ بات میرے ضمیر پر بوجھ رہے گی۔''
اس نے اتنا کہہ کر اپنی پلکیں جھکا دیں اور افتخار کو یوں لگا جیسے ہر سو شام کی کجلاہٹ پھیل گئی ہو۔ مخمور و مدہوش کردینے والی کجلاہٹ۔
افتخار اس کی بات کا مطلب بہ خوبی سمجھ چکا تھا اور اسے اس کی یہ خودداری اور صاف گوئی اچھی لگی تھی۔ یہ ایک اچھی بات تھی کہ طوبیٰ خالصتاً اپنی محنت اور قابلیت کے بل بوتے پر اس جاب کی متمنی تھی۔ افتخار کو اس کی یہ ادا بھا گئی۔ پھر اس نے کیا بھی ایسا ہی۔ واقعی غیر جانبدار انٹرویو کے بعد طوبیٰ کے بجائے کسی دوسری لڑکی کو اپائنٹ کردیا۔ جو نہ صرف تعلیمی قابلیت میں طوبیٰ سے بہتر تھی بلکہ اسے دو سالہ تجربہ بھی تھا۔ نیز چھوٹی موٹی ڈرافٹنگ اور ٹائپنگ بھی کرلیتی تھی لیکن سب سے بڑھ کر افتخار احمد نے اس میں ایک اہم بات محسوس کی کہ وہ لڑکی واقعی ضرورت مند تھی۔ ایک بوڑھی ماں اور دو چھوٹے بہن بھائیوں کا بوجھ بھی تھا اس کے نازک کاندھوں پر۔
طوبیٰ کو انٹرویو میں کامیاب نہ ہونے کا ذرا بھی ملال نہ تھا بلکہ خوشی تھی کہ افتخار نے اس کی ''خواہش'' کا احترام کیا تھا۔ اگرچہ بعد میں اس کے باپ قادر بخش نے سیٹھ نثار احمد سے اپنی بیٹی طوبیٰ کی سفارش کروانے کی کوشش بھی کی تھی مگر افتخار نہیں مانا تھا۔
مگر...... طوبیٰ نہیں جانتی تھی کہ وہ جاب کے لیے اس انٹرویو میں تو فیل ہوگئی ہے مگر دل کے ایک خاموش مگر محسوس کرنے والے انٹرویو میں ''پاس'' ہوگئی تھی۔
اس عجیب موڑ پر آمنا سامنا ہونے کے بعد افتخار اور طوبیٰ کے درمیان کسی نہ کسی بہانے پہلے اِکا دُکا اور پھر متواتر ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ دونوں میں امید کی بیلیں پروان چڑھنے لگی تھیں اور پھر یہ دونوں قریب آتے چلے گئے تھے۔ آج یہ دونوں ریستوران میں بیٹھے ایک پیچیدہ مسئلے پر غور و فکر کرنے کے بعد جیسے اپنی زندگی کے کسی اہم فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔
''افتخار! ابو کی اوچھی حرکتوں کی وجہ سے مجھے جس ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔'' ایک طویل خاموشی کے بعد طوبیٰ نے افتخار سے کہا۔ اس کے لہجے میں حد درجہ ندامت پنہاں تھی۔
''کم و بیش...... میرا بھی یہی حال ہے۔ ڈیڈ نے جس انداز میں تمہارے ابو کو خریدنے کی کوشش کی وہ میرے لیے بھی باعثِ شرم ہے۔'' افتخار نے بھی اپنے اندر کی کدورت دھونی چاہی۔ اگرچہ اس کے انداز میں یہ حقیقت بھی مضمر تھی کہ وہ اس طرح حساب برابر کرکے طوبیٰ کی ذہنی کوفت کو دور کرنا چاہتا تھا۔
''سمجھ میں نہیں آتا۔ ابو نے تمہارے ڈیڈ سے بھی پیسے لے لیے اور تم سے بھی، آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟''
طوبیٰ کے لہجے میں خفت پوشیدہ تھی۔
''ڈبل کراس!'' افتخار نے استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ زیرِ لب کہا تو طوبیٰ قدرے چونک کر اس کا پُروجیہہ چہرہ تکنے لگی۔ ''ہاں طوبیٰ!'' افتخار نے اس کے صبیح چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ڈیڈ نے تمہارے ابو کو رقم اس لیے دی کہ وہ تمہاری شادی جلد سے جلد کسی اور جگہ طے کردیں۔ اس طرح وہ اپنی راہ کا کانٹا ہٹانا چاہ رہے تھے تاکہ میں تمہیں اپنانے کی ضد چھوڑ دوں لیکن تمہارے ابو قادر بخش نے یہ ساری بات میرے گوش گزار کردی۔ محض اس لیے کہ وہ قیمت بڑھانا چاہتے تھے۔ مجبوراً مجھے ڈیڈ کی طرح یہ چال چلنا پڑی اور میں تمہارے ابو کو ڈیڈ کی آفر سے بڑی رقم دینے پر مجبور ہوگیا۔'' افتخار نے اپنی بات مکمل کی۔
''اف میرے خدایا...... ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ کوئی باپ اتنا بھی پستیوں میں گرسکتا ہے۔'' طوبیٰ احساسِ ندامت کے بعد اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ افتخار اس کی خفت آمیز ہیبت کذائی پر بولا۔
''اوکم آن...... طوبیٰ! ٹیک اٹ ایزی...... بھول جاؤ ساری خرافات کو۔ اب آگے کی سوچو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے گہری نظروں سے طوبیٰ کے گم صم اور متفکر چہرے کی طرف دیکھا۔
طوبیٰ بولی۔ ''افی! کیا یہ اچھا نہیں ہوتا کہ...... تمہارے ڈیڈ ہماری شادی سے خوش ہوجاتے۔ کیا تم نے انہیں بھی منانے کی کوشش نہیں کی؟''
''کیسی باتیں کرتی ہو طوبیٰ! تمہیں کیا معلوم کہ میں نے کس کس طریقے سے ڈیڈ کو نہیں منایا مگر وہ ضد کے پکے ہیں، میں بھی آخر ان کا ہی بیٹا ہوں۔ میں بھی تم سے شادی کرکے رہوں گا۔ بس ہم نے جو فیصلہ کرلیا ہے، اس پر ہمیں کل ہی فوراً عمل کرنا ہوگا۔''
افتخار اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے سے عزم عیاں تھا۔ جیسے وہ اس معاملے پر مزید سوچ بچار کرنا ہی نہ چاہتا ہو۔
''میرا خیال ہے افتخار پھر ہمیں کم از کم...... میرا مطلب

ہے تمہیں اس شادی کے بارے میں اپنے حتمی فیصلے سے ڈیڈ کو آگاہ کرنا ہی پڑے گا۔'' طوبیٰ نے کسی خیال کے تحت اپنے ہونے والے سسر سیٹھ نثار احمد سے مصالحت کی کوشش جاری رکھی۔ افتخار نے استہزائیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ تبھی تو انہیں تمہارے باپ کے ساتھ گل کھلانے کا موقع ملا تھا۔ اب میں نہیں چاہتا کہ وہ پھر ہم دونوں کے بیچ کوئی دوسری خندق کھودیں۔ لہٰذا اب صرف شادی ہوگی اور جلدی ہوگی...... دیٹس آل......'' افتخار نے فیصلہ کن انداز میں ہاتھ کھڑے کر کے کہا۔

☆......☆......☆

دو دن بعد افتخار نے طوبیٰ سے شادی کر لی اور اسے دلہن بنا کر اپنے گھر لے آیا۔ سیٹھ نثار احمد جیسے پتھرا کر رہ گئے مگر دوسرے ہی لمحے انہوں نے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے انتہائی سرد لہجے میں کہا۔

''بالآخر تم نے اپنی ضد پوری کر کے ہی چھوڑی۔''

''یہ ضد نہیں تھی ڈیڈ! یہ تو......'' افتخار نے بڑے رسان کے ساتھ باپ سے کہنا چاہا مگر سیٹھ نثار نے ہاتھ کھڑا کر کے اسے کچھ کہنے سے روک دیا۔

''دیٹس انف...... اینڈ ناؤ، زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بدستور پتھر بنے رہے۔ اس سے وہ کسی بھی روپ میں باپ نظر نہیں آ رہے تھے۔ جیسے افتخار ان کا بیٹا نہیں بلکہ کوئی نالائق ترین ملازم ہو جسے وہ نوکری سے ڈس مس کرتے ہوئے اس کی کوئی بات ماننے یا سننے کے لیے تیار ہی نہ ہوں۔ قریب موجود بیگم نثار شوہر اور بیٹے کے بیچ گہری پڑتی دراڑ کے تصور سے اپنا خون خشک کیے کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو، غم اور انجانے اندیشے گڈمڈ ہو کر سکتے کی سی کیفیت طاری کیے ہوئے تھے۔ وہ بے چاری خوفزدہ نظروں سے کبھی اپنے شوہر کو دیکھتیں تو کبھی بیٹے کو مجبور نگاہوں سے تکتیں۔ انہوں نے شاید اس بھیانک اور کربناک حقیقت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب سسک اٹھیں۔

''تمہارا آج کے بعد سے، ہم سے اور اس گھر کے در و دیوار سے کوئی ناتا نہیں رہا۔ سمجھے تم......'' پتھرائی ہوئی بے رحم آواز افتخار احمد نے خاموشی سے سنی پھر وہ دھیرے سے مگر قدرے طمانیت کے ساتھ بولا۔

''جی بہتر ڈیڈ......! اور کچھ؟''

ادھر بیگم نثار کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہنے لگے تھے۔ انہیں گویا آسمان ٹوٹنے کا قیامت انگیز احساس ہو چلا تھا۔

''اور...... میں تمہاری نافرمانی پر تمہیں اپنی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد سے بھی......''

''نہیں...... نہیں...... خدا کے لیے...... یہ ظلم نہ کرو نثار میرے بیٹے پر۔'' بالآخر بیگم نثار شدت غم سے پھٹ پڑیں۔

''تم چپ رہو بیگم! شکر کرو کہ بیٹے کی نافرمانی کا ذمے دار میں تمہیں نہیں سمجھ رہا...... ورنہ......''

سیٹھ نثار نے قریب کھڑی اپنی بیگم کی طرف گھورتے ہوئے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

ان کے خطرناک تیوروں کا اندازہ کر کے بیگم نثار نے سسکتے ہوئے آنچل میں اپنا منہ چھپا لیا۔ ادھر سیٹھ نثار کا پورا وجود غیظ و غضب کے مارے کانپ رہا تھا۔ وہ بدستور زہریلی نظروں سے بیٹے کی طرف گھور رہے تھے۔ وہ پھر بیٹے کو مخاطب کر کے گمبھیر لہجے میں گرجے۔ ''مسٹر افتخار احمد! اب تم اپنی بیوی کو لے کر میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ اس سے پہلے کہ یہ معاملہ میری برداشت سے باہر ہو جائے۔''

افتخار نے ایک نگاہ اپنی سسکتی ہوئی ماں کی طرف دیکھا پھر خاموشی کے ساتھ طوبیٰ کا ہاتھ پکڑا اور باپ کی عالیشان کوٹھی سے باہر آ گیا۔ اس کے چہرے پر بڑی زہرخند مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس وقت شام ہو چلی تھی۔ وہ دونوں اب بلند و بالا عمارتوں والی کوٹھیوں کے درمیان بنی پختہ سڑک پر کھڑے تھے۔

''افتخار! اب...... اب کیا ہوگا؟ ہم کہاں جائیں گے؟'' طوبیٰ نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں اپنے محبوب شوہر افتخار احمد سے کہا۔

''میرے ہوتے ہوئے تم کیوں فکر کرتی ہو طوبیٰ؟'' افتخار نے اسے بڑی ملائمت کے ساتھ تسلی دی۔

''گلستان جوہر میں میرا ایک دو کمروں والا فلیٹ ہے۔ ادھر ہی چلتے ہیں۔ میں ٹیکسی دیکھتا ہوں۔''

☆......☆......☆

گلستان جوہر میں واقع ایک عمارت میں دو بیڈ رومز کا بڑا خوبصورت فلیٹ تھا اور سارا فرنشڈ بھی...... طوبیٰ کو یہ فلیٹ بہت اچھا لگا۔ یوں تو وہ افتخار کو پا کر بلکہ...... دونوں ہی ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش اور مسرور تھے مگر طوبیٰ کے ملیح چہرے پر بے نام سی افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ افتخار اس کی افسردگی سے بہ خوبی واقف تھا۔ اس لیے اس نے اس کی

دلجوئی شروع کردی۔

''طوبیٰ! ہمیں اور کیا چاہیے بھلا۔ ساری دنیا کی دولت تو ہمارے قدموں تلے ہے۔''

''کتنا اچھا ہوتا افتخار اگر...... اگر تمہارے ڈیڈ......''

''پلیز! طوبیٰ لیواٹ ناؤ۔ اب آگے کی سوچو، زندگی ہم دونوں نے گزارنی ہے۔ ڈیڈ کا یہ وقتی ابال ہے۔ آہستہ آہستہ جب ان کا غصہ سرد پڑ جائے گا، وہ خود ہی ہمیں ایک دن لینے یہاں آن پہنچیں گے۔'' افتخار نے جیسے طوبیٰ کو تسلی دی مگر خود اسے اپنی آواز کا کھوکھلا پن صاف محسوس ہو رہا تھا۔ مگر طوبیٰ کو بھی کافی حد تک اندازہ ہو گیا تھا کہ افتخار اس کا دل رکھنے کے لیے ایسا کہہ رہا تھا۔

وہ پھر کبیدہ خاطر ہو کر بولی۔

''افتخار! میری وجہ سے تم اپنے باپ سے دور ہوئے۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگا۔''

''او...... کم آن...... طوبیٰ! اب چھوڑو بھی...... آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' افتخار نے کہا۔

''اس کے سوا اب کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ تم شاید نہیں جانتیں کہ میرے ڈیڈ مجھے کیش کرانا چاہتے تھے۔ وہ میرے جذبات اور احساسات کو اپنے کاروباری اصولوں کی بھینٹ چڑھانا چاہتے تھے اور...... پھر میری ذاتی زندگی کو بھی ایک 'بزنس ڈیل' سمجھ کر اسے تاعمر روندتے ہی رہتے۔''

طوبیٰ نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے یہ سب تمہاری غلط فہمی ہو۔ ایک باپ بھلا کب یہ چاہے گا کہ......'' طوبیٰ کی بات ادھوری رہ گئی۔ دوسرے ہی لمحے افتخار نے اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز نظروں سے مسکرا کر کہا۔

''اور...... تمہارا اپنے باپ کے بارے میں کیا خیال ہے۔ وہ بھی تو تمہیں 'کیش' کرانا چاہتے تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے ابا کو تو کم از کم اس معاملے میں ضرور کامیابی حاصل ہو گئی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے افتخار نے شرارت بھری نظروں سے طوبیٰ کی طرف دیکھا تو طوبیٰ نے خفت کے مارے اپنا سر جھکا دیا۔ افتخار نے محبت پاش نظروں سے اس کے نکھرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی ٹھوڑی آہستگی سے اوپر کی۔ اس کا حنائی ہاتھ اپنی مضبوط گرفت میں لیا پھر محبت سے لبریز لہجے میں بولا۔ ''طوبیٰ! مجھے صرف اس چار دیواری سے محبت ہو گی جہاں تمہارے وجود کی خوشبو ہو، جہاں تمہاری موجودگی کا مسرت بھرا کیف آور احساس ہو۔ چاہے چار دیواری سونے کی ہو یا گارے مٹی کی......''

افتخار کے محبت سے لبریز لہجے کی چاہت بھری خوشبو نے طوبیٰ کو مسرور کر ڈالا۔ ایسے میں طوبیٰ کے گلابی لبوں میں لرزش پیدا ہوئی، جیسے دل کی بات لبوں تک آتے آتے رہ گئی ہو۔

''ہاں طوبیٰ! تمہاری محبت، تمہاری سنگت...... میرے لیے دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے۔ تمہاری من موہنی صورت، تمہارا گلاب سا نازک اندام پیکر صحیح معنوں میں مجھے ملکیت کا احساسِ تفاخر بخشنے لگا ہے۔ مجھے اس بات کا بھلا کیا غم کہ میرے ڈیڈ نے مجھے اپنی منقولہ و غیر منقولہ جائداد سے عاق کر دیا ہے۔ میری اصل دولت اور جائداد تو تم ہو۔ صرف تم۔ باقی سب ہیچ ہے تمہارے آگے۔''

''اور میری دولت تم ہو افتخار۔ صرف تم۔''

افتخار کے خاموش ہوتے ہی طوبیٰ کے دلکش لبوں سے نکلا۔ اس لیے اس نے اپنی سرمئی پلکوں کی جھالر کو اٹھا کر افتخار کے روشن روشن چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ پھر افتخار کی نشیلی نظروں سے طوبیٰ کی مدبھری نگاہیں چار ہوئیں تو جیسے دو پیار سے لبالب بھرے جام چھلک پڑے۔ افتخار سے نہ رہا گیا اور اس نے طوبیٰ کے قریب ہوتے ہوئے سرگوشی کی۔

''طوبیٰ! میری اس چھوٹی سی چار دیواری کو جنت بنا دو بس! مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔''

☆......☆......☆

وہ ساحلِ سمندر پر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے گھنٹوں دنیا و مافیہا سے لاتعلق گیلی ریت پر ننگے پاؤں گھوم رہے تھے۔ ان سرور بھری ساعتوں کو دیکھ کر دونوں کے مسرت بھرے دل سے بے اختیار یہ خواہش ابھرنے لگی کہ کاش یہ کیف آور لمحے تھم جائیں۔

طوبیٰ اور افتخار گھنٹوں ساحل پر گھومتے رہتے اور خوش آئند دنوں کی منصوبہ بندی کرتے رہتے۔

''جناب! اب یہ سیر سپاٹے چھوڑیں اور کچھ ذریعۂ معاش کی طرف بھی دھیان دیں۔'' سی ویو کے ایک اوپن ائیر ریستوران کے قدرے تنہا گوشے میں چنوں کی چاٹ کھاتے ہوئے طوبیٰ نے افتخار سے کہا۔ اس وقت دور پُرسکون سمندر کے ہلکورے لیتے افق پر سورج کی لال ٹکیا ڈوب رہی تھی۔

''ابھی میرے پاس بہت سارا روپیا ہے۔'' افتخار نے طوبیٰ کی طرف محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے قدرے بے نیازی سے کہا۔ ''میرے اکاؤنٹ میں ابھی کافی بیلنس ہے۔ ابھی تو ہمیں ہنی مون پر بھی نکلنا ہے۔ میں نے بہت

کام کرلیا اب ذرا کچھ دن خوشیوں اور شادمانیوں کے بھی گزار لینے دو۔"

"افتخار! بیٹھ کر کھانے سے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہوجاتا ہے۔" طوبیٰ کے لہجے میں اچانک گہری متانت عود کر آئی۔ "ہنی مون ضروری نہیں۔" طوبیٰ کے لہجے میں فکر فردا کی کاٹ تھی جسے افتخار نے محسوس کرلیا تھا۔ چنانچہ اب وہ بھی قدرے سنجیدہ نظر آنے لگا اور کچھ سوچتے ہوئے طوبیٰ سے بولا۔

"طوبیٰ! تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں جلد ہی کوئی نوکری ڈھونڈ لوں گا۔ کم ازکم مجھے کسی بھی اچھی فرم میں جنرل منیجر کی نوکری تو ضرور مل جائے گی۔"

"ڈھونڈو گے تو ملے گی نا۔ یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرنے سے تو نہیں ملے گی۔"

"اوہو...... بھئی تم نے یہ کیا تھانیداری دکھانی شروع کردی ہے۔ ہاتھ پہ ہاتھ کہاں دھرے بیٹھا ہوں میں۔" افتخار نے معنی خیز انداز میں شرارت بھری نظروں سے طوبیٰ کے چہرے کی طرف دیکھا تو بے اختیار طوبیٰ کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔

☆......☆......☆

وقت گزرتا گیا۔ کسی نے کسی کی کوئی خبر نہ لی، طوبیٰ البتہ اپنے باپ کے ہاں ہوآتی تھی۔ افتخار کہاں جاتا؟ اس کا اپنے گھر میں داخلہ گویا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ ماں کی محبت سے مجبور ہوکر وہ فون پر اس سے بات کرلیا کرتا تھا۔

نثار نے اپنے بیٹے کی کوئی خبر نہ لی، وہ گویا جیسے واقعی اپنے بیٹے کو بھلا بیٹھا تھا۔ باپ کی شفقت اور محبت کے سلسلے میں افتخار کے دل میں جو غرور آمیز مان تھا کہ...... ایک دن باپ اپنی اولاد...... اپنے بیٹے کی پدرانہ محبت سے مجبور ہوکر اسے منانے آجائے گا مگر وہ مان اب ریت کی طرح بند مٹھی سے نکلتا جارہا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر، میں بھی آخر ان کا ہی بیٹا ہوں۔ سیٹھ نثار احمد کا بیٹا۔ افتخار احمد خان...... اگر ایک باپ کو بیٹے کا غم نہیں تو...... پھر بیٹے کو بھی ایسے بے حس باپ کی فکر نہیں ہونی چاہیے...... کیوں طوبیٰ...... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا......"

وہ معصوم ٹوٹے ہوئے دل رکھنے والے بچے کی طرح سسکنے لگا۔ طوبیٰ کو ڈر ہونے لگا تھا کہ اس کے شوہر کو کہیں باپ کا غم نہ لے ڈوبے۔ وہ اس کی دلجوئی کرتی رہتی۔

وقت گزرنے کے ساتھ زندگی کی کچھ دوسری تلخیوں نے ظاہر ہونا شروع کردیا تھا جس میں سے اہم مسئلہ ذریعہ معاش کا تھا۔ افتخار کا یہ "تسلی بخش" خیال باطل ثابت ہوا تھا کہ اسے فوراً اچھی نوکری مل جائے گی۔ اسے اپنے کاروباری حلقے کا جو زعم تھا اسے اندازہ ہوا کہ وہ باپ کے عاق نامے کے بعد ہی قطع ہوچکا ہے۔ وہ بہت دلبرداشتہ ہوا۔ "کیا میری اپنی کوئی پہچان نہ تھی؟ میری شناخت میرے حوالے سے نہ تھی؟ پھر...... پھر میں کیا تھا؟" وہ سوچتا۔ وہ بالکل ڈھے گیا ہوتا اگر طوبیٰ کا ساتھ نہ ہوتا۔

جو جمع پونجی تھی، وہ اس زعم میں تیزی کے ساتھ سیر سپاٹے میں لٹاتا رہا تھا کہ اسے عام لوگوں کی طرح کون سا نوکری کے لیے جوتے چٹخانے پڑیں گے مگر اب اسے آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہونے لگا تھا مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ اسے اپنے "فیصلے" پر کوئی پچھتاوا ہو۔ طوبیٰ کو پاکر اسے کسی اور شے کی بھلا طلب ہی کہاں رہی تھی۔ تاہم زندگی گزارنے کے لیے کوئی نہ کوئی ذریعہ معاش تو درکار ہوتا ہے۔ وہ اس کے حصول کے لیے مصروف ضرور تھا۔

اب پتا نہیں بے روزگاری کا دکھ تھا یا باپ کی بے مروتی کا غم...... افتخار بیمار رہنے لگا۔ طوبیٰ نے بیوٹیشن کا کورس کررکھا تھا۔ وہ اپنے فلیٹ کے ایک کمرے میں بیوٹی پارلر کھولنا چاہتی تھی مگر اس کے لیے بھی تو سرمائے کی ضرورت پڑتی جو ان کے پاس نہ تھا۔ تاہم طوبیٰ نے اس کا طریقہ نکالا...... اس نے پہلے افتخار کو اعتماد میں لیا، اس کے بعد اس پر عمل شروع کردیا۔ یہ فلیٹ بڑا تھا اور ان کی ضرورت سے زیادہ بھی۔ ایک اسٹیٹ ایجنٹ سے بات کی گئی، فلیٹ فروخت کردیا گیا اور دوسرا ایسا ہی فلیٹ کرائے پر لے لیا گیا۔ کچھ پیسے فکس ڈپازٹ سرٹیفکیٹ اسکیم میں لگادیے اور باقی پیسوں سے طوبیٰ نے ایک کمرے میں بیوٹی پارلر کھول لیا۔

زندگی کی گاڑی کو ذرا دھکا لگا تو پژمردہ زندگی کچھ مسکرائی مگر ادھر تقدیر نے کسی پیاسی ڈائن کی طرح ان کا گھر دیکھ لیا تھا۔ طوبیٰ کو تو مصروفیات کا بہانہ مل گیا تھا مگر افتخار کی طبیعت پھر بھی نہ سنبھل پائی۔ حتیٰ کہ وہ سخت بیمار پڑ گیا۔ طوبیٰ حیران پریشان اسے قریبی ڈاکٹر کے کلینک میں لے گئی۔ اس نے چند ضروری دواؤں کا ایک نسخہ طوبیٰ کو تھمادیا۔ مگر ساتھ میں یہ بھی فرمادیا کہ اگر طبیعت نہ سنبھلے تو کسی دماغی یا نفسیاتی ڈاکٹر سے کنسلٹ کریں۔ یہی ہوا۔ مذکورہ ڈاکٹر سے بھی افاقہ نہ ہوا تو مجبوراً طوبیٰ افتخار کو لے کر ایک مشہور ماہر نفسیات کے پاس گئی جس نے سب سے پہلے تگڑی فیس کھری کی۔ پھر آدھے گھنٹے کے تفصیلی معائنے کے بعد

افتخار کی اس بیماری کو مینیا' (Mania) کا نام دے کر چند ضروری ہدایات دیں پھر رخصت کر دیا۔

اس مرض کی دوائیں بھی بڑی مہنگی تھیں۔ دوا کو بھی چھ سے نو ماہ تک کے لیے تفویض کیا گیا تھا۔ اس پر بھی ڈاکٹر موصوف نے علیحدگی میں طوبیٰ کو ''مریض'' سے متعلق ایک ضروری ہدایت بھی دی تھی کہ..... ''بی بی! دواؤں سے زیادہ اگر آپ وہ اسباب ری موو (Remove) کرنے کی کوشش کریں تو مریض کو جلد شفا مل سکتی ہے۔''

طوبیٰ جانتی تھی کہ اس کے محبوب شوہر کی بیماری کا صرف ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے اس کے باپ کی بیٹے سے لاتعلقی......طوبیٰ کبھی حیرت اور افسوس کے ساتھ اپنے سسر سیٹھ نثار احمد کے بارے میں سوچتی تھی کہ آخر وہ کیسا باپ تھا جو اپنی انا کے خول میں بند ہو کر رہ گیا تھا اور اس نے بیٹے کی پلٹ کر خبر تک نہ لی تھی۔

افتخار کی حالت وطبیعت پھر بھی نہ سنبھل پائی کہ ایک دن طوبیٰ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق افتخار کی اس عجیب بیماری کا سبب دور کرنے کے لیے خاموشی سے اپنے سسر کی عالیشان کوٹھی جا پہنچی۔ بیگم نثار تو پریشان ہو گئیں مگر سیٹھ نثار نے طوبیٰ کو دیکھ کر زہرناک لہجے میں کہا۔

''تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟ میں کسی فقیر کو خیرات تو دے سکتا ہوں مگر......مگر تمہیں......''

''میں اپنے لیے خیرات لینے نہیں آئی ہوں سیٹھ صاحب! آپ کے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگنے آئی ہوں آپ کے پاس۔''

طوبیٰ نے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

اس پر بیگم نثار نے اپنا سینہ تھام لیا مگر سیٹھ نثار کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔

''خود ہی بھگتو اب اپنی ضد۔'' انہوں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

بیگم نثار بلبلا اٹھیں اور روہانسی ہو کر اپنے شوہر سے بولیں۔ ''نثار! اتنے سنگدل نہ بنو۔ آخر کو وہ ہمارا بیٹا ہے۔ وہ بیمار ہے۔''

''تم خاموش رہو بیگم! میں ان کے ڈرامے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اب لیلیٰ مجنوں کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو رہا ہے۔'' سیٹھ نثار کٹھور پن سے بولے اور بڑی سنگدلی اور بے مہری سے طوبیٰ کو واپس لوٹا دیا۔

طوبیٰ کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ گھر آتے آتے اسے چکر آ گئے۔ راہ چلتے کچھ خدا ترس لوگوں نے طوبیٰ کو قریب ہی ایک لیڈی ڈاکٹر کے کلینک پر پہنچا دیا۔ وہاں اسے ماں بننے کی خوش خبری ملی۔ طوبیٰ بے چاری دم بخود رہ گئی۔ سوچنے لگی کہ اس خبر پر وہ خوشی منائے یا...... اب تو جیسے خوشیوں کو بھی گھن لگ گیا تھا۔

اس نے گھر آ کر مبہم لہجے میں افتخار کو یہ ''خوشخبری'' سنائی۔ دونوں کے چہروں پر ذرا دیر کو نئے آنے والے مہمان کی وجہ سے خوشی کے تاثرات بھی ابھرے مگر وہی گھن لگی خوشی......طوبیٰ نے البتہ افتخار کو اس کے باپ کی بے حسی کے بارے میں نہیں بتایا کہ کہیں اس کا دل مزید بوجھل نہ ہو جائے لیکن اس دن افتخار نے خود ہی طوبیٰ سے کہہ ڈالا۔

''طوبیٰ! ایک کام تو کرو، میری بیماری کے متعلق ذرا میرے ڈیڈ کو تو آگاہ کر دو خود جا کر۔''

اس کی بات سن کر طوبیٰ کا کلیجا کٹ گیا۔ وہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ کہیں مزید اس غم میں افتخار کی طبیعت بگڑ جائے وہ خاموش رہی۔ جب اس کا اصرار بڑھا تو طوبیٰ کو بالآخر یہ تلخ حقیقت بتانا ہی پڑی کہ وہ یہ کام بہت پہلے کر چکی ہے اور اس کے جواب میں سیٹھ نثار نے اس کے ساتھ کیسا ناروا اور سنگدلانہ سلوک کیا تھا۔

افتخار کے چہرے پر پہلے حیرت، پھر غم کے تاثرات گڈمڈ ہو گئے۔ اس کے بعد اچانک نہ جانے اسے کیا ہوا۔ وہ پاگلوں کی طرح ہنستا چلا گیا۔ طوبیٰ خوف زدہ سی نگاہوں سے افتخار کو تکنے لگی۔

☆......☆......☆

محبت کی ابتدا تو ہے مگر انتہا کوئی نہیں۔ ایک دن افتخار کا ڈپریشن اتنا شدید بڑھا کہ وہ دنیا سے ہی رخصت ہو گیا۔ مرتے وقت اس نے طوبیٰ کے کان میں ایک وصیت آمیز سرگوشی کی تھی جسے سن کر طوبیٰ کے دل ودماغ کی عجیب کیفیت ہو گئی تھی۔ اس وصیت کو طوبیٰ نے اپنے ذہن کے دور افتادہ گوشے میں محفوظ کر لیا تھا۔

وقت بڑے بڑے زخموں کو مندمل کر دیتا ہے مگر اپنے محبوب شوہر کی موت کا غم طوبیٰ سے بھلائے نہیں بھولتا تھا لیکن پھر تھوڑے عرصے بعد ہی جب طوبیٰ نے ایک پیارے سے صحت مند بچے کو جنم دیا تو تب کہیں جا کر اس کے بے قرار دل کو کچھ سکون ملا۔ اس کے ماں باپ اس کے فلیٹ میں ہی آ کر رہنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

بچے کی پیدائش کے بعد ہی طوبیٰ کے کانوں میں اپنے

مرحوم شوہر افتخار کی سرگوشی گونجنے لگی اور پھر طوبیٰ نے ایک دن بڑے اہتمام کے ساتھ...... سیٹھ نثار کو اس کے دادا بننے کی خبر پہنچائی۔ طوبیٰ نہیں جانتی تھی کہ بیٹے کی موت کے بعد پتھر دل سیٹھ نثار احمد پر کیا بیتی تھی؟ وہ شاید اپنے بیٹے افتخار کی بیماری کو پہلے ڈراما اور جذباتی بلیک میلنگ سمجھتے تھے۔ طوبیٰ جانتی تھی کہ ایک باپ جب اپنے بیٹے کی بیماری کا سن کر اسے دیکھنے نہیں آیا تو بھلا پوتے کی پیدائش پر اسے دیکھنے کس طرح آسکتا ہے مگر چونکہ یہ بات اس کے شوہر افتخار کی وصیت کا ایک حصہ تھی۔ چنانچہ طوبیٰ نے اس پر عمل کرتے ہوئے سیٹھ نثار تک یہ خبر پہنچادی تھی۔

اس خبر کے پہنچنے کی دیر تھی کہ اگلے دن ہی سیٹھ نثار اپنی بیگم اور دو عدد نوکروں کے ساتھ پہنچ گئے۔ انہوں نے بڑے بڑے شاپر زاٹھار کھے تھے جن میں چھوٹے بچے کے کپڑے اور کھلونے وغیرہ تھے۔ طوبیٰ نے بڑی سرد مہری کے ساتھ ان کا استقبال کیا تھا۔ طوبیٰ کے کانوں میں ابھی تک افتخار کی وصیت کے الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے مرتے وقت کہے تھے اور حیرت کی بات تھی کہ بالکل ویسا ہی ہو رہا تھا سب کچھ۔ طوبیٰ نے محسوس کیا کہ سیٹھ نثار پوتے کو دیکھ کر خوشی سے نہال ہوئے جارہے تھے۔ اسے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ جس باپ نے محض اپنی جھوٹی انا کی خاطر اپنے بیٹے سے تعلق نہیں رکھا تو اب پوتے پر اس قدر پیار آنا تعجب ہی کی بات تھی۔ کہتے ہیں کہ جھوٹی انا اور ضد کا خول تبھی ٹوٹتا ہے جب دل پر چوٹ لگ جائے۔

افتخار کی اچانک اور ناگہانی موت پر سیٹھ نثار بھی ایک لمحے کو گنگ ہو گئے تھے کیونکہ وہ یہی سمجھے ہوئے تھے کہ افتخار بیمار نہیں ہے، محض بیماری کا ڈراما رچا کر ان کی جذباتی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس نکلی۔ افتخار کا انتقال ہوا تو احساس جاگا کہ ان سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے۔ اب وہ اپنے ننھے پوتے کی صورت میں اپنے بیٹے کی شبیہ دیکھ رہے تھے۔ آخر کو باپ تھے مگر بعض غلطیوں کی تلافی ناممکن ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب سیٹھ نثار نے طوبیٰ کو اپنے گھر چلنے کا کہا تو یک دم اسے اپنے شوہر کے آخری الفاظ یاد آگئے۔

''طوبیٰ! بعض تلخ حقیقتوں کا احساس انسان کو بعد میں ہوتا ہے۔ موت بھی ایسی ہی تلخ حقیقت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میری موت کے بعد میرے باپ کو اپنے غلطی کا احساس ہو جائے...... میرا دل کہتا ہے...... ایسا ضرور ہوگا۔ میرا باپ تلافی کے لیے تمہارے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھنے آئے گا لیکن طوبیٰ! مجھے یہ منظور نہیں ہوگا کہ میرا باپ اپنے ضمیر کا بوجھ تمہارے ذریعے ہلکا کرنے کی کوشش کرے۔ اب اس بوجھ تلے اسے ساری عمر جینا ہوگا۔ تم سمجھ گئی ہونا...... میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟''

اور طوبیٰ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ ویسے بھی وہ افتخار کی موت کے بعد اپنے سسرال والوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اس کی یہ مشکل افتخار کی وصیت نے آسان کردی تھی۔

لہٰذا آج جب افتخار کی بات حیرت انگیز طور پر سچ ثابت ہونے لگی تو طوبیٰ کے اندر سلگتے شعلوں کی تپش تیز تر ہونے لگی مگر اس نے بہ مشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''سیٹھ نثار احمد صاحب! آپ بھول رہے ہیں کہ آپ نے اپنے بیٹے افتخار کو خود سے لاتعلق قرار دے دیا تھا۔ اب بھلا یہ تعلق کیونکر جوڑا جارہا ہے؟''

''وہ میری غلطی تھی بیٹی......!'' سیٹھ نثار کے لہجے میں ندامت تھی۔ ''اور میں اپنی غلطی پر سخت پشیمان ہوں اب...... اب میرا سارا پیسا میرے پوتے کا ہی تو ہے۔ تم دونوں میرے پاس خوش رہوگے۔''

''پلیز سیٹھ صاحب! پہلی بات تو یہ کہ مجھے آپ بیٹی نہ کہیں۔ دوسرا یہ کہ میرے بچے کو آپ کی دولت کا سہارا نہیں چاہیے۔ محض آپ کی ضد کی وجہ سے میرا بچہ باپ کی شفقت بھری دولت سے محروم ہوگیا اور اب کون سی دولت اس معصوم کے لیے اہمیت رکھے گی۔'' یہ کہتے ہوئے طوبیٰ کے فرطِ غم سے آنسو نکل پڑے مگر وجود میں بھری غصے کی تپش روئیں روئیں سے پھوٹ رہی تھی۔ سیٹھ نثار نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر طوبیٰ بول پڑی۔

''پلیز سیٹھ صاحب!...... آپ لوگ جتنی جلدی ہوسکے یہاں سے چلے جائیں، کہیں مجھ سے کوئی بدتمیزی نہ ہو جائے۔''

طوبیٰ نے کھلونوں اور کپڑوں والے شاپر بھی انہیں واپس کردیے...... سیٹھ نثار کے چہرے پر بڑے کرب اور دکھ کے تاثرات تھے۔ وہ شرمسار اور نادم نادم سے لوٹ گئے۔

ان کے جانے کے بعد طوبیٰ بھی بے اختیار رو پڑی تھی۔ اس نے افتخار کی وصیت پوری کردی تھی۔ جس نفسیاتی و ذہنی بیماری کا شکار افتخار رہا تھا، اس بیماری کا اب سیٹھ نثار بھی شکار ہونے والے تھے۔

حکمِ ربّی

ملک صفدر حیات

زن، زر، زمین کا جھگڑا صدیوں پرانا... جانتے سب ہیں، مانتا کوئی نہیں... زمین کے بٹوارے، زر کا لالچ اور زن کا عشق اسی طرح... سر چڑھ کر بولتا رہتا ہے اور کوئی نہ کوئی داستان رقم ہوتی رہتی ہے۔ یہاں بھی محبت نے محبت کو پانے کے لیے کھلواڑ کیا اور یہ بھلا دیا کہ محبت خلوص کی محتاج ہوتی ہے، بدی کی سمت کبھی نہیں دھکیلتی... اس نے بھی سیدھی سچی محبت میں فریب اور مکاری جیسا زہر ملا دیا پھر کیسے حسبِ منشا نتائج نکل سکتے تھے... وہ جو تنہائیوں میں بہت رویا، بہت تڑپا مگر محبوب کی سنگدلی پر فرق نہ آیا... بالآخر اس نے پھر کچھ ایسا ہی فیصلہ کیا جس کا انجام تباہی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

حکم ربی پر آنکھ بند کر کے یقین اور دل سے محنت کرنے والے ایک پولیس آفیسر کی ہمت کی کہانی

اس عورت نے بڑی عجیب بات کی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو میں اس کا منہ دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ مجھ سے ملنے تھانے آئی تھی اور میرے کمرے میں پہنچ کر اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

''تھانے دار صاحب! آپ تھانے میں بیٹھے بیٹھے ہی تھانے داری کرتے ہیں یا کچھ خبر بھی ہے، ادھر قصبے میں کیا ہو رہا ہے؟''

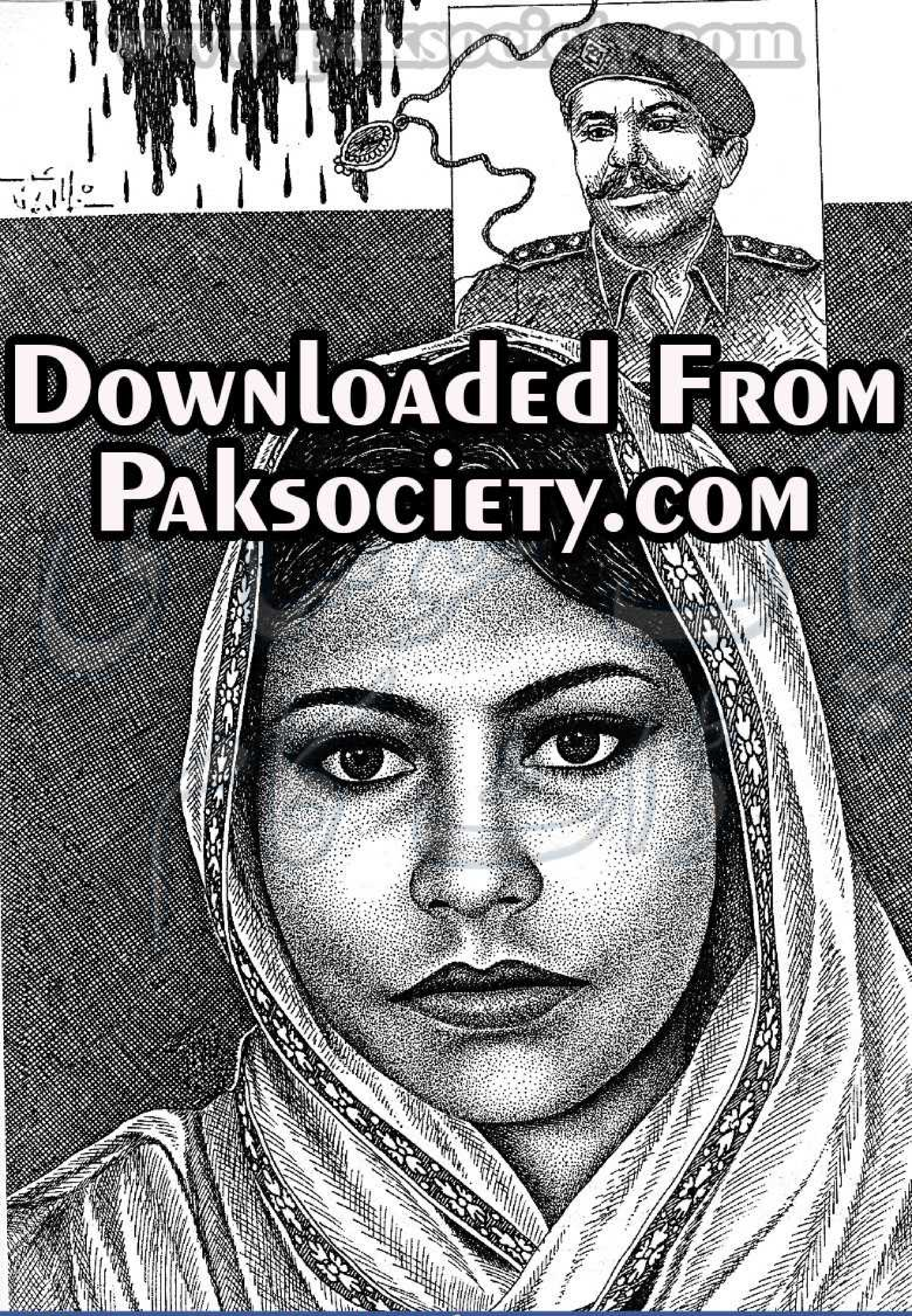
ان دنوں میں ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک گنجان آباد قصبے کے تھانے میں تعینات تھا۔ قصبہ ''جلال پور'' کی آبادی کم و بیش دو ہزار رہی ہوگی۔ اس زمانے میں کسی قصبے کی اتنی آبادی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ بس، یوں سمجھیں کہ جلال پور ایک چھوٹا شہر ہی تھا جہاں تین، ساڑھے تین سو کے قریب گھر آباد تھے اور ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز بھی مل جاتی تھی۔

''بی بی! تم کون ہو، کہاں سے آئی ہو اور تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے اپنے سامنے کھڑی سراپا سوال اس عورت سے پوچھا۔ ''بیٹھ کر آرام سے بات کرو۔'' میں نے اپنی میز کے سامنے بچھی کرسیوں کی جانب اشارہ کیا اور کہا۔ ''مجھے بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟''

وہ بے جھجک ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ اس کے انداز واطوار اور گفتگو سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک نڈر، بے باک اور بہادر عورت ہے۔ وجود سے مضبوط اور چہرے سے خاصی پُراعتماد بھی نظر آتی تھی۔ میں اس کے چہرے پر نگاہ جما کر اپنے سوال کا جواب موصول ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

''میرا نام خورشید بیگم ہے۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''میں ادھر جلال پور ہی کی رہنے والی ہوں اور میرے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے؟'' میں نے شک زدہ نظر سے اسے گھورا۔ ''پھر تم میرے پاس کیا لینے



آئی ہو؟"

"جس کے ساتھ کوئی مسئلہ نہ ہو کیا وہ آپ کے پاس نہیں آسکتا تھانے دار صاحب؟" اس نے بڑی سادگی سے استفسار کیا۔

"یہ بات نہیں ہے خورشید بی بی!" میں نے جلدی سے وضاحت کردی۔ "دراصل...... تھانہ اور کچہری دو ایسی جگہیں ہیں جہاں بلاوجہ کوئی بھی قدم نہیں رکھتا۔"

"ہاں، یہ بات تو ٹھیک ہے تھانے دار صاحب!" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں بھی آپ کے پاس بلاوجہ نہیں آئی لیکن......" لمحاتی توقف کرکے اس نے گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"لیکن میرے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں نرگس کے مسئلے کے لیے یہاں آئی ہوں......"

"اور یہ نرگس کون ہے؟"

"نرگس میری پڑوسن ہے تھانے دار صاحب۔" اس نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ "اور اس کی جان کو خطرہ ہے۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"کیسا خطرہ؟"

"مجھے ڈر ہے کہ نرگس کا گھر والا اسے کوئی نقصان پہنچانے والا ہے۔" اس نے سنسنی خیز انداز میں بتایا۔

"اوہ......" میں ہونٹ بھینچ کر گہری نظر سے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی خورشید بیگم کو تکنے لگا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا کہ نرگس کا شوہر اس کا دشمن ہے اور اسے کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے؟"

"میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے جی۔" وہ پراسرار انداز میں بولی۔ "جاوید اسے دھمکی دے رہا تھا۔"

"جاوید......" میں نے تصدیق طلب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ نرگس کا گھر والا؟"

"جی، میں اسی کی بات کررہی ہوں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"ذرا وضاحت کرو۔" میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ "تم نے کب جاوید کو کس قسم کی خطرناک باتیں کرتے سنا ہے۔ میرا مطلب ہے، وہ کب اپنی بیوی کو دھمکی دے رہا تھا؟"

"وہ جی، بات دراصل یہ ہے کہ......" وہ تفصیل بتانے لگی۔ "دونوں میاں بیوی میں کھٹ پٹ تو کافی عرصے سے چل رہی ہے۔ یوں سمجھیں کہ جب سے شادی ہوئی ہے، ایک دن بھی ان میں اتفاق اور پیار دیکھنے کو نہیں ملا۔ ایک کا منہ اور مزاج مشرق ہے تو دوسرے کا مغرب۔ ہر روز ایک نیا جھگڑا کھڑا ہوجاتا ہے اور......"

"ان کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"چھ سال تقریباً۔" خورشید بیگم نے جواب دیا۔

میں نے ایک اہم سوال کیا۔ "ان کے بچے کتنے ہیں؟"

"کوئی نہیں تھانے دار صاحب۔" وہ مایوسی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"جب ان کے بچے ہوجائیں گے تو پھر لڑائی جھگڑے بھی ختم ہوجائیں گے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "ایسا اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ شادی کے دو تین سال بعد تک اگر میاں بیوی صاحبِ اولاد نہ ہوپائیں تو ان میں "تو تکار" اور لڑائی جھگڑے شروع ہوجاتے ہیں۔ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"میں آپ کی بات سے اختلاف نہیں کروں گی تھانے دار صاحب......" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ایک زمانے میں میرے اور طالب حسین کے بیچ بھی اسی قسم کی سرد جنگ جاری رہتی تھی پھر رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہوگیا لیکن......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن یہاں معاملہ کچھ اور ہی ہے......"

میں نے خورشید بیگم کے "معاملہ کچھ اور" کو ایک طرف رکھتے ہوئے پہلے یہ پوچھ لیا۔ "یہ طالب حسین کون ہے؟"

"طالب حسین میرا گھر والا ہے جناب۔" اس نے بتایا۔

"اچھا اچھا!" میں نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "شادی کے بعد اولاد نہ ہونے کی وجہ سے تم میاں بیوی میں نوک جھوک ہوتی رہتی تھی، پھر رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہوگیا...... اب آپ لوگوں کے کتنے بچے ہیں؟"

میرے اندازے کے مطابق، خورشید بیگم کی عمر چالیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ اگر اس کی شادی کو پندرہ سال بھی ہوئے تھے تو اس وقت اس کے پانچ چھ بچے تو ہونا ہی چاہیے تھے لیکن اس کے جواب نے میرے اندازے کی ایسی تیسی کردی۔

"ابھی تک ایک بھی بچہ نہیں ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "اور اب آگے اور کیا ہوسکتا ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی تیزی سے بڑھاپے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔"

"مایوسی گناہ ہے خورشید بی بی!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ قادرِ مطلق ہے۔ رحیم وکریم ہے۔ وہ بڑھاپے کی کئی منزلیں طے کرنے والے

حضرت زکریاؑ کو ان کی بانجھ بیوی میں سے حضرت یحییٰ جیسی اولاد دے سکتا ہے تو وہ ذاتِ پاک تم پر بھی مہربان ہو سکتا ہے۔''

''میں بلکہ ہم دونوں اللہ کی رحمت اور کرم سے مایوس نہیں ہیں تھانے دار صاحب!'' وہ چٹانی لہجے میں بولی۔ ''بلکہ بات یہ ہے کہ ہم نے اولاد کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ خوش اور مطمئن رہنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو کچھ عطا کر رکھا ہے اس کے لیے ہم اس کے شکرگزار ہیں اور جو کچھ ہمیں میسر نہیں، اس پر ہم نے صبر کر لیا ہے۔''

''اس سے اچھی تو اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''جو شخص اللہ کی رضا پر صابر و شاکر ہے، وہ زندہ ولی ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ''تمہارا گھر والا کیوں نہیں آیا؟ اصولی طور پر تو یہ شکایت لے کر طالب حسین کو تھانے آنا چاہیے تھا یا کم از کم اسے تمہارے ساتھ آنا چاہیے تھا؟''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ اداس لہجے میں بولی۔ ''لیکن طالب حسین کے ساتھ ایک ایسی مجبوری ہے کہ وہ آپ کے پاس نہیں آسکتا تھا۔''

''کیسی مجبوری خورشید بی بی؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

''طالب حسین معذور ہے۔'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''اس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں پر سے کٹی ہوئی ہیں۔''

''اوہ......!'' میں ایک بوجھل نظر اس پر ڈالتے ہوئے ہمدردی بھرے انداز میں مستفسر ہوا۔ ''کوئی حادثہ وغیرہ پیش آ گیا تھا؟''

''بہت ہی سنگین اور عبرت ناک حادثہ۔'' وہ دکھی لہجے میں بولی۔ ''یہ تحریکِ آزادی کی ایک ''یادگار'' ہے تھانے دار صاحب......''

میں یک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔ میرے پوچھنے پر خورشید بی بی نے دھیمے لہجے میں مجھے بتایا کہ قیامِ پاکستان کے وقت طالب حسین بھی تحریکِ آزادی کا ایک سرگرم رکن رہا تھا اور ہندوؤں سے ایک معرکے کے دوران میں اس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئی تھیں۔ اس ضمن میں خورشید بی بی نے مجھے ایک دردناک کہانی سنا ڈالی تھی۔ یہ کہانی چونکہ زیرِ نظر داستان کا حصہ نہیں اس لیے میں طالب حسین کو پیش آنے والے افسوس ناک قصے کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ تاہم اس کی بپتا کے اختتام پر میں نے یہ ضرور پوچھا تھا۔

''تم دونوں کی گزراوقات کیسے ہوتی ہے خورشید بی بی؟''

''آٹھ دس ایکڑ زرعی اراضی ہے تھانے دار صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''میں اور طالب حسین تو کھیتی باڑی کے قابل نہیں ہیں اس لیے ہم نے یہ زمین ایک مزارع کو ٹھیکے پر دے رکھی ہے۔ سال میں یہ زمین اتنا اناج پیدا کر دیتی ہے کہ ہماری گزر بسر بہت اچھے اور باعزت انداز میں ہو جاتی ہے...... اللہ کا بڑا کرم ہے۔ اس نے کسی کا محتاج نہیں رکھا۔''

''بے شک! آپ دونوں اللہ کی اس نوازش پر اس کا جتنا بھی شکر ادا کریں، کم ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔ ''خورشید بی بی! تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا تھا کہ نرگس اور جاوید کے درمیان ہونے والے جھگڑے کی بنیادی وجہ اولاد کا نہ ہونا نہیں ہے بلکہ وہاں معاملہ کچھ اور ہے...... تو یہ معاملہ کیا ہے؟''

''اس گھر میں فساد کی دو جڑیں ہیں تھانے دار صاحب۔'' اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے بتایا۔ ''ایک جاوید کی ماں یعنی نرگس کی ساس رحمت بی بی اور دوسری جاوید کی بڑی بہن خالدہ...... ان دونوں عورتوں نے نرگس کی زندگی کو پچھلے چھ سال سے جہنم کا نمونہ بنا رکھا ہے۔''

''اور جاوید اس معاملے میں کیا کہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اس کا کردار کیا ہے؟''

''اگر وہ کسی قابل ہوتا تو پھر مسئلہ ہی کیا تھا۔'' وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ''وہ کمبخت اپنی ماں اور بہن کا غلام ہے۔ انہی کے اشاروں پر ناچتا ہے۔''

''آپ لوگ ان کے پڑوسی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کا فرض بنتا ہے کہ ان لوگوں کو فرداً فرداً سمجھائیں۔ میرا خیال ہے، یہ معاملہ اتنا پیچیدہ نہیں کہ پولیس کی مدد کی ضرورت پیش آئے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' وہ مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے بولی۔ ''ہم نے ابتدا میں اپنا فرض نبھاتے ہوئے یہ کوشش کر کے دیکھ لی ہے تھانے دار صاحب۔ جاوید اور اس کی ماں وبہن کو قطعاً یہ پسند نہیں کہ ہم ان کے گھریلو معاملات میں بڑھ چڑھ کر مداخلت کریں۔ مجبوراً ہم نے خاموشی اختیار کر لی اور شاید ہماری یہ خاموشی برقرار ہی رہتی کہ پچھلی رات میں نے اتفاق سے جاوید کی باتیں سن لیں۔ وہ بڑے

خطرناک انداز میں نرگس کو دھمکا رہا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی باتیں سن کر مجھے ڈر محسوس ہوا تھا۔ میں نے طالب حسین سے ذکر کیا تو وہ بھی پریشان ہو گیا اور پھر مجھے مشورہ دیا کہ ہمیں ان حالات کی پولیس کو خبر کر دینا چاہیے۔ کل کلاں کچھ ہو گیا تو اچھا نہیں ہوگا اور اب میں آپ کے سامنے بیٹھی ہوں......''

''مثلاً......وہ کس قسم کی خطرناک باتیں کر رہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''بس، وہ نرگس کو ڈرا دھمکا رہا تھا کہ یہ اچھا نہیں ہوگا، وہ اچھا نہیں ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''خورشید بی بی! تم جس نوعیت کی شکایت لے کر میرے پاس آئی ہو وہ اپنی جگہ درست سہی لیکن یہ بتاؤ کہ ان میاں بیوی کے معاملے میں بھلا میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''آپ اس علاقے کے تھانے دار ہیں۔'' وہ کراری آواز میں بولی۔ ''آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ آپ کے لیے بھلا کیا مشکل ہے......''

''مشکل تو کچھ نہیں ہے لیکن پولیس کو بھی کارروائی کرنے کے لیے کسی اصول اور ضابطے کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے مطابق اس گھر میں نرگس کے ساتھ بہت ظلم اور زیادتی ہو رہی ہے۔ ٹھیک ہے، میں نے تمہاری بات کا یقین کر لیا لیکن مجھے کسی کارروائی کے لیے نرگس کی تائید کی ضرورت ہوگی۔ جب تک خود نرگس یا اس کے میکے کا کوئی قریبی رشتے دار مجھ سے شکایت نہ کرے، میں بھلا جاوید یا اس کی ماں اور بہن پر کسی قسم کا دباؤ کیسے ڈال سکتا ہوں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

''جی......میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔'' وہ پُرسوچ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''کیا تم ایسا کر سکتی ہو کہ......'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ''کسی وقت نرگس کو لے کر میرے پاس آجاؤ۔ میں اس کی زبانی اس کی کہانی سن کر کوئی فیصلہ کرتا ہوں کہ اس کے لیے کیا، کیا جا سکتا ہے۔''

''یہ ممکن نہیں ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ان لوگوں نے بڑی کڑی نظر رکھی ہوئی ہے نرگس پر۔ اسے کہیں آنے جانے بھی نہیں دیتے۔ میں تو پڑوسن ہوں اس لیے اس کے دکھ کی خبر ہے مجھے۔ جاوید اس پر بہت ظلم کرتا ہے۔ کئی کئی ماہ تک اسے میکے بھی نہیں جانے دیتا۔ وہ کسی بے بس قیدی کی طرح زندگی گزار رہی ہے۔''

''کیا اس کے میکے میں اس کے درد سے کوئی واقف نہیں ہے؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''میرا خیال ہے، نرگس کے ماں باپ کو بڑی حد تک ان کے حالات کا علم ہے۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''لیکن آپ تو جانتے ہیں، بیٹی کے ماں باپ کتنے مجبور ہوتے ہیں۔''

''ہاں، شادی شدہ بیٹیوں کے والدین بسا اوقات بہت کمزور اور بے بس ہو جاتے ہیں۔'' میں نے خورشید بی بی کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''نرگس کا کوئی اور بھائی بہن؟''

''ایک چھوٹا بھائی ہے، بارہ تیرہ سال کا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس بچے کو اپنی بہن کے مسائل کا پوری طرح احساس بھی نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے خورشید بی بی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم اطمینان سے گھر جاؤ۔ میں کوئی حل نکالتا ہوں اس مسئلے کا۔ اللہ بہتر کرے گا۔''

وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

خورشید بی بی جو مسئلہ لے کر میرے پاس آئی تھی، اس کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں مظلوم نرگس کے لیے ایک تھانے دار کی حیثیت سے کیا کر سکتا ہوں۔ خورشید بی بی کا جذبۂ ہمدردی اور حقِ ہمسائیگی اپنی جگہ لیکن عین ممکن تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی انداز میں نرگس کے لیے سوچ رہی ہو۔ ایسا ہو سکتا تھا۔ ''میاں بیوی'' کے گھریلو جھگڑے ایک ازلی ابدی حقیقت ہے اور کوئی بھی ذی شعور شخص اس حقیقت کی وقوع پذیری سے انکار نہیں کر سکتا۔

میں رات سونے سے پہلے بھی دیر تک اس مسئلے پر غور و فکر کرتا رہا۔ خورشید بی بی کو تو میں نے تسلی تشفی دے کر تھانے سے رخصت کر دیا تھا لیکن اس سلسلے میں کوئی عملی کارروائی کرنے کے لیے میرے ذہن میں باقاعدہ کسی قسم کا لائحہ عمل ہرگز نہیں تھا۔

اگلی صبح میں نے ایک پھرتیلے قسم کے کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ نہایت ہی خفیہ انداز میں نرگس کے شوہر جاوید کے بارے میں معلومات حاصل کر کے مجھ تک پہنچائے۔ میں جب تک اس کے حوالے سے بنیادی باتوں سے واقف نہ ہو جاتا، کوئی عملی قدم اٹھانے یا اسے تھانے میں بلا کر پوچھ

تاچھ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا مگر میرا ہمیشہ سے یہ اصول رہا تھا کہ میں خوامخواہ کی ''تفتیش'' کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ جب تک کسی شخص کے مجرم ہونے کا مجھے شک نہ ہو جائے، میں اسے ایک تھپڑ مارنا بھی حماقت اور بے وقوفی ہی سمجھتا ہوں.....اور جاوید کا معاملہ تو فی الحال کچھ تھا بھی نہیں۔

دوروز کے بعد اس کانسٹیبل نے مجھے رپورٹ دی جسے میں نے جاوید کی ٹوہ لینے پر مامور کیا تھا۔ ناصر علی نامی اس کانسٹیبل نے آکر مجھے بتایا کہ جاوید ایک موٹا تازہ اور بے ہنگم سا شخص تھا۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال رہی ہوگی۔ وہ ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ''ریل بازار'' میں کپڑے کی ایک دکان چلاتا تھا اور سارا دن اس دکان پر بیٹھ کر مختلف قسم کا کپڑا فروخت کرتا تھا۔ خورشید کا گھر بھی ''ریل بازار'' کے پچھواڑے تھا۔ میرا تھانہ اس سڑک کے کنارے پر واقع تھا جو لائل پور اور لاہور کو آپس میں ملاتی تھی اور اسی روڈ کی دوسری جانب قصبہ جلال پور آباد تھا۔ مذکورہ سڑک سے تھوڑے فاصلے پر ریلوے لائن گزرتی تھی۔ ریلوے اسٹیشن کے عین سامنے سڑک سے جو بازار قصبے کی اندرونی سمت جاتا تھا، وہ ''ریل بازار'' کہلاتا تھا۔ مجھے جلال پور کے اس تھانے میں تعینات ہوئے ابھی صرف دو ماہ ہوئے تھے۔ میں جولائی کے اختتام پر یہاں آیا تھا اور اب ماہ اکتوبر چل رہا تھا۔

کانسٹیبل ناصر علی سے حاصل ہونے والی معلومات ایسی نہیں تھیں کہ میں کوئی سخت قسم کا ایکشن لیتا۔ البتہ یہ ضرور پتا چلا تھا کہ جاوید غصے کا بہت تیز تھا اور دکان پر آنے والے اکثر گاہکوں سے اس کا جھگڑا بھی ہو جاتا تھا۔ کئی مرتبہ پڑوسی دکان داروں سے بھی اس کی لڑائی ہو چکی تھی۔ تلخ کلامی تو ایک معمول کی بات تھی۔

یہی حال گھر کے اندر کا بھی تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ گھر کے اندر جاوید کے چیخنے چلانے کی آوازیں اکثر ابھرتی رہتی ہیں اور بیوی کے ساتھ بھی اس کا جھگڑا چلتا رہتا ہے۔ بہر حال، قصہ مختصر یہ کہ جاوید پر ہاتھ ڈالنے کے لیے مجھے کوئی بھی معقول بہانہ نہیں مل سکا اور میں اس قصے کو بھول بھال گیا۔

اس قصے کو بھولنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ پہلے دن کے بعد پھر کبھی خورشید بی بی نے یا نرگس کے اور کسی حمایتی نے تھانے کا رخ نہیں کیا تھا۔

جیسا کہ میں نے ابھی بتایا، اس تھانے میں میری تعیناتی کو ابھی صرف دو ماہ ہوئے تھے۔ کسی بھی تھانے میں تقرری کے ابتدائی دنوں میں کام زیادہ ہوتا ہے۔ جانے والا تھانے دار کون سے معاملے کو کس حال میں اور کیسے چھوڑ کر جاتا ہے اور آئندہ اس معاملے کو کس انداز میں ٹیکل کرنا ہے، یہ سب سوچنا اور اس کے لیے لائحہ عمل بنانا ایک وقت طلب کام ہے۔ میں اس کام میں ایسا مصروف ہوا کہ مجھے اپنے کھانے پینے اور سونے جاگنے کا کچھ ہوش نہیں رہا، ان حالات میں، میں جاوید اور نرگس کو کہاں یاد رکھتا......

چند دن بعد کی بات ہے۔ میں ایک روز حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو پتا چلا کہ کھیتوں میں کسی مرد کی لاش پڑی ہے، یہ ایک چونکا دینے والی خبر تھی۔ میں نے اطلاع لانے والے کانسٹیبل سے پوچھا۔

''طفیل! وہ لاش کس کی ہے اور کہاں سے ملی ہے؟''

''جناب! دو بندے ابھی یہ خبر لے کر تھانے آئے ہیں۔'' طفیل مجھے تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ ''ان کا کہنا یہ ہے کہ مقتول کا تعلق جلال پور سے ہے۔ وہ مرنے والے کا نام جاوید بتاتے ہیں۔''

''جاوید'' کا نام سن کر میں چونکا اور مجھے یاد آگیا کہ خورشید بی بی نے بھی مجھ سے کسی خرد ماغ جاوید کا ذکر کیا تھا جو اپنی بیوی نرگس کے ساتھ بہت ظلم وزیادتی کیا کرتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ وہی جاوید تو نہیں۔

''طفیل......'' میں نے کانسٹیبل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری باتوں سے تو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اطلاع لانے والے خود جلال پور کے وسنیک نہیں ہیں ورنہ وہ یہ نہ کہتے کہ مقتول کا تعلق جلال پور سے ہے......''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے ملک صاحب!'' کانسٹیبل طفیل اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ دونوں موضع چک بتی (بتیس) سے آئے ہیں اور جاوید نامی اس شخص کی لاش بھی انہی کے چک کے نزدیک کھیتوں میں پائی گئی ہے۔''

''اوہ......!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''چک'' سے مراد آپ ''گاؤں'' سمجھ لیں۔ چک بتی یعنی نمبر بتیس میرے تھانے کے جنوب میں لگ بھگ چار میل کے فاصلے پر پایا جاتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں زیادہ سے زیادہ ایک سو گھر آباد ہوں گے۔

میں نے اطلاع لانے والے دونوں افراد کو اپنے کمرے میں بلالیا۔ وہ شکل صورت سے عام سے دیہاتی نظر آتے تھے۔ میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ

لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''کیا تم لوگوں کو یقین ہے کہ جس جاوید کی لاش تمہارے گاؤں کے کھیتوں میں پڑی ملی ہے وہ جلال پور ہی کا رہنے والا ہے؟''

''پکا یقین ہے سرکار!'' ان میں سے ایک مضبوط لہجے میں بولا۔ ''ہم بھلا اس جاوید کو پہچاننے میں کیسے غلطی کر سکتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے گھور کر اس شخص کی طرف دیکھا۔ ''تم لوگ غلطی کیوں نہیں کر سکتے۔ کیا مرنے والے کے ساتھ تم لوگوں کا یارانہ تھا؟''

''یارانہ نہیں تھا مائی باپ......!'' دوسرے شخص نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن جاوید ہمارے پنڈ کا جنوائی تھا جناب۔ ہم پچھلے پانچ چھ سال سے اسے اچھی طرح جانتے ہیں، اس لیے اس کی شناخت میں کسی غلطی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''پنڈ کا جنوائی'' اور ''پانچ چھ'' سال کے الفاظ نے مجھے بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا اور خورشید بی بی کی کہی ہوئی باتیں میرے ذہن میں گھومنے لگیں۔ میں نے باری باری ان دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آپ لوگ اس جاوید کی بات کر رہے ہو جس کی شادی چھ سال پہلے نرگس سے ہوئی تھی؟''

''جی ہاں، بالکل......'' وہ بیک زبان ہو کر بولے۔ ''نرگس کا تعلق ہمارے ہی چک سے ہے۔ وہ چھ سال پہلے بیاہ کر جلال پور آئی تھی۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''کیا تم لوگ سیدھے تھانے آئے ہو یا تم نے جاوید کے گھر والوں کو اس واقعے کی اطلاع دے دی ہے؟''

''ابھی تو ہم سیدھے تھانے ہی آئے ہیں جناب!'' ان میں سے ایک نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب جو آپ کا حکم ہو؟''

''تم دونوں باہر برآمدے میں جا کر بیٹھو۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''میں تھوڑی دیر میں تم لوگوں کے ساتھ جائے وقوعہ کی طرف چلتا ہوں اور جہاں تک جاوید کے گھر والوں کو اس اندوہناک واقعے کے بارے میں بتانے کا معاملہ ہے تو اس کا میں انتظام کر دیتا ہوں۔''

وہ اٹھے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ آئندہ پندرہ بیس منٹ میں، میں نے تھانے کے معاملات کو سیدھا کیا پھر اے ایس آئی مراد خان کی معیت میں جائے واردات کی جانب روانہ ہو گیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ دونوں اطلاع کنندگان بھی میرے ہمراہ ہی تھے۔ میں نے تھانہ چھوڑنے سے پہلے جاوید کے گھر اس افسوسناک واقعے کی خبر پہنچا دی تھی۔

☆☆☆

ہمارا تانگا جب موضع چک بتیس پہنچا تو اس وقت دھوپ چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ وہ ماہ اکتوبر کا وسط چل رہا تھا۔ چاول کی فصل کا اختتام تھا۔ اکثر کھیتوں میں فصل کی کٹائی ہو چکی تھی اور بعض میں ابھی فصل کھڑی نظر آرہی تھی۔ جاوید کی لاش بھی ایک ایسے ہی کھیت میں پڑی ملی تھی جس کے اندر چاول کی فصل کٹائی کے لیے بالکل تیار کھڑی تھی۔

میں اے ایس آئی کے ساتھ موقع واردات پر پہنچ گیا۔ جیسا کہ میں نے بتایا، جلال پور سے ایک کچا راستہ چک بتی تک آتا تھا جس پر تانگے، بیل گاڑیوں، گھوڑوں اور سائیکل وغیرہ کی آمد و شد جاری رہتی تھی۔ چک بتی اور جلال پور کے درمیان لگ بھگ چار میل کا فاصلہ حائل تھا۔ مذکورہ کچے راستے کی دونوں جانب کھیتوں کا سلسلہ تا حدِ نگاہ پھیلا دکھائی دیتا تھا۔ جاوید کی لاش جس کھیت کے اندر سے ملی تھی، وہ اس کچی سڑک کے کنارے سے لگا ہوا تھا اور لاش بھی کھیت کے ابتدائی حصے ہی سے دریافت ہوئی تھی۔ بس آٹھ دس فٹ کھیت کے اندر......!

میں نے اکڑوں بیٹھ کر لاش کا جائزہ لیا۔ جاوید نے موسم کی مناسبت سے ایک سادہ سا شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ پاؤں میں چمڑے کی کھلی چپل تھی اور اس کا سر بری طرح زخمی تھا...... مجھے یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی وقت محسوس نہیں ہوئی کہ جاوید کی کھوپڑی کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ ڈنڈوں سوٹوں کی مدد سے اس کے سر پر بہت کاری وار کیے گئے تھے جن کے نتیجے میں اس کی کھوپڑی کئی جگہ سے بری طرح چٹخ گئی تھی اور یہی اس کی موت کا سبب بھی نظر آتا تھا۔ چٹخی ہوئی کھوپڑی سے خارج ہونے والا خون اس کے چہرے اور گردن پر جم چکا تھا جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اسے رات کے ابتدائی حصے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ موت کی گہری نیند سونے والے جاوید کے دونوں بازو بھی مختلف مقامات سے بری طرح گھائل تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ موت کو گلے لگانے سے پہلے اس نے اپنی جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے تھے تاہم اس کی کوئی پیش نہیں چل سکی اور کھوپڑی کے علاوہ اس کے دست و بازو بھی زخمی ہوتے چلے گئے۔ بالآخر وہ کٹے ہوئے درخت کے مانند زمین بوس ہو کر اس جہاں سے اس جہاں میں منتقل ہو گیا تھا۔

میں نے مقتول کی جامہ تلاشی لی تو اس کی جیبوں میں سے مختلف چھوٹی موٹی اشیا کے علاوہ دو سو روپے کی نقدی بھی برآمد ہوئی۔ اس زمانے میں دو سو روپے کو ایک اچھی خاصی رقم سمجھا جاتا تھا۔ ایک عام آدمی کی تنخواہ پچاس ساٹھ روپے سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ بیس سے پچیس روپے میں ایک متوسط خاندان کا مہینے بھر کا راشن آجاتا تھا۔

ایک بات تو واضح ہوگئی کہ جاوید کو لوٹنے کی غرض سے موت کے گھاٹ نہیں اتارا گیا تھا۔ اگر یہ عام راہزنی یا لوٹ مار کی واردات ہوتی تو قاتل لٹیرے ہرگز ہرگز اس کی جیب میں موجود دو سو روپے چھوڑ کر نہیں جاسکتے تھے۔ گویا، یہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کی جانے والی ایک قاتلانہ انتقامی کارروائی ہوسکتی تھی۔

میں نے اوپر لفظ ''قاتل لٹیرے'' استعمال کیے ہیں جو کہ جمع کا صیغہ ہے۔ یعنی میرے اندازے کے مطابق قاتل دو یا دو سے زیادہ افراد تھے۔ جاوید کے سر اور دست وبازو کو جس برے انداز میں زخمی کیا گیا تھا، اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس پر لاٹھیوں اور ڈنڈوں کی برسات کردی گئی تھی۔ اگر یہ کسی ایک شخص کا ''کارنامہ'' ہوتا تو جاوید نہ تو ایسا شدید گھائل ہوتا اور نہ ہی اس کی موت اتنی یقینی ہوتی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اسے گھیر کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

لاش کے معائنے کے دوران ہی میں ایک اور سنسنی خیز انکشاف بھی ہوا۔ میں جاوید کی لاش کو الٹ پلٹ کر اس کا جائزہ لے رہا تھا تو کھیت کی زمین نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ جہاں جاوید کی لاش پڑی تھی، وہاں زمین پر خون کا ایک دھبا بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ نہ خشک اور نہ ہی تر...... جبکہ مقتول کے سر سے خارج ہونے والے خون نے اس کے چہرے اور لباس کو اچھی طرح بھگو ڈالا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کے بدن سے نکلنے والا خون زمین پر نہ گرتا؟

ہاں...... یہ ایک ہی صورت میں ممکن تھا...... جب جاوید کو کسی اور جگہ قتل کیا گیا ہوتا اور اس کی لاش کو لاکر کھیتوں میں پھینک دیا گیا ہوتا۔ یقیناً یہی بات تھی۔ ابھی تک تو میں اسی سوال کا جواب تلاش کرنے میں لگا ہوا تھا کہ جاوید کھیتوں کے اندر کیا کررہا تھا جب اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا......؟

اب سوچ کا ایک نیا دروازہ کھل گیا تھا۔ جاوید کو کسی اور جگہ پر قتل کرنے کے بعد یہاں لاکر پھینکا گیا تھا...... مگر کہاں؟ اس سوال کے جواب کے لیے میں نے ارگرد کے

علاقے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ دس منٹ کے بعد مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ میں زمین کے اس حصے پر ''گڑبڑ'' کے آثار تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا جو کچی سڑک اور کھیت کی منڈیر کے بیچ واقع تھا۔ پھر مجھے سڑک کے کنارے پر بھی افراتفری کے اچھے خاصے نشانات مل گئے۔ قدموں کے بےترتیب اور آپس میں خلط ملط نشانات اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ وہاں چند افراد میں اچھی خاصی مڈبھیڑ ہوئی تھی اور اسی ''گڈمڈ'' افراتفری کے بیچوں بیچ چند مقامات پر خون کے جمے ہوئے دھبے بھی میری نظر کی پکڑ میں آگئے۔ اب مجھے اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نظر نہیں آرہی تھی کہ جاوید کو اسی کچے راستے کے کنارے بڑی بےدردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ میں نے تھوڑی سی کوشش کی تو یہ جاننے میں بھی کامیاب ہوگیا کہ جاوید کی لاش کو کچے کنارے سے گھسیٹ کر کھیتوں کے اندر پہنچایا گیا تھا۔

وہ لوگ کون تھے جنھوں نے بڑی بےرحمی سے جاوید کی زندگی کا چراغ گل کیا تھا؟ جاوید کے ساتھ ان کی کیا دشمنی تھی؟ اور یہ کہ جاوید پچھلی شام یا پچھلی رات چک بتی کے آس پاس کیا کر رہا تھا؟...... ان تمام تر سوالات کے مجھے جواب تلاش کرنا تھے کیونکہ ان جوابات کی عدم موجودگی میں قاتلوں تک رسائی ممکن نہیں تھی۔

موقع کی کارروائی کے دوران میں ہی وہاں دو درجن سے زیادہ لوگ جمع ہوچکے تھے۔ جب میں جائے وقوعہ پر پہنچا تو اس وقت بھی درجن بھر افراد یہاں موجود تھے۔ میں سوال وجواب کے لیے لوگوں کی جانب بڑھا تو اے ایس آئی مراد خان بھی میرے پاس آگیا۔ جب میں لاش کا معائنہ کر رہا تھا تو مراد خان جائے وقوعہ کے گردونواح کی ''سیر'' کو نکل گیا تھا۔ واپسی میں اس کے چہرے پر دبا دبا جوش دیکھ کر میں چونک اٹھا۔

''کوئی خاص بات مراد خان؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

جواب دینے کے بجائے اس نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب اس کا مذکورہ ہاتھ جیب سے باہر نکلا تو اس میں ایک لاکٹ کو دیکھ کر میں حیران ہوا۔ وہ اس لاکٹ کو میری جانب بڑھاتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! یہ لاکٹ مجھے جاوید کی لاش سے چند قدموں کے فاصلے پر کھیتوں کے باہر پڑا ملا ہے۔''

''کھیتوں کے باہر......!'' میں نے الجھن زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو مراد خان؟''

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں ملک صاحب۔'' وہ کچے راستے کے کنارے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ وہاں مٹی میں پڑا تھا۔''

لاکٹ کی حالت بھی یہی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ مٹی دھول میں پڑا رہا ہوگا۔ مراد خان نے اس لاکٹ کی دریافت کا جو مقام بتایا تھا، وہ اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں میں نے جاوید اور اس کے قاتلوں کی دھینگا مشتی کے آثار پائے تھے۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ مذکورہ لاکٹ مقتول جاوید یا اس کے قاتلوں میں سے کسی کا تھا جو اس ''معرکے'' کے دوران میں بدن سے جدا ہوکر زمین پر جا گرا تھا۔

میں اس لاکٹ کو اپنے ہاتھوں میں گھما کر اس کا تفصیلی جائزہ لینے لگا۔ وہ چاندی کا لاکٹ تھا جس میں ایک فیروزہ جڑا ہوا تھا۔ اس فیروزے کا سائز لگ بھگ پون انچ رہا ہوگا اور شکل بیضوی۔ وہ سبزی مائل نیلا فیروزہ تھا اور میرے محتاط اندازے کے مطابق اس کا وزن دس سے پندرہ قیراط کے درمیان رہا ہوگا اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ فیروزہ درمیان سے چٹخا ہوا تھا۔

''فیروزہ'' کے حوالے سے ایک روایت بہت مشہور ہے کہ یہ پتھر دیگر فوائد کے ساتھ ہی انسان کی جان کا بھی محافظ ہے اگر کسی شخص نے فیروزہ پہن رکھا ہو اور اس پر کوئی مصیبت یا سخت مشکل آنے والی ہو تو فیروزہ چٹخ جاتا ہے کیونکہ یہ انسان کی حفاظت کرتے ہوئے خود چٹخ جاتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چٹخا ہوا فیروزہ استعمال میں نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ایک اور روایت فیروزہ کے بارے میں یہ بھی ہے کہ اس کا اچانک گم ہوجانا اچھا شگون نہیں۔ اس کی گمشدگی کے بعد کوئی نہ کوئی پریشانی ضرور آتی ہے اور یہ بھی کہ ''فیروزہ'' کو کسی پتھروں کے ماہر کے مشورے کے بغیر نہیں پہننا چاہیے۔

مذکورہ فیروزے والے لاکٹ میں زنجیر کی جگہ کالی ڈوری استعمال کی گئی تھی اور وہ ڈوری بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ مطلب یہ کہ گرہ کے قریب سے وہ ڈوری کٹ گئی تھی جبھی وہ لاکٹ پہننے والے شخص کی گردن سے نکل کر زمین پر جا گرا تھا۔ ڈوری کے ایک سرے پر گرہ اور دوسرا سرا خالی تھا جہاں پر ڈوری ٹوٹ جانے کے باعث دھاگے نکلے ہوئے تھے۔

میں نے وہ فیروزے والا لاکٹ موقع پر موجود تمام افراد کو باری باری دکھایا اور پوچھا۔ ''تم میں سے کوئی اس

لاکٹ کے بارے میں کچھ جانتا ہے؟"

حیرت انگیز طور پر اس "شناختی پریڈ" کے نتائج صفر کے برابر برآمد ہوئے۔ وہاں موجود پچیس تیس افراد میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا کہ جو اس لاکٹ کو پہچان پاتا۔ بالآخر تھک ہار کر میں نے وہ لاکٹ اپنی جیب میں رکھ لیا البتہ اس پوچھ تاچھ کا ایک فائدہ ضرور ہوا اور وہ یہ کہ میں یہ جاننے میں کامیاب ہوگیا کہ مذکورہ فیروزہ والا لاکٹ مقتول جاوید کا ہرگز نہیں تھا اور یہ معلومات مجھے جاوید کے سسر خیر دین سے حاصل ہوئی تھیں جو اس وقت جائے وقوعہ پر موجود تھا۔

اس دوران میں جب میں موقع کی کارروائی میں مصروف تھا، جلال پور سے جاوید کی ماں رحمت بی بی بھی دو افراد کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ وہ جاوید کی لاش کو دیکھ کر باقاعدہ بین کرنے لگی۔

"انہی ظالموں نے میرا بچہ کھایا ہے......" وہ خیر دین کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔ "میں نے تو جیدے سے کہا تھا کہ وہ منحوس میکے گئی ہے تو اس کمبخت کو ادھر ہی رہنے دے لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی اور کل چل پڑا اپنی بیوی کو لینے۔ میں نے کہا تھا کہ رات سے پہلے واپس آجانا...... وہ ادھر ہی رک گیا اور...... گیا جان سے......" وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر فریادی لہجے میں مجھ سے کہا۔

"تھانے دار صاحب! آپ خیر دین کو گرفتار کرلیں۔ جب آپ اس کی چھترول کریں گے تو یہ خود بتائے گا کہ جاوید کی جان کس نے لی ہے؟"

رحمت بی بی کی اس داد فریاد سے بہت سی باتیں سامنے آئیں کہ نمبر ایک، وہ ایک بدتمیز اور عاقبت نااندیش عورت تھی۔ نمبر دو، وہ اپنے سمدھی خیر دین سے نفرت کرتی تھی یا کم از کم اسے سخت ناپسند کرتی تھی۔ نمبر تین، ان دنوں نرگس اپنے میکے یعنی چک بتی آئی ہوئی تھی۔ نمبر چار، مقتول جاوید کل کسی وقت جلال پور سے اپنی بیوی کو لینے چک بتی آیا تھا۔ نمبر پانچ، رحمت بی بی کو پورا شک تھا کہ اس کے بیٹے جاوید کے قتل میں نرگس کے میکے والوں کا ہاتھ ہے...... ان تمام تر نکات کو سمجھنے کے لیے مجھے بڑی پلاننگ سے کام لینا تھا۔

میں نے پہلی فرصت میں رحمت بی بی کے واویلے کو بریک لگوائے۔ تسلی آمیز انداز میں اسے یقین دلایا۔ "رحمت بی بی! جب میں یہاں موجود ہوں تو پھر تمہیں تھانے دار بننے کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جاوید کے قاتلوں کو بہت جلد بے نقاب کردوں گا اور انہیں عدالت سے عبرت ناک سزا بھی دلواؤں گا۔"

"تھانے دار جی! میں بتا رہی ہوں نا، میرے جیدے کے قاتل یہی لوگ ہیں۔" وہ خیر دین کی طرف دیکھتے ہوئے اصراری لہجے میں بولی۔ "آپ ان پر سختی کریں گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔"

"تم فکر نہیں کرو رحمت بی بی! میں سب سے پوچھ گچھ کروں گا۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "کوئی بھی چھوٹا بڑا میری تفتیش سے بچ نہیں سکے گا۔ تم حوصلہ رکھو...... سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

وہ ایک طرف ہوکر کھڑی ہوگئی۔ میرے سمجھانے بجھانے کا اس پر اتنا اثر ضرور ہوا تھا کہ اس نے خیر دین اور اس کے خاندان کے خلاف زہر اگلنا بند کردیا تھا تاہم دبی زبان میں اس کا واویلا اور آہ و زاری اب بھی جاری تھی اور اس کام سے میں اسے نہیں روک سکتا تھا۔ اس بدنصیب کا بیٹا قتل کردیا گیا تھا۔ میں اسے پہنچنے والے صدمے سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ انسانیت کا تقاضا یہی تھا کہ اسے جی بھر کر دل کا غبار نکال لینے دیا جائے۔

میں نے ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد جاوید عرف جیدا کی لاش کو پوسٹ مارٹم کی غرض سے اے ایس آئی مراد خان کی زیر نگرانی سرکاری اسپتال بھجوا دیا اور پھر موقع پر موجود لوگوں کے بیانات قلم بند کرنے لگا۔

سب سے پہلے میں نے اس شخص کو بلا لیا جس نے سب سے پہلے جاوید کی لاش کو دیکھا تھا۔ اس بندے کا نام حنیف عرف حنیفو تھا۔ حنیفو کی حیثیت ایک کھیت مزدور ایسی تھی۔ آج صبح وہ کھیتوں کی طرف معمول کے مطابق نکلا تو اس کی جاوید کی لاش پر نظر پڑی اور اس نے شور مچا کر بہت سے لوگوں کو وہاں جمع کرلیا تھا۔

"حنیفو!" میں نے اس شخص کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ "تم کھیتوں میں کس قسم کی مزدوری کرتے ہو؟"

"سرکار! میں ہر قسم کا کام کرلیتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "فصل کی بیجائی (بوائی) سے لے کر کٹائی اور چھڑائی تک ہر کام آتا ہے مجھے۔"

"آج تم کس کام سے گھر سے نکلے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"آج کل چاول کی کٹائی کا کام چل رہا ہے جناب۔" وہ بڑی رسان سے بولا۔ "میں بھی اسی مقصد سے کھیتوں کی طرف آیا تھا۔"

جس کھیت کے اندر سے جاوید کی لاش ملی تھی، اس

کھیت کے اندر بھی چاول کی فصل کھڑی تھی۔ اسی بنیاد پر میں نے حنیفو سے سوال کیا۔

''کیا تم اسی کھیت کی فصل کاٹنے آئے تھے جس کے اندر جاوید کی لاش پڑی ملی ہے؟''

''نہیں جی......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میرا کام تو اس سے کافی آگے کے کھیتوں میں چل رہا ہے۔ بس، میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ میری نظر پڑ گئی......''

حنیفو کی بات مجھے ہضم نہ ہو سکی۔ میں نے گھور کر اسے دیکھا اور قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ''جاوید کی لاش کھیتوں کے اندر دس بارہ گز کے فاصلے پر پڑی ہوئی تھی۔ کھڑی فصل کے اندر اتنی دور تک دیکھنا ممکن نہیں پھر تم نے یہاں سے گزرتے ہوئے یہ لاش کیسے دیکھ لی۔ کیا تمہارے پاس کوئی دوربین وغیرہ بھی تھی؟''

''نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ میرے مضبوط اعتراض پر جزبز ہو کر رہ گیا۔

میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''ایسی بات نہیں تو پھر کیسی بات ہے؟''

''وہ جی، میں یہاں سے گزر رہا تھا تو مجھے رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنی حاجت پوری کرنے کھیت کے اندر گیا تو ادھر جاوید کی لاش پڑی نظر آئی۔ میں اپنی حاجت کو بھول گیا اور بھاگ کر کھیت سے باہر نکل آیا۔''

''باہر آ کر تم نے سب سے پہلا کام کیا کیا تھا؟''

''میں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔'' وہ اپنی وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میری آواز پر کھیتوں میں کام کرنے والے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔''

''جب تم ابھی...... حاجت پوری کرنے گئے تو وہاں تمہیں جاوید کی لاش پڑی دکھائی دی۔'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''کیا لاش پر نگاہ پڑتے ہی تمہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جاوید ہی ہے...... تمہارے چک کا جنوائی...... نرگس کا گھر والا......؟''

یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ میں نے جاوید کی لاش کا تفصیلی معائنہ کیا تھا۔ اس کی چٹخی ہوئی کھوپڑی میں سے نکلنے والے خون نے اس کے چہرے کو اس طرح تربتر کر دیا تھا کہ پہلی نظر میں اس کی شناخت اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھی۔ اس کے چہرے کے مختلف حصوں اور لباس پر لگنے والا خون جمنے کے بعد گہری سیاہی مائل رنگت اختیار کر چکا تھا۔

''نہیں جی......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں فوری طور پر اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ میں نے کھیتوں سے باہر نکل کر ''لاش، لاش'' چلانا شروع کر دیا تھا۔ پھر جب لوگ جمع ہوئے اور ہم نے ایک ساتھ کھیتوں کے اندر جا کر دوبارہ لاش کا غور سے جائزہ لیا تو تب یہ انکشاف ہوا کہ وہ جاوید تھا۔''

اس کی وضاحت معقولیت کے دائرے کے اندر آتی تھی۔ پھر وہاں موجود دو تین افراد نے اس کے بیان کی تصدیق بھی کر دی تھی لہٰذا میں نے مزید دو تین سوالات کے بعد حنیف عرف حنیفو کو فارغ کر دیا۔ اگر حنیفو رفع حاجت.... پوری کرنے کھیتوں کا رخ نہ کرتا تو عین ممکن تھا، جاوید کی لاش ایک، دو یا تین دن ادھر کھیتوں کے اندر ہی پڑی رہتی۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اس کی لاش بروقت دریافت ہو گئی تھی ورنہ میری معلومات کے مطابق ابھی دو تین دن تک اس کھیت کی فصل کی کٹائی کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

میں نے حنیفو کے علاوہ بھی وہاں موجود کئی افراد سے پوچھ گچھ کی مگر جاوید کو پیش آنے والے واقعے کے بارے میں کسی قسم کی کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ اب میں نے مقتول کے حقیقی متعلقین کی جانب رخ کیا۔ مقتول کی ماں رحمت بی بی اور اس کا سسر خیر دین میرے نزدیک ہی موجود تھے تاہم رحمت بی بی نے اپنے سمدھی کی جانب سے رخ پھیر رکھا تھا۔ خیر دین کی عمر پچاس کے آس پاس نظر آتی تھی۔ وہ ایک سیدھا سادہ اور شریف انسان نظر آتا تھا اور اس کی شرافت کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ اس نے رحمت بی بی کے سنگین الزامات کے جواب میں اسے اُف تک نہیں کہا تھا بلکہ جوشِ جذبات میں اور فقدانِ احساس میں رحمت بی بی نے اسے گالیاں بھی دے ڈالی تھیں مگر مجال ہے، اس کی زبان سے ردِعمل میں کوئی سخت بات نکلی ہو۔ خیر دین نے ایک ہاتھ پر خاصی موٹی اور چوڑی پٹی باندھ رکھی تھی جیسے اسے کوئی خطرناک چوٹ لگی ہو۔

یہاں کھیتوں میں کھڑے کھڑے مزید تفتیش مناسب نہیں تھی لہٰذا میں نے خیر دین سے کہا۔ ''خیر دین! کیا خیال ہے، تمہارے گھر جا کر بیٹھیں۔ باقی کی باتیں وہیں ہوں گی۔ میں تمہاری بیٹی نرگس سے بھی ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ست بسم اللہ جی۔ میرا گھر حاضر ہے۔'' وہ پُرخلوص لہجے میں بولا۔ ''آپ آئیں میرے ساتھ۔''

میں نے جاوید کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''رحمت بی بی! تم بھی چلو میرے ساتھ۔ تم سے بھی مجھے

ضروری بات چیت کرنا ہے۔''

''میں کہاں چلوں جی......؟'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے تکنے لگی۔

''کہاں کا کیا مطلب......!'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔''جب میں خیر دین کے ساتھ اس کے گھر جا رہا ہوں تو تمہیں بھی وہیں چلنا ہوگا۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھانے دار جی۔'' وہ بدکے ہوئے انداز میں بولی۔''میں اپنے بیٹے کے قاتلوں کے گھر کیسے جا سکتی ہوں......''

رحمت بی بی کے دماغ کی سوئی جس جگہ پھنس گئی تھی، وہاں سے فوری طور پر نکالنا ممکن نہیں تھا۔ وہ خیر دین اور جاوید کی سسرال والوں کو اپنا اور جاوید کا دشمن سمجھ رہی تھی۔ میں چند منٹ میں اس کی یہ غلط فہمی دور نہیں کر سکتا تھا اور اگر بالفرض، وہ درست بھی سوچ رہی تھی تو یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں دونوں پارٹیوں کو روبرو بٹھا کر کوئی مناظرہ کراتا۔ جب تک میں خود واقعے کی حقیقت سے واقف نہ ہو جاتا، انہیں کوئی بات سمجھانا حماقت ہی ہوتی لہٰذا میں نے رحمت بی بی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''رحمت بی بی! تم جلال پور جاؤ۔ میں یہاں سے فارغ ہونے کے بعد سیدھا تمہاری طرف آؤں گا۔ پھر تم سے تفصیلی بات ہوگی۔''

یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی اور وہ فی الفور ایک تانگے میں بیٹھ کر جلال پور کے لیے روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

خیر دین کا گھر چک بتی کے وسط میں واقع تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا اور گھر کے اندر ہی خیر دین نے کریانے کی دکان کھول رکھی تھی۔ اس دکان پر پرچون کے تمام سودوں کے علاوہ سبزی بھی فروخت ہوتی تھی اور موسم کی مناسبت سے ایک آدھ پھل بھی رکھا نظر آتا تھا۔ یہ دکان گھر کی بیٹھک میں سجائی گئی تھی اور خیر دین کے علاوہ اس کی بیوی صفیہ بھی امور دکان داری میں اس کا بھرپور ساتھ دیتی تھی۔ علاوہ ازیں خیر دین کا بیٹا خاور بھی اس کام میں حسبِ ضرورت اپنے ماں باپ کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا، اس وقت خاور گھر کے اندر موجود نہیں تھا۔

خیر دین نے مجھے گھر کے ایک اندرونی کمرے میں بٹھانا چاہا مگر میں نے صحن میں بیٹھنے کو ترجیح دی لہٰذا وہیں پر دو چارپائیاں بچھا دی گئیں۔ خیر دین کے ساتھ ہی ایک چارپائی پر اس کی بیوی صفیہ بھی بیٹھ گئی۔ جاوید کے قتل کے واقعے نے انہیں دکان نہیں کھولنے دی تھی۔ مجھے پتا چلا کہ نرگس (جاوید کی بیوہ) اندر ایک کمرے میں بیٹھی ہے۔

صفیہ خالصتاً ایک گھریلو عورت تھی۔ اس کی عمر پینتالیس کے اریب قریب نظر آتی تھی۔ میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھے جاوید کی موت کا سخت افسوس ہے۔ آپ لوگوں کے خیال میں اسے کس نے موت کے گھاٹ اتارا ہوگا؟''

''ہم کیا جانیں تھانے دار صاحب۔'' خیر دین عجیب سے لہجے میں بولا۔

''آپ نہیں جانو گے تو پھر اور کون جانے گا۔'' میں نے قدرے تلخ انداز میں پوچھا۔''وہ تم لوگوں کا داماد تھا اور جلال پور سے یہاں چک بتی تمہارے گھر آیا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں، تم لوگوں ہی سے پوچھا جائے گا نا......؟''

''نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ بڑی سادگی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''یہ سچ ہے کہ جاوید ہمارا جنوائی تھا لیکن وہ گھر تو نہیں آیا ہوا تھا۔''

''کیا مطلب......؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔''وہ آپ لوگوں کے گھر نہیں آیا تھا تو پھر چک بتی میں کس کے پاس آیا تھا؟''

''خیر دین بالکل ٹھیک بتا رہا ہے تھانے دار صاحب۔'' صفیہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔''جاوید کے یہاں آنے کے بارے میں ہمیں کچھ خبر نہیں۔ ہمیں تو آج صبح ہی پتا چلا ہے کہ جاوید کو کسی نے قتل کر کے منجی کے کھیتوں میں پھینک دیا ہے۔''

''لیکن......'' میں نے خیر دین کی طرف دیکھتے ہوئے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔''وہاں منجی (چاول) کے کھیتوں میں تمہاری سمدھن رحمت بی بی نے تمہارے سامنے کہا تھا کہ جاوید کل جلال پور سے روانہ ہوا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ نرگس کو اپنے ساتھ واپس لے کر جائے گا۔''

''وہ تو پتا نہیں جی...... اور بھی کیا کیا بول رہی تھی۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔''اس عورت کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ پتا نہیں، کیا کیا بکتی رہتی ہے۔ نرگس کی زندگی بھی اسی شیطان عورت کی وجہ سے جہنم بن کر رہ گئی ہے۔''

خیر دین اسی نوعیت کی باتیں کر رہا تھا جیسی چند روز پہلے خورشید بی بی نے تھانے آ کر مجھ سے کی تھیں۔ میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

''تو آپ لوگوں کو جاوید کے یہاں آنے کے

پروگرام کی کوئی اطلاع نہیں تھی؟"
"بالکل نہیں جناب۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "ورنہ ہمیں آپ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے، تھانے دار صاحب......!"
"ہوسکتا ہے، نرگس کو اس بارے میں کچھ پتا ہو!" میں نے سوچتی ہوئی نظر سے باری باری ان میاں بیوی کی طرف دیکھا۔
"پتا نہیں جی۔" صفیہ بی بی بیزاری سے بولی۔ "مجھ سے تو اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔"
"نرگس کب سے چک بتی آئی ہوئی ہے؟" میں نے ایک اہم سوال کیا۔
"وہ دس تاریخ کو یہاں آئی تھی جناب۔" اس نے جواب دیا۔ "اور آج تیرہ تاریخ ہے۔"
"اوہ......تو ابھی اسے یہاں آئے دو، تین دن ہی ہوئے ہیں۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "پھر تو اس کی واپسی کی وجہ نظر نہیں آتی۔"
"اور یہ بھی ہم نے نرگس کو جس طرح یہاں بلایا ہے وہ ہمارا خدا ہی جانتا ہے تھانے دار صاحب۔" صفیہ دکھی لہجے میں بولی۔ "ورنہ ان منحوسوں نے تو میری بچی کو قیدی بنا کر رکھا ہوا تھا۔ اگر خیر دین کا ہاتھ نہ کٹ جاتا تو شاید وہ نرگس کو یہاں نہ بھیجتے......"
"تمہارے ہاتھ کو کیا ہوا ہے خیر دین؟" میں نے پوچھا۔
وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اس ہاتھ پر مجھے زہریلے سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ بہت ہی موذی سانپ تھا وہ۔ پورا ہاتھ یکدم سیاہ ہوگیا تھا۔ مجبوراً کلائی پر سے میرا ہاتھ کاٹنا پڑا۔ اگر فوری طور پر یہ ہاتھ نہ کاٹا جاتا تو زہر پورے بازو میں پھیل سکتا تھا اور پھر کندھے پر سے بازو کاٹنا پڑتا......"
"اوہ......" میں نے تاسفانہ انداز میں ہونٹ سکیڑے اور کہا۔ "بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔"
"افسوس تو سارے جہان کو ہوا تھا تھانے دار صاحب۔" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ "اگر نہیں افسوس ہوا تو صرف تین لوگوں کو......نمبر ایک جاوید، نمبر دو جاوید کی ماں، نمبر تین جاوید کی بہن، خیر......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔
"اب تو کافی بہتر ہے۔ حکیم جی کا کہنا ہے، چند پٹیوں کے بعد ٹھیک ہوجائے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں ایک ہاتھ سے محروم ہوگیا ہوں مگر اللہ کا شکر ہے کہ......جان تو بچ گئی۔"
"جب خیر دین پر یہ مصیبت نازل ہوئی تو ہم نے نرگس کو یہاں بلانے کی بہت تگ و دو کی تھی تھانے دار صاحب۔" صفیہ نے بتایا۔ "لیکن ان لوگوں کو ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا۔ پھر ایک خدا ترس عورت کی مہربانی اور تعاون سے دو دن پہلے ہم نرگس کو یہاں بلانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔"
"خدا ترس عورت......" میں نے چونک کر صفیہ کی طرف دیکھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"
"ادھر جلال پور میں ایک بے اولاد جوڑا رہتا ہے۔" خیر دین وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اور یہ اتفاق ہے کہ وہ لوگ جاوید کے پڑوسی بھی ہیں۔ میں نے ان لوگوں کو پیغام بھیجا کہ......"
"خیر دین! تم کہیں خورشید بیگم اور طالب حسین کی بات تو نہیں کر رہے......؟" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے پوچھ لیا۔
"جی......جی ہاں......وہی۔" وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "خورشید بی بی بہت ہی ہمدرد اور نیک عورت ہے۔ جاوید تو اپنی مصروفیت کا بہانہ کرتے ہوئے ہر روز نرگس کو ٹالتا رہتا تھا لیکن دو دن پہلے خورشید بی بی نے ہمت کی اور نرگس کو یہاں پہنچا دیا لیکن ہمیں کیا پتا تھا کہ نرگس کو یہاں بھیجنے کے بعد جاوید بھی ادھر کا رخ کرے گا اور پھر چک بتی کے نواحی کھیتوں میں بے دردی سے قتل کردیا جائے گا اور......اس کی موت کے حوالے سے ہم پر شک کیا جائے گا۔"
خورشید بی بی تھانے آکر مجھ سے ایک ملاقات کرچکی تھی۔ وہ نرگس کے گھریلو حالات کی وجہ سے بہت تکلیف میں تھی اور مجھ سے اس نے نرگس کے مسائل کے حل کے لیے درخواست کی تھی۔ خورشید بی بی نے جاوید کی طرف سے نرگس کی جان کو خطرہ بتایا تھا لیکن یہاں تو جاوید ہی اپنی زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔
"کیا خورشید بی بی نے ایسی کوئی بات کی تھی کہ دو تین روز کے بعد جاوید، نرگس کو لینے چک بتی آئے گا؟" میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
"نہیں جی......کوئی نہیں۔" صفیہ سادگی سے بولی۔ "ہم تو یہی سمجھ رہے تھے کہ اب نرگس کو کم از کم ایک مہینا یہاں رکھیں گے لیکن دو دن کے بعد ہی یہ مصیبت کھڑی ہوگئی۔ اب پتا نہیں، کیا ہوگا......نرگس کو واپس جلال پور جانا

پڑے گا۔‘‘

’’اصولی طور پر تو اس واقعے کے بعد نرگس کو فوراً جلال پور روانہ ہو جانا چاہیے۔‘‘ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’جاوید جیسا بھی تھا، نرگس کا شوہر تھا۔ اس موقع پر نرگس کو میت والے گھر میں ہونا چاہیے لیکن......!‘‘

میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لحاتی توقف کیا تو میرے دوبارہ بولنے سے پہلے ہی صفیہ نے اضطراری لہجے میں پوچھ لیا۔ ’’لیکن کیا تھانے دار صاحب......؟‘‘

’’لیکن......میرا مشاہدہ اور تجربہ یہ بتا رہا ہے کہ نرگس کو نہ تو کوئی بلائے گا اور نہ ہی اس کے وہاں نہ جانے سے کوئی اس کی کمی محسوس کرے گا۔ میری معلومات کے مطابق اس گھر میں اور...... وہاں رہنے والے افراد کے دلوں میں نرگس کے لیے کوئی جگہ ہے اور نہ ہی گنجائش......‘‘

’’آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب!‘‘ خیر دین تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’اس کا مطلب ہے آپ نرگس کے سسرالی حالات کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔‘‘

’’اچھی طرح تو نہیں مگر کافی حد تک ضرور جانتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’جاوید بہت زیادہ برا انسان نہیں تھا تھانے دار صاحب!‘‘ صفیہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ’’بس وہ کانوں کا کچا تھا اور پوری طرح اپنی ماں اور بڑی بہن کی پٹیوں پر چلتا تھا اور...... وہ دونوں ایک سے بڑھ کر ایک کمینی ہیں......جاوید کی بہن خالدہ طلاق یافتہ ہے......زبان کی تیز اور کڑوی......دو سال پہلے ہی اس کے گھر والے نے طلاق دے کر اسے فارغ کیا ہے۔‘‘

پھر ان دونوں میاں بیوی نے مجھے بتایا کہ خالدہ بہت ہی بد زبان اور شر پسند عورت ہے۔ جب تک وہ اپنے شوہر وہاب علی کے گھر میں رہی، ہر دن کوئی نہ کوئی جھگڑا اٹھا ہوتا رہتا تھا پھر انہی تنازعات سے تنگ آ کر وہاب علی نے اسے طلاق دے دی تھی اور اب وہ پچھلے دو سال سے اپنے میکے میں بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کی شر پسندی میں سرِ مو فرق نہیں آیا تھا اور ماں بیٹی دونوں نے مل کر نرگس کی زندگی کو نمونہ جہنم بنا دیا تھا۔ صفیہ نے اپنی بات کے اختتام پر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

’’جاوید کی موت کا افسوس اپنی جگہ ہے لیکن اللہ کے کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔ جاوید کے قتل کے بعد نرگس آزاد ہو گئی ہے۔ ورنہ ان لوگوں نے نرگس کو اتنا تنگ کر رکھا تھا کہ ہم مجبوراً اس رشتے کے خاتمے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔‘‘

’’وہ عزت اور ذلت کا مالک ہے۔‘‘ خیر دین آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’اگر نرگس کو ہم جاوید سے چھٹکارا دلواتے تو اس پر ایک دھبا لگ جاتا۔ قدرت نے اپنے انداز میں میری بچی کو اس رشتے سے آزادی دلا کر ہم سب پر احسان کیا ہے۔‘‘

وہ دونوں میاں بیوی بہت ہی صابر وشاکر اور متوازن سوچ کے مالک تھے۔ تاہم اس معاملے میں نرگس سے تفصیلی بات کرنا بھی ضروری تھا۔ ’’نرگس سے میں تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ میں نے باری باری ان میاں بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’آپ نرگس کو یہاں بلا لیں یا پھر مجھے اس کے پاس لے چلیں......‘‘

’’جی ضرور......‘‘ خیر دین نے اثبات میں گردن ہلائی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ’’آپ آئیں میرے ساتھ......‘‘

تھوڑی ہی دیر کے بعد میں، اندر کمرے میں نرگس کے روبرو بیٹھا ہوا تھا اور ہم دونوں کے علاوہ اس وقت کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ نرگس کی عمر پچیس سال کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ ایک گوری چٹی اور پُرکشش نقش ونگار کی مالک جاذب نظر عورت تھی۔ اگر جاوید نے واقعی اس کی قدر نہیں کی تھی تو میری نظر میں وہ دنیا کا احمق ترین اور بدقسمت شخص تھا۔

’’نرگس! مجھے جاوید کی المناک موت کا دلی صدمہ ہے۔‘‘ میں نے گہری سنجیدگی سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ’’میں اسے دوبارہ زندہ تو نہیں کر سکتا کیونکہ وہ جہاں جا چکا ہے، وہاں سے کوئی واپس نہیں آتا لیکن تم سے میرا وعدہ ہے کہ میں بہت جلد اس کے قاتلوں کا سراغ لگا لوں گا اور پھر انہیں میرے ہاتھوں عبرت ناک انجام تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔‘‘

اس نے گردن اٹھا کر دزدیدہ نظر سے مجھے دیکھا اور سپاٹ آواز میں بولی۔ ’’جو اللہ کو منظور تھا وہ ہو گیا اور آئندہ بھی وہی ہوگا جو اللہ چاہے گا۔‘‘

’’میں تمہارے خیالات سے اتفاق کرتا ہوں نرگس۔‘‘ میں نے ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔ ’’بے شک! اللہ قادرِ مطلق ہے۔ وہ جو چاہے، کر سکتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے۔ جو بس میں ہو، اس حد تک کوشش لازمی ہے اور میں بھی جاوید کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے اپنی سی کوشش

کردوں گا لیکن اس مقصد میں کامیابی کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی اشد ضرورت ہوگی۔"

"میرا تعاون......؟" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"ہاں...... بالکل......" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تمہاری مدد کے بغیر میں اس کیس میں کچھ بھی نہیں کر پاؤں گا۔"

"لیکن میں کس طرح آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟" اس کی حیرت میں الجھن بھی شامل ہوگئی۔

"میرے سوالوں کے سچے اور کھرے جواب دے کر۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستحکم لہجے میں کہا۔ "میں تم سے جو بھی پوچھوں، پوری سچائی اور دیانت داری سے اس کا جواب دینا......"

"جی پوچھیں......" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "میں آپ کے سامنے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کروں گی۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا یہ درست ہے کہ سسرال میں تمہاری زندگی جہنم کا نمونہ بنی ہوئی تھی؟"

"جی...... اس میں تو کوئی شک نہیں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"مجھے تمہارے حالات کا کسی حد تک اندازہ ہے۔" میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس واقعے سے کچھ عرصے پہلے تمہاری پڑوسن خورشید بی بی، جاوید کی شکایت لے کر میرے پاس آئی تھی۔"

"جی...... چاچی خورشید نے مجھے بتایا تھا۔" نرگس اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "اور یہ بھی کہا تھا کہ آپ نے ان کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔"

"یہ بات ہی ایسی تھی کہ پولیس کی مداخلت کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "بہرحال، تم مختصر الفاظ میں مجھے بتاؤ کہ سسرال میں تمہیں کس قسم کی مشکلات کا سامنا تھا؟"

اس نے آئندہ دس منٹ میں مجھے اپنی بپتا سے آگاہ کر دیا۔ اس کے مطابق شادی کے ایک سال بعد ہی سسرال میں اس کے جھگڑے شروع ہوگئے تھے۔ اس کی ساس مزاج کی بہت تیز تھی اور اٹھتے بیٹھتے روک ٹوک کرتی رہتی تھی۔ چھوٹی موٹی باتیں تو وہ برداشت کرتی رہی لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد رحمت بی بی نے ایک عجیب پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں آس پڑوس میں بتانے لگی کہ اس کی بہو یعنی نرگس بانجھ ہے اسی لیے شادی کے بعد وہ ابھی تک کوئی بچہ پیدا نہیں کر سکی۔ اس قسم کی باتیں نرگس کا کلیجا چھلنی کر دیتی تھیں کیونکہ لوگوں کو جب بھی موقع ملتا وہ نرگس کو اس کی ساس کی چہ میگوئیوں کے بارے میں بتاتے رہتے تھے۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا پھر جب جاوید کی بڑی بہن خالدہ طلاق کا طوق گلے میں ڈال کر اپنے میکے پہنچی تو نرگس کے عذاب میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ "یک نہ شد، دو شد" والی صورتِ حال نے نرگس کی زندگی اجیرن کر دی۔ دونوں ماں بیٹیوں نے مل کر نرگس پر وہ ظلم و ستم ڈھانا شروع کیے کہ وہ خود کو ایک دہکتے ہوئے جہنم میں محسوس کرنے لگی۔

نرگس نے دکھ بھرے انداز میں مجھے بتایا کہ سسرال میں اس کی حیثیت کسی نوکرانی سے زیادہ نہیں تھی۔ جھاڑو پونچھا، کھانا پکانا، برتن دھونا، کپڑوں کی دھلائی وغیرہ سب اس کے ذمے تھا۔ اس کے علاوہ اسے شوہر اور ساس کی خدمت بھی کرنا پڑتی تھی۔ یہاں تک کہ رات کو روزانہ رحمت بی بی کے پاؤں دبانا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا اور اگر کبھی وہ بیمار ہو جاتی اور اپنی ان گھریلو "ذمے داریوں" کو مناسب انداز میں پورا نہ کر پاتی تو اسے ساس اور نند کی کھری کھری سننا پڑتی تھیں بلکہ وہ دونوں مل کر اس کی پٹائی بھی کر دیا کرتی تھیں۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا رحمت بی بی اور خالدہ تمہیں باقاعدہ مارا بھی کرتی تھیں......؟"

"جی ہاں......" اس کی آواز بھرا گئی۔ "یہی حقیقت ہے۔ خورشید چاچی نے آپ سے کوئی بھی جھوٹ نہیں بولا۔ مجھے ہر لمحے یہی محسوس ہوتا تھا کہ میں ان لوگوں کی زرخرید لونڈی ہوں......"

"اور تمہارے گھر والے......!" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "خیر دین اور صفیہ نے بھی اس ظلم کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی۔ تم ان کی سگی بیٹی ہو، ان کے جگر کا ٹکڑا ہو۔ تم پر وہ لوگ ایک سے بڑھ کر ایک ستم ڈھاتے رہے اور یہ لوگ خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہے...... کیوں...... اتنی بے بسی کیوں؟"

"اماں اور ابا میری بے بسی کا تماشا نہیں دیکھ رہے تھے تھانے دار صاحب۔" اس نے دکھی لہجے میں بتایا۔ "یہ بے قصور ہیں۔ میں انہیں کوئی الزام نہیں دے سکتی۔ مجھے اپنے ماں باپ سے کوئی شکایت نہیں۔"

"یہ لوگ کیسے قصوروار نہیں ہیں۔" میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ "تم ان کی بیٹی ہو۔ انہوں نے تمہیں بیاہا

تھا، کوئی ان لوگوں کے ہاتھ فروخت نہیں کیا تھا؟''
''یہ لوگ اس لیے بے قصور ہیں تھانے دار صاحب کہ......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''کہ انہیں میرے حالات کی کچھ خبر نہیں تھی۔''
''کیا مطلب......!'' میں نے الجھن زدہ انداز میں گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تم پچھلے پانچ چھ سال سے اپنی سسرال میں لاکھ عذاب اور کروڑ اذیتیں سہہ رہی ہو اور تمہارے والدین کو تمہارے حالات کی کچھ خبر ہی نہیں...... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''
''یہ اس طرح ہوا جناب کہ میں نے زندگی میں کبھی اپنا دردِ انہیں بتایا ہی نہیں۔'' وہ اداس لہجے میں بولی۔ ''میں چپ چاپ سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ میں جانتی ہوں کہ میں بانجھ نہیں لیکن میں بانجھ پن کے طعنے سنتی رہی۔ میں خدمت گار نوکرانی ہونے کے باوجود بھی اپنے شوہر اور ساس نند کے لات جوتے کھاتی رہی مگر کبھی اپنے ماں باپ کو کچھ نہیں بتایا۔ یہ تو جب دو دن پہلے چاچی خورشید مجھے یہاں چھوڑ گئی ہے تو اس کی زبان کھل گئی حالانکہ میں نے اسے سختی کے ساتھ منع بھی کیا تھا کہ اماں ابا کو میرے حالات کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔ میں ان بے چاروں کو... خوامخواہ پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی مگر چاچی خورشید بھی جاوید اور اس کے گھر والوں کی طرف سے خوب بھری بیٹھی تھی۔ اس نے پچھلے چھ سال کی درد بھری میری کہانی اماں ابا کو سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلیا۔''
''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تو یہ صورتِ حال ہے...... پھر یہ دکھ بھری کہانی سن کر تمہارے والدین نے کیا ردِعمل ظاہر کیا تھا؟''
''انہوں نے تکلیف بھرے انداز میں چاچی خورشید کی باتیں سنیں پھر مجھے خوب لتاڑا کہ میں نے اپنے درد کو ان سے اتنے عرصے تک کیوں چھپائے رکھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اور پھر...... اسی دن اماں ابا نے ایک فیصلہ کرلیا کہ اب وہ مجھے کبھی جلال پور نہیں بھیجیں گے۔ اگر وہاں سے کوئی مجھے لینے آیا تو اس سے دوٹوک بات ہوگی۔ اگر وہ لوگ اسٹیمپ پیپر پر لکھ کر دیں گے کہ آئندہ میرے ساتھ وہ ایسا ظلم نہیں کریں گے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ لوگ اپنے گھر میں اچھے اور ہم لوگ اپنے گھر میں پھر......'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوئی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔
''پھر...... آج صبح جو واقعہ پیش آیا ہے اس کے بعد تو میرا جلال پور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خدا نے خود ہی مجھے اس عذاب سے چھٹکارا دلا دیا ہے۔ جب جاوید ہی باقی نہیں رہا تو میں اس کی بیوی بھی نہیں رہی لہٰذا اب رحمت بی بی اور خالدہ سے بھی میرا کوئی رشتہ نہیں رہا۔ پہلے میں جاوید کے منہ کو دیکھتے ہوئے اپنی ساس اور نند سے مار کھا لیتی تھی۔ انہوں نے مار مار کر میری ہڈیوں کا سُرمہ بنا ڈالا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دی ہے۔ اب میں کبھی جلال پور میں قدم بھی رکھوں، اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھانے دار صاحب۔''
''تم نے اپنے حالات کے مطابق بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''نرگس! رحمت بی بی نے ادھر کھیتوں میں بتایا تھا کہ کل جاوید گھر سے اس نیت سے نکلا تھا کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ واپس جلال پور لے جائے گا لیکن تمہارے ماں باپ کے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔ تم اس بارے میں کیا کہتی ہو...... کیا اس نے تمہیں بتا رکھا تھا کہ تین دن کے بعد وہ تمہیں لینے چک بی آئے گا؟''
''نہیں جی، اس نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔'' اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے تو خود اس بات پر حیرت ہے کہ وہ کل اس طرف کیا لینے آیا تھا۔''
''ہوں......'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''تمہاری دکھ بھری کہانی سن کر مجھے دلی افسوس ہوا ہے۔ اس کہانی کی سطر سطر درد میں ڈوبی ہوئی ہے لیکن دو سوالات میرے ذہن میں ایسے ہیں جن کا جواب صرف اور صرف تم ہی مجھے دے سکتی ہو......''
''کون سے سوالات تھانے دار صاحب؟'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔
''نمبر ایک......'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ جاوید نے تمہارے میکے آنے پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ جب تمہارے باپ کو زہریلے سانپ نے ڈس لیا اور مجبوراً اس کا ہاتھ کاٹنا پڑا تو اس سانحے کی خبر تم تک بھی پہنچی تھی اور تمہارا دل مچلا تھا کہ اڑ کر جلال پور سے چک بی پہنچ جاؤ لیکن جاوید کافی دنوں تک مصروفیت کا بہانہ کرکے تمہیں ٹالتا رہا۔ بالآخر تمہاری پڑوسن خورشید بی بی نے کسی حیلے بہانے سے تمہیں چک بی پہنچا دیا......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کوئی اس واقعے تک ہی محدود نہیں۔ میری معلومات کے مطابق جاوید کو تمہارا چک بتی آنا بالکل پسند نہیں تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ تم یہاں نہ آؤ۔ جاوید کی یہ خواہش اور رویہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ چک بتی میں تمہارے ماں باپ اور چھوٹا بھائی رہتا ہے۔ یہ تمہارا آبائی گاؤں ہے۔ تم یہاں پیدا ہوئی ہو۔ پل بڑھ کر جوان ہوئی ہو۔ چھ سال پہلے اسی گاؤں سے تمہاری ڈولی اٹھی تھی۔ اس چک سے تمہارا تعلق اور ناتا بہت مضبوط ہے پھر جاوید کو ایسی کیا تکلیف تھی کہ وہ تمہیں یہاں بھیجنے پر راضی نہیں ہوتا تھا؟''

''میں سمجھتی ہوں کہ جاوید کی اس ضد کے پیچھے اس کی ماں کا ہاتھ تھا۔''

''اس کی ماں کا ہاتھ......'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم کہنا کیا چاہتی ہو نرگس؟''

''میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ میری ساس اس بات کے حق میں نہیں تھی کہ میں چک بتی آؤں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''وہ اشاروں کنایوں میں مجھے یہ بات سمجھانے کی کوشش کرتی رہتی تھی اور درِ پردہ وہ جاوید کے بھی کان بھرتی تھی اور پھر جاوید مجھ پر پابندیاں لگاتا تھا۔''

''لیکن تمہارے چک بتی آنے میں آخر رحمت بی بی کا کیا نقصان تھا؟''

''نقصان یہ تھا کہ......'' اس نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ''میرے چک بتی آنے سے ان کے گھر کا سارا انتظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ مفت کی نوکرانی ہاتھ سے نکل جاتی تو پھر گھر کا سارا کام کاج ان ماں بیٹی کو خود ہی کرنا پڑتا اور کام کرتے ہوئے تو انہیں موت آتی تھی۔ اس کے علاوہ......''

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''اس کے علاوہ کیا نرگس؟''

میں نے محسوس کیا تھا کہ اس نے دانستہ اپنی زبان کو کچھ کہنے سے روکا تھا۔ کوئی ایسی بات جو بہت اہم ہو لیکن وہ مجھے بتانا نہ چاہتی ہو۔ ایسی کیا بات ہو سکتی تھی جو اس نے مجھ سے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ میرے استفسار نے اسے تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ بات ادھوری چھوڑ کر بری طرح الجھ گئی تھی۔ میں نے نہایت ہی مشفقانہ لہجے میں کہا۔

''نرگس! تم میری بیٹی کی طرح ہو۔ مجھے اپنا سچا ہمدرد سمجھو اور مجھ سے کچھ بھی نہ چھپاؤ۔ میرا تم سے یہ وعدہ ہے کہ یہاں ہمارے درمیان جو بھی باتیں ہوں گی، میں ان کا ذکر کسی سے بھی نہیں کروں گا۔ یہ راز ہم دونوں کے بیچ ہی رہے گا۔''

اس نے نگاہ اٹھا کر معصومیت بھرے انداز میں مجھے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ اس کے سینے میں کوئی بہت بڑا طوفان کروٹیں بدل رہا ہے لیکن وہ زبان کھولتے ہوئے ڈر رہی ہے۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے اپنا درد مجھ سے شیئر کرنا چاہیے یا نہیں۔ میں نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

''مجھ پر بھروسا کرو نرگس۔ میں تمہارا سچا خیرخواہ ہوں۔ اگر تم اپنے دل کی بات مجھے بتا دو گی تو ممکن ہے، میں بہتر انداز میں تمہاری مدد کر سکوں......''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب!'' اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ ''آپ میرے مسئلے کو سمجھ سکتے ہیں۔ آپ ایک تجربہ کار اور سمجھدار انسان ہیں۔''

''تو پھر بتاؤ، تم مجھے کیا بتانے والی تھیں کہ بولتے بولتے اچانک رہ گئیں......؟'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''رحمت بی بی کو مجھ پر شک تھا......!'' وہ ہمت کرتے ہوئے بولی۔

''شک...... کس قسم کا شک؟''

''کہ یہاں چک بتی میں میرا کسی سے کوئی چکر ہے۔''

''اوہ......'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''وہ اسی حوالے سے جاوید کے کان بھرتی رہتی تھی۔'' وہ دکھی لہجے میں بتانے لگی۔ ''اور جاوید کا دماغ ماں کی باتیں سن کر بہت زیادہ خراب ہو جاتا تھا پھر وہ مجھے چک بتی بھیجنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔''

''تمہاری ساس کو تم پر جو شک تھا، کیا میں اس شک کی حقیقت جان سکتا ہوں؟''

نرگس کے اس انکشاف نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ شک ایک نہایت ہی خطرناک سوچ کا نام ہے۔ شک زدہ خیالات انسان کا دماغ خراب کر دیتے ہیں پھر اس خراب دماغ کے اندر سے منفی خیالات ہی جنم لیتے ہیں جو کسی انسان کی زندگی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اگر نرگس کی ساس کو اس کی ذات کے حوالے سے کسی قسم کا شک تھا تو اس شک کی بنیاد کھود کر حقیقت کو برآمد کرنا میرا فرض تھا اور میں اسی کے لیے کوشاں تھا۔

''اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں تھانے دار

صاحب۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولی۔ ''رحمت بی بی کی مت ماری گئی تھی۔ کسی نے اسے بتادیا تھا کہ یہاں چک بتی میں میرا ساجد سے میل ملاپ ہے۔ اس شکی عورت نے جاوید کو میرے خلاف اتنا بھڑکایا کہ وہ بھی میرے کردار پر شک کرنے لگا اور اس نے میرے یہاں چک بتی آنے پر پابندی لگادی تھی۔''

''ساجد'' ایک نیا نام نکل کر سامنے آیا تھا اور مجھے بہت کچھ سوچنے پر بھی مجبور کررہا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رائی ہو تو پہاڑ بنتا ہے یعنی جب کوئی معاملہ ابھر کر سامنے آتا ہے اور مبینہ طور پر اس معاملے میں کوئی سچائی نہیں ہوتی تو بھی اس پہاڑ سائز کے معاملے میں اگر اس کی تہ میں جھانک کر دیکھا جائے تو اس معاملے کے حوالے سے رائی کے سائز کا کچھ نہ کچھ ضرور چھپا ہوتا ہے۔ اسی ''دریافت'' کی کوشش میں، میں نے غیر محسوس انداز میں نرگس کو کریدنا شروع کیا۔

''تمہاری ساس کو تم پر ایک بے بنیاد شک تھا۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''لیکن کیا چک بتی میں واقعی کوئی ساجد نام کا شخص موجود ہے؟''

''ساجد ہمارے پڑوسیوں کا لڑکا ہے تھانے دار صاحب!'' نرگس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''لیکن وہ یہاں نہیں رہتا۔''

''پڑوسیوں کا لڑکا ہے اور یہاں نہیں رہتا......'' میں نے الجھن زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہاری بات میرے پلے نہیں پڑی نرگس؟''

''ساجد کو چار سال پہلے نوکری مل گئی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ لاہور میں ہوتا ہے۔ مہینے، دو مہینے میں اپنے ماں باپ سے ملنے یہاں چک بتی آتا ہے۔''

نرگس کی شادی کو چھ سال کا عرصہ گزر گیا تھا اور اس کا پڑوسی ساجد چار سال پہلے لاہور چلا گیا تھا، یعنی نرگس کی شادی کے دو سال بعد ساجد نے چک بتی کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھ لیا۔

''نرگس! تمہاری ساس کو ساجد کے حوالے سے تم پر شک کیوں ہوا تھا۔ کیا واقعی تم دونوں کے بیچ کسی قسم کا ربط ضبط رہا تھا؟''

''میں آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولوں گی تھانے دار صاحب!'' وہ خاصے توانا لہجے میں بولی۔

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہوگی۔''

''سچی بات یہ ہے کہ......'' وہ اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''ساجد مجھے پسند کرتا تھا اور اس کے گھر والوں نے میرے لیے اس کا رشتہ بھی بھیجا تھا لیکن میرے گھر والوں نے اس رشتے سے صاف انکار کردیا تھا۔ بس، اتنی سی بات ہے۔''

''ہوں......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ اس رشتے کے لیے تمہارے گھر والوں نے انکار کیوں کیا تھا لیکن یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ اس انکار کے بعد ساجد اور اس کے گھر والوں کا کیا ردِعمل رہا تھا؟''

''میں آپ کے سوال کا جواب ضرور دوں گی لیکن اس سے پہلے یہ بھی بتاؤں گی کہ میرے اماں ابا نے ساجد کے رشتے سے انکار کیوں کیا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اصل میں بات یہ ہے کہ ساجد عمر میں مجھ سے پانچ سال چھوٹا تھا۔ جب میری شادی ہوئی، میں انیس سال کی تھی اور ساجد صرف چودہ سال کا لیکن وہ اپنی جسامت اور قد کاٹھ سے اٹھارہ انیس کا نظر آتا تھا۔ عمروں کے اس فرق کی وجہ سے میرے گھر والوں نے اس رشتے سے انکار کردیا تھا اور جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تھانے دار صاحب......'' اس نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''ساجد کے گھر والوں نے تو اس انکار کا کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا البتہ ساجد کافی دنوں تک اداس رہا تھا۔ وہ مجھے پسند کرتا تھا اور اس انکار سے اسے جذباتی صدمہ پہنچا تھا۔''

''تم نے دو تین بار اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ساجد تمہیں پسند کرتا تھا۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا اس کی یہ پسندیدگی یک طرفہ تھی......تم میری بات کو سمجھ رہی ہونا......؟''

''بڑی اچھی طرح سمجھ رہی ہوں تھانے دار صاحب!'' وہ بڑے اعتماد سے سر کو تائیدی انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولی۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے ساجد کے بارے میں کبھی اس انداز سے سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ میرے چھوٹے بھائی خاور کی طرح تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے اپنا چھوٹا بھائی ہی سمجھا تھا۔ جب ساجد کی خواہش ''رشتے'' کی شکل میں ہمارے گھر پہنچی تو مجھے اس پر شدید حیرت بھی ہوئی تھی۔''

''اگر تمہاری طرف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی تو تمہیں حیرت ہونا بھی چاہیے تھی۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''اس واقعے کے بعد ساجد کی ذہنی حالت کیسی

رہی تھی؟‘‘

’’چند دنوں تک وہ بولایا بولایا پھرتا رہا لیکن پھر سب کچھ نارمل ہوگیا تھا۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’کیونکہ اس واقعے کے فوراً بعد، دو تین ماہ کے اندر میری جاوید سے شادی ہوگئی تھی۔‘‘

’’اوہ......‘‘ میں نے چونک کر نرگس کی طرف دیکھا اور سوال کیا۔ ’’ان دو تین ماہ کے اندر ساجد نے کبھی تم سے ملنے کی یا کوئی بات کرنے کی کوشش کی؟‘‘

’’جناب! ہم ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔‘‘ وہ سادگی سے بولی۔ ’’اس لیے ہمارا آمنا سامنا تو ہوتا ہی رہتا تھا اور ظاہر ہے...... بات بھی ہوجاتی تھی۔‘‘

’’میرا اشارہ اس بات چیت کی طرف تھا جو اس کی پسندیدگی کو اجاگر کرتی ہو۔‘‘ میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ’’کیا اس دوران میں اس نے تم سے کبھی اظہارِ محبت یا اظہارِ پسندیدگی کرنے کی کوشش کی؟‘‘

’’نہیں جی...... بالکل نہیں۔‘‘ وہ پوری قطعیت کے ساتھ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ’’ہمارا جب بھی سامنا ہوا، وہ مجھے شرمندہ شرمندہ سا نظر آیا جیسے اس نے میرے لیے رشتہ بھیج کر کوئی سنگین جرم کیا ہو۔‘‘

’’پھر دو تین ماہ کے بعد تمہاری جاوید سے شادی ہوگئی۔‘‘ میں نے ایک خاص زاویے سے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ’’اس کے بعد جب بھی تمہارا چک بتی آنا ہوتا تھا تو کیا ساجد سے تمہاری ملاقات ہوتی تھی؟‘‘

’’بہت کم...... تقریباً نہ ہونے کے برابر......‘‘ اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ’’پھر ڈیڑھ دو سال کے بعد تو وہ ملازمت کے سلسلے میں لاہور ہی چلا گیا تھا۔ میں جب بھی چک بتی آتی تو یہی پتا چلتا کہ ساجد لاہور میں ہے۔ ان چار سالوں میں بہ مشکل دو تین بار میرا ساجد سے آمنا سامنا ہوا ہوگا۔‘‘

’’اس ’’آمنا سامنا‘‘ میں ساجد کے دلی جذبات کیا تھے؟‘‘

’’دلوں کا حال تو رب ہی جانتا ہے۔‘‘ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ’’لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے میں کچھ بھی محسوس نہیں کرسکی تھی اور پھر یہ کہ ہماری یہ ملاقات ’’سلام دعا‘‘ تک ہی محدود رہی تھی۔‘‘

’’آخری بار تم نے ساجد کو کب دیکھا تھا؟‘‘ میں نے دریافت کیا۔

’’ایک ڈیڑھ سال پہلے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’یہیں چک بتی میں؟‘‘

’’جی ہاں، ادھر ہی۔‘‘ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

’’کیا آج کل بھی ساجد چک بتی آیا ہوا ہے؟‘‘

’’نہیں جی، وہ اس وقت لاہور میں ہے۔‘‘ نرگس نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔ ’’مجھے پتا چلا ہے، وہ پچھلے ماہ یہاں کا چکر لگا کر گیا ہے اور اب ڈیڑھ دو مہینے کے بعد ہی ادھر آئے گا۔‘‘

میں نے ابھی تک نرگس سے گھما پھرا کر مختلف زاویوں سے جتنے بھی سوالات کیے تھے ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں نرگس اور ساجد کے بیچ کسی خفیہ کنکشن کی تلاش میں تھا اور مجھے اس کوشش میں کامیابی حاصل نہیں ہوسکی تھی۔ نرگس کے جوابات کی روشنی میں میرا تجربہ یہ بتاتا تھا کہ اس نے کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا لہٰذا میں نے سوالات کے موضوع کو تبدیل کرنا ضروری جانا اور اس سے پوچھا۔

’’نرگس! جتنی بے دردی سے جاوید کو قتل کیا گیا ہے، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قاتلوں کے دلوں اور ذہنوں میں شدید قسم کی نفرت پل رہی تھی۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ بہیمانہ قتل کون کرسکتا ہے؟‘‘

میری بات کے اختتام تک اس کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوچکی تھیں۔ ادھر میں خاموش ہوا، ادھر اس نے پوچھ لیا۔ اس کی آواز میں شدید نوعیت کی حیرت جھلکتی تھی۔

’’یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب......؟‘‘

’’کیوں...... میں نے ایسا کیا عجیب کہہ دیا؟‘‘ میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا۔

’’آپ کا مطلب یہ ہے کہ ایک سے زیادہ لوگوں نے مل کر جاوید کی جان لی ہے؟‘‘

’’بالکل، میرا یہی مطلب ہے۔‘‘ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ’’اس مطلب تک میں لاش کے معائنے کے بعد پہنچا ہوں۔ میں نے جاوید کی چٹخی ہوئی کھوپڑی کا بغور جائزہ لیا ہے۔ اس کے سر اور جسم کے دیگر حصوں پر لگنے والی چوٹیں بتاتی ہیں کہ اس پر دو تین یا اس سے بھی زیادہ افراد نے یک بیک حملہ کیا تھا۔ اگر ایک آدھ شخص ڈنڈے سوٹے سے اس پر حملہ آور ہوتا تو جاوید اس سے مار کھانے والا نہیں تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش ضرور کرتا یا جائے وقوعہ سے فرار اختیار کرکے بھی وہ اس ناگہانی سے محفوظ رہ سکتا تھا لیکن وہ ایسا نہیں کرسکا اور دشمنوں نے گھیر کر اس کے سر پر اتنی کاری چوٹیں لگائیں کہ وہ بے بسی کی موت مارا گیا۔‘‘

"اوہ......" وہ افسوس ناک انداز میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ "جاوید کے اتنے خطرناک دشمن کون لوگ ہوسکتے ہیں؟"

"یہی تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اور جاوید کے ان خطرناک دشمنوں تک تم مجھے پہنچاؤ گی۔"

"میں...... وہ کیسے جی؟" وہ الجھن بھری آنکھوں سے مجھے تکنے لگی۔

"تم جاوید کی بیوی تھیں۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "تم ہی مجھے اس کے دشمنوں تک پہنچا سکتی ہو نرگس۔ میرا شک تو ایک جانب ابھرا تھا مگر تم نے اس کی نفی کردی ہے؟"

"نفی کردی ہے۔" وہ کچھ سمجھ نہ پائی۔ "تھانے دار صاحب! میں نے آپ کے کون سے شک کی نفی کردی ہے۔"

"ساجد والے شک کی۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "جب مجھے یہ پتا چلا تھا کہ ساجد تمہیں پسند کرتا تھا اور اس کا رشتہ بھی تمہارے لیے آیا تھا لیکن اس رشتے سے انکار کے باعث ساجد کو دلی صدمہ پہنچا تھا تو لامحالہ میرا دھیان ساجد کی طرف چلا گیا تھا لیکن پھر تم نے مجھے جو حالات بتائے، ان کی روشنی میں یہ کارروائی ساجد کی نہیں ہوسکتی۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جی۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "ساجد جوشِ انتقام میں اس حد تک نہیں جاسکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ رشتے سے انکار کے بعد جب میری شادی جاوید سے ہوئی تو اس نے حسد محسوس کیا ہوگا۔ اس کے دل میں جاوید کے لیے نفرت بھی پیدا ہوئی ہوگی لیکن اس نے کوئی بھی اوچھا قدم اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ واردات کسی اور ہی نے کی ہے کیونکہ ساجد تو پچھلے ایک ماہ سے لاہور میں ہے اور پھر چھ سال کے بعد وہ اس قسم کی حرکت کرے گا، اس کا کوئی جواز نہیں بنتا جناب۔"

"ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "اگر تم دونوں کے بیچ دوطرفہ معاملہ ہوتا یعنی جیسے ساجد تمہیں پسند کرتا تھا، تم بھی اس کی محبت میں گرفتار ہوتیں تو کہا جاسکتا تھا کہ اس نے تمہارے حصول کی خاطر جاوید کو ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔"

"میں سمجھتی ہوں، جاوید کی موت میں ساجد کا دور دور تک کوئی ہاتھ نہیں۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "یہ کسی اور ہی کا رچایا ہوا خونی کھیل ہے۔"

"اور کسی" "اور" ہی کی مجھے شدت سے تلاش ہے۔" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "کوئی ایسا شخص جو اپنے دل میں جاوید کے لیے بے پناہ نفرت اور انتقام کے جذبات رکھتا ہو۔ کیا یہاں چک بتی میں ایسا کوئی شخص ہوسکتا ہے؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔" وہ پُروثوق انداز میں بولی۔ "چک بتی میں جاوید کا کوئی دشمن نہیں ہے......" لمحاتی توقف کرکے اس نے گہری سانس لی پھر چونکے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"تھانے دار صاحب! یہ راہزنی کی کوئی واردات بھی تو ہوسکتی ہے۔ ممکن ہے لٹیروں نے اسے لوٹنے کی کوشش کی ہو اور اس کی مزاحمت پر انہوں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔"

نرگس سے میں کافی دیر سے بات چیت کررہا تھا لیکن اس خونی واردات کے حوالے سے یہ پہلو ابھی زیرِبحث نہیں آیا تھا تاہم میرا ذہن اس معاملے میں شیشے کی طرح صاف اور شفاف تھا۔ یہ کسی بھی صورت راہزنی کی واردات نہیں تھی۔

"راہزنی......!" میں نے نرگس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس قسم کی وارداتوں میں راہزن اور ڈاکو وغیرہ مسافروں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو مسافر شرافت سے لٹ جاتے ہیں ان کی جان سلامت رہتی ہے۔ مال کو وہ جان کا صدقہ سمجھ کر صبر شکر کرلیتے ہیں اور جو مسافر لٹیروں کی کارروائی میں مزاحمت پیش کرتے ہیں، لٹ تو وہ بھی جاتے ہیں مگر شدید زخمی ہونے کے بعد اور بعض اوقات جان گنوانے کے بعد لیکن جاوید کے ساتھ ایسا نہیں ہوا......"

"کیا ایسا نہیں ہوا تھانے دار صاحب؟" وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ "جاوید کو بڑی بے دردی سے قتل تو کردیا گیا ہے۔ ڈاکو اس سے زیادہ اور کیا کرسکتے تھے؟"

"یہ اچھا سوال ہے کہ ڈاکو اس سے زیادہ اور کیا کرسکتے تھے۔" میں نے اسی کے الفاظ کو دہراتے ہوئے کہا۔ "ڈاکوؤں کا بنیادی مقصد مسافروں کو لوٹنا ہوتا ہے لیکن اس واردات میں ڈاکوؤں بہ الفاظِ دیگر جاوید کے قاتلوں نے اسے لوٹنے کی کوشش نہیں کی۔"

"جی......!" اس کی حیرت ساتویں آسمان کو چھونے لگی۔ "تھانے دار صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں تمہارے سامنے حقیقت بیان کررہا ہوں

نرگس!'' میں نے گہری سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ ''جاوید کے قاتلوں نے اس کی جیب سے ایک پیسا بھی نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے پاس جو بھی رقم تھی، وہ مجھے اس کی جیب کے اندر سے مل گئی ہے جس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ جاوید کو پیش آنے والا واقعہ راہزنی کی کوئی واردات نہیں تھی بلکہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اسے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔''

''اوہ......'' وہ تشویش ناک انداز میں مجھے تکنے لگی۔ ''ایسی گھٹیا حرکت کون کرسکتا ہے؟''

''مجھے بھی تو اسی نازک اور اہم سوال کے جواب کی تلاش ہے نرگس!'' میں نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ''یہاں چک بی میں تمہارے سسرالی حالات سے کون کون واقف تھا؟''

یہ سوال اس حوالے سے میرے ذہن میں چمکا تھا کہ ممکن ہے چک بی کا کوئی وسنیک نرگس سے گہری ہمدردی رکھتا ہو اور جب اسے نرگس کے سسرالی مصائب و آلام کی خبر ہوئی ہو تو اس نے چپ چاپ جاوید کو ٹھکانے لگا دیا ہو لیکن نرگس کے جواب نے میرے اس خیال کی نفی کر دی۔

''نہیں تھانے دار صاحب......'' وہ اپنی گردن کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے بولی۔ ''میں نے اپنے سسرالی حالات کو سینے میں دفن کر رکھا تھا۔ جب میں نے اپنے ماں باپ کو کچھ نہیں بتایا تو اور کسی کو کیسے بتا سکتی تھی...... چک بی میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ ادھر سسرال میں مجھ پر کیا بیت رہی تھی۔''

''ہوں......'' میں نے گمبھیر انداز میں ہنکارا بھرا پھر پوچھا۔ ''اور ادھر جلال پور کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''جی...... میں سمجھی نہیں!'' وہ تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے مجھ سے کیا پوچھا ہے؟''

''میں نے یہ پوچھا ہے کہ ادھر جلال پور میں جاوید کی کسی سے دشمنی وغیرہ تھی؟''

''نن...... نہیں......!'' اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن ہلائی۔ ''میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب......!''

''دیکھو نرگس!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جاوید کے ساتھ جو بھی اندوہناک واقعہ پیش آیا ہے، یہ کسی دوست کا کارنامہ تو ہو نہیں سکتا۔ یقیناً اس کے کسی دشمن ہی نے اسے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔''

''جی...... آپ کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہیں۔''

''اگر میں ٹھیک کہہ رہا ہوں تو پھر تم میری ضرورت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جب تک مجھے جاوید کے دشمنوں کے حوالے سے کوئی سراغ یا اشارہ نہ ملے، میں اس کے قاتلوں تک آسانی سے رسائی حاصل نہیں کرسکوں گا اور اگر میری قاتلوں تک رسائی نہیں ہوگی تو میں انہیں کیفرِ کردار تک کیسے پہنچاؤں گا؟''

''جی...... میں آپ کی بات کو تو سمجھ رہی ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن یقین کریں، میں جاوید کے دشمنوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی...... اگر مجھے کچھ پتا ہوتا تو میں آپ کو ضرور بتا دیتی۔''

''مجھے پتا چلا ہے، وہ غصے کا بہت تیز تھا۔'' میں نے ایک اور پہلو سے اسے کھنگنے کی کوشش کی۔ ''اکثر لوگوں سے اس کی منہ ماری ہوتی رہتی تھی۔ کیا کبھی کسی سے ایسا جھگڑا بھی ہوا جو سنگین صورت اختیار کر گیا ہو...... میرا مطلب ہے، اس جھگڑے میں جاوید نے کسی کی درگت بنا دی ہو؟''

''نہیں جی...... اتنا شدید جھگڑا تو اس کا کسی سے بھی نہیں ہوا تھا۔'' وہ معتدل لہجے میں بولی۔ ''ہاں، یہ بات درست ہے کہ وہ بہت جلد غصے میں آجاتا تھا اور اکثر لوگوں سے اس کی گرما گرمی بھی ہو جاتی تھی۔''

''کیا تم کسی ایسے شخص کو جانتی ہو جو اپنے گلے میں فیروزے والا لاکٹ پہنتا ہو؟'' میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

''جی، کیا......'' اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ ''یہ فیروزے کا لاکٹ کیا ہوتا ہے؟''

سوال پوچھنے کے ساتھ ہی میں نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ بھی ڈال دیا تھا۔ نرگس کے سوال نے مجھے یہ تو بتا دیا تھا کہ وہ لفظ ''فیروزے'' پر چونکی تھی ورنہ لاکٹ کوئی ایسا ناشناس لفظ نہیں تھا۔ یقیناً وہ فیروزے کے حوالے سے کچھ نہیں جانتی تھی۔

میں نے چیختے ہوئے فیروزے والے لاکٹ کو اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ لاکٹ مجھے اس جگہ پڑا ملا ہے جہاں قریب ہی کھیتوں میں جاوید کی لاش پائی گئی تھی۔ مجھے یقین ہے، یہ لاکٹ قاتلوں میں سے ہی کسی کا ہے جو

واردات کے دوران میں اس کی ڈوری ٹوٹ جانے سے زمین پر گر گیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں تمہاری ساس رحمت بی بی سے بھی پوچھا تھا۔''

''پھر اس نے کیا جواب دیا تھانے دار صاحب؟''

الٹا اس نے مجھ سے سوال کر ڈالا۔

''اس کا کہنا ہے کہ اس لاکٹ کا جاوید سے کوئی تعلق نہیں۔'' میں نے نرگس کو بتایا۔ ''اور نہ ہی وہ اس لاکٹ کے بارے میں اور کچھ بتا سکی ہے۔''

''میرا بھی یہی جواب ہے تھانے دار صاحب!'' وہ پُراعتماد انداز میں بولی۔ ''میں نے ایسا کوئی لاکٹ جاوید کے پاس کبھی نہیں دیکھا بلکہ جاوید کو تو لاکٹ پہننے کا کبھی شوق ہی نہیں رہا۔''

''کسی اور کے گلے میں تم نے یہ لاکٹ دیکھا ہو؟''

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ میں نے مذکورہ لاکٹ کو جیب میں رکھا اور وہاں سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

جلال پور میں پہنچنے کے بعد میں نے تھانے کا رخ کرنے سے پہلے مقتول جاوید کی ماں رحمت بی بی سے ملاقات کرنا از حد ضروری جانا۔ اگرچہ نرگس کے معاملے میں اس کا کردار بہت ہی منفی اور احمقانہ بلکہ سازشانہ رہا تھا تاہم اس کے بیٹے کی المناک موت ہوئی تھی۔ وہ ایک ماں تھی اور اولاد کے لیے ہر ماں کا دل ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔

میں شام سے کچھ پہلے رحمت بی بی کے گھر میں تھا۔ اس سے ابتدائی ملاقات تو ادھر چک بتی کے چاول کے کھیتوں ہی میں ہو گئی تھی اور میں نے اس سے واجبی سی پوچھ تاچھ بھی کی تھی لیکن یہ معاملہ ایسا تھا کہ اس سے تفصیلی ملاقات کی ضرورت تھی۔ چک بتی میں خیر دین، صفیہ اور نرگس کی زبانی مجھے ''نرگس اور جاوید'' کی شادی کے بارے میں تمام تر معلومات حاصل ہو گئی تھیں اور یہ بات بھی کہ جاوید سے شادی سے چند ماہ پہلے نرگس کے لیے ساجد کا رشتہ آیا تھا تاہم بعد میں ان کے بیچ کسی قسم کا میل ملاپ نہیں رہا تھا۔

نرگس نے بڑے اعتماد کے ساتھ مجھ سے بات کی تھی اور میرا تجربہ بتاتا تھا کہ اس نے کسی بھی مرحلے پر دروغ گوئی سے کام نہیں لیا تھا اور اس کی باتوں سے میں نے بڑا واضح محسوس کر لیا تھا کہ اب اس کا جلال پور آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کے والدین کی بھی یہی مرضی تھی۔

میں اس وقت رحمت بی بی کی بیٹھک میں اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! آپ نے میرے جیدے کے قاتلوں کو گرفتار کر لیا؟''

''جاوید کے قاتل بہت جلد قانون کی گرفت میں ہوں گے رحمت بی بی۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

''بس، ذرا مجھے ان تک پہنچنے کا راستہ مل جائے اور یہ راستہ مجھے تم دو گی۔''

''راستہ کیا...... میں نے تو آپ کو بندے کا نام تک بتا دیا تھا۔'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''مگر آپ نے کچھ نہیں کیا...... کچھ بھی نہیں۔'' بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔

''تم نے مجھے کس بندے کا نام بتایا تھا؟'' میرے لہجے سے حیرت ٹپک رہی تھی ''اور کب......؟''

''ادھر چک بتی کے کھیتوں میں تھانے دار صاحب۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''آپ اتنی جلدی بھول گئے۔ میں نے کہا تھا، اس بندے کو گرفتار کر لیں۔ سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

''اوہ...... تم نے تو نرگس کے باپ خیر دین کی طرف اشارہ کیا تھا۔'' مجھے یاد آ گیا۔ ''تو کیا تمہارے خیال میں خیر دین نے جاوید کو قتل کیا ہے؟''

''اس خبیث بڈھے نے میرے بیٹے کو قتل کیا ہے یا کسی اور سے کرایا ہے، یہ میں نہیں جانتی۔'' وہ ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ خیر دین میرے جیدے کے دشمن کو اچھی طرح جانتا ہے۔ آپ اسے گرفتار کر کے سختی کریں گے تو اس کی زبان کھل جائے گی۔''

میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ رحمت بی بی اپنے دل میں نرگس اور اس کے ماں باپ کے لیے حد سے زیادہ عناد رکھتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، خیر دین کا ذکر کرتے ہوئے اس کی زبان زہر اگلنے لگتی تھی۔ پہلے اس کا فوکس خیر دین پر تھا، اب اس نے جاوید کا کوئی دشمن بھی نکال لیا تھا لہٰذا اس خرانٹ عورت کو احتیاط سے ٹٹولنے کی ضرورت تھی۔

''ٹھیک ہے رحمت بی بی! میں خیر دین کو گرفتار کر لوں گا۔'' میں نے مصلحت آمیز انداز میں کہا۔ ''لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم اپنے بیٹے کے دشمن کو اچھی طرح جانتی ہو...... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا......؟''

''ٹھیک...... بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔'' وہ بڑے

اعتماد کے ساتھ بولی۔ ''اس بندے کا نام ہے ساجد......!''

اگرچہ نرگس کی زبانی مجھے ساجد کے حوالے سے تمام تر معلومات حاصل ہو چکی تھیں مگر رحمت بی بی کا نقطۂ نظر جاننا بھی ضروری تھا لہٰذا میں نے ان جان بنتے ہوئے پوچھا۔

''یہ ساجد کون ہے؟''

''نرگس کا یار۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔

میں نے سوال کیا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا رحمت بی بی؟''

میرے سوال کے جواب میں اس نے مجھے ایک چٹ پٹی مسالے دار کہانی سنا ڈالی جس کے مطابق نرگس کا اپنے پڑوسی ساجد کے ساتھ بڑا طوفانی قسم کا معاشقہ چل رہا تھا۔ ساجد، نرگس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن نرگس کی شادی جاوید سے ہو گئی لہٰذا ساجد، جاوید کا دشمن بن گیا اور پھر موقع ملتے ہی اس نے جاوید کو ٹھکانے لگا دیا تاکہ اپنی محبوبہ سے شادی رچا سکے، وغیرہ وغیرہ......!

رحمت بی بی کی کہانی مبنی بر عناد تھی۔ اس نے ساجد کو جس انداز میں پینٹ کیا تھا، اس سے یہی لگتا تھا کہ وہ اسے اپنے بیٹے کا قاتل ڈکلیئر کر چکی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''رحمت بی بی! تمہاری باتوں سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ تم ساجد کو اپنے بیٹے کا قاتل سمجھتی ہو لیکن وہ تو پچھلے چار سال سے لاہور میں ہوتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق وہ لگ بھگ ایک ماہ پہلے چک بتی آیا تھا اور جاوید کا قتل تو ایک دن پہلے ہوا ہے۔ پھر وہ تمہارے بیٹے کے قتل میں کس طرح ملوث ہو سکتا ہے؟''

''وہ میرے جیدے کا پکا دشمن ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ ضدی لہجے میں بولی۔ ''وہ ایک ماہ پہلے چک بتی آیا تھا تو کیا ہوا...... وہ اس کے بعد بھی تو آ سکتا ہے۔ اس کے چک بتی آنے پر کوئی پابندی تو نہیں لگی ہوئی۔ میں تو کہتی ہوں کہ آپ نرگس کے باپ اور ساجد کو فوراً گرفتار کریں۔ آپ ان دونوں پر سختی کریں گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔''

میں نے رحمت بی بی سے اس بات پر بحث نہیں کی کیونکہ وہ اپنے موقف سے ایک سوت ادھر ادھر ہٹتی دکھائی نہیں دیتی تھی اور فی الحال میرے پاس ایسی کوئی ٹھوس دلیل نہیں تھی کہ میں ساجد کو اس معاملے سے لاتعلق ثابت کر کے بے گناہ قرار دے سکتا لہٰذا میں نے سوالات کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''رحمت بی بی! تمہارا بیٹا جاوید کل یعنی بارہ اکتوبر کو کتنے بجے گھر سے نکلا تھا؟''

اس نے بتایا۔ ''جیدا کل صبح ہی یہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ آدھا دن وہ دکان پر گزارے گا۔ اس کے بعد وہ چک بتی کی طرف جائے گا۔ چک بتی یہاں سے صرف چار میل دور ہے۔ میں نے اسے تاکید کر دی تھی کہ شام سے پہلے واپس آ جانا لیکن جب وہ کل شام تک گھر نہیں آیا تو مجھے بڑی فکر ہوئی پھر یہ سوچ کر میں نے خود کو تسلی دے لی کہ ہو سکتا ہے نرگس کے گھر والوں نے اسے زبردستی روک لیا ہو۔ صبح آ جائے گا لیکن صبح تو مجھ پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی جب پتا چلا کہ......'' اس کی آواز رندھ گئی اور وہ خاموش ہو گئی۔

یہ ٹھیک ہے کہ خورشید بیگم اور نرگس کے باپ خیر دین کی زبانی مجھے رحمت بی بی کے بارے میں جو کچھ پتا چلا تھا، اس کی روشنی میں یہ بہت ہی فتنہ پرور عورت تھی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایک بیٹے کی ماں بھی تھی اور وہ بیٹا گزشتہ رات بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا لہٰذا دکھی دل رحمت بی بی کے جذبات کا احترام مجھ پر لازم تھا۔ میں نے نہایت ہی ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

''رحمت بی بی! تمہارے بیٹے کی موت کا مجھے بھی بہت افسوس ہے اور میں یہ ساری پوچھ گچھ اس کے قاتلوں تک پہنچنے کے لیے ہی کر رہا ہوں۔''

''جی......'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں سمجھ رہی ہوں۔''

''میری معلومات کے مطابق جاوید کی بیوی نرگس دس اکتوبر کو اپنے میکے گئی تھی۔'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اور دو دن بعد ہی جاوید اسے لینے کے لیے گھر سے چل پڑا۔ کیا جاوید نے نرگس کو یہ بات بتا رکھی تھی کہ وہ دو دن بعد اسے لینے آئے گا؟''

''جیدا اپنی مرضی کا مالک تھا جناب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''مجھے نہیں پتا کہ اس نے نرگس کو دو دن والی بات بتائی تھی یا نہیں۔''

''مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ نرگس کسی خورشید نامی عورت کے ساتھ یہاں سے چک بتی گئی تھی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ جاوید کے ساتھ کیوں نہیں گئی تھی؟ اور یہ خورشید بیگم کون ہے؟''

میں خورشید بیگم سے مل چکا تھا اور اس کے بارے میں اچھی خاصی معلومات بھی رکھتا تھا لیکن میں رحمت بی بی کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے بتایا۔

''خورشید ہماری پڑوسن ہے تھانے دار صاحب۔ یہ اس دن صورت نگر جارہی تھی۔ چک بتی صورت نگر جاتے ہوئے راستے میں آتا ہے۔ خورشید نے کہا کہ میں نرگس کو چک بتی چھوڑ کر صورت نگر کی طرف نکل جاؤں گی اس لیے ہم نے نرگس کو اس کے ساتھ بھیج دیا تھا۔''

صورت نگر نامی گاؤں چک بتی سے دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں نے رحمت بی بی سے پوچھا۔

''مجھے پتا چلا ہے کہ جاوید غصے کا بہت تیز تھا۔ اس واقعے سے پہلے اس کا کسی سے کوئی جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا تھا...... میرا مطلب ہے، ادھر بازار میں کسی سے اس کی منہ ماری ہوئی ہو؟''

''نہیں جی، ایسا تو کچھ نہیں ہوا۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ جیدے کو غصہ جلدی آجاتا تھا لیکن ان دنوں میں اس کا کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔'' لحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''تھانے دار صاحب! آپ اپنا وقت برباد کررہے ہیں۔ میں نے قاتل کی نشان دہی کردی ہے۔ آپ ساجد کو گرفتار کرکے اس پر سختی کریں۔ مجھے یقین ہے، وہ زبان کھول دے گا۔''

''میں تمہارے اس مشورے پر ضرور عمل کروں گا۔'' میں نے تشفی آمیز انداز میں کہا۔ ''لیکن ہر زاویے سے تفتیش کرنا میرا فرض بنتا ہے۔ تم فکر نہیں کرو۔ میں بہت جلد تمہارے بیٹے کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچادوں گا۔''

میں تھوڑی دیر مزید وہاں بیٹھا پھر خورشید بیگم کے گھر آیا۔ رحمت بی بی اور خورشید بیگم کے گھر آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ خورشید بیگم اور اس کا شوہر طالب حسین ایک بے اولاد جوڑا تھے۔ طالب حسین نے تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا تھا اور ایک سانحے میں وہ اس قدر شدید زخمی ہوگیا تھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں پر سے کاٹنا پڑی تھیں۔ چند روز پہلے خورشید بیگم میرے پاس تھانے آئی تھی اور اس نے رحمت بی بی، خالدہ اور جاوید کی مجھ سے شکایت کی تھی۔ اس کے خیال میں نرگس کے ساتھ اس گھر میں بہت ظلم ہورہا تھا۔ میں نے خورشید بیگم کو اس وقت کافی مایوس کیا تھا۔ رحمت بی بی کے گھر میں اس کی مطلقہ بیٹی خالدہ سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی اور...... میں نے اسے کافی تیز وطرار پایا تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ خالدہ کی زبان درازی کی وجہ سے اسے طلاق ہوئی تھی۔

خورشید بیگم کا شوہر طالب حسین خاصا زندہ دل اور دوراندیش انسان تھا۔ ہم تھوڑی دیر تک تحریکِ آزادی کی یادوں کو تازہ کرتے رہے پھر تازہ ترین صورتِ حال زیر بحث آگئی۔ خورشید بیگم نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلائی اور بولی۔

''تھانے دار صاحب! میں نے آپ سے کہا تھا نا، کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ آپ دیکھ لیں۔ نرگس کے ساتھ تو کچھ نہیں ہوا مگر جاوید جان سے چلا گیا۔''

''بڑی دردناک موت ہوئی ہے اس کی۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''ظالموں نے اس کی کھوپڑی اور جسم کے مختلف حصوں کا ستیاناس مار کر رکھ دیا ہے۔ تم لوگوں کے خیال میں جاوید کا قاتل کون ہوسکتا ہے یا ہوسکتے ہیں؟'' اپنی بات کے اختتام پر میں نے سوالیہ نظر سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔

''مجھے تو یہ لوٹ مار اور راہزنی کی واردات لگتی ہے۔'' طالب حسین نے کہا۔

خورشید بیگم بولی۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

میں نے ان دونوں کے خیالات کو رد کرنے کے لیے منطقی انداز میں انہیں بتایا کہ وہ کسی بھی طور پر راہزنی کی واردات نہیں تھی۔ اگر وہ ڈاکو لٹیرے ہوتے تو مقتول کی جیب میں سے مجھے ہرگز ہرگز دو سو روپے نہ ملتے۔ اس وضاحت کے بعد انہوں نے میری بات سے اتفاق کرلیا۔

''خورشید بیگم! مجھے بتایا گیا ہے کہ نرگس تمہارے ساتھ چک بتی گئی تھی؟''

''آپ کو بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''نرگس کافی عرصے سے اپنے میکے جانے کے لیے تڑپ رہی تھی لیکن جاوید کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے اسے ٹال دیتا تھا۔ جب نرگس کے باپ خیردین کو زہریلے سانپ نے دائیں ہاتھ پر ڈس لیا اور خیردین کی زندگی بچانے کے لیے اس کے متاثرہ ہاتھ کو کاٹنا پڑا تو نرگس اس واقعے سے بہت غم زدہ ہوگئی تھی اور ہر لمحہ چک بتی جانے کو اس کا دل مچل رہا تھا لیکن سنگ دل اور بے رحم جاوید پر اس واقعے اور نرگس کی حالت کا ذرا اثر نہ ہوا۔ پھر میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا اور میں نے فوراً اس آئیڈیے پر عمل بھی کر ڈالا......''

''تو گویا تمہارا صورت نگر جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا؟'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔

''آپ سمجھدار انسان ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ

تعریفی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں نے نرگس کو اس کے ماں باپ اور بھائی سے ملوانے کے لیے ایک ڈراما رچایا تھا۔ میں نے رحمت بی بی سے کہا کہ جاوید کو تو وقت نہیں مل رہا چک بتی جانے کا۔ میں اتفاق سے صورت نگر جا رہی ہوں۔ تم نرگس کو میرے ساتھ بھیج دو۔ میں اسے چک بتی پہنچانے کے بعد صورت نگر چلی جاؤں گی اور...... رحمت بی بی نے میری بات مان لی......'' لحاتی توقف کر کے اس نے ایک آسودہ سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تھانے دار صاحب! جب گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکل رہا ہو تو پھر انگلی کو ٹیڑھا کرنا ہی پڑتا ہے......''

''اور تم نے چک بتی پہنچتے ہی نرگس کے ماں باپ کو اس کے حالات کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔'' میں نے کہا۔ ''حالانکہ نرگس نے تمہیں سختی سے منع کیا تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

''یہ بہت ضروری تھا تھانے دار صاحب۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''نرگس کے حالات سے میں بہت دکھی تھی۔ اس کے ماں باپ کو کسی بات کی خبر ہی نہیں تھی۔ میں نے جو کچھ بھی کیا، نیک نیتی سے کیا ہے اور نیکی کرتے وقت بہت سی چیزوں کو نظر انداز بھی کرنا پڑتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو خورشید بی بی۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ ''یہ نرگس کے بانجھ پن کا کیا قصہ ہے؟''

''یہ سراسر نرگس پر الزام ہے جناب۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس کے ساتھ بانجھ پن والا کوئی معاملہ نہیں۔''

''تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو؟'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا۔ ''اس کی شادی کو چھ سال ہو گئے ہیں اور ابھی تک وہ بے اولاد ہے......''

''میں یہ بات اتنے وثوق سے اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ان چھ سالوں میں دوبار نرگس کا ابارشن ہوا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اگر نرگس بانجھ ہوتی تو پھر اس کے ہاں امید کا پودا پنپنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو خورشید بیگم۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کسی بانجھ عورت کا ابارشن نہیں ہو سکتا۔''

''مجھے تو جاوید ہی میں کوئی نقص لگتا ہے ملک صاحب۔'' طالب حسین نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''نقص کیا، میرے خیال میں بالکل ناکارہ ہے۔'' خورشید بیگم ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''اسی لیے اسے غصہ بھی زیادہ آتا ہے۔ ناکارہ بندہ اپنی ناکامیوں کا غصہ دوسروں پر ہی نکالتا ہے، یہ تو آپ بھی مانتے ہیں تھانے دار صاحب!''

''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''اس کے علاوہ موٹے جثے والے بندے کو بھی زیادہ غصہ آتا ہے۔ جاوید بھی خاصے بھاری بھرکم وجود کا مالک تھا۔''

میں نے جائے وقوعہ سے ملنے والے فیروزے والے لاکٹ کو نرگس اور رحمت بی بی کو دکھایا تھا لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس لاکٹ کو نہیں پہچانا تھا۔ میں نے مذکورہ لاکٹ خورشید بیگم کو بھی دکھایا لیکن اب کی بار بھی نتیجہ صفر کے برابر ہی برآمد ہوا۔ میں ان کے گھر سے اٹھا اور تھانے آ گیا۔

تھانے پہنچ کر میں نے ایک سادہ لباس اہلکار کو ''خصوصی ہدایات'' کے ساتھ جائے وقوعہ کی جانب روانہ کر دیا۔

☆☆☆

آئندہ روز میں نے ایک کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور ریل بازار پہنچ گیا۔ قصبہ جلال پور مین روڈ اور ریلوے لائن کے بیچ میں واقع تھا اسی لیے اس بازار کا نام ریل بازار رکھا گیا تھا۔ یہ بازار ریلوے اسٹیشن کے سامنے سے سیدھا اندر قصبے کی طرف آتا تھا اور اسی بازار میں جاوید کی کپڑے کی دکان تھی۔

ریل بازار میں ملی جلی ہر چیز کی دکانیں تھیں۔ جاوید کے قتل کی اطلاع ہر شخص کو ہو چکی تھی۔ میں نے اس کے آس پاس والے دکان داروں سے پوچھ تاچھ کی تاکہ یہ پتا چلایا جا سکے کہ جاوید کو پیش آنے والے واقعے کا ذمے دار کون ہے۔ اس تفتیش کا نتیجہ بھی صفر کے برابر ہی برآمد ہوا۔ ان میں سے کسی نے بھی جاوید کے قاتلوں کے حوالے سے ایسی کوئی بات نہیں کی جس کی روشنی میں اس کیس کو میں آگے بڑھا سکتا۔ میں ناکام و نامراد واپس تھانے آ گیا۔

نرگس کی زبانی مجھے اس کے نو عمر عاشق ساجد کی کہانی معلوم ہو چکی تھی اور یہ بھی پتا چلا تھا کہ وہ پچھلے چار سال سے لاہور میں نوکری کر رہا ہے۔ نرگس کی شادی سے وہ اس قدر

دل برداشتہ ہوا تھا کہ اس نے چک بتی ہی کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ اب وہ اپنے ماں باپ سے ملنے ادھر کا چکر لگا لیا کرتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق ساجد ایک ماہ پہلے چک بتی آیا تھا اور اس وقت وہ لاہور ہی میں تھا۔

جب نرگس کی زبان سے میں نے ساجد کا ذکر سنا تھا تو فوری طور پر میرا ذہن اس کی طرف بھی گیا تھا۔ میں نے نرگس کو اس حوالے سے کافی کریدا تھا کہ کہیں جوشِ انتقام میں آ کر ساجد ہی نے تو جاوید کا کام تمام نہیں کر دیا۔ رقابت کا جذبہ بڑے خطرناک نتائج لا سکتا ہے لیکن نرگس نے میرے خیال کی تردید کر دی تھی۔

نرگس کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا لہٰذا اس کیس میں وقتی طور پر ساجد کی طرف سے میرا دھیان ہٹ گیا تھا لیکن رحمت بی بی نے دوبارہ اس جانب میری توجہ مبذول کرا دی تھی۔ رحمت بی بی کا اصرار تھا کہ میں فوری طور پر ساجد کو گرفتار کر کے اس پر سختی کروں تو وہ زبان کھول دے گا۔ اسے یقین تھا اور اس نے مجھے بھی یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ ساجد ہی نے اس کے بیٹے جاوید کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔

رحمت بی بی لاکھ لڑاکو، ظالم اور فتنہ پرور عورت سہی لیکن وہ مقتول کی وارث تھی۔ اگر وہ اپنے بیٹے کے قاتل کے سلسلے میں کسی شخص پر اپنے شک کا اظہار کر رہی تھی تو میں اس کے دعوے کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ رحمت بی بی کی نشان دہی پر اس لیے بھی توجہ دینے کی ضرورت تھی کہ ساجد چھ سال پہلے نرگس کا طلب گار رہا تھا۔

میں نے ایک ہوشیار قسم کے اہلکار کو لاہور روانہ کر دیا تاکہ وہ ساجد کے معمولات پر گہری نگاہ رکھ سکے۔ اگر وہ جاوید کے قتل میں ملوث تھا تو اس نے کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور کرنا تھی اور جبھی وہ پکڑ میں آ جاتا۔

دوپہر کے بعد پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی جاوید کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش بھی تھی۔ میں نے رحمت بی بی کو اطلاع بھجوا دی کہ وہ تھانے آ کر ضروری کارروائی کے بعد اپنے بیٹے کی لاش وصول کر لے۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق جاوید کی موت بارہ اکتوبر کی شام کسی وقت واقع ہوئی تھی۔ موت کے وقت کا تعین سہ پہر اور شام کے درمیان کیا گیا تھا۔ ریل بازار سے میں پتا چلا چکا تھا کہ جاوید بارہ اکتوبر کو دوپہر کے بعد دکان بند کر کے چلا گیا تھا۔ اس حساب سے سہ پہر کو اسے چک بتی کے آس پاس ہونا چاہیے تھا۔ قصبہ جلال پور سے چک بتی صرف چار میل کے فاصلے پر تھا۔ نرگس اور اس کے ماں باپ کی زبانی مجھے پتا چل چکا تھا کہ جاوید چک بتی نہیں پہنچا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ اسے چک بتی میں داخل ہونے سے پہلے ہی ٹھکانے لگا دیا گیا تھا پھر اس کی لاش کو گھسیٹ کر چاول کے کھیتوں کے اندر چھپا دیا گیا تھا تاکہ فوری طور پر اس پر کسی کی نظر نہ پڑے۔

میں نے بڑی باریک بینی سے جائے وقوعہ کا معائنہ کیا تھا اور پوسٹ مارٹم رپورٹ میرے تجزیے کی تصدیق کرتی تھی۔ مجھے بھی جاوید کی لاش کو کچے راستے سے گھسیٹ کر کھیتوں کے اندر لانے کے آثار ملے تھے۔ یقیناً جاوید کو اس کچے راستے پر گھیر کر مارا گیا تھا جو جلال پور سے چک بتی کی طرف آتا تھا گویا چک بتی پہنچنے سے پہلے ہی اسے موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ نے میرے ایک اور اندازے کی بھی تصدیق کر دی تھی کہ حملہ آور ایک سے زیادہ افراد تھے۔ رپورٹ کے مطابق کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ چار افراد نے لاٹھیوں کی مدد سے اس پر بھرپور حملہ کیا تھا اور اسے سنبھلنے کا ذرا موقع نہیں دیا تھا۔ نتیجے کے طور پر اس کی کھوپڑی کا حشر نشر ہو گیا۔ علاوہ ازیں اس کے دست و بازو بھی شدید زخمی ہوئے تھے۔

پورا دن جاوید کے بہیمانہ قتل کی گتھی کو سلجھانے میں گزر گیا لیکن ابھی تک اس کیس کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں نے کسی بھی حال میں مایوس ہونا نہیں سیکھا۔ میرا یہ ایمان ہے کہ سختی اور پریشانی کی کوئی رات چاہے کتنی بھی طویل کیوں نہ ہو، اسے کبھی نہ کبھی ختم ہونا ہی ہوتا ہے۔ سحر کو طلوع ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ جو لوگ سحر کے انتظار میں ثابت قدم رہتے ہیں وہ منزل کا سراغ پا لیتے ہیں۔

چودہ اکتوبر کی شام کو جب میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں آیا تو میرا دل خاصا بوجھل اور دماغ الجھا ہوا تھا اور یہ عین فطری کیفیت تھی۔ پچھلے دو دنوں سے میں جس قسم کے حالات سے گزر رہا تھا، یہ سب اسی کے اثرات تھے۔

میں نے رات کا کھانا کھایا اور عشا کی نماز ادا کی۔ وہ اکتوبر کا زمانہ تھا۔ گلابی جاڑے کا آغاز ہو چکا تھا۔ دن اگرچہ گرم ہی تھا لیکن رات میں ٹھنڈک ہو جاتی تھی۔ میں سونے کے لیے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ میرے کوارٹر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس وقت دستک کا مطلب ایک ہی تھا کہ تھانے میں کوئی ایمرجنسی ہو گئی تھی۔ جب میں تھانے

سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں آجاتا تھا تو پھر میرا اسٹاف چھوٹے موٹے معاملات کے لیے مجھے پریشان نہیں کرتا تھا حالانکہ میں نے واضح الفاظ میں ان سے کہہ رکھا تھا کہ کوئی بھی معاملہ ہو، مجھے فوراً بلالیا جائے۔ میرا کوارٹر تھانے کے عقبی حصے میں احاطے کے اندر ہی بنا ہوا تھا۔

میں نے دروازہ کھولا تو شبینہ ڈیوٹی والے ایک کانسٹیبل کی صورت دکھائی دی۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”فاروق! خیریت تو ہے نا......؟“

”ملک صاحب! چک بتی سے ناصر واپس آگیا ہے اور وہ اپنے ساتھ ایک بندے کو بھی لایا ہے۔“

ناصر وہی پولیس اہلکار تھا جسے میں نے سادہ لباس میں جائے وقوعہ کی کڑی نگرانی پر تعینات کیا تھا۔ اگر وہ کسی بندے کو ساتھ لایا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس کے پاس کوئی بڑی خبر تھی۔

”تم چلو میں آرہا ہوں۔“ میں نے کانسٹیبل فاروق سے کہا۔

وہ مجھے سیلیوٹ مار کر واپس چلا گیا۔ ٹھیک پانچ منٹ کے بعد میں تھانے میں اپنے کمرے میں سول ڈریس میں موجود تھا۔ ناصر نے اپنے ساتھ لائے ہوئے بندے کو فوراً میرے سامنے پیش کردیا اور بتایا۔

”ملک صاحب! میں نے اس بندے کو جائے وقوعہ سے پکڑا ہے۔ یہ ادھر کچے راستے پر کچھ تلاش کررہا تھا۔ آپ نے مجھے جائے وقوعہ کی نگرانی کا کام سونپا تھا۔ یہ بندہ اور اس کی حرکتیں مجھے مشکوک لگیں تو میں نے اسے پکڑلیا اور پکڑ کر آپ کے پاس لے آیا ہوں۔ باقی کا انٹرویو آپ خود کرلیں۔“

وہ بندہ سر جھکائے میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا ڈیل ڈول اور قد کاٹھ اچھا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کڑک دار آواز میں پوچھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”بھولا جی...... مجھے بھولا کہتے ہیں۔“ اس نے سہمی ہوئی آواز میں بتایا۔

”بھولا......!“ میں نے اس کے الفاظ دہرائے پھر طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تم تو کہیں سے بھی بھولے نظر نہیں آتے۔ مجھے تو تم دس نمبری بدمعاش لگتے ہو۔“

”تھانے دار صاحب! میں بے قصور ہوں۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر منت ریز لہجے میں بولا۔ ”آپ کا بندہ مجھے خوامخواہ ہی پکڑ کر یہاں لے آیا ہے۔“

"میرے اسٹاف کے لوگ خوامخواہ کچھ بھی نہیں کرتے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "بتاؤ، تم کچے راستے پر کیا تلاش کر رہے تھے؟ کیا تمہاری ماں کے جھمکے وہاں گم ہو گئے تھے؟"

"وہ جی...... میں تو وہاں کچھ بھی نہیں ڈھونڈ رہا تھا۔" وہ جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا۔ "بس جی، میں تو ادھر سے گزر رہا تھا اور آپ کے بندے نے مجھے پکڑ لیا۔"

"یہ ایسے زبان نہیں کھولے گا ملک صاحب!" ناصر نے دبے دبے جوش کے ساتھ کہا۔ "آج کی رات آپ اسے میرے حوالے کر دیں، میں اس کے سارے کس بل نکال کر الف کی طرح سیدھا کر دوں گا۔"

"کیوں بھئی بھولا......!" میں نے اس بندے کی طرف دیکھتے ہوئے کڑے لہجے میں پوچھا۔ "تم شرافت سے زبان کھولتے ہو یا میں تمہیں ناصر کے حوالے کر دوں؟"

"آپ میری بات کا یقین کریں جناب۔" وہ روہانسی آواز میں بولا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا۔"

اگرچہ بھولا کا انداز منت سماجت والا تھا لیکن میں نے اس کی آنکھوں سے جھلکتی مکاری اور عیاری کو صاف پڑھ لیا تھا لہٰذا اس کے لیے میرے دل میں ہمدردی یا نرمی کے جذبات ابھر ہی نہیں سکتے تھے۔

"اگر میں تمہیں تمہاری اماں جان کے گم شدہ جھمکوں کی جھلک دکھا دوں تو پھر تم سب سچ سچ بتا دو گے نا......" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں اس سے استفسار کیا۔

"کون سے جھمکے؟" وہ بے ساختہ بول اٹھا۔

"وہی جھمکے...... جنہیں تم چک بتی کے کچے راستے پر بڑی شدومد سے تلاش کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ مصنوعی پریشانی سے بولا۔

میں نے اس کی اداکاری کو بھانپ لیا اور اپنی میز کی دراز کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ابھی سب تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔ ماں کے جھمکے تمہاری کھوئی ہوئی یادداشت کو واپس لے آئیں گے۔"

وہ ہراساں نظر سے ادھر اُدھر تکنے لگا۔ میں نے میز کی دراز کے اندر سے فیروزے والا وہ لاکٹ برآمد کر لیا جو جائے وقوعہ سے مجھے ملا تھا اور اس میں جڑا ہوا فیروزہ چٹخا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لاکٹ انہی حملہ آوروں میں سے کسی کا تھا جنہوں نے جاوید کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میں نے مذکورہ لاکٹ کو بھولا کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

"ان جھمکوں کو پہچانتے ہو......؟"

یہ سوال کرتے وقت میں بھولا کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور میں نے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی بڑی واضح چمک نوٹ کی یعنی اس نے فیروزے والے لاکٹ کو پہچان لیا تھا لیکن اگلے ہی لمحے ڈھٹائی نے اس چمک کی جگہ لے لی اور وہ منافقانہ لہجے میں بولا۔

"یہ جھمکے تو نہیں ہیں، ایک لاکٹ ہے اور...... اس لاکٹ سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں......"

"میں نے پوچھا کہ اس لاکٹ کا تم سے واسطہ تعلق ہے یا نہیں؟" میں نے کھا جانے والی نظر سے اسے گھورا۔

"وہ جی...... آپ مجھے دکھا جو...... رہے ہیں اس لیے...... میں نے کہا......" وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

میں نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔ "تو یہ لاکٹ تمہارا نہیں ہے؟"

"نن...... نہیں......" اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"ناصر! یہ بندہ آج کی رات تمہارا مہمان ہے۔" میں نے کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "تم رات بھر اس کی خوب خاطر تواضع کرو۔ صبح تک اس کی زبان کا تالا کھل جانا چاہیے۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب!" کانسٹیبل ناصر خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "میں اس کا 'بہت خیال' رکھوں گا۔ آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا اور صبح جب آپ تھانے آئیں گے تو یہ کسی ٹیپ کی طرح فرفر بولنے کے قابل ہو جائے گا...... انشاء اللہ!"

اگر میں نے بھولا کی آنکھوں میں فیروزہ والے لاکٹ کے حوالے سے شناسائی کی چمک نہ دیکھی ہوتی تو میں اسے ہرگز ہرگز ناصر کے حوالے نہ کرتا۔

☆☆☆

اگلی صبح خاصی روشن اور چمک دار تھی۔ یہ صبح میرے لیے ایک خاص زاویے سے اہمیت کی حامل تھی کیونکہ پندرہ اکتوبر کی صبح جب میں تھانے پہنچ کر اپنی کرسی پر بیٹھا تو ایک خوش خبری میری منتظر تھی۔ ناصر نے میرے پاس آ کر بتایا۔

"ملک صاحب! بھولا نے زبان کھول دی ہے۔"

"کیا اس نے فیروزے والے لاکٹ کی ملکیت قبول کر لی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہ صرف ملکیت قبول کر لی ہے بلکہ اس نے جاوید کے قتل کا اقرار بھی کر لیا ہے۔" کانسٹیبل نے سنسنی خیز لہجے

میں بتایا۔ ''اس نے اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے بارہ اکتوبر کی سہ پہر چک بتی کے قریب کچے راستے پر جاوید پر لاٹھیوں سے حملہ کر کے اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ ان کے وار ایسے زوردار تھے کہ جاوید کو اپنی حفاظت کا موقع ہی نہیں مل سکا اور وہ چند لمحات ہی میں اپنی جان کی بازی ہار گیا۔''

''کیا بھولا نے اپنے دونوں ساتھیوں کے نام بھی بتائے ہیں؟''

''جی بتائے ہیں۔'' کانسٹیبل نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ان میں سے ایک کا نام قادر اور دوسرے کا نام فرید ہے۔ میں نے بھولا کی نشان دہی پر قادر اور فرید کی گرفتاری کے لیے دو اہلکاروں کو روانہ کر دیا ہے۔''

''شاباش!'' ناصر اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش رچکا تو میں نے تعریفی انداز میں اس کی ''پھرتی'' کو راہا۔

ایک لحاظ سے جاوید کے قتل کا معما حل ہو چکا تھا۔ اگر بھولا نے اقبالِ جرم کر لیا تھا تو اس کے شریک جرم ساتھیوں قادر اور فرید کو پکڑنا زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن اس کیس کا ایک پہلو ابھی تک تشنہ تھا۔ مجھے اس سوال کا بھی جواب چاہیے تھا کہ انہوں نے جاوید کی جان کیوں لی؟

میں نے ناصر سے پوچھا۔ ''کیا بھولا نے بتایا کہ ان لوگوں کی جاوید سے کیا دشمنی تھی؟''

''براہِ راست ان کی جاوید سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔'' ناصر نے جواب دیا۔ ''یہ کام انہوں نے پیسوں کے لالچ میں کیا ہے۔''

''پیسوں کے لالچ میں......؟'' میں چونک اٹھا۔ ''کس نے انہیں پیسے دیے تھے...... جاوید کا اصل دشمن کون ہے؟''

وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''ساجد......!''

''اوہ......'' میں گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ ''وہی ساجد نا جس کا تعلق چک بتی سے ہے اور وہ لاہور میں نوکری کرتا ہے؟''

''جی بالکل وہی۔'' کانسٹیبل نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''بھولا نے اسی کا نام لیا ہے۔''

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا...... تو گویا رحمت بی بی کا دعویٰ درست تھا۔ جاوید کے قتل کا ذمے دار ساجد ہی تھا۔ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے تو جاوید کی جان نہیں لی تھی لیکن یہ قتل اسی کے ایما پر ہوا تھا لہٰذا وہ اس قتل کی واردات میں برابر کا شریک تھا۔

میں نے گزشتہ روز ایک اہلکار کو اس کی کڑی نگرانی کے لیے لاہور روانہ کیا تھا لیکن اب حالات نے جو کروٹ لی تھی اس کی روشنی میں ساجد کو فی الفور گرفتار کر کے یہاں لانا ضروری تھا لہٰذا میں نے دو افراد کی ٹیم کو ساجد کی گرفتاری کے لیے فوراً لاہور روانہ کر دیا۔

پندرہ اکتوبر کا سورج غروب ہونے سے پہلے یہ کیس اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا تھا۔ ناصر نے قادر اور فرید کی گرفتاری کے لیے جن اہلکاروں کو روانہ کیا تھا، وہ دوپہر تک کامیاب واپس آ گئے۔ قادر اور فرید کی ٹھیک ٹھاک چھترول کے بعد ان کا بیان ریکارڈ کیا گیا۔ انہوں نے بھولا کے شریکِ جرم ہونے کا اقرار کر لیا تھا۔ انہیں بھی بھولا کے ساتھ ہی حوالات میں بند کر دیا گیا۔

لاہور جانے والی ٹیم لگ بھگ پانچ بجے واپس آئی اور اپنے ساتھ ساجد کو بھی لائی، میں نے ساجد کو اپنے کمرے میں بلا لیا اور کرخت لہجے میں کہا۔

''تم نے جن تین افراد کو پیسے دے کر جاوید کے قتل کا فریضہ سونپا تھا، وہ اس وقت میرے تھانے کی حوالات میں بند ہیں۔ انہوں نے تمہارے جرم کی قلعی کھول دی ہے۔ تم اپنی حمایت میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

''میں نے بھولا، قادر اور فرید کو حوالات میں بیٹھے دیکھ لیا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ان میں سے میں صرف بھولا کو جانتا ہوں۔ باقی دونوں بھولا کے ساتھی ہیں۔ ان کے نام مجھے آپ سے معلوم ہوئے ہیں اور میں نے آج پہلی مرتبہ انہیں دیکھا ہے اور جہاں تک اپنی حمایت میں کچھ کہنے کی بات ہے تو......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں بہت بدقسمت ہوں۔ میں نہ تو نرگس کو حاصل کر سکا اور نہ ہی اسے جاوید کے ظلم و ستم سے بچانے میں کامیاب ہو سکا......''

''کامیاب تو تم ہو چکے ساجد۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''جاوید کی موت کے بعد نرگس آزاد ہو چکی ہے۔''

''وہ تو آزاد ہو چکی ہے......'' وہ حسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''لیکن میری آزادی چھن گئی ہے۔ اگر بھولا نہ پکڑا جاتا تو آپ کبھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔''

ایک لحاظ سے وہ درست ہی کہہ رہا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ میں نے اس کی نگرانی کا کامل بندوبست کر رکھا تھا، میں نے اس سے پوچھا۔

''ساجد! کیا تمہیں یقین تھا کہ جاوید کے قتل کے بعد نرگس تم سے شادی کے لیے تیار ہوجائے گی؟''

''میں نے ایک جوا کھیلا تھا۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''اگر وہ راضی ہوجاتی تو میں اپنی قسمت پر رشک کرتا اور اگر اس بار بھی ادھر سے مجھے انکار ہی سننے کو ملتا تو میں یہ سوچ کر مطمئن ہوجاتا کہ...... کم ازکم میں نے نرگس کو جاوید، رحمت بی بی اور خالدہ کے ظلم وستم سے تو نجات دلادی۔ وہ گھر نرگس کے لیے کسی جہنم سے کم نہیں تھا۔''

ساجد کی بات سن کر میں چونک اٹھا۔ میں نے اضطراری لہجے میں اس سے دریافت کیا۔ ''تمہیں یہ بات کیسے پتا چلی کہ جاوید کا گھر نرگس کے لیے دوزخ سے کم نہیں تھا؟''

میرے سوال پر وہ جزبز ہوکر رہ گیا۔

''نرگس کی شادی کو چھ سال ہوگئے ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کی زندگی تو روزِ اول ہی سے سپردِ عذاب تھی۔ پھر تمہیں چھ سال کے بعد اسے جہنم سے نکالنے کا خیال کیوں آیا۔ کیا اب تک تم بھنگ پی کر سورہے تھے؟''

''مجھے ایک ماہ پہلے ہی نرگس کے حالات کی خبر ہوئی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''جب میں چک بتی آیا تھا۔''

نرگس کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ سسرال میں اس پر ظلم کے جو پہاڑ توڑے جارہے تھے، اس کی صدا پہلی مرتبہ چک بتی میں چار روز پہلے دس اکتوبر کو اس وقت گونجی تھی جب خورشید بیگم نے خیردین اور صفیہ بی بی یعنی نرگس کی ماں کو اس کی بپتا سنائی تھی۔ دس اکتوبر سے پہلے چک بتی میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ قصبہ جلال پور میں پچھلے چھ سال سے نرگس کن حالات کا شکار ہے۔ پھر ایک ماہ پہلے ساجد کو کس نے ان حالات کی خبر دی؟

یہی سوال میں نے جب ساجد سے کیا تو اس کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔

''نرگس کے حالات کے بارے میں مجھے خورشید بیگم نے بتایا تھا۔''

خورشید بیگم کو ساجد کے جواب کے بعد شاملِ تفتیش کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ اس مرتبہ میں نے اسے تھانے بلالیا۔ پچھلی بار میں نے اس کے گھر میں تیرہ اکتوبر کی شام اس سے ملاقات کی تھی اور اس کے یہ الفاظ ابھی تک میرے ذہن میں نقش تھے...... تھانے دار صاحب! جب گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکل رہا ہو تو پھر انگلی کو ٹیڑھا تو کرنا ہی پڑتا ہے نا!

گویا خورشید بیگم نے نرگس کو اس جہنم سے نکالنے کے لیے دو مرتبہ اپنی انگلی ٹیڑھی کی تھی۔ پہلی بار ایک ماہ پہلے جب اُس نے ساجد کو اس کے حالات سے آگاہ کیا تھا اور دوسری مرتبہ چار دن پہلے جب اس نے نرگس کے ماں باپ کو ساری کہانی سنائی تھی۔

خورشید بیگم تھانے پہنچی تو اس کے چہرے پر ڈر اور خوف کا نام ونشان نہیں تھا۔ میں نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔

''تو اس سارے کھیل میں تم نے اہم کردار ادا کیا ہے؟''

اس وقت میرے اور خورشید بیگم کے سوا کمرے میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولی۔

''تھانے دار صاحب! میں تو سب سے پہلے شکایت لے کر آپ ہی کے پاس آئی تھی لیکن آپ نے میری بات کا یقین ہی نہیں کیا تھا......''

''جب میں نے تمہاری خواہش کے مطابق رحمت بی بی، خالدہ اور جاوید کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تو تم نے خود تھانے دار بننے کا فیصلہ کرلیا...... ہیں نا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''تم نے سوچا گھی سیدھی انگلی سے تو نکل نہیں رہا، اب انگلی کو ٹیڑھا کرنا چاہیے۔''

''میں نے جو کچھ کیا، خلوصِ نیت سے کیا ہے۔'' وہ بے خوف لہجے میں بولی۔ ''میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ ساجد، جاوید کو قتل کرادے۔ میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ ساجد کسی طرح نرگس کو اس جہنم سے نکالے۔ ساجد نے کرائے کے قاتلوں کی مدد سے جو کچھ کیا، یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ میں اس کے اعمال کی ذمے دار نہیں ہوں۔''

ساجد کے اقبالِ جرم کے بعد میرا کام آسان ہوگیا تھا۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جاوید نے اپنی زندگی سے ہاتھ دھوئے۔ یہ سب حکمِ ربی سے ہوا تھا لیکن میں اس وقت کے ذمے داروں کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں نے ساجد، بھولا، قادر اور فرید کو جاوید کے قتل کے الزام میں حوالۂ عدالت کردیا۔

میں نے خورشید بیگم کو بھی ایک سزا دی تھی لیکن میں آپ کو بتاؤں گا نہیں کہ وہ سزا کیا تھی۔ ذہین قارئین اندازہ لگانے کی کوشش کریں۔

(تحریر: حُسام بٹ)

گفتگو کی بھنبھناہٹ میں...... لوگوں کے ازدحام میں ایک کمزور سی آواز ابھری تھی۔ ''اس سے پستول چھین لو...... یہ مجھے مار ڈالے گا......''
مگر اس شور میں یہ آواز دب کر رہ گئی اور ایک زوردار آواز آئی۔ گولی کی آواز...... اس آواز کو سنتے ہی وہاں موجود لوگوں میں افراتفری پھیل گئی۔ گولی مارنے والا باہر کے گیٹ کی جانب بھاگا جسے گیٹ پر موجود گن مین نے پکڑلیا اور کمال مہارت سے اس کے ہاتھ میں موجود پسٹل

ایک بلیک میلر کی خباثت کی شرانگیزی اور عبرت ناک انجام

بند گلی

علی اختر

انسانی فطرت اتنی الجھی ہوئی اور سخت ہوگی، خدا کی قدرت اس بات کو پہلے سے جانتی تھی تب ہی تو اللہ تعالیٰ نے زندگی، موت اور رزق جیسے معاملات اپنے ہاتھ میں رکھے... اس کے باوجود کچھ لوگ، دوسروں کو حلال رزق کمانے کھانے میں رکاوٹیں ڈال کر اپنی برتر حیثیت اور اختیارات کی دھاک بٹھا کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ وہ بھی کچھ ایسا کرنا نہیں چاہتی تھی جیسا کرنے پر اسے مجبور کر دیا گیا... لیکن وہ ایسا نہ کرتی تو پھر ویسا ہو جاتا جیسا وہ شاطر چاہتا تھا۔



بھی چھین لیا۔

زخمی کو دو آدمیوں نے سہارا دے کر اٹھایا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے اسے باہر لے جانے لگے۔ اس کا خون بہہ رہا تھا۔ چند لمحے پہلے جہاں شور تھا وہاں اب معمول کا کام شروع ہو گیا تھا۔ یہ ساری کارروائی ایک مشہور بینک کی مین برانچ میں ہوئی تھی۔ برانچ منیجر پریشانی کے عالم میں اپنے کیبن سے نکل کر واردات کی جگہ پہنچا تھا۔ یہ ایک بڑی برانچ کا وسیع وعریض ہال تھا۔ وہیں یہ تمام کارروائی ہوئی تھی۔ گولی چلانے اور زخمی ہونے والے دونوں بینک کے ملازم تھے اور آپس میں بھائی بھی تھے۔

برانچ منیجر عرفان بیگ نے فوری طور پر مقامی پولیس اسٹیشن میں اس کی اطلاع دی۔ کچھ ہی دیر میں پولیس کے چند سپاہی اور آفیسر سجاد احمد تفتیش کے لیے برانچ میں آ گئے۔ پولیس انسپکٹر سجاد احمد کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ ذہین نوجوان ہے اور اپنے کام میں مہارت رکھتا ہے۔ اس نے آتے ہی اس مخصوص جگہ کا معائنہ کیا جہاں کچھ دیر پہلے زخمی رشید اور حمید میں جھگڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے ایک سپاہی نے جائے واردات کا نقشہ بنایا اور پھر کچھ عینی شاہدین کو منیجر کے کمرے میں بلا کر ان کے بیانات لیے۔ دونوں بھائیوں کے درمیان گھریلو جائداد کا تنازعہ کافی عرصے سے چل رہا تھا۔ جس کے بارے میں کچھ کچھ خبریں اس کے ساتھی ملازمین تک بھی پہنچتی رہی تھیں اور آج اس کا نتیجہ اس جھگڑے کی صورت میں ہوا۔ زخمی رشید بینک کی مقامی یونین کا آفس سیکریٹری تھا اور اس کے تمام بڑے افسران سے ذاتی تعلقات اس لیے بھی قائم تھے کہ وہ نہ صرف مقامی ٹریڈ یونین کا عہدیدار تھا بلکہ اسے تعلقات بنانے کا فن بھی خوب آتا تھا۔ اس لیے بھی افسران اس سے خاصا دبتے تھے۔ حمید اس کا سگا بھائی تھا اور عمر میں اس سے چھوٹا تھا۔

والد کے مرنے کے بعد سے لے کر اب تک ان دونوں میں جائداد کے بٹوارے کا جھگڑا چل رہا تھا اور رشید اپنی متکبرانہ طبیعت کے باعث اس بٹوارے کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ ویسے بھی رشید اپنے مکارانہ رویے کے باعث پورے بینک میں بدنام تھا۔ اونچا لانبا قد، اس پر بڑی بڑی اور بے ہنگم مونچھیں، ہروقت نشے میں دھت رشید جب کسی کام کی غرض سے بینک کے اعلیٰ عہدے داروں کے کمروں میں جاتا تو اپنے بوٹ کی نوک سے دروازہ کھولتا اور بغیر اجازت کمرے میں چلا جاتا اور پھر باہر کھڑے

دوسرے لوگ اس کے اونچی آواز میں چلّانے سے اندازہ لگا لیتے کہ وہ کس انداز میں بات کرنے کا عادی تھا۔

اس کے علاوہ وہ ہروقت نشے میں رہنے کے سبب اول فول بکنے اور فحش ولچر گفتگو کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ اسے کام لینے کے لیے افسران کو خریدنے کا فن بھی آتا تھا۔ اس کے جاننے والے جانتے تھے کہ اس کام میں وہ خوب صورت کال گرلز اور کاروباری لڑکیوں کو بھی افسرانِ بالا تک پہنچانے سے گریز نہ کرتا۔

بینک اور خصوصاً اس برانچ میں لڑکیاں بھی ملازمت کرتی تھیں جن سے اس کے تعلقات بڑے اچھے طریقے سے قائم تھے۔ گھریلو جھگڑے کی بازگشت اب اس کے ساتھی ملازمین تک بھی پہنچ چکی تھی۔ رشید یونین میں ہونے کی وجہ سے ہروقت اپنی حفاظت کے لیے پستول ساتھ رکھتا تھا چونکہ ملازمین کی جامہ تلاشی نہیں لی جاتی تھی۔ اس لیے حمید بھی اسلحہ بینک میں بغیر کسی روک ٹوک کے لے کر آتا تھا۔ چونکہ دونوں اسلحہ رکھتے تھے اور رشید کو پستول نکالنے میں تھوڑی دیر ہوئی تھی اس لیے حمید نے اپنا کام دکھا ڈالا۔

سجاد احمد نے ابتدائی اطلاعات کو ایک کاغذ پر لکھ لیا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ وہ اس کیس کے باقاعدہ اندراج کے بعد اگلی کارروائی کا آغاز کرے گا۔ اگلے ہی دن بینک میں اسپتال سے اطلاع ملی کہ رشید زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مر گیا ہے۔ اب قتل کی باقاعدہ تفتیش مرحوم کی نوجوان بیوی پریسہ کے اندراج پرچہ کی مدعیت میں ہونے لگی تھی۔ اسی روز ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے حمید کو ایک بار پھر تفتیش کے لیے بینک کی برانچ میں لایا گیا اور اس سے باقاعدہ تفتیش کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس وقت برانچ میں بینک کے اعلیٰ عہدیدار بھی موجود تھے۔ حمید کی آنکھوں میں خوف ضرور جھلک رہا تھا مگر اس کی باڈی لینگویج سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے اسے اپنے اقدام پر قطعاً کوئی شرمندگی نہیں۔

"آپ جانتے ہیں کہ قتل ایک بہت بڑا جرم ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے بینک کے کچھ ملازمین کو بیانات کے لیے پولیس اسٹیشن بلایا جا سکتا ہے۔" سجاد احمد نے دوران چائے نوشی آہستہ آہستہ گفتگو کرتے ہوئے افسران اعلیٰ سے کہا۔

"ہمیں اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن ناجائز دباؤ اور کسی قسم کی متشددانہ کارروائی سے گریز کیا جائے۔" انہوں نے کہا۔

"اگرچہ اصل قاتل ہماری حراست میں ہے لیکن پھر بھی...... یہ سب ضروری ہوتا ہے۔ آپ تو سمجھتے ہی ہیں۔"

سجاد احمد نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر اپنے ساتھی سپاہی کی طرف دیکھا جس نے اپنی بیلٹ کے ساتھ بندھی ہوئی ہتھکڑی کو سنبھالتے ہوئے حمید کو اٹھایا اور ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق گولی مقتول کے جسم کے ساتھ لگا کر چلائی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے گولی کا زہر پورے جسم میں انتہائی سرعت کے ساتھ پھیل گیا تھا اور زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے دورانِ آپریشن مقتول مرگیا تھا۔ مقتول کے نزعی بیان میں بھی اس کے گھریلو جھگڑے کا ذکر موجود تھا۔ اس سلسلے میں بینک کے اعلیٰ افسران کا دباؤ یہ تھا کہ چونکہ بینک ایک اعلیٰ اور شاندار روایات کا حامل نجی ادارہ ہے، لہٰذا اس کی شہرت کو نقصان پہنچائے بغیر اگر اس قتل کی انکوائری کرلی جائے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ سجاد احمد بھی اس بات سے پوری طرح متفق تھا لیکن بات یہیں نہیں ختم ہوجاتی تھی۔ اخباری نمائندگان اور میڈیا کی شہر میں موجود ٹیمیں ہر وقت اِدھر اُدھر دندناتی پھرتی ہیں۔ اس لحاظ سے سجاد احمد دُہرے دباؤ کا شکار تھا...... اوپر سے جب سجاد احمد، مقتول کے گھر اس کی بیوہ سے بیان لینے پہنچا تو اس کے ساتھ بھی اخبارات کے مقامی نمائندے موجود تھے۔

”کیا آپ کے نزدیک یہ صرف جائداد کی تقسیم کے شاخسانے میں کیا جانے والا قتل ہے یا اس کے عوامل کچھ اور بھی ہیں......؟“ ایک تیز طرار اخباری نمائندے نے سجاد احمد کو وہاں موجود پا کر سوال کیا۔

”ہوسکتا ہے، لیکن جب تک تفتیش نہیں مکمل ہوجاتی، کچھ کہا نہیں جاسکتا......“ سجاد احمد نے اطمینان سے جواب دیا۔

”میرے خیال میں جب سے آپ کی تعیناتی اس اسٹیشن میں ہوئی ہے، یہ یہاں کا پہلا کیس ہے اور سنا ہے کہ آپ ایسے اندھے قتل کو حل کرنے میں خاصی مہارت اور شہرت رکھتے ہیں۔“ ایک اور نمائندے نے پوچھا۔

”یہ تو سب اوپر والے کا کرم ہے۔ میں ہر قتل کو کسی مجرم کا...... یا بے گناہ کا قتل نہیں سمجھتا بلکہ انسانیت کا قتل سمجھتا ہوں جو کہ میرے نزدیک ایک گھناؤنا جرم ہے۔ ابھی تو اس کیس کی ابتدا ہے، آگے دیکھیں......“ سجاد احمد نے جان چھڑائی۔

رشید کے گھر میں تعزیت کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ سجاد احمد نے مقتول کی بیوہ پریسہ تک رسائی حاصل کرتے ہوئے اسے الگ لے جا کر بیان دینے کے لیے کہا۔

گھر کی بیٹھک کا دروازہ کھول دیا گیا اور سجاد احمد کو ادھر بلا لیا گیا۔ ایک اونچے لمبے قد کی سرخ وسپید رنگت اور تیکھے نقوش والی، آئیڈیل جسمانی خطوط کی حامل بڑی بڑی گہری نیلی آنکھوں والی نوجوان خاتون بیٹھک میں داخل ہوئی تو سجاد احمد نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔

اس کی گہری نیلی آنکھیں مسلسل رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں۔ چہرے پر غم کی پرچھائیں موجود تھیں۔ وہ خاموشی کے ساتھ سجاد احمد کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی تو سجاد احمد نے گفتگو شروع کی۔

”مجھے آپ کے خاوند کے قتل کا افسوس ہے۔ مجھے اس سلسلے میں آپ سے معلومات درکار ہے۔ آخر وہ کیا معاملہ تھا جس کا سبب اس کے قتل تک آپہنچا؟“ سجاد احمد نے رکتے رکتے اپنے آنے کا سبب بتایا۔ پھر پریسہ کی حالت دیکھتے ہوئے مزید کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ اگرچہ آپ اس وقت گہرے رنج سے گزر رہی ہیں لیکن کچھ سوالات پوچھنا بھی ضروری تھے۔ اس لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔'' سجاد احمد نے مزید توجیہہ دی۔

''جی پوچھیے۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

''کیا حمید کی فیملی بھی آپ کے ساتھ ہی رہتی ہے؟''

''جی......'' مختصر جواب دیا گیا۔

''وہ کدھر...... میرا مطلب ہے، ان کے کمرے الگ سے تھے؟'' سجاد احمد نے پوچھا۔

''وہ حویلی کی دوسری جانب جو کمرے آپ کو نظر آرہے ہیں، انہی کے ہیں لیکن چونکہ ہمارا مشترکہ خاندانی نظام ہے لہٰذا چولہا چوکی ایک ہی ہے۔'' پریسہ نے بتایا۔

''لگتا ہے، آپ پڑھی لکھی ہیں...... کہاں تک......'' سجاد احمد نے بات بدلی۔

''گریجویشن کیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہوں...... تو کیا بتارہی تھیں آپ......'' سجاد احمد نے دوبارہ پوچھا۔

''ہم مشترکہ خاندانی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔ حمید کی بیوی ہمیشہ اسے یہاں سے الگ کرنے کے بارے میں اکساتی رہتی تھی اور جب سے میرے سسر فوت ہوئے ہیں، یہ جھگڑے بڑھتے ہی چلے جارہے تھے۔''

''کیا وہ لوگ پُرسے کے لیے ادھر آئے ہیں؟'' سجاد احمد نے سوال کیا۔

''نہ جی...... جب سے انہوں نے اس بارے میں سنا ہے وہ تو وہ...... خود حمید کی بیوی بھی ادھر سے غائب ہیں۔ وہ لوگ سنا ہے گھر بار کو تالے ڈال کر کہیں اور جا چھپے ہیں۔'' پریسہ نے رک رک کر جواب دیا۔

''آپ کے اپنے شوہر کے ساتھ کیسے تعلقات تھے...... اور آپ کے شوہر کیسے انسان تھے؟'' سجاد احمد نے سوال کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''جیسے ایک شوہر کے اپنی بیوی کے ساتھ ہوتے ہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''ذرا میری طرف دیکھ کر جواب دیں۔'' سجاد احمد بولا۔

اس نے اپنی ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور بولی۔

''کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ......؟''

''میں نے سنا ہے، وہ نشہ کرتا تھا اور بازاری عورتوں سے بھی اس کے تعلقات قائم تھے۔'' سجاد احمد نے آہستہ آہستہ اپنا مقصد واضح کیا۔

''ہوں گے...... کون سے مرد کے ایسے تعلقات نہیں ہوتے۔ ہر بندہ چاہے گھر میں پری ڈال رکھے، لیکن باہر جھک ضرور مارتا ہے اور اگر رشید کے تعلقات باہر ہوں گے تو مجھے اس سے غرض نہیں تھی...... کہ میری تمام ضروریات کا وہ بے حد خیال رکھتا تھا۔'' اس نے تفصیل سے جواب دیا۔

وہ ابھی سوال جواب کر رہے تھے کہ ایک ہلکی سی دستک کے ساتھ بند دروازے کو کھولا گیا اور ایک خوب صورت نوجوان...... جس کے بڑے بڑے بال اس کے کندھے پر گر رہے تھے، اندر داخل ہوا۔ اس نے پتلون اور قمیص پہن رکھی تھی۔ نفیس لباس اور اس کی بولتی آنکھیں بتا رہی تھیں جیسے وہ وقت گزرنے کے ساتھ بہت پریشان ہو رہا ہو...... اور اسی لیے وہ جلدی اور پھرتی سے ادھر بیٹھک میں آیا ہو جہاں سجاد احمد اور پریسہ بیٹھے تھے۔

تیزی سے اندر داخل ہو کر اس نے متجس نظروں سے سجاد احمد کی طرف دیکھا اور پریشانی میں اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھا دیا۔

''وہاج افضل......''

''سجاد احمد......'' اس نے بھی اپنا ہاتھ آگے کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''دراصل میں اس قتل کی تفتیش کر رہا ہوں اور اسی سلسلے میں یہاں بیٹھا ہوں۔'' سجاد نے اپنا تعارف کرایا۔

''اوہ...... دخل اندازی کی معذرت...... دراصل باہر کچھ خواتین ان سے افسوس کرنے آئی تھیں۔ اس لیے......'' اس نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے واپس پلٹنا چاہا۔

''کوئی بات نہیں...... چاہیں تو آپ ادھر بیٹھ رہیں۔'' سجاد احمد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو ایک متوحش سی جھلک اس کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی نظر آئی۔

سجاد احمد نے اپنی پیشہ ورانہ ذہانت کے سبب اسے نوٹ کرتے ہی پریسہ کی طرف دیکھا۔ اس کی خوب صورت اور نیلی آنکھوں میں بھی اسے کچھ ایسا ہی ارتعاش نظر آیا۔ لگتا تھا جیسے اسے یہاں بے سبب آنے کی وجہ سے خلجان سا ہونے لگا تھا۔

''یہ میرے کزن ہیں......'' پریسہ نے اپنی پریشانی پر کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

''میں چلتا ہوں۔'' وہاج افضل نے کہا اور جاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

"دیکھیے...... کیس ابھی شروع ہوتا ہے، ممکن ہے، اس سلسلے میں مجھے کئی بار ادھر آنا پڑے۔ آپ کو ناگوار تو نہیں گزرے گا؟" سجاد احمد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "دراصل مجھے یہ کام اپنے پولیس اسٹیشن میں بیٹھ کر کرنا چاہیے لیکن چونکہ آپ کا تعلق ایک شریف اور معزز فیملی سے ہے اس لیے میں آپ کو ادھر نہیں بلانا چاہتا......"

"نہیں...... نہیں، ایسی کوئی بات نہیں...... آپ جب چاہیں...... مجھے فون کردیں، یہ میرا اسیل نمبر ہے......" اس نے ایک چھوٹی چٹ پر نمبر لکھ دیا اور خود بھی اٹھ گئی۔

سجاد احمد کی پیشہ ورانہ تربیت اسے بتا رہی تھی کہ اس قتل کے محرکات میں ایک سبب تو جائداد کی تقسیم ہوسکتا ہے مگر اس کے پیچھے اور بھی خدشات سر ابھار رہے تھے کیونکہ جب دہاج افضل بیٹھک میں داخل ہوا اسی وقت مقتول کی بیوہ کی آنکھوں میں بے کلی سی اتر آئی تھی اور یہی حیرانی وہاج کی آنکھوں سے بھی جھانک رہی تھی۔ سجاد احمد کو اسی وقت ایک شک سا گزرا تھا کہ ممکن ہے اس قتل کا محرک کچھ اور بھی ہو...... مگر یہ سوچ اس وقت دم توڑ جاتی تھی، جب اس کا قاتل خود پولیس کی تحویل میں تھا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ واپس تھانے آگیا۔ تھانے آکر اس نے ابتدائی رپورٹ کے مطابق حمید کے خلاف پرچہ کاٹا اور اگلے دن اسے عدالت میں پیش کرکے ریمانڈ لے لیا۔

☆☆☆

روزنامہ "فٹ پاتھ" اپنی زرد صحافت کی وجہ سے شہر بھر میں بدنام تھا جو وقتاً فوقتاً اپنی مطلب برآری کے لیے کسی نہ کسی سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں کے خلاف کالم لکھنے، خبریں لگانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اور اس سے بچنے کے لیے ان اداروں کے لوگ اسے اپنی بدنامی کے خوف سے منہ مانگی رقوم دے دیتے تھے۔ اس کے نمائندے شہر میں دندناتے پھرتے تھے اور وہ جس کام کے بھی پیچھے لگ جاتے تو جب تک ان کے مقاصد حاصل نہ کرلیتے اطمینان سے نہ بیٹھتے تھے۔ اس کیس میں بھی یہی ہوا...... جس ادارے میں یہ قتل ہوا تھا، اس کو بدنام کرنے کی سکت تو شاید اس روزنامے کے بس کی بات نہ تھی لیکن پولیس کو اپنے مقصد کے استعمال میں انہوں نے پورا زور لگا رکھا تھا۔

حمید کے ریمانڈ کی خبر ان تک بھی پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا اسی روز جب سجاد احمد اپنی ڈیوٹی پر آکر بیٹھا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

احمق

ایک لکھ پتی نے اپنی بیٹی کے امیدوار سے شادی کا انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم میری بیٹی سے اس وقت بھی محبت کرو گے جب میں اسے تمام جائداد سے عاق کردوں گا؟"

"ہاں یقیناً......" نوجوان نے جواب دیا۔

"تم جاسکتے ہو۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔" لکھ پتی نے کہا۔

"اپنے فیصلے سے مجھے بھی آگاہ کردیجیے گا۔"

"میں ابھی تمہیں آگاہ کردیتا ہوں کہ میں اپنے خاندان میں کسی احمق کا اضافہ نہیں کرسکتا۔"

انتخاب۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

سجاد احمد نے ٹیلی فون اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔

"روزنامہ فٹ پاتھ کا کرائم رپورٹر امانت علی بول رہا ہوں۔ کہیے کیسے ہیں؟" اس کی آواز میں بڑی کھنک تھی۔ اس نے مزید کہا۔ "سنا ہے، دوسرے پولیس والوں کی طرح آپ اس کیس میں لیت ولعل سے کام لے رہے ہیں اور اپنی کوششوں سے اسے بگاڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

اس کی بات سن کر سجاد احمد کو غصہ آگیا۔

"کون سے کیس کی بات کررہے ہو تم...... اور تمہیں کم از کم تصدیق سے پہلے الزام لگانے کا حق کس نے دیا ہے۔"

دوسری طرف سے ہنسنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی بولا گیا

"ارے صاحب...... ناراض ہوگئے...... آپ تو ہمیشہ اپنے ہاتھوں کو دھو کر صاف رکھنے میں مشہور ہیں اور ماشاء اللہ پیچھے کوئی نشان بھی نہیں چھوڑتے...... میں دراصل رشید کیس کی بات کررہا ہوں۔" اس نے چبا چبا کر کہا۔

"اس کی تفتیش جاری ہے...... پھر اصل مجرم ہمارے پاس ہے اور صاف بات ہے کہ قتل اسی نے کیا ہے۔" سجاد احمد نے اطمینان سے جواب دیا۔

"تھانیدار جی...... سکے کے ہمیشہ دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک ہی رخ کو نہیں دیکھتے رہنا چاہیے۔" امانت نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم خود کیوں نہیں تفتیش کر لیتے......" سجاد احمد نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

"جس کا کام اسی کو ساجھے...... ہم تو صرف دھیان رکھتے ہیں، کہیں کوئی گھپلا نہ ہو جائے۔ آپ تو ناراض ہوگئے۔ ہم وقتاً فوقتاً آپ کو تکلیف دیتے رہیں گے۔ اگر آپ غصہ کرتے رہے تو ہمارا کام کیسے چلے گا۔ اللہ حافظ......" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ سجاد احمد غصے سے کچھ بڑبڑایا۔ پھر اس نے ...... گھنٹی بجائی تو ایک سنتری اندر آ گیا۔

"جی صاحب......"

"اشرف کو بلاؤ اور اسے کہو...... حمید کو لے کر آئے اور جب تک وہ میرے کمرے میں رہے کسی اور کو اندر نہ آنے دینا۔" سجاد احمد نے کہا۔

"جی اچھا......" یہ کہہ کر وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا اور کچھ دیر بعد اشرف، حمید کو لے کر آ گیا اور اس کو سامنے کھڑا کر دیا۔

رات بھر کے جاگنے اور مسلسل مارنے پیٹنے سے اس کا حلیہ بدلا ہوا تھا اور اس سے کھڑا ہونا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

"ہوں...... کیا بنا......" سجاد نے اشرف سے پوچھا۔

"یہ مان نہیں رہا......" اشرف نے کہا۔

"کیوں بے...... جھگڑا تمہارا ہوا...... پستول تم سے برآمد ہو گیا۔ آلۂ قتل پولیس کے پاس موجود ہے پھر بھی تم انکاری ہو؟" سجاد احمد نے رک رک کر جرح کی۔

"یہ ٹھیک ہے صاحب...... پستول میرے ہاتھ سے پکڑا گیا۔ یہ بھی درست ہے کہ ہمارا جھگڑا بھی ہوا تھا لیکن صاحب کون ایسا بے درد ہو سکتا ہے کہ اپنے سگے بڑے بھائی کو جان سے مار دے......" اس نے لڑکھڑاتے الفاظ میں جواب دیا۔

"دیکھو...... تمام شہادتیں اور گواہوں کے بیانات تمہارے خلاف ہیں۔ ان کے بارے میں تم کیا کہو گے...... کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو...... صاف صاف قبول لو...... جائداد کے پیچھے تو روزانہ ہزاروں قتل ہوتے ہیں۔" سجاد احمد نے دوبارہ پوچھا۔

"صاحب جی...... آپ جس قسم کی چاہیں قسم لے لیں...... مگر میں یہی کہوں گا کہ میں نے قتل نہیں کیا۔" اس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا۔

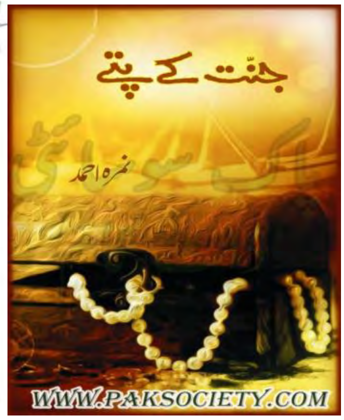
"تمہارا جائداد کے علاوہ بھی کوئی جھگڑا تھا اور پھر ایسے جھگڑے تو گھر بیٹھ کر کسی بڑے کی یا پنچایت کے ذریعے حل ہو سکتے ہیں۔ اس پر ایک ناحق جان کو مار ڈالنے سے کیا یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ لعنت ہے تم پر......" سجاد احمد نے جرح کرتے ہوئے کہا۔

"صاحب جی...... میں ان پڑھ، جنونی یا جذباتی تو ہوں نہیں۔ سچ کہہ رہا ہوں کہ یہ قتل میں نے نہیں کیا بلکہ الٹا مجھے اس کی طرف سے یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ وہ ہتھ چھٹ اور مکار طبیعت کا مالک ہے۔ کہیں اشتعال میں آ کر مجھے ہی نہ مار ڈالے۔ اس لیے میں یہ پستول ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا اور المیہ یہ تھا کہ ہم دونوں ایک ہی ادارے میں کام کرتے تھے جہاں دن میں ہزاروں بار ایک دوسرے کے سامنے آتے تھے بلکہ صاحب...... میں نے تو یہاں سے اپنے تبادلے کی درخواست بھی دے رکھی تھی جس کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ ہم تقریباً روزانہ رات کو جائداد پر جھگڑتے تھے مگر اس کا کوئی حل بھی رشید بھائی کو قبول نہ تھا۔ الٹا وہ مجھے اور میری گھر والی کو گندی گندی گالیاں دیتا تھا اور کہتا تھا کہ میری بیوی کے ناجائز تعلقات کسی کے ساتھ قائم ہیں جس کی وجہ سے وہ مجھے اس سے الگ رہنے کا مشورہ دے رہی ہے، حالانکہ خود اس کی بیوی...... مگر چھوڑیں صاحب جی...... میں اپنے بارے میں کہتا ہوں کہ جس طرح...... کا مرضی اطمینان کر لیں۔ میں نے یہ قتل نہیں کیا۔ اس روز بھی جھگڑے کے دوران اور مجھ سے تگڑا ہونے کے باوجود نہ جانے کس طرح وہ نیچے گر گیا۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا جو میں نے اس کی سامنے کی طرف سے اس کے گردوں کے قریب لگا رکھا تھا اور وہ چیخ رہا تھا کہ اس کے پاس پستول ہے، اس سے چھین لو...... یہ مجھے گولی مار دے گا۔ اس کی آواز سن کر کچھ لوگوں نے مجھے پکڑنے کی کوشش بھی کی مگر میرا گریبان اس کے ہاتھ میں تھا، اسی چھینا جھپٹی میں ایک گولی چلی...... اس اچانک آواز سے میں ڈر گیا تھا۔ شاید یہ میرے پستول ہی کی گولی ہو...... میں نے یہ سوچ کر باہر کی جانب بھاگنا چاہا تو چوکیدار نے مجھے پکڑ لیا اور مجھ سے پستول بھی چھین لیا۔"

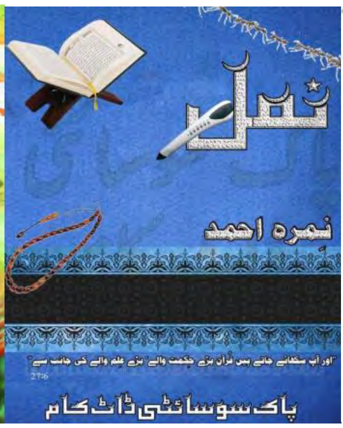
وہ چپ ہوا تو سجاد احمد طنزیہ لہجے میں بولا۔

"لگتا ہے ڈرائنگ روم کی سیر نے بھی تمہیں سچ بولنے پر نہیں اکسایا۔ ابھی کوئی کسر باقی ہے۔ سوچ لو...... یہاں تو آ کر پتھر بھی بولنے لگتے ہیں تُو، تو پھر بندہ ہے۔ جاوئے اشرف سمجھا اسے...... اور لے جا...... ابھی ریمانڈ ختم ہونے میں دس روز باقی ہیں...... دس دن کا مہمان ہے یہ...... کوشش کر دیکھ۔ اگر نہ مانا تو سجاد احمد کی سبکی ہوگی۔ ساری شہرت داغ دار ہو جائے گی۔"

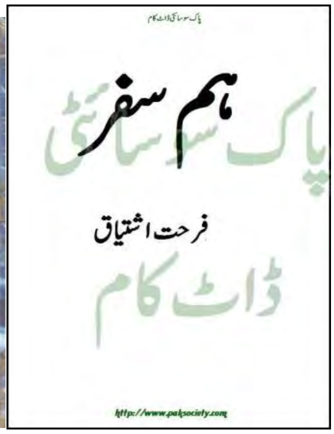
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

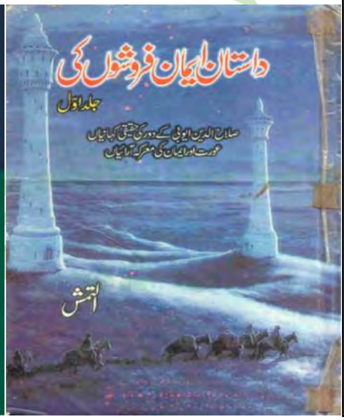




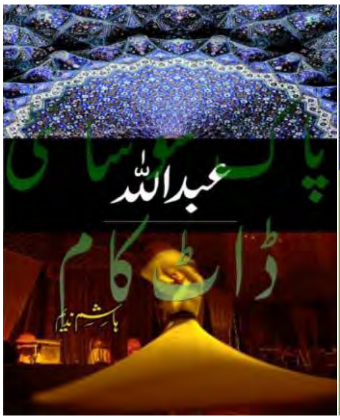


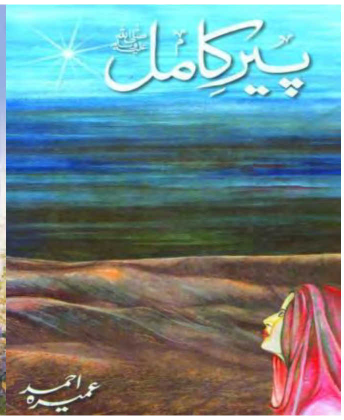




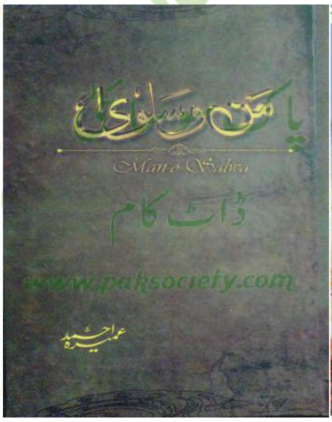




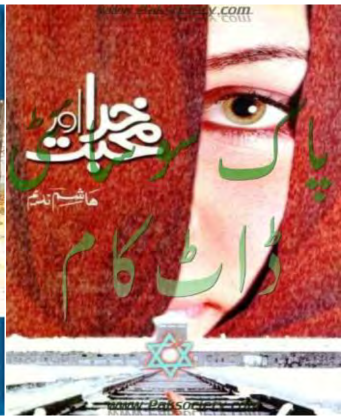


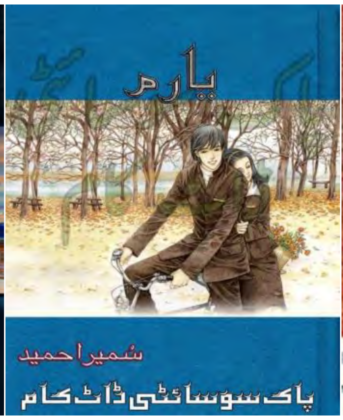




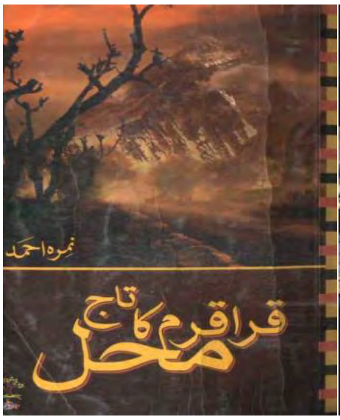












ان کے نکلنے کے بعد ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

سجاد احمد نے فوراً ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے تحکمانہ آواز آئی۔

''ملک قیصر بول رہا ہوں۔ تمہارے حلقے کا ایم این اے......''

''جی سر...... جی سر...... کیسے ہیں آپ...... جی میں سن رہا ہوں......'' سجاد احمد نے روایتی جملوں سے استقبال کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میرے قریب میرے نہایت عزیز اور بھائی وہاج افضل بیٹھے ہیں۔ ادھر تمہارے قریبی بینک کی ایک شاخ میں قتل ہو گیا ہے۔ سنا ہے قاتل بھی تمہاری گرفت میں ہے۔ جائداد وغیرہ کا کوئی جھگڑا چل رہا تھا یار...... اسے جلد از جلد فارغ کر دو...... اور ذرا مضبوط کیس بنا کر قانون کے حوالے کر دو...... رعایت نہیں برتنی...... سنا تم نے......'' اسی رعب دار آواز میں کہا گیا۔

''مگر سر...... ملزم تو انکاری ہے کہ قتل اس نے نہیں کیا۔'' سجاد احمد نے آہستگی سے جواب دیا۔

''وہاٹ...... وہ...... بات......ٹ!'' اس نے رک رک کر تیز لہجے میں کہا۔ ''آلہ قتل کے برآمد ہونے اور رنگے ہاتھوں گرفتار ہونے پر بھی وہ کس طرح اس قتل سے انکار کر سکتا ہے۔ دیکھو...... ذرا دھیان سے اس کیس کو ہینڈل کرو...... اور پسماندگان کے ساتھ پوری طرح انصاف ہونا چاہیے۔''

ادھر سے تحکمانہ لہجے میں کہا گیا۔

''میں دلچسپی کے ساتھ اس کو ڈیل کر رہا ہوں سر!'' سجاد احمد نے بتایا۔

''او کے...... کہیں کوئی سفارش اور رخنہ اندازی ہو تو مجھے بتانا۔'' یہ کہہ کر ایم این اے کا ٹیلی فون بند تو ہو گیا مگر سجاد احمد کے لیے ایک نئی کھڑکی کھول گیا...... ایک نئی راہ......

پکی گواہیاں...... آلہ قتل کی موجودگی...... لیکن قاتل کا انکار...... یہ سب کیا تھا جو اسے آہستہ آہستہ اپنی زنجیر میں جکڑنے لگا تھا۔ اگلے روز وہ پھر پریسہ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔

☆☆☆

''ادارے سرکاری ہوں یا پرائیویٹ ان کے اپنے اپنے اصول و ضوابط ہوتے ہیں سر...... پھر ہم تو ملازم لوگ ہیں۔ سارا سارا دن ہاتھ میں اسکینر پکڑے آتے جاتے لوگوں کے جسموں پر پھیرتے رہتے ہیں۔ ہماری ذمے داری تو آنے والے لوگوں سے کوئی ناجائز چیز پکڑنا ہوتی ہے، کوئی اسلحہ یا کوئی بھی مشکوک چیز تحویل میں لے لینا یا اس کی نشاندہی ہوتی ہے مگر صاحب! ادارے کے ملازموں کی تلاشی لینا تو ہماری ذمے داری نہیں ہے۔ اگر بڑے افسران ہمیں کہیں تو ایسا بھی کر سکتے ہیں مگر آج تک کبھی کسی افسر نے ہم سے نہیں کہا۔'' بینک میں اس روز ڈیوٹی پر موجود گن مین زیارت خان نے بیان دیتے ہوئے کہا۔

''تو کیا ہر ملازم بھی اسلحہ لے کر بینک کے اوقات میں اندر باہر آ جا سکتا ہے؟'' سجاد احمد نے جرح کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں جی...... اور پھر رشید تو بہت کمینہ قسم کا بندہ تھا جی...... اور معاف کریں، فوراً ماں بہن ایک کر دیتا تھا جی...... بڑے افسروں کی مونچھ کا بال تھا...... اس کی بیلٹ میں ہر وقت جدید اور اعلیٰ نسل کا پستول لٹکا ہوتا تھا اور وہ دن میں کئی کئی مرتبہ برانچ میں آتا جاتا رہتا تھا......'' زیارت خان ہر بات بڑی تفصیل سے بتا رہا تھا۔

''زیارت خان! پھر...... تمہارا یہ اسکینر پکڑ کر ہر وقت کھڑے رہنا تو بے کار ہوا نا......'' سجاد احمد نے پوچھا۔

''یہی سمجھ لیں جی...... ہمیں کہیں گے تو ہم اس پر عمل کریں گے۔''

''اس روز کیا ہوا تھا؟'' سجاد احمد نے اس سے پوچھا۔

''پتا نہیں جی ہم تو ادھر گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔ اندر برانچ میں شور مچا۔ میں بھی دروازے سے اندر آیا تو پتا چلا کچھ جھگڑا ہو گیا ہے اور پھر کسی نے بڑی تیزی سے کہا۔

''گیٹ بند کرو...... بھاگنے نہ پائے...... میں نے فوراً گیٹ بند کر دیا...... حمید بھاگا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں نے اس سے چھیننا چاہا۔ پہلے تو اس نے مجھے دھکا دے کر گرانے کی کوشش کی...... مگر میں نے اس پر چھپی ڈال لی اور اس سے پستول چھین لیا۔ اس کے بعد کچھ لوگ اس کے برادر رشید کو سہارا دے کر باہر لائے۔ بینک کی جیپ میں اسے ڈالا۔ اس وقت اس کے جسم سے بے حد خون بہہ رہا تھا۔ اس کے جاتے ہی کچھ اور لوگ اسے اسپتال دیکھنے دوڑ گئے۔ اسٹاف کا معاملہ تھا نا جی...... میں نے حمید کو منیجر کے کمرے میں بٹھا دیا۔ پھر پولیس آ کر اسے لے گئی اور پستول بھی میں نے ایک پولیس والے کو پکڑا دیا تھا۔ مجھے

نہیں پتا ان کے درمیان جھگڑا کس بات کا تھا یا کیا ہوا تھا بہرحال بُرا ہوا۔ کیا زمانہ آگیا ہے جی...... بھائی...... بھائی کے خون کا پیاسا ہوگیا ہے۔''

زیارت خان کو اس سے بڑھ کر اور کچھ معلوم نہ تھا۔ اس لیے تفصیل کے ساتھ اس کا بیان قلم بند کرنے کے بعد اسے پولیس اسٹیشن سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

بے پناہ تشدد اور ہر حربہ استعمال کرنے کے باوجود حمید کا یہی بیان تھا کہ اس نے گولی نہیں چلائی۔ البتہ اس کا جرم اتنا ضرور تھا کہ اس نے اپنا پستول صرف ڈرانے کے لیے رشید کے جسم کے ساتھ لگایا تھا لیکن اس نے تو اپنی انگلی بھی ٹریگر سے باہر رکھی ہوئی تھی۔ مبادا جذبات میں آکر اس سے گولی نہ چل جائے۔

اس کے اس بیان نے پولیس کو مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر اس نے گولی نہیں چلائی...... تو پھر گولی کس نے چلائی تھی...... پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق گولی بالکل نزدیک سے چلائی گئی تھی۔

یہی سوچ کر اگلے دن سجاد احمد نے پریسہ کو تھانے بلایا تھا۔ کیس کو الجھتا دیکھ کر سجاد احمد نے نئے رخ سے اس کی تفتیش کرنا شروع کردی تھی۔ محض اس خیال سے کہ شاید کوئی اور نشان، کوئی اور کڑی مل جائے جس سے کیس درست سمت اختیار کر جائے کیونکہ قاتل حمید کا یہی بیان تھا کہ اس نے قتل نہیں کیا۔

پریسہ اس روز بڑا بن ٹھن کر پولیس اسٹیشن آئی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے پہلی بار اس کے جوبن پر بہار آئی ہو۔ گو جس طرح کا سیاہ لباس اس نے پہن رکھا تھا، اس کی سوگواریت پر دلالت کرتا تھا مگر پہلی نظر میں دیکھنے والا کسی طرح بھی یہ اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ یہ حال ہی میں قتل ہونے والے رشید کی بیوہ ہے۔

سجاد احمد نے اسے کمرے میں آتے دیکھ کر چپڑاسی کو دروازہ بند کرنے کا کہا۔ وہ مسکراتے ہوئے آکر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی تھی اور پھر بڑے والہانہ انداز میں پوچھنے لگی۔

''کیا آپ آنے والوں کو بیٹھنے کا نہیں کہتے......؟''

''اوہ میں بھول گیا...... معذرت خواہ ہوں۔ آپ بیٹھیں......'' سجاد احمد نے اسے ہاتھ سے اشارہ کرکے کہا۔

''شکریہ......'' اسے لگا جیسے قیامت بیٹھ گئی ہو۔

''اتنے سارے شواہد کے ہوتے ہوئے اور قاتل کے ہاتھ سے آلۂ قتل برآمد ہونے کے باوجود آپ کو لگتا ہے کہ میرے شوہر کا قتل کسی اور نے کیا ہے۔'' اس نے شکوہ بھرے انداز میں کہا۔

''جی...... اب تو کچھ کچھ مجھے بھی یقین سا ہونے لگا ہے کہ واقعتاً یہ قتل کسی اور نے کیا ہے۔ حمید تو صرف استعمال ہوا ہے......'' سجاد احمد نے اس کی نیلی کجراری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بتایا۔

''کیا...... کیا آپ کو پکّا یقین ہے......'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''دیکھیے مسز رشید...... ہم نے اپنا ہر حربہ اس پر استعمال کرکے دیکھ لیا۔ تھرڈ ڈگری اندازِ تفتیش بھی اس پر کارگر نہیں ہوا۔ اس کا صرف ایک ہی بیان ہے کہ قتل اس نے نہیں کیا اور وہ اس سلسلے میں بے قصور ہے۔''

''کمال ہے...... اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ کی تفتیش ناکامی کا منہ دیکھنے جارہی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے چوٹ کی اور مزید کہا۔

''آپ جیسے ذہین، خوب صورت اور محنتی آفیسر کا یہ احساسِ شکست کچھ اچھا نہیں لگا۔'' اس نے طنز کے سارے تیر برسانا شروع کردیے۔ تب اچانک سجاد احمد نے بھی پینترا بدلا۔

''کبھی کبھی خوب صورتی کے آگے ہتھیار بھی کند ہوجاتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ میرے تمام تر ہتھیار اور حربے اس نے ایک ہی بات کی ڈھال پر سہہ ڈالے کہ یہ قتل اس نے نہیں کیا......'' سجاد احمد نے کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو ایک ہلکی سی خوفزدہ سوچ وہاں تیرتے ہوئے نظر آئی۔ ٹھیک اسی لمحے سجاد احمد نے چوٹ کی۔

''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں وہاج افضل کے بارے میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟ دیکھیے یہ بھی ہماری تفتیش کا ایک حصہ ہے۔ آپ کا خاوند قتل ہوا ہے اور قاتل لاک اپ میں موجود ہے، جو اس سے انکاری ہے پھر تیسرا شخص کون ہے...... اسے میری طرح آپ کو بھی تلاش ہے لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کو اپنے خاوند کے قتل کا اس قدر افسوس نہیں ہے جس قدر حمید کو سزا دلوانے میں آپ اور وہاج دلچسپی لے رہے ہیں۔ کہیں نہ کہیں کوئی کمزور پہلو ضرور ہے جو شک کی بنیادوں کو یقین کی دیواریں بنا رہا ہے۔'' سجاد احمد نے دھیرے دھیرے کہا تو پریسہ اپنی کرسی سے اچھل پڑی۔

''انسپکٹر صاحب...... آپ کو ایک شریف عورت پر شک کرنے کی اجازت کس نے دی ہے۔''

''دیکھیے محترمہ...... آپ نے بتایا کہ آپ کے اور مقتول رشید کے گھریلو تعلقات ٹھیک چل رہے تھے مگر میرے اندازے کچھ اور کہہ رہے ہیں۔'' بات کرتے کرتے سجاد احمد رک گیا۔

''آپ کا کیا اندازہ ہے، میں نے جھوٹ کہا ہے......'' پریسہ خوفزدہ ہوکر بولی۔

''جی ہاں...... یہی کہ آپ کے گھریلو تعلقات ٹھیک نہیں تھے۔ چونکہ آپ کا خاوند نہ صرف شراب کا عادی تھا بلکہ اس کے بازاری عورتوں سے تعلقات بھی تھے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر بڑے بڑے آفیسرز کو ان کی من پسند لڑکیاں بھی پیش کرتا تھا۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں......'' سجاد احمد تھوڑی دیر کو رکا پھر اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا، تو اسے ایسا لگا جیسے پریسہ اندر سے کہیں ٹوٹ گئی ہو...... اس کی خوب صورت آنکھیں چھلک پڑیں۔

''آپ کا اندازہ درست ہے آفیسر...... رشید مجھے شروع سے ہی پسند نہ تھا لیکن چونکہ ہماری شادی ایک خاندانی معاملہ تھا اس لیے بڑوں کے فیصلوں کی صلیبوں پر ہم جیسی لڑکیوں کو چپ چاپ چڑھنا پڑ جاتا ہے جبکہ اس کے بجائے مجھے وہاج پسند تھا۔ ہم ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے تھے لیکن اسے آپ اور میں صرف تقدیر کہہ سکتے ہیں۔ میں رشید کی بیوی بن گئی۔ یہاں آکر جب میں نے رشید کا رویّہ اور اس کی شہرت سنی تو اس نے مجھے اس سے بدظن کر ڈالا اور میرا جھکاؤ ایک بار پھر وہاج کی طرف ہو گیا۔ اسی اثنا میں دونوں بھائیوں کے درمیان جائداد کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا...... رشید اپنی حرکتوں کے سبب گھر میں بھی اکثر دیر سے آتا اور کئی بار تو وہ کسی بہانے گھر سے بھی کئی کئی روز غائب رہتا تھا۔ اس کی مذموم حرکات کا اکثر و بیشتر مجھے علم ہو جاتا تھا۔ وہاج نے کئی بار مجھے اس سے خلع لینے کا مشورہ دیا مگر میں ٹال گئی لیکن آپ جس طرح مرضی اطمینان کر لیں، ہم حاضر ہیں کہ اس قتل میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔'' پریسہ نے روتے ہوئے ہولے سے بتایا۔

''دیکھیں محترمہ...... مجھے آپ کے ذاتی معاملات سے کوئی غرض نہیں۔ میں نے تو اس قتل کا مسئلہ حل کرنا ہے۔ جو میرے نزدیک ایک جیتے جاگتے انسان کا قتل ہے اور میں اس معاملے میں بہت دور تک بھی جا سکتا ہوں۔ بہرحال اب آپ جا سکتی ہیں، آخر میں...... میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کے اور وہاج کے تعلقات کا کس کس کو علم ہے؟''

''میرے اندازے کے مطابق ابھی تک کسی کو نہیں......'' اس نے روتے ہوئے بتایا۔

''ٹھیک ہے، اب آپ گھر جائیں۔ کسی بھی وقت قانونی ضرورت کے تحت آپ کو دوبارہ بلایا جا سکتا ہے۔'' سجاد احمد نے بتایا۔

''ہم حاضر ہیں......'' پریسہ نے اپنے پرس سے ٹشو نکال کر اپنی بھیگی آنکھیں صاف کیں اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

ایگزامن رپورٹ پولیس اسٹیشن میں اس کی میز پر پڑی تھی جس میں واضح طور پر لکھا ہوا تھا کہ پستول کے میگزین میں موجود گولیوں سے مقتول کو لگنے والی میچ نہیں کرتی۔ اگرچہ میگزین میں ایک گولی کم تھی مگر رشید کے جسم سے برآمد ہونے والی گولی ان سے میچ نہیں کرتی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ حمید کا بیان سچ تھا کہ اس کے بھائی کے جسم سے نکالی جانے والی گولی اس کے پستول کی نہ تھی...... پھر یہ گولی کس نے چلائی تھی؟ کسی کو اس کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟ حمید دوبارہ ریمانڈ پر پولیس اسٹیشن میں موجود تھا اور آج اس کا یہاں آخری دن تھا۔

تب سجاد احمد نے ایک بار پھر اسے بلا کر پوچھا۔

''دیکھو...... اگر تم قاتل نہیں ہو تو پھر اسے کس نے قتل کیا ہے؟ تمہیں کسی پر شبہ......''

''یقین کریں صاحب جی...... میں بالکل نہیں جانتا...... کہ اسے کس نے قتل کیا ہے۔ وہ عیاش طبع تھا اور بڑے لوگوں کو لڑکیاں بھی پیش کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اسٹاف میں بھرتی ہونے والی لڑکیاں بھی اس کی پہنچ سے دور نہ تھیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اپنی ترقی کے خواب دیکھنے والی کچھ لڑکیاں کیا کچھ نہیں کر گزرتیں۔ وہ اکثر جب سیدھے ہاتھ سے گھی نہ نکلتا دیکھتا تو بڑے مذموم ہتھکنڈے استعمال کرنے لگتا تھا۔ ہاں یاد آیا...... وہ پچھلے کچھ دنوں سے زوئیلہ...... جو کہ نئی نئی عارضی آفیسر بن کر اس برانچ میں آئی تھی اس کو ورغلا رہا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بے حد پریشان رہتی تھی۔ ایک روز اس نے بھائی رشید کی شکایت مجھ سے بھی کی تھی۔ تب میں نے اسے تسلی دے دی تھی کہ میں اس کے لیے کچھ کروں گا مگر اسے میری بزدلی جانیں کہ میں رشید بھائی سے کچھ نہ کہہ سکا...... زوئیلہ دبلی پتلی اور انتہائی خوب صورت لڑکی تھی۔ وہ اکثر مجھ سے ہنستے ہوئے کہتی تھی۔

''حمید بھائی...... یہ حسن بھی بڑی زحمت ہے۔ یہ جس کو مل جائے اس کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔ اب دیکھو اس

ادارے میں مجھے جاب ملی تو میں خوش تھی کہ ایک معتبر ادارے میں ملازمت مل گئی ہے۔ اب میری عزت اور آبرو محفوظ رہے گی مگر یہاں بھی میرے اردگرد بھوکے گدھ منڈلانے لگے ہیں۔ سوچ رہی ہوں کہ میں استعفادے دوں۔''

''میں نے اسے بے حد روکا...... مگر میرا اپنا بھائی اس کی عزت کے درپے ہو رہا تھا۔ اس روز بھی اس نے روتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ اب تو اس کا جینا دوبھر ہو چکا ہے۔ دو ہی راستے ہیں اس کے پاس یا تو خودکشی یا پھر دوبارہ بے روزگاری......

''تمہارے بھائی نے کل مجھے وارننگ دی تھی کہ اگر اس کی بات نہ مانی تو مجھے اغوا کرلیا جائے گا کیونکہ اسے اپنا ایک ضروری کام نکلوانے کے لیے میری ضرورت ہے۔''

حمید نے آہستہ سے اسے بتایا تو اس کی سوچوں میں ایک دھماکا سا ہوا۔ وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے، لے جاؤ اسے اور صبح اسے عدالت میں پیش کر دینا۔ دوبارہ ریمانڈ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اب ایک نیا راستہ زوئیلہ کی صورت میں اس کو دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے اگلے روز پولیس اسٹیشن آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بینک منیجر سے بات کی۔

''میں پولیس اسٹیشن سے سجاد احمد بول رہا ہوں۔'' اس کی آواز سن کر دوسری طرف سے کچھ پوچھا گیا، تب وہ دوبارہ بولا۔

''مجھے آپ کی برانچ کی پروبیشنری آفیسر زوئیلہ سے قتل کی بابت کچھ انکوائری کرنا ہے۔ آپ اسے کچھ دیر کے لیے پولیس اسٹیشن بھجوا سکتے ہیں۔ کہیں تو میں اس سلسلے میں لیڈی پولیس کو بھجوا دوں۔''

''ہاں...... ہاں بھجوا دیں لیکن احتیاط رہے کہ وہ سادہ کپڑوں میں ہو۔ پولیس کی وردی میں ہوگی تو ہماری بدنامی ہونے کے ساتھ ساتھ زوئیلہ بھی گھبرائے گی۔ وہ ایک بہت شریف اور گھریلو قسم کی لڑکی ہے۔ اس کی ہر طرح کی ضمانت خود میں دینے کو بھی تیار ہوں۔ اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔''

''میں آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔'' اس نے یقین دہانی کرائی اور ایک لیڈی کانسٹیبل کو بینک بھجوا دیا۔

کچھ دیر بعد زوئیلہ اس کے ساتھ پولیس اسٹیشن میں موجود تھی۔ وہ خاصی خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا اب اس کا

گنجائش

غور کیجیے تو مباحثے اور مناظرے کے لیے چارپائی سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ اس کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ فریقین آمنے سامنے نہیں بلکہ عموماً اپنے حریف کی پیٹھ کا سہارا لے کر آرام سے بیٹھتے ہیں اور بحث وتکرار کے لیے اس سے بہتر طرز نشست ممکن نہیں، کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ فریقین کو ایک دوسرے کی صورت نظر نہ آئے تو کبھی آپے سے باہر نہیں ہوتے۔ اسی بنا پر میرا عرصے سے یہ خیال ہے کہ اگر بین الاقوامی مذاکرات گول میز پر نہ ہوئے ہوتے تو لاکھوں جانیں تلف ہونے سے بچ جاتیں۔ آپ نے خود دیکھا ہوگا کہ لدی پھندی چارپائیوں پر لوگ پیٹ بھر کے اپنوں کی غیبت کرتے ہیں مگر دل برے نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ سبھی جانتے ہیں کہ غیبت اسی کی ہوتی ہے جسے اپنا سمجھتے ہیں اور کچھ یوں بھی ہے کہ ہمارے ہاں غیبت سے مقصود قطع محبت ہے نہ گزارش احوال واقعی بلکہ محفل میں...... لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ......

لوگ گھنٹوں چارپائی پر کسمساتے رہتے ہیں مگر کوئی اٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ اس لیے کہ ہر شخص اپنی جگہ بخوبی جانتا ہے کہ اگر وہ چلا گیا تو فوراً اس کی غیبت شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ پچھلے پہر تک مرد ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے بحث کرتے ہیں اور عورتیں گال سے گال بھڑائے کچر کچر لڑتی رہتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مرد پہلے بحث کرتے ہیں، پھر لڑتے ہیں۔ عورتیں پہلے لڑتی ہیں اور بعد میں بحث کرتی ہیں۔ مجھے ثانی الذکر طریقہ زیادہ معقول نظر آتا ہے، اس لیے کہ اس میں آئندہ سمجھوتے اور میل ملاپ کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ ایک چارپائی پر بیک وقت کتنے آدمی بیٹھ سکتے ہیں تو گزارش ہے کہ چارپائی کی موجودگی میں ہم نے کسی کو کھڑا نہیں دیکھا۔ لیکن اس نوع کے نظریاتی مسائل میں اعداد وشمار پر بے جا زور دینے سے بعض اوقات عجیب وغریب نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ جس وقت مسلمانوں نے اندلس فتح کیا تو وہاں کے بڑے گرجا میں چوٹی کے مسیحی علما وفقہا اس مسئلہ پر کمال سنجیدگی سے بحث کر رہے تھے کہ سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے بیٹھ سکتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ''چراغ تلے'' سے اقتباس

سرخ وسپید رنگ ہلدی کی طرح زرد ہورہا تھا۔ سجاد نہیں چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں اس کی اپنی شہرت پر کچھ آنچ آئے اور پھر اسے اس کی جوانی پر بھی ترس آرہا تھا۔

''یہاں جو بھی گفتگو ہوگی اس کی بازگشت باہر سنائی نہ دے۔''

سجاد احمد نے اپنی ساتھی پولیس کانسٹیبل کو کہا تو وہ آہستہ سے بولی۔

''جی......سر......!'' اس نے اٹھ کر پانی کا ایک گلاس زوئیلہ کے پاس رکھ دیا اور اسے پینے کو کہا مگر زوئیلہ نے انکار کردیا اور سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے یہاں کس سلسلے میں لایا گیا ہے؟''

''دراصل آپ کو رشید قتل کیس کے سلسلے میں بلایا گیا ہے۔ اس کی انکوائری میں آپ سے کچھ پوچھنا تھا......'' سجاد نے مطمئن لہجے میں کہا۔

''میرا اس سے کیا تعلق؟'' اس کے اندر مری ہوئی کوئل بولی۔

اس کی آواز میں بلا کی نغمگی تھی۔ سجاد احمد اس کی خوب صورتی کے ساتھ اس کی آواز کے لوچ سے بھی گھائل ہونے لگا تھا۔

''دیکھیں بی بی...... بعض تعلق ایسے ہوتے ہیں جو نہ چاہتے ہوئے بھی کسی نام کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔ اگر آپ میرے ساتھ تعاون کریں گی تو یہ آپ کے لیے بہتر ہوگا، ورنہ سچ اگلوانے کے لیے ہمیں دوسرے حربے بھی استعمال کرنا آتے ہیں۔''

یہ سن کر زوئیلہ کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہوگیا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''پوچھیے...... جو پوچھیں گے...... میں سچ سچ بتاؤں گی۔ ویسے بھی یہ حسن میرے لیے وبال بن چکا ہے۔ میں خود اپنی اس خوب صورتی سے تنگ آچکی ہوں، جس نے مجھے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے اور مجھے بدنامی کی پاتال میں گرانا چاہتی ہے۔'' وہ روتے ہوئے دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔

''مجھے بس آپ کا اقبالی بیان چاہیے کہ یہ قتل آپ نے کیا ہے۔'' سجاد احمد نے سیدھے الفاظ میں کہا تو وہ روتے ہوئے بولی۔

''لکھیں......''

سجاد احمد نے لیڈی پولیس کانسٹیبل کو اشارہ کیا تو وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔ اب دھیرے دھیرے زوئیلہ بولے جارہی تھی اور وہ لکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سجاد احمد نے ایک چھوٹا ٹیپ ریکارڈر بھی آن کرلیا تھا۔ زوئیلہ اپنا اقبالی بیان ریکارڈ کروانے لگی۔

''میں زوئیلہ بنتِ عبداللہ بقائمی ہوش وحواس یہ بیان ریکارڈ کروارہی ہوں کہ میں رشید کی قاتلہ ہوں، میں نے یہ قتل محض اپنی عزت بچانے کی خاطر کیا...... جس کی تفصیل کچھ یوں بنتی ہے۔ میں ایک انتہائی غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں اپنے پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہوں...... میں نے اپنی تعلیم بڑے ہی خراب حالات میں مکمل کی۔ آپ یقین نہیں کریں گے کہ اس سلسلے میں بعض اوقات ہمیں کئی کئی دن بھوکا رہنا پڑا۔ میرا محنت کش باپ فالج کا شکار ہوگیا تو اماں لوگوں کے گھروں میں کام کرنے لگیں۔ اس سے جو آمدنی ہوتی وہ میرے تعلیمی اخراجات اور گھر کے معاملات چلانے کے قابل بھی نہ تھی۔ میں نے دسویں کے بعد بچوں کو ٹیوشنز پڑھانا شروع کردیا اور اپنے تعلیمی اخراجات کو بھی گھسیٹنے لگی۔

''مجھے میرے اردگرد کے ماحول نے شروع دن سے ہی یہ احساس دلادیا تھا کہ میں بے حد خوب صورت ہوں۔ اب راہ چلتے لوگوں کے آوازے اور پیشکشیں مجھے اور بھی پریشان کرنے لگی تھیں۔ محلے کے لڑکے ویسے ہی میری جان کے دشمن ہوچلے تھے۔ میں نے اپنی ثابت قدمی سے انہیں ہروقت اپنے سے دور رکھا۔ میٹرک سے نکل کر اب میں اگلی کلاسوں میں جانے کے لیے پر تولنے لگی تھی مگر اس کے لیے مجھے بے حد اخراجات کی ضرورت تھی۔ کالج کی فیسیں الگ......

''یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے انسان کے دل میں رحم ڈال دیا جس نے نہ صرف میری ہمت بندھائی بلکہ اخراجات کا بوجھ بھی اٹھالیا۔ یہ میری ایک ہمسائی تھی جو بے حد امیر تھی مگر اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔ اس نے اس طرح کے بیسیوں نیک کاموں کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا۔ اس طرح میں نے اپنی اعلیٰ تعلیم بھی جیسے تیسے پوری کرلی اور پھر مجھے بینک میں ملازمت مل گئی۔ مگر میری خوب صورتی جو ہمیشہ سے میری گھات میں تھی۔ یہاں بھی مجھے چین سے نہ رہنے دے رہی تھی۔ یہاں کے اعلیٰ افسران اب مجھے اپنے نشانے پر لینے کو تلے ہوئے تھے۔ اب تو ان کی طرف سے خفیہ طریقوں سے تعاون کرنے کی پیشکشیں ہونے لگی تھیں اور ان کے بدلے میں میرے درخشاں مستقبل کی نوید بھی سنائی جانے لگی تھی۔ جسے میں بڑی ہمت سے ٹھکراتی چلی آئی تھی۔

''اس معاملے میں...... ایک بار میں نے اسٹاف

یونین کے کرتا دھرتا لوگوں سے بات کی تو انہوں نے بھی میری کوئی مدد نہ کی بلکہ الٹا اس کے ایک رکن رشید نے مجھ سے رابطہ بڑھا کر مجھے اس راستے پر چلنے کی پیشکش کی جسے میں نے نہ صرف ٹھکرا دیا بلکہ اس کی اچھی خاصی گوشمالی بھی کر ڈالی لیکن اس کے باوجود وہ انتہائی ذلالت سے وقتاً فوقتاً مجھے زچ کرنے لگا تھا۔ پھر ایک روز تو اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

''زوبیلہ...... کیا ہے اگر تمہارے حسن کی خیرات کسی ایسے بندے کی جھولی میں گر جائے۔ یقین کرو...... ایسا کرنے سے نہ صرف وہ بندہ تمہارا زندگی بھر کا غلام ہو جائے گا بلکہ ترقی کے تمام دروازے بھی تم پر کھل جائیں گے۔ میری مانو...... عیش کرو گی عیش...... یہ جو تمہارے اردگرد دوسری لڑکیاں یہاں ملازمت کر رہی ہیں اور دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہیں۔ اس کا سبب بھی تقریباً وہی ہے جو میں نے تمہیں بتایا ہے۔ سوچ لو...... خوب اچھی طرح...... میں نے اس کو نہ صرف دھتکار دیا بلکہ اس کی بے عزتی بھی کی اور اس کی شکایت اس کے چھوٹے بھائی حمید سے بھی کی...... لیکن وہ بھی اس معاملے میں بے بس نکلا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس سے کس طرح چھٹکارا حاصل کر سکتی ہوں۔

''ان ہی دنوں میری منگنی اپنے رشتے داروں میں ہو گئی۔ وجاہت نہ صرف شکل صورت کا بلکہ دل کا بھی بے حد خوب صورت انسان تھا۔ وہ ایسا تھا جس کی ہمراہی کی خواہش ہر لڑکی کرتی ہے۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا تھا کہ مجھے وجاہت ایسا ساتھی ملا۔ میں اب جلد ہی اپنی ملازمت کو چھوڑنے والی تھی لیکن وجاہت کی چند مجبوریوں نے مجھے کام سے استعفا دینے سے روکے رکھا، ان ہی دنوں رشید نے میرے اردگرد اپنے مذموم ارادوں کا گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کا ذکر وجاہت سے بھی کیا اور اپنی حفاظت کے لیے اس سے کہہ کر پستول کا لائسنس بھی لے لیا۔ اس نے اپنے خرچ سے کچھ پیسے بچا کر مجھے ایک پستول بھی لے دیا۔ جو میں اب اپنے پاس رکھنے لگی تھی۔ اس روز رشید نے مجھے صریحاً دھمکی دی تھی۔

''آخری بار تمہیں کہہ رہا ہوں، میری بات مانو گی تو خوش رہو گی۔ وگرنہ کل تک تم اٹھالی جاؤ گی۔ پھر دیکھوں گا تم کیسے نخرے کرتی ہو، بہت دیکھ لیے تمہارے چونچلے......''

''چونکہ اسٹاف کی تلاشی نہیں ہوتی اس لیے میں پستول ہمیشہ اپنے دستی بیگ میں رکھتی تھی۔ اس روز رشید اور اس کے بھائی حمید کے درمیان جھگڑا ہوا۔ نوبت ہاتھا پائی تک آ پہنچی...... میں یہ سب دیکھ رہی تھی۔ پھر حمید نے اسے صوفوں کے قریب گرا لیا اور اس کے جسم پر سوار ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر مجھے نہ جانے کیا سوجھا۔ میں نے دل میں دعا کی...... کہ اللہ کرے حمید اسے قتل کر دے۔ حمید نے جب پستول کی نال اس کے گردوں پر لگائی تو رشید ڈر کے مارے چیخ اٹھا۔

''بچاؤ...... اس کے ہاتھ میں پستول ہے، یہ مجھے جان سے مار دے گا۔'' کچھ لوگ اس کی طرف بھاگے تو میرے ذہن میں جانے کہاں سے یہ بات آئی کہ رشید جیسے گند کو ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے ہینڈ بیگ سے اپنا پستول نکالا اور بڑی پھرتی کے ساتھ ادھر جا پہنچی۔ نہ جانے کس نے حمید کا ہاتھ پکڑ کر اونچا کر دیا تھا اور اس سے اس کا پستول چھیننا چاہا۔ میں نے فوراً اسی جگہ پر اپنا پستول رکھا اور اس کا ٹریگر دبا دیا...... گولی کے چلنے کے ساتھ رشید کی آواز آئی۔

''اوہ اس نے مجھے مار ڈالا......'' حمید ڈر کر بھاگا...... لوگ اس کے پیچھے بھاگے اور میں اپنی سیٹ پر دوبارہ آ کر بیٹھ گئی...... حمید کو گرفتار کر لیا گیا اور رشید قتل ہو چکا تھا۔ ایک برائی ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی تھی اور میں مطمئن تھی کہ میرا نام اس قتل میں کبھی نہیں آئے گا مگر میری سوچ غلط تھی۔ آج میں بقائمی ہوش و حواس اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ رشید کی اصل قاتل میں ہوں، میں ہوں......''

اتنا لکھوانے کے بعد وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لیڈی کانسٹیبل نے اس کے بیان کے نیچے اس کے دستخط لیے اور اس کی باقاعدہ گرفتاری ڈال کر اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

سجاد احمد نے اس کا بڑی سوچ بچار کے بعد چالان مکمل کیا اور اس کے بیان کی روشنی میں بہت ہی نرم شقیں لگا کر اس کا چالان کر کے اس کی گرفتاری ڈال دی۔ کیا اس نے ایسا خدا ترسی کی وجہ سے کیا تھا...... اس کی خوب صورتی سے مرعوب ہو کر کیا تھا یا اس کی جوانی پر اسے ترس آ گیا تھا؟ انتہائی نرم شقیں لگا کر مکمل ہونے والا یہ اس کا پہلا اور شاید آخری چالان تھا اور گرفتاری بھی...... اس نے ایسا کس لیے کیا؟ یہ وہ آج تک نہیں سمجھ سکا۔ اس سے جب بھی پوچھا تو اس نے یہی کہا کہ بندگلی میں تو اس کا اپنا سانس گھٹنے لگتا ہے۔ وہ اب قانون کی بندگلی میں زوبیلہ کو ساری زندگی قید نہیں رکھنا چاہتا اس لیے اس نے یہ رعایت برتی ہے۔



محفلِ شعروسخن

❄ محمد زاہد سیال......پاک پتن شریف
آج توڑنے ہوں گے گھر کے سب آئینے مجھے دلنشین
محبت میں ہارے لوگ اب دیکھے نہیں جاتے

❄ محمد خواجہ......کورنگی، کراچی
حیراں ہوں چارہ گر کو سناؤں میں کیا حال
اب تک تو دردِ دل میں ذرا بھی کمی نہیں
میں خود بدل گیا ہوں کہ زمانہ بدل گیا
مدت سے اب بہار میں کیوں دلکشی نہیں

❄ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ......ضلع خانیوال
واقف نہیں تم اپنی نگاہوں کے اثر سے
اس راز کو پوچھو کسی برباد نظر سے

❄ سیدہ ثانیہ کاظمی......ڈیرہ اسماعیل خان
سکوں میں رقص کناں، رقص میں سکون پذیر
خرامِ حسن کا آئینہ ہے خرامِ حیات

❄ احمد حسن عرضی خان......قبولہ شریف بائی پاس
آج تم یاد کیوں نہیں آئے
آج تم سے بہت خفا ہوں میں

❄ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال
مجھ سے مخلص، نہ واقف میرے جذبات سے تھا
اس کا رشتہ تو فقط اپنے مفادات سے تھا
اب جو بچھڑا ہے تو کیا روئیں جدائی پہ اس کی
یہ اندیشہ تو ہمیں پہلی ہی ملاقات سے تھا

❄ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان......ڈاہرانوالہ
جرائم آج جتنے ہیں وہ کل بھی برملا ہوں گے
جو سارے لازم وملزوم ہیں کیونکر جدا ہوں گے

❄ حافظ شعیب معاویہ......خان پور، رحیم یار خان
جو زندگی میں مشکل مقام آیا تو کیا کرو گے؟
میں رو رہا ہوں، تم ہنس رہے ہو میں مسکرایا تو کیا کرو گے؟
کچھ اپنے دل پہ بھی زخم کھاؤ، میری وجہ سے بہار کب تک؟
مجھے سہارا بنانے والو! میں لڑکھڑایا تو کیا کرو گے؟

❄ ریاض بٹ......حسن ابدال
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

❄ محمد اسلم گھلو......خانیوال
بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

❄ سید عبادت کاظمی......ڈیرہ اسماعیل خان
عید کی رات ہے برسات میری آنکھوں میں
لیجیے بس یہی سوغات میری آنکھوں میں
پھر نئے زخم کیے زیبِ تن عید کے دن
پوچھ لو کیسی کٹی رات میری آنکھوں میں

❄ محمد اکبر تاج......لودھراں
ہوا کے دوش پہ رکھا ہے آرزو کا چراغ
خود اپنی ذات سے یہ دشمنی عجیب ہے

❄ تنویر لودھی......آفیسرز کالونی، واہ کینٹ
جاں ان کی ہے، دل ان کا
ہم اُن کے ہیں، سب ان کا
وہ لیں گے تو کیا لیں گے
ہم دیں گے تو کیا دیں گے

❄ رانا بشیر احمد ایاز......احسان پور، رحیم یار خان
تیز بارش میں کبھی سرد ہواؤں میں رہا
اک تیرا ذکر تھا جو میری صداؤں میں رہا
کتنے لوگوں سے میرے گہرے مراسم ہیں مگر
تیرا چہرہ ہی فقط میری دعاؤں میں رہا

❄ مرزا طاہر الدین بیگ......میر پور خاص
یہ کون پھر سے انہی راستوں میں چھوڑ گیا
ابھی ابھی میں عذابِ سفر سے نکلا تھا
میں رات ٹوٹ کے رویا تو چین سے سویا
کہ دل کا زہر میری چشمِ تر سے نکلا تھا

❄ وردا، آریز احمد ملک......کراچی
دل سے لٹ کر بھی سخاوت کی تمنا نہ گئی
کوئی اجڑا ہوا آئے تو دعا لے جائے

❄ قیصر اقبال گچہ......کلول ضلع بھکر
دیکھ رفتہ رفتہ نکل ہی گئے نا آخر!
مصر سے یوسف، جنت سے آدم اور ترے دل سے ہم

❄ جاوید اختر رانا......پاک پتن شریف
میں نے جس جس کو بھی چاہا ہے بہت چاہا ہے
تم کسی ایک سے تصدیق کرا سکتی ہو
کل میں اک خواب کسی آنکھ میں بھول آیا تھا
کیا تم اس خواب کا انجام بتا سکتی ہو

❄ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
شاید یہی تضاد قیامت کی جان ہے
فطرت ضعیف ہے مگر انساں جوان ہے

❄ محمد رشید سیال......روہڑی ضلع سکھر
یہ زندگی ہاتھوں میں لیے پھرتی ہے پتھر عدم
ہم نے کس شوق سے گھر شیشے کے بنوائے تھے

❄ نواب احمد......آزاد کشمیر
ہر ایک شے پہ اجالا سا ہلکا ہلکا ہے
ترا خیال ہے یا صبح کا دھندلکا ہے

❄ رشید احمد......سیالکوٹ
چاند ہے، پھول ہیں، لب جُو ہے
میرے پہلو میں دل نہیں، تو ہے

❄ انور علی......ملتان
لبوں میں نرم تبسم رچا کے گھل جائیں
خدا کرے مرے آنسو کسی کے کام آئیں
جو ابتدائے سفر میں دیے بجھا بیٹھیں
وہ بدنصیب کسی کا سراغ کیا پائیں

❄ احمد علی......پشاور
یوں بیکار نہ بیٹھو دن بھر، یوں پیہم آنسو نہ بہاؤ
اتنا یاد کرو کہ بالآخر آسانی سے بھول بھی جاؤ
سارے راز سمجھ لو لیکن خود کیوں ان کو لب پر لاؤ
دھوکا دینے والا رو دے، ایسی شان سے دھوکا کھاؤ

❄ ادریس احمد......مانسہرہ
کیا ترے لطف کا معیار زباں بندی ہے؟
بات بے بات بدل جاتے ہیں تیور تیرے
اک ہم ہی کو نہ تجھے اپنا بنانا آیا
انجمن تیری ہے، مے تیری ہے، ساغر تیرے

❄ عاصم خان......سرگودھا
لٹ کر بھی کوئی وحشتِ جنوں کی نہ راہ لے
اپنی شکست ہی میں محبت پناہ لے

❄ فردوس احمد......میر پور خاص
یہ کون دور سے دامن کشاں گزرنے لگا
چراغ لو کو ہوا کے سپرد کرنے لگا

❄ مہتاب احمد......حیدر آباد
کرن کا رنگ فریبِ نگاہ ہوتا ہے
ثواب اصل میں عذرِ گناہ ہوتا ہے

❄ شبانہ ادریس......بہاولپور
میں کب سے گوش برآواز ہوں، پکارو بھی
زمین پر یہ ستارے کبھی اتارو بھی
مری غیور امنگو، شباب فانی ہے
غرورِ عشق کا دیرینہ کھیل ہارو بھی

❄ ناہید یوسف......اسلام آباد
مسلسل سرخوشی مرگِ مسلسل ہوتی جاتی ہے
کہ تیرے قرب سے اک عمر اک پل ہوتی جاتی ہے

❄ اطہر حسین......کراچی

عشق سے گرمیاں حیات کی ہیں
سب تفاصیل ایک بات کی ہیں

❄ بلقیس بانو......حیدرآباد

کس درجہ منحنی نظر آتے ہیں دور سے
وہ قافلے جو رک نہ سکیں گے حضور سے

❄ زارا انور......لاہور

کتنا بلند، کتنا انوکھا مقام ہے
انسان اک تسلسلِ شیریں کا نام ہے

❄ عابد علی......راولپنڈی

زندگی کے سانچے میں جو نظام ڈھلتا ہے
زندگی کے سانچے کو توڑ کر نکلتا ہے

❄ ظہیر احمد......کراچی

وہ جن کو لوگ حقیقت پرست کہتے ہیں
حقیقتوں کے تصور میں مست رہتے ہیں

❄ جبران احمد ملک......گلشن اقبال، کراچی

عجیب درد بھری لذتیں بہار میں ہیں
کہ جتنے پھول ہیں، شبنم کے انتظار میں ہیں

❄ حسان احمد......ملتان

تمہیں خلعت کے بدلے فرشِ پا انداز ملتا ہے
یہیں سے بات کھلتی ہے یہیں سے راز ملتا ہے

❄ بلاول انصاری......سکھر

چمن میں اہلِ چمن درپے چمن ہوں گے
خبر نہ تھی کہ بہاروں کے یہ چلن ہوں گے

❄ ادریس خواجہ......سیالکوٹ

اگرچہ مسلکِ ماضی رہا ہے آگ ہی آگ
اجڑ سکا نہ مگر مادرِ زمیں کا سہاگ

❄ محمد صفدر......پشاور

ہنسے تو مجھ پہ ہنسے اور وہ بھی بر سرِ عام
سنا ہے آپ تو ڈرتے تھے جگ ہنسائی سے

❄ زمین اعجاز......فیصل آباد

تم اتنی دور سے چل کر مرے قریب آئے
تو اب قریب ہی بیٹھو، تھکن مجھے دے دو

❄ کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی

وہ دور کوئی اور تھا جب دل کا بھرم تھا
اب ملتا ہے بازار میں دو چار درم کا

❄ مدحت......کراچی

ہم اپنی وضع کے بندے ہیں ہم اپنی طرز کے انساں ہیں
جو زیست مرا سرمایہ تھی وہ زیست بھی تجھ پہ واری ہے

❄ محمد قاسم......لاہور

آنا پڑا ہے اس کو ہمارے حضور میں
ہم سے الجھ رہے تھے مقابل کے فیصلے

❄ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی

ہر سمت نظارے تو ہیں بکھرے ہوئے لیکن
اک اس کے تبسم کا وہ جلوہ نہیں ملتا

❄ ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی

بات کا زخم ہے قتل کے زخموں سے سوا
کیجیے قتل مگر منہ سے کچھ ارشاد نہ ہو

❄ افضل خان......کوئٹہ

یوں بھی ہوتا ہے کہ طوفان کی زد میں آکر
بادل اُمڈے ہوئے طوفان پہ چھا جاتے ہیں

❄ انعم کمال......کراچی

جس کے موڑوں پہ لٹایا گیا انساں کا سہاگ
میں تو اس راہ کو تلووں کا لہو تک بھی نہ دوں

❄ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی

جلتے ہوئے سورج کو سمندر سے نکالو
ساحل کو جلانے سے اُجالا نہیں ہوتا

❄ عشرت جہاں......سکھر

وہ کفر ہے ایمان کی معراجِ کمال
جس کفر کو انساں سے محبت ہوجائے

کوپن
برائے
شمارہ
ستمبر
2016

محفلِ شعر و سخن

نام : ______________________

پتا : ______________________

دھماکا

عظیم جمال

ایک چھوٹا سا دل اور اس کے بڑے کمال... اگر اس میں عشق کا جذبہ نہ ہوتا تو شاید انسان میں اتنی جرأت بھی نہ ہوتی... وہ بھی بے خوف و خطر موت کے راستے پر چل رہے تھے... چاہت میں جینے کی آرزو میں آخری سفر کے مسافر جب منزل پر پہنچے تو گویا تمام تھکن اتر گئی۔

ایک دوسرے کو پانے کی تمنا میں فنا ہوجانے والے عاشقوں کا قصہ



مل ٹابون اپنے کمرے میں ایک نہایت اہم کام میں مشغول تھا۔ وہ چھ عدد ہلکے قسم کے ڈائنامیٹ بموں کو ایک ساتھ باندھ رہا تھا اور جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک نہایت طاقتور بم تھا جو ایک بڑی ڈیزل کشتی کے پرخچے اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کے بعد وہ کافی دیر تک بم میں لگے ہوئے فیوز کے تاروں کو چیک کرتا رہا۔ اس نے فیوز کے تاروں کے دونوں سرے بڑی احتیاط سے ایک دوسرے سے جدا کر رکھے تھے کیونکہ

یہ بم اس نے خود اپنے جسم کے پرخچے اڑانے کے لیے نہیں بنایا تھا۔

رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہی وہ چونک پڑا۔ بم کو اس نے بڑی احتیاط سے دبیز کاغذ کی ایک تھیلی میں رکھا۔ لباس درست کرنے کے بعد آئینے پر الوداعی نظر ڈالی اور گھر سے باہر نکل آیا۔ اب وہ اپنی کار میں بیٹھا ہاورڈ کونر کے مکان کی طرف جا رہا تھا۔ ہاورڈ نہ تو اس کا دوست تھا، نہ ہی شناساؤں میں تھا۔ یہ اور بات تھی کہ ہاورڈ اس حقیقت سے لاعلم تھا۔ اس کا بنگلا نما مکان آبادی سے قدرے ہٹ کر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھا اور آبادی سے پہاڑی تک جانے کا راستہ ہر وقت سنسان پڑا رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب چاہتا، ہاورڈ کی غیر موجودگی میں اس کے مکان پر پہنچ جاتا۔ یہاں تک کہ کوئی راہ گیر بھی اس کی اس آمدورفت کو نہیں دیکھ پاتا تھا۔

اس نے اپنی کار مکان سے سو گز دور ہی پام کے ایک بڑے درخت کے نیچے کھڑی کی۔ وہ ہمیشہ اپنی کار اسی جگہ کھڑی کرتا تھا کیونکہ اس جگہ کھڑی ہوئی کار کو نہ بڑی شاہراہ پر سے دیکھا جا سکتا تھا اور نہ وہ ہاورڈ کے مکان سے نظر آ سکتی تھی۔ اب وہ کاغذ کی تھیلی کو ہاتھ میں لیے ہوئے بڑی تیزی سے مکان کے پچھلے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔

ہاورڈ کی بیوی جینن کونر بھی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ متوسط قد کی ایک قبول صورت عورت تھی۔ سر کے بال سنہرے اور چمک دار تھے جس کی وجہ سے اس کے حسن کی رعنائی میں چار چاند لگ گئے تھے۔ بڑی بڑی خوابیدہ آنکھوں سے ذہانت اور سخت گیری عیاں تھی۔

ٹابون نے باورچی خانے کا پچھلا دروازہ بند کرنے کے بعد قریب رکھے ہوئے ایک اسٹول پر دبیز کاغذ کی وہ تھیلی رکھ دی جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کے بعد اس نے گیس کے چولھے کے قریب کھڑی ہوئی جینن کو اپنی آغوش میں لے لیا لیکن اس کے ہونٹ جینن کے ہونٹوں سے نہ ٹکرا سکے۔ اس نے بڑی پھرتی سے اپنا چہرہ ایک جانب گھما لیا تھا جس کے نتیجے میں ٹابون کے ہونٹ اس کے رخسار سے چپک کر رہ گئے۔

''کیوں...... کچھ ناراض ہو؟'' ٹابون نے پوچھا۔

''میں اس وقت بہت پریشان ہوں ٹابون۔'' یہ کہہ کر اس نے اسٹول پر رکھی ہوئی خاکی رنگ کے دبیز کاغذ والی تھیلی کو گھور کر دیکھا اور بولی۔ ''لے آئے کیا؟''

''ہاں۔''

''اوہ...... اس طرح! اگر یہ پھٹ گیا تو؟'' جینن نے قدرے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔ چھ کے چھ ڈائنامیٹ اس وقت بغیر فیوز کے ہیں۔'' ٹابون نے کہا۔

''چھ ڈائنامیٹ!''

''بالکل......'' ٹابون نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''یہ نہ صرف اس کی کشتی کے پرخچے اڑا دیں گے بلکہ ان کے دھماکے کی آواز بھی دور دور تک سنی جا سکے گی۔''

''لیکن ٹابون میں......''

''اوہ جینن خدا کے لیے۔'' ٹابون نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اب کسی دوسری تجویز کی گنجائش نہیں ہے، ہم اسی منصوبے کو بروئے کار لائیں گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے ٹابون لیکن مجھے خدشہ ہے کہ ہم پر شبہ ضرور کیا جائے گا۔''

''نہایت لغو خیال ہے۔'' ٹابون نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاورڈ حسب معمول اپنی کشتی میں سوار ہوگا اور انجن اسٹارٹ کرنے کے لیے اگنیشن کی چابی گھمائے گا اور بس...... دھماکا!''

''اوہ۔'' جینن نے جھرجھری سی لی۔

''ہاں۔'' مل ٹابون نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد تم چند ماہ تک ایک سوگوار بیوہ کی کامیاب اداکاری کرو گی اور ان چند ماہ کے دوران سب سے پہلے تو تم انشورنس کمپنی سے ہاورڈ کی زندگی کے بیمے کی رقم جو چالیس ہزار ڈالرز بنتی ہے، حاصل کرو گی۔ بیس ہزار ڈالرز کا یہ مکان اور اتنی ہی مالیت کے بونڈ وغیرہ۔ ممکن ہے دس پندرہ ہزار ڈالرز کی نقدی ہاورڈ کے اکاؤنٹ میں بھی موجود ہو اور پھر اس کا سیف ڈیپازٹ لاکر بھی تمہارے سامنے کھولا جائے گا۔ اس میں سے ظاہر ہے کہ کنکر پتھر نہیں برآمد ہوں گے۔ یہ ساری کی ساری رقم ایک لاکھ ڈالرز سے بھی زیادہ بنتی ہے جو قانونی طور پر تمہاری ہو جائے گی اور تمہارے مال دار ہو جانے کے بعد بھلا میں کس طرح غریب رہ سکتا ہوں۔ دونوں مل کر عیش کریں گے۔''

''لیکن اس طرح تو تم بھی شبہے سے بالاتر نہیں رہ سکو گے۔'' جینن نے کہا۔

''پھر وہی لغو خیال۔ بھلا مجھ پر کیوں شبہ کیا جائے گا؟ جبکہ ایسے کیس میں عام طور پر بیوی پر شبہ کیا جاتا ہے لیکن سوگوار بیوہ کا جو کہ مال دار بھی ہو، ساتھ دینے والے بہت سے پیدا ہو جاتے ہیں اور جو لوگ تم سے ہمدردی کریں گے،

میں بھی انہی میں سے ایک ہوں گا اور پھر تم اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو کہ تمہارا شوہر ایک رسوائے زمانہ شخص ہے۔ درجنوں لوگ رات دن اسے کوستے رہتے ہیں اور اس کی موت کے خواہاں ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے جین کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا اور کہا۔ ''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں جین کہ ان حالات میں ہم پر کسی طرح بھی شبہ نہیں کیا جائے گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر پولیس......''

''پولیس اس میں کیا کر سکے گی؟ وہ ہمارے خلاف ثبوت کہاں سے لائے گی؟ ہم دونوں کے تعلقات کے متعلق کسی کو علم نہیں ہے۔ ہم کبھی کسی کے سامنے ایک دوسرے سے نہیں ملے لیکن ہاورڈ کے کرتوتوں اور اس کے دشمنوں سے سبھی واقف ہیں۔ بھلا ایک ایسا شخص جس نے اپنے درجنوں دشمن بنا رکھے ہوں، کسی وقت بھی کسی حادثے کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس نے نہ جانے کتنے خاندان اجاڑے ہوں گے لہٰذا ایسے شخص کی سلامتی کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے۔ میں کہتا ہوں جین کہ اب اس بم کا دھماکا ضرور ہوگا۔''

جین کچھ نہیں بولی۔ اس کے بجائے وہ فریج کی طرف بڑھی اور اسے کھول کر مشروب کی بوتل نکال لی۔

''میری طبیعت بہت پریشان ہے ٹابون۔ میں اپنے ذہن کا کچھ بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے مگر ابھی نہیں۔'' ٹابون نے اس کے ہاتھ سے بوتل لیتے ہوئے کہا۔ ''بعد میں...... پہلے ہم یہ کام کریں گے جو بہت ضروری ہے۔ اس کے بعد ہمارے لیے پینا اور پلانا ہی باقی رہ جائے گا۔ ہم اپنی کامیابی کا جشن اور ہاورڈ کی موت کا سوگ پی پی کر منائیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟''

''لیکن ٹابون......''

''اب کیا ہے؟''

''ایک چیز اور ہے جو میں نے محسوس کی ہے۔''

''وہ کیا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ ہاورڈ ہم پر شبہ کرنے لگا ہے۔''

''پھر وہی۔'' ٹابون نے کہا۔ ''تم''...''ہم'' کا استعمال کر کے مجھے بھی شامل کر رہی ہو۔ میرے متعلق ہاورڈ کچھ نہیں جانتا۔ اب صرف تم باقی رہ جاتی ہو۔ تو تم نے بھلا یہ کیونکر محسوس کیا کہ وہ تم پر شبہ کرنے لگا ہے؟''

''یہ تو میں نہیں کہہ سکتی لیکن کئی بار میں نے ایسا محسوس کیا ہے۔'' جین نے کہا۔

سائنس کی دنیا

س: یہ بتائیے کہ قدرتی سائنس کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے؟

ج: دو علم نباتات اور علم حیوانات

س: کیا آپ دنیا کی اس واحد رنگین گیس کا نام جانتے ہیں جو سبزی مائل زرد رنگ کی ہوتی ہے؟

ج: کلورین

س: یہ بتائیے کہ بارش کے ایک قطرے کا اوسط وزن کتنا ہوتا ہے؟

ج: 0.2 گرام

س: ان شعاعوں کا نام بتائیں جسے فوٹو گرافرز اندھیرے میں تصاویر بنانے کے لیے استعمال میں لاتے ہیں؟

ج: انفرا ریڈ ریز

س: اس مرکب کا نام بتائیں جس کی مقدار سوئی گیس میں سب سے زیادہ ہوتی ہے؟

ج: میتھین۔

س: یہ بتائیے کہ پارہ کتنے درجہ فارن ہائیٹ پر جم جاتا ہے؟

ج: صفر درجہ فارن ہائیٹ سے بھی 38 درجے نیچے پر۔

س: یہ بتائیے کہ واٹر گیس کسے کہتے ہیں؟

ج: ہائیڈروجن اور کاربن مونو آکسائیڈ کے آمیزے کو۔

س: یہ بتائیے کہ روشنی کتنے رنگوں کا مرکب ہے؟

ج: سات۔

س: یہ بتائیے کہ روشنی کس شکل میں سفر کرتی ہے؟

ج: لہروں کی صورت میں۔

س: یہ بتائیے کہ قدیم ترین سائنس کا علم کسے کہا جاتا ہے؟

ج: علم ہیئت۔

قلمی تعاون: ادریس بھٹی، منڈی بہاؤالدین

"تمہارا اشارہ کہیں بیمہ پالیسی کی طرف تو نہیں؟"

"ہاں۔" جین نے کہا۔ "کیا یہ بات مشکوک نہیں ہے کہ جب میں نے ہاورڈ سے اس کی بیمہ پالیسی کو دُگنا کرنے کے لیے کہا تو وہ بلا حیل و حجت راضی ہو گیا اور اسی دن اس نے نہ صرف اپنی بلکہ اس کے ساتھ ہی میری بیمہ پالیسی کی رقم بھی دُگنی کر دی۔"

"تو اس میں پریشان ہونے کی کون سی بات ہے؟"

"اوہ ٹابون...... تم سمجھتے کیوں نہیں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس نے مجھے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہو ورنہ میری بیمہ پالیسی کی رقم کو دُگنا کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟"

"بالفرض اگر ایسا بھی ہے تو کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ بم دھماکے کے بعد وہ تمہیں قتل کرنے اور تمہاری بیمہ پالیسی کی رقم حاصل کرنے کے لیے زندہ رہ جائے گا۔" یہ کہہ کر ٹابون نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ "جین! تم واقعی بری طرح نروس ہو لیکن اگر تم ذرا بھی غور کرو تو حقیقت یہ ہے کہ تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

چند لمحوں تک جین ٹابون کو غیر یقینی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ خشک ہونٹوں کے درمیان سے جھانکتی ہوئی سفید دانتوں کی قطاریں بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ اچانک اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے اور بولی۔ "ہاورڈ کو ضرور مرنا چاہیے۔ اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

یہ سن کر ٹابون نے چہکتے ہوئے کہا۔ "یہ ہوئی نا بات...... اب یہ سمجھ لو کہ آج اس شہر میں سب سے پہلے مرنے والا شخص ہاورڈ کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔" پھر اس نے جین کی ٹھوڑی کو اپنی انگلی سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اس فیصلے کے بعد تم کس قدر حسین لگ رہی ہو جین کہ بس...... لیکن آؤ پہلے موت کے اس ہرکارے کو اس کی اپنی جگہ پر نصب کر آئیں۔ پھر آج رات ہم ہوں گے اور یہ مشروب ہوگا۔"

"لیکن ایک گلاس تو واپسی پر......"

"نہیں، ہرگز نہیں۔" ٹابون نے کہا۔ "واپسی پر تم گھر میں سب سے پہلے ٹی وی دیکھو گی اور اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کرو گی۔ میں سیدھا ہوٹل پام گرو اور اپنے دوستوں کے ساتھ وقت گزاروں گا تاکہ ان سب کو وہاں میری موجودگی کا احساس ہو سکے اور وہ لوگ میری موجودگی میں ہی اس دھماکے کی آواز سن سکیں۔"

بات جین کی سمجھ میں آ گئی تھی اور اب دونوں مکان سے نکل کر ساحل کی طرف جا رہے تھے جہاں ہاورڈ کی تیس فٹ لمبی ڈیزل کشتی ایک چھوٹی سی برتھ سے لگی ہوئی ہلکے ہلکے ہلکورے کھا رہی تھی۔ برتھ پر چڑھنے کے بعد دونوں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں لیکن اطراف میں مکمل سناٹا تھا۔ دونوں خاموشی سے کشتی میں اتر گئے۔

مل ٹابون کو اپنے فن کے جوہر دکھانے میں مشکل سے نصف گھنٹا لگا تھا۔ اس نے کمال ہوشیاری سے بم کا فیوز انجن کے سوئچ سے منسلک کر دیا تھا۔ کام ختم ہو جانے کے بعد دونوں چند لمحوں تک اسٹیئرنگ وہیل کے پاس ہی دبکے بیٹھے رہے۔ کشتی کے اطراف ہلکی ہلکی لہروں کے ٹکرانے کے شور کے سوا اور کسی قسم کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اچانک جین نے جھرجھری سی لی اور کسی سردی کھائی ہوئی بکری کی طرح کانپنے لگی۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔ میں سوچ رہی ہوں ٹابون کہ جب وہ اس اگنیشن سوئچ میں چابی گھمائے گا تو کیا ہوگا؟"

"یہ بات ہم کشتی سے باہر نکل کر بھی سوچ سکتے ہیں۔" ٹابون نے کہا۔ "آؤ یہاں سے نکلیں۔ ہاورڈ اب آتا ہی ہوگا۔ اسے تم لنچ کھلاؤ گی اس کے بعد وہ اپنے روزانہ دورے پر روانہ ہونے کے لیے کشتی پر آئے گا۔ اگنیشن سوئچ میں چابی گھمائے گا، اس کے بعد جو کچھ ہوگا، وہ ہم کل کے کسی بھی اخبار میں پڑھ سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے جین کا ہاتھ پکڑا اور کشتی میں سے بھورے رنگ کے دبیز کاغذ کی اس تھیلی کو اٹھانا بھی نہیں بھولا تھا جس میں وہ بم رکھ کر لایا تھا۔

لیکن جیسے ہی وہ برتھ کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے، جین کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ خود ٹابون بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ان دونوں ہی کی نظریں ایک ساتھ اس لمبے تڑنگے شخص پر پڑی تھیں جو بڑی کینہ توز مسکراہٹ کے ساتھ ان کی جانب بڑھ رہا تھا۔

"خوب، بہت خوب۔" اس نے ان دونوں کے قریب آ کر کہا۔ اس کا انداز راستہ روکنے کا سا تھا۔ "تو تم دونوں کو معاشقہ لڑانے کے لیے یہ کشتی ہی مناسب معلوم ہوئی...... کیوں؟"

"ہاورڈ!" جین نے سسکاری سی لی۔

"ہاں، کہو میری جان۔" ہاورڈ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ پھر وہ ٹابون کی طرف گھوما اور اس کی مٹھی میں

دبی ہوئی بھورے رنگ کی کاغذ کی خالی تھیلی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اور مسٹر ٹابون! یقیناً تم اس تھیلی میں سینڈوچز لائے ہو گے حالانکہ ایسے رنگین موقع پر بوتل زیادہ کارآمد رہتی ہے۔''

''ہاورڈ...... ہم دونوں...... میرا مطلب ہے کہ تم غلط سمجھ رہے ہو۔ ہم دونوں صرف......''

''یوشٹ اپ......'' ہاورڈ نے دہاڑ کر کہا۔ ''میں تم دونوں پر کافی عرصے سے نگاہ رکھے ہوئے ہوں۔''

''آپ اپنی بیوی پر الزام لگا رہے ہیں مسٹر ہاورڈ......'' ٹابون نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

''بیٹا تم تو چپ ہی رہو۔'' ہاورڈ نے منہ سے کف اڑاتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی بیوی پر الزام بھی نہ لگاؤں اور تم دوسرے کی بیوی کے ساتھ گل چھرے اڑاؤ۔ چلو تم دونوں کشتی میں واپس چلو۔''

''خدا کے لیے ہاورڈ جلد بازی سے کام نہ لو۔'' جین نے التجا کی۔ یہ سن کر ہاورڈ نے اپنے کوٹ کی بغلی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر نکالا تو اس میں چھوٹی نال کا ایک پستول دبا ہوا تھا۔ ''اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ اور کشتی پر واپس چلو۔'' اس نے پستول کو حرکت دے کر غراتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں ہاورڈ...... کشتی نہیں۔'' جین نے بوکھلا کر کہا۔

''کیوں...... کشتی میں کیوں نہیں؟ وہی تو ایک مناسب جگہ ہے۔ ابھی ابھی کچھ دیر پہلے تم دونوں نے کشتی میں ہی استفادہ حاصل کیا ہے۔''

''میری بات سنو ہاورڈ۔ کشتی میں......''

''چل...... کمینی!'' ہاورڈ نے اسے برتھ کی جانب دھکیلتے ہوئے کہا۔ ٹابون بھی اپنا سفید چہرہ لیے ہوئے جین کے ساتھ تھا۔ کشتی میں سوار ہوتے ہی ہاورڈ نے باریک ڈور کا ایک لچھا جین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لو ذرا جلدی سے اپنے اس نامراد عاشق کے ہاتھ پیر کس کر باندھ دو۔''

''ہاورڈ! خدا کے لیے ہماری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم نے کشتی میں......''

''میں سب جانتا ہوں، اسے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

مجبوراً جین نے اس کے ہاتھ سے باریک ڈوری کا لچھا لیا اور ٹابون کے دونوں ہاتھ کس کر اس کی پشت پر باندھ دیے۔ اس کے بعد پیر بھی باندھ دیے۔ ہاورڈ پستول تانے کھڑا رہا۔ اس کے بعد اس نے فرسٹ ایڈ بکس کھولا اور اس میں سے ٹیپ کا رول نکال کر جین کو دیتے ہوئے کہا۔ ''اب اس ٹیپ سے اس کا منہ بند کرو۔''

پھر جیسے ہی جین اس کام سے فارغ ہوئی، ہاورڈ نے بڑی آسانی سے اسے بھی باندھ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، منہ پر ٹیپ بھی چپکا دی۔ ''بس اب تم یہ نہیں بتا سکو گے کہ تم نے کشتی میں کیا کیا ہے۔'' اس نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا اور ان دونوں کو پچھلی نشست پر بٹھا دیا اور خود اسٹیرنگ والی نشست پر جا بیٹھا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اسٹیرنگ وہیل تھام لیا۔ وہ ٹابون کی طرف گھوما اور بولا۔ ''کچھ دیر بعد میں تمہاری کار جھیل والی پہاڑی پر لے جاؤں گا جہاں چٹان میں اتنا بڑا سوراخ موجود ہے کہ اس میں سے تمہاری کار گزر کر دو سو فٹ کی بلندی پر سے جھیل میں جا گرے گی۔ نشانی کے طور پر تم دونوں کے کچھ کپڑے بھی ڈال دوں گا تاکہ پولیس کو یقین ہو جائے کہ تم دونوں اس حادثے میں ہلاک ہو چکے ہو۔''

یہ سن کر جین اور ٹابون خود کو آزاد کرانے کی جدوجہد کرنے لگے۔ ہاورڈ نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''لیکن اس سے پہلے میں تم دونوں کو گہرے سمندر کے اس حصے میں لے جا کر ڈالوں گا جہاں آج کل شارک مچھلیوں کا بہت زور ہے۔''

پھر اس نے جیب سے ایک چاقو نکالا۔ اسے کھول کر اس کے چمکدار پھل کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اور سمندر میں پھینکنے سے پہلے اس چاقو سے تم دونوں کے جسموں پر کچھ نقش و نگار بھی بناؤں گا۔ یہ میرا شوق بھی ہے اور یقیناً مچھلیاں بھی اسے پسند کریں گی۔''

یہ سن کر جین اور ٹابون خود کو آزاد کرانے کے لیے ایک بار پھر ناکام جدوجہد کرنے لگے۔ وہ تڑپ رہے تھے، مچل رہے تھے اور ان کی پُرخوف اور سرخ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ چاقو جیب میں رکھنے کے بعد ہاورڈ چند لمحوں تک ان دونوں کی جدوجہد سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر اس نے اگنیشن سوئچ میں چابی داخل کی اور ان دونوں کی طرف گھوم کر بولا۔ ''بس...... تو اب تیار ہو جاؤ دوستو! یہ اپنی نوعیت کی واحد اور دھماکا خیز موت ہو گی۔'' ہاورڈ نے کہا اور چابی گھما دی۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُم مریم	نایاب جیلانی	ایماء اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

محی الدین نواب

تینتیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چھپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت واحترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن وعشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین وسنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ وآہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ





گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمر واور چاچی فتی کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا، وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی، برباد کر کے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جج تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی۔ مراد قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ ماروی چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے۔ مراد نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوگیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کوبو کے ساتھ مل گیا۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آگئی۔ مراد مرینہ کے زیر اثر آچکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کردیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ MET آفیسر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ممنی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کر کے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجیکشن لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر ممنی سن کے بیٹے ایمان سے ہوگئی۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھٹکانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں میکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے میکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آگیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہوگئی اور پاکستان آگئی۔ ادھر مراد دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کر کے انڈیا پہنچ گیا اور میکی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا اور اسے اغوا کرلیا۔ تاہم بعد میں اسے چھوڑ دیا مگر میڈونا کو مرینہ سے بچانے کے لیے مراد اسے لے کر نکل پڑا لیکن مرینہ نے راستے میں اسے چھاپ لیا۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے تاہم مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہوگئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کرالیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوا دیا۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہوگئے اور وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ درگا نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشریٰ اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہوگئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کرلیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست باب النساء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی جیکرز کو زیر کرلیا۔ مراد ملکہ نگارا کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے

مراد کی باتوں سے اندازہ لگالیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کرلیا۔ ادھر مرینہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ نگار سے نکاح پڑھوالیا اور بشری اور بلے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کرلیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہوگیا۔ مراد اور نگار میں اختلاف ہوگیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد برسرِاقتدار آگیا۔ بابا اجمیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہوگئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاد۔ دونوں جب چاہتے نادیدہ ہوجاتے۔ مراد نے نادیدہ رہ کر دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ ادھر دشمن مراد کو پکڑنے کے لیے محبوب اور ماروی کے پیچھے پڑ گئے۔ تاہم مراد نے ان کی ہر سازش ناکام بنادی اور انہیں سبق سکھایا۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور منگی پسند آگئی۔ مراد نے اسے اپنی شریکِ حیات بنالیا۔ مراد کے بارے میں یہ مشہور ہوگیا کہ اس کے تابع کئی جنات ہیں جن سے وہ دشمنوں کو زیر کرتا آرہا ہے۔ دشمن اس کا توڑ ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ مراد اور ہم زاد کی نادیدہ صلاحیت ختم ہوگئی اب وہ دونوں اس صورتِ حال پر پریشان تھے۔ ادھر ہم زاد کو اس سے زیادہ اپنی محبوبہ جینی کے پاس نہ جانے کی پریشانی تھی، وہ اس کے بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔ ادھر دشمن تنظیموں نے مراد کو دھمکی دی تھی کہ وہ ان کا سرپرست بن جائے ورنہ اپنے انجام کے لیے تیار رہے۔ مراد نے جیکی براؤن کو فون کیا اور اسے انجام سے خبردار کیا تو وہ مراد سے دشمنی سے باز آگیا اور اس نے مراد کے دس دشمنوں کو ٹھکانے لگادیا۔ ادھر جینی کو ریاست ارض اسلام پہنچانے کے لیے جہاز میں سوار کیا گیا مگر حادثاتی طور پر جینی نے بچے کو جنم دیا اور خود جان کی بازی ہار گئی۔ وہ بچہ عجوبہ تھا۔ پیدا ہوتے ہی اس نے سب کو حیران کرنا شروع کردیا۔ وہ کروٹ بھی لے رہا تھا اور دودھ کی فیڈر کو ہاتھوں سے پکڑ کر دودھ پیا تھا۔ جینی کی لاش کو جہاز کے ذریعے واپس یہودیوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ یہودی اس عجوبہ بچے (عابد علی منگی) کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ان کے مذہب پر چلے۔ وقت گزرتا گیا اور عابی دس برس کا ہوگیا۔ دس برس کا ہونے کے باوجود وہ نوجوان لگتا تھا۔ غیر معمولی طاقت کا حامل عابی کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ اس کا حافظہ بہت تیز تھا۔ عابی کو یہودیوں نے اغوا کرانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے مگر عابی نے ان کو ٹھکانے لگادیا۔ دو اغوا کاروں کو عابی نے زندہ رکھا اور خواہش کی کہ وہ دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ خود چلا گیا۔ مراد اور ہم زاد اس کے لیے پریشان تھے۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ عابی اغوا کاروں کے ساتھ اپنی مرضی سے گیا ہے۔ ادھر یہودی تنظیم فری میسن کے عہدیدار اس کا برین واش کرنے کی تدبیر سوچ رہے تھے۔ عابی وہاں کے دارالسلطنت کس ناؤ پہنچ گیا۔ پھر وہاں سے رومانیہ آگیا۔ رومانیہ میں اسے پتا چلا کہ یہودی انسانی اعضا کی خرید وفروخت میں ملوث ہیں۔ مراد نے وہاں موجود اس عمارت کو نیست ونابود کرڈالا۔ ادھر ہم زاد کے ہاں ایک اور بچے کی ولادت متوقع تھی جو عابی کی طرح عجوبہ تھا۔ دراصل وہ بچہ نہیں بچی تھی۔ مراد نے مشورہ دیا کہ بچی کا نام ماروی رکھا جائے تو زیب النساء محفوظ رہے گی۔ یہ ان کے دل کی بات تھی۔ ادھر اچانک خبر ملی کہ ماروی انتقال کرگئی ہے۔ اچانک زیب النساء کی کوکھ میں تین ماہ کی بچی متحرک ہوگئی تھی۔ مراد نے ماسٹر کوبوبو کی مدد سے اپنا چہرہ تبدیل کرلیا اور حماد کے نام سے اپنے کاغذات تیار کرالیے۔ حماد کے پیچھے شائلہ شانی کی بیٹی تھی تاہم مراد نے اسے باور کرادیا کہ وہ حماد کا ہم شکل ہے۔ ادھر ایئرپورٹ پر شائلہ پر حملہ ہوا عابی نے اسے زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا۔ عابی کو ایک پولیس افسر اپنے ساتھ لے گیا۔ تاہم پولیس افسر عابی سمیت اغوا کیا گیا۔ پولیس افسر مارا گیا۔ مرتے وقت اس نے بیٹی کی ذمے داری عابی کے سپرد کردی۔ عابی نے ماریہ سے نکاح پڑھالیا۔ عابی اپنے دوست پولیس آفیسر کی موت کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ماریہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ ادھر زیب النساء کے ساتھ غیر معمولی واقعات ہورہے تھے۔ جب وہ بسم اللہ پڑھتی تو اس کے پیٹ میں وائبریشن سی ہوتی جیسے نومولود بچی نے جواب میں پڑھا ہو۔ انہیں بابا اجمیری کی یاد آنے لگی۔ یہ امید تھی کہ ان سے رابطہ ہوگا اور کوئی انہونی ہوسکتی تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ تناور درخت جو کبھی جھکتے نہیں وہ آندھیوں میں جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔ کارمن ڈی مورا کو یہ غرور تھا کہ اسے کوئی جھکا سکتا ہے، نہ توڑ سکتا ہے لیکن اب وہ جھک رہا تھا۔ پرنس عابی کا طوفان اس کے قدم اکھاڑ رہا تھا۔ وہ خطرناک طاقتور تنظیموں سے دوستی اور تعاون کی درخواست کرچکا تھا لیکن عابی کے خلاف کوئی اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھا۔ سب ہی کہہ چکے تھے کہ دنیا کی کوئی قانونی اور غیر قانونی قوت اسے پناہ نہیں دے سکے گی۔

ویسے یہ حقیقت ہے کہ اس دنیا میں جتنی فرعونی طاقتیں ہیں، وہ کبھی کسی سے کمتر ہونا گوارا نہیں کرتیں۔ وہ عارضی طور پر برابری کا سمجھوتا تو کرلیتی ہیں لیکن درپردہ برابر ہونے والے کو خاک کردینے کی تدابیر پر عمل کرتی رہتی ہیں۔

مراد علی منگی پہلے ہی ناقابلِ تسخیر تھا۔ اب اس کے بیٹے عابد علی منگی نے اسے اور زیادہ فولاد بنادیا تھا۔ یہ تمام مخالفین کو نظر آرہا تھا۔ ان حالات میں تمام مخالفین عارضی طور پر خود تو جھک سکتے تھے لیکن اپنے مذاہب کو دین اسلام سے کمتر ہوتے کبھی دیکھ نہیں سکتے تھے۔ فی الحال مجبور تھے کہ ان باپ بیٹے کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے سیاسی حکمتِ عملی سے دوستی نباہ رہے تھے۔

کوئی فرد ہو، کوئی قوم ہو وہ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کمزوری کا شکار ہوتی ہے۔ ازل سے تاریخ کے صفحات میں مسلسل کوئی بھی طاقتور نہیں رہا۔ یہ امید تھی کہ ان باپ بیٹے کو بھی جلد یا بہ دیر زوال آئے گا۔ ان کی کوئی بہت بڑی کمزوری ہاتھ آئے گی۔ تب وہ برتری حاصل کرکے

انہیں خاک میں ملاسکیں گے۔

اللہ تعالیٰ جل جلالہ وجل شانہ نے اس دنیا کو ایک طرح سے تماشا گاہ بنایا ہے۔ وہ غم و خوشی، عروج و زوال اور... شہ زوری و کمزوری کو الٹ پلٹ کر ہنگامہ آرائیاں جاری رکھتا ہے۔ صحت کے ساتھ بیماریاں اور جوانی کے ساتھ بڑھاپے کی کمزوری لگادی ہے۔ پہیا گھومتا رہتا ہے۔ ثواب اور عذاب ایک دوسرے کے کبھی پیچھے کبھی آگے چلتے رہتے ہیں۔ ان باپ بیٹے کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہونے والا تھا۔ ان کا دین ایمان سلامت تھا۔ وہ کمزور ہونے والے نہیں تھے لیکن ذرا بھی بھول چوک ہو تو اللہ تعالیٰ انسان کو یہ ضرور دکھاتا ہے کہ اس کی دنیا میں سیر پر سوا سیر بھی ہوا کرتے ہیں۔ اگر ایک فولاد ہے تو کوئی فولاد شکن بھی پیدا ہوجاتا ہے۔

اور ایسا ہورہا تھا اور جو ہورہا تھا' وہ ابھی نامعلوم تھا۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا تھا۔ مراد کو اور عابی کو ابھی نامعلوم مصائب سے اور آزمائشوں سے گزرنا تھا۔

ابھی کارمن ڈی مورا کی روداد جاری ہے۔ وہ راتوں رات ہیلی کاپٹر کے ذریعے پیرس اور اٹلی کے ایک سرحدی شہر میں پہنچ گیا تھا۔ وہاں سے اپنے ملک کے ایک شہر فلورنس میں آکر شہر روم کی طرف جانے والا تھا۔ اس کے دستِ راست والٹوکریز نے کہا۔ ''آپ کا کوئی رشتے دار، کوئی قابلِ اعتماد دوست بھی روم کی خفیہ پناہ گاہ کے بارے میں نہیں جانتا ہے۔ وہاں آپ اپنی شناخت تبدیل کرکے محفوظ رہیں گے۔''

اس نے کہا۔ ''اس میں شبہ نہیں کہ تم میرے وفادار اور جاں نثار ہو لیکن اندیشہ تمہاری طرف سے یوں ہے کہ پرنس یا اس کا باپ تمہاری گردن دبوچ کر اس پناہ گاہ تک پہنچ جائیں گے۔ تم ان سے جان نہیں چھڑا سکو گے۔''

''باس! میں بھی آپ کے ساتھ روپوش رہوں گا پھر کوئی ہماری پرچھائیں تک بھی نہیں پہنچ سکے گا۔''

وہ بہت پریشان تھا۔ اس نے کہا۔ ''پتا نہیں کتنے عرصے تک روپوش رہنا ہوگا۔ وہ روبوٹ ہے اسے زیر نہیں کرسکوں گا۔ کیا تمام عمر ایک خفیہ پناہ گاہ میں قیدی بن کر رہوں گا؟''

''پریشانیاں ہمیشہ نہیں رہتیں۔ ہوسکتا ہے وہ ہماری تدبیر سے نہ مرے، ہماری بددعاؤں سے مرجائے۔ ایسا بعض اوقات دیکھنے میں آیا ہے۔ اسے آج یا کل قدرتی موت آسکتی ہے۔''

کارمن کی ماں ایک وچ لیڈی تھی۔ اسے کالے علوم میں مہارت حاصل تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو عابی پر حاوی کرنے کے سلسلے میں دو بار جادوئی حربے استعمال کرچکی تھی۔ اسے مار ڈالنے کے لیے ایسے خطرناک منتر پڑھتی رہی تھی جس کے نتیجے میں وہ فولاد موم کی طرح پگھل جاتا لیکن حیران تھی کہ اس پر کسی طرح کا ردِعمل نہیں ہوا تھا۔

عابی کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوا تھا کہ کوئی اس پر جادو کررہا ہے۔ جادو تو ہر بندے پر اثر کرتا ہے۔ وہ پریشان تھی کہ اس کے پراسرار علوم بے اثر کیوں ہوگئے ہیں؟ اس نے سنا تھا کہ وہ بہت ہی دین دار اور عبادت گزار ہے۔ آسمانی کتاب کا ایک ایک لفظ اس کے لہو میں گردش کرتا رہتا ہے۔ شاید اسی لیے کسی بھی کالے عمل کو اس کے اندر داخل ہونے کا راستہ نہیں ملتا ہوگا۔

اس نے بیٹے کو فون پر کہا۔ ''وہ پرنس کوئی زبردست جادوگر ہے۔ اسے آسانی سے زیر نہیں کیا جاسکے گا۔ میں چلہ کشی کروں گی، تب ہی وہ شکنجے میں آئے گا۔ تب تک تم میرے پاس آکر رہو۔ یہاں تمہیں کالے منتروں کے حصار میں رکھوں گی۔ وہ تمہارے قریب بھی نہیں آسکے گا۔''

وہ بچپن سے ماں کے جادوئی کمالات دیکھتا آرہا تھا۔ اس کے دستِ راست والٹو نے کہا۔ ''آپ کو جادو کے ذریعے بھی بچاؤ کی تدبیر کرنی چاہیے۔ آپ کی مام بڑی باکمال وچ لیڈی ہیں۔ آپ وہاں کچھ روز رہ کر اپنی مام کی کالی شکتی کو آزمائیں۔''

اس کی ماں کا نام نتالی ووڈ تھا۔ وہ انٹرنیشنل شیطانی سوسائٹی کی ایک اہم رکن تھی۔ خوبصورت تھی لیکن چڑیل صفت تھی۔ نانی نتالی یعنی بدمعاش نتالی کہلاتی تھی۔ استنبول کی ایک قدیم بستی میں بڑھاپا گزار رہی تھی۔ وہ دوسرے ہی دن ماں کی پناہ میں پہنچ گیا۔ اسے چھپنے کی جلدی تھی۔ وہ اتنی جلدی اپنا چہرہ اور اپنی شخصیت تبدیل کرکے نئے پاسپورٹ اور ضروری کاغذات تیار نہیں کراسکتا تھا۔ اس نے پیرس سے فلورنس پھر فلورنس سے استنبول تک کارمن ڈی مورا کی حیثیت سے ہی سفر کیا۔ خود کو سمجھایا کہ رات کی تاریکی میں اسے دوست اور دشمن دیکھنے نہیں آئیں گے۔

جرائم پیشہ افراد دنیا کے تمام انٹرنیشنل ائرپورٹ پر کسی نہ کسی مقصد سے ضرور موجود رہتے ہیں۔ وہاں ماسٹر کوبوبو کے ایک ماتحت نے اسے دیکھ لیا پھر فون پر اطلاع دی۔ ''باس! میں استنبول کے اتاترک ائرپورٹ میں کارمن ڈی مورا کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کی ماں نانی نتالی اسے ریسیو کرنے آئی ہے۔''

ماسٹر نے کہا۔ ''وہ ہمارے پرنس سے چھپنے کے لیے ادھر گیا ہے۔ اسے نظروں میں رکھو۔''

نتالی بیٹے کی سلامتی کے لیے پریشان تھی۔ وہ پچھلی رات سے عمل پڑھتی رہی تھی۔ اس کی حویلی نما رہائش گاہ کے ایک حصے میں شیطانی سوسائٹی کے ارکان آکر شیطان کی پرستش کیا کرتے تھے۔ وہاں نتالی نے اپنے گرو گھنٹال کے تعاون سے بیٹے کے اطراف حصار باندھ دیا۔ یہ اطمینان ہوگیا کہ پرنس عابی اور اس کا باپ بھی کارمن ڈی مورا کے قریب آکر اسے چھو نہیں سکے گا۔

عابی ان کی شیطانی دشمنی سے بے خبر تھا جبکہ نتالی کئی خطرناک منتر پڑھ کر اس کی سمت حملے کرچکی تھی۔ وہ منتر اس کے آس پاس سے ہوا کی طرح گزر گئے ہوں گے اور یہ ناکامی بتا رہی تھی کہ اس پر نادیدہ شیطانی حملے کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

عابی کو پیرس جاکر بڑے ہی تلخ اور جذباتی حقائق سے دوچار ہونا تھا۔ ان میں سے ایک تو یہ کہ کارمن کو ٹھکانے لگانا تھا جبکہ وہ دشمن اب پیرس میں نہیں تھا۔ دوسرا اہم معاملہ اپنی مام جینی سے محبت اور عقیدت کا تھا۔ وہ ماں کے معاملے میں بہت جذباتی تھا۔ اس ماں نے اپنی جان پر کھیل کر اسے جنم دیا تھا۔ عابی اس کے اپارٹمنٹ میں جاکر رہتا تو جیسے ماں کی گود میں پہنچ جاتا۔

ڈی جان ہنٹر پورے یورپ میں انسانی اعضا کی خرید وفروخت کا سب سے بڑا تاجر تھا۔ مراد نے اس کے ایک تجارتی مرکز کو آگ لگا کر اسے کھنڈر بنا کر کروڑوں ڈالرز کا نقصان پہنچایا تھا۔ وہ تجارتی مرکز یہودیوں کی ملکیت تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ پرنس عابی نے اتنے بڑے ادارے کو نیست ونابود کیا ہے اور عابی نے سخت لہجے میں کہا تھا کہ اسی نے یہ نیک کام کیا ہے۔ آئندہ بھی کرے گا اور پیرس جاکر ڈی جان ہنٹر کے جسمانی اعضا چیل کوّوں کو کھلائے گا۔

فی الحال جذباتی معاملہ حاوی تھا۔ ماریہ کو منکوحہ بنانے کے بعد وہ پہلی بار ایک صنفِ نازک کے قریب آیا تھا۔ کار کی محدود چاردیواری میں وہ تھوڑی دیر تک ایک دوسرے سے لگے رہے تھے پھر فوراً ہی الگ ہوگئے تھے۔ کیونکہ وہ صرف شادی کا ہی دن نہیں تھا۔ ایک مقتول باپ اور سسر کا ماتم بھی کرنا تھا۔

وہ ایک رات کے لیے دور ہوگئے تھے۔ پہلی بار عابی کو معلوم ہوا کہ قربت کی آنچ دے کر جانے والی کوئی ہستی کس طرح دور ہوکر یاد آتی رہتی ہے۔ اس نے صبح تک سونے اور جاگنے کے دوران اسے یاد نہ کرنے کے باوجود یاد کیا تھا۔ وہ آپ ہی آپ اس کے خیالوں میں آتی رہی تھی۔

دوسری صبح وہ پھرمل گئے۔ سامانِ سفر کے ساتھ جہاز میں آکر بیٹھ گئے۔ انہیں مسافروں کے درمیان ایسی تنہائی ملی تھی کہ وہ صرف باتیں کرسکتے تھے۔ اس نے پوچھا۔ ''کیسی ہو؟''

اس نے نظریں جھکا کر کہا۔ ''ٹھیک ہوں۔ بہت مطمئن ہوں۔''

''اچھی نیند آئی تھی؟''

''آں...... نہیں۔ رات بھر طرح طرح کے خیالات گڈمڈ ہوتے رہے۔ ایک ہی دن میں ایسا صدمہ ملا جو ذہن پر حاوی رہے گا اور اتنی ساری خوشیاں ملی ہیں کہ میں ہواؤں میں اڑی جارہی ہوں۔ پتا ہی نہ چلا کہ کیسے تمام رات جاگتی رہی۔''

عابی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ خوش ہوکر بولی۔ ''کل پہلی بار تمہارے قریب آئی تو بتا نہیں سکتی کیا حال ہورہا تھا۔ میں اندر ہی اندر کانپ رہی تھی۔ خوف نہیں تھا۔ اچھا لگ رہا تھا۔''

''میرا بھی عجیب حال تھا۔ جی چاہتا تھا تمہارے پاس چلا آؤں۔ تمہارے بغیر کچھ خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ اچانک ہی تم میرے لیے ضروری ہوگئی ہو۔ شاید اسی کو محبت کہتے ہیں۔''

''کیا ہم ابھی دنیا والوں سے دور نہیں جاسکتے؟''

''یہی میں سوچ رہا ہوں لیکن ممکن نہیں ہے۔ پیرس کے ائرپورٹ پر استقبال کرنے والوں کا ہجوم ہوگا۔ ہم وہاں سے اپنی مام کے اپارٹمنٹ میں جائیں گے۔''

پھر اس نے کہا۔ ''بہتر ہے' میں اپنی مام کے بارے میں اپنی محبت' عقیدت' جذبات واحساسات بیان کردوں۔''

وہ اپنی ماں سے بہت متاثر تھا۔ اس کا دیوانہ تھا۔ ماریہ کے لیے ابھی محبت تھی، دیوانگی نہیں تھی۔ پیار کے اہم مراحل سے گزرنے کے بعد دیوانگی طاری ہوتی ہے۔ ابھی وہ ماں کے اپارٹمنٹ میں گویا ماں کی آغوش میں جانے والا تھا۔

وہ اسے بتانے لگا کہ جینیفر عرف جینی کتنی عظیم تھی کیونکہ اس کی ماں تھی اور ماں کی عظمت سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ بے شک جینی نے ناقابلِ برداشت تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ اس نے تخلیق کے کرب سے اور بڑے عذابوں سے

گزر کر ایک عجیب وغریب بیٹے کو جنم دیا تھا۔ ماریہ اس کی روداد سن کر لرز گئی تھی۔

وہ بڑے جذبے سے بولی۔ ''میں تمہاری مام کو سلام کرتی ہوں۔ رب کریم سے دعا مانگتی ہوں' کوئی ماں پھر کبھی ایسے عذاب سے نہ گزرے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی امان میں رکھے۔''

عابی نے کہا۔ ''میری دوسری مام کے ساتھ پھر یہی اندیشہ ہے۔ میرے جیسی ایک عجیب وغریب بہن پیدا ہونے والی ہے۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''یا خدا......! کیا واقعی؟''

''ہاں۔ کوششیں کی جارہی ہیں کہ میری دوسری مام کے ساتھ ایسا نہ ہو۔ دنیا جہان کے تجربہ کار ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کی جارہی ہیں۔ مام کو دن رات اٹینڈ کیا جاتا ہے۔''

وہ پیرس پہنچ گئے۔ اس روز ائرپورٹ کی انتظامیہ مشکل میں پڑ گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا سارا شہر امڈ آیا ہے۔ یہودی تنظیم کا ایک مسلح لشکر تھا۔ لشکر میں صرف اسلحہ نہیں تھا۔ رنگا رنگ پھولوں کے بڑے بڑے گلدستے تھے۔ وہ تمام مجرمانہ تنظیمیں جو مراد اور عابی سے سمجھوتا اور دوستی کرتی رہتی تھیں، پرنس کی دلہن کا استقبال کرنے کے لیے پھولوں سے لدی ہوئی آئی تھیں۔ سپر پاور اور اس کے اتحادی ممالک کے نمائندے بھی پھولوں کا انبار لے کر آئے تھے۔ ائرپورٹ کے اندر ممنوعہ حصوں میں فرانسیسی حکومت کے سپاہی اور افسران بڑی اپنائیت سے ماریہ اور عابی کو پھول پیش کر رہے تھے۔

اس ملک کے حکمران وہاں سے دور اپنے محلوں میں بیٹھے ٹی وی اسکرین پر انہیں دیکھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ ''کیسی مجبوری ہے' ہم پھول پیش کر رہے ہیں جبکہ جانتے ہیں' آج سے ہمارے شہر کا، ہمارے ملک کا امن و امان غارت ہونے والا ہے۔''

عابی خوب سمجھ رہا تھا۔ وہ سب طاقت کی پوجا کر رہے تھے۔ کوئی اس کے نام سے اور صورت سے محبت کرنے کے لیے پھول لے کر نہیں آیا تھا۔ ہزاروں کے ہجوم میں صرف ماسٹر کو بوبو کے جاں نثار کارندے قابلِ اعتماد تھے پھر یہ کہ اپنی مام تک پہنچنے کے لیے یہودیوں سے بنائے رکھنا لازمی تھا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ کریگ ہوسٹن اور ان کے خاص عہدیداروں کو اندر آنے دیا جائے۔ وہ ان کے ساتھ رہائش کے لیے جائے گا۔ اس طرح ان یہودی اکابرین کو ان کے شایانِ شان اہمیت حاصل ہوئی تھی۔ انہیں اطمینان ہوگیا کہ عابی اب کہیں نہیں بھٹکے گا۔ اپنی مام کے اپارٹمنٹ میں ان کے سامنے ہی رہا کرے گا۔

ڈی جان ہنٹر اپنے وسیع وعریض لاؤنج میں ایک صوفے کے پاس کھڑا ٹی وی اسکرین پر عابی کو دیکھ کر ناگواری سے منہ بنا رہا تھا۔ اس شہزادے سے کروڑوں ڈالرز کا نقصان اٹھا چکا تھا۔ اس اسپتال میں انسانی دل' گردوں اور آنکھوں کا اچھا خاصا ذخیرہ میڈیکل پروسس سے گزار کر محفوظ کیا گیا تھا...... مگر پھر عابی (مراد) نے اس انسٹیٹیوٹ کی وسیع وعریض عمارت کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔

ڈی جان ہنٹر انسانی اعضا کی خرید وفروخت کا بہت بڑا تاجر تھا۔ بظاہر نیک کام کر رہا تھا۔ دیکھا جائے تو وہ اپنے پیشے اور اعمال کے حساب سے ایک فرشتہ تھا۔ دکھی انسانیت کے کام آتا رہتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام مرنے والے اپنے دل، گردے اور آنکھیں دے کر نہیں جاتے۔ اس دنیا میں کروڑوں ناکارہ افراد ہیں۔ ان کی ضرورتیں پوری کرتے' اپنے کاروبار سے لاکھوں کروڑوں ڈالرز کماتے رہنے کے لیے چور دروازوں سے دل' گردے اور آنکھیں حاصل کی جاتی ہیں۔

ڈی جان ہنٹر جیسے تاجروں نے جو اسپتال قائم کیے تھے وہاں کسی لاوارث یا گمنام مریض کے آپریشن کے دوران میں رازداری سے ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ کسی کا پوسٹ مارٹم کرتے وقت اس کے سینے کو دل سے خالی کر دیا جاتا ہے۔ ایسی چوریاں ہوتی ہیں کہ مرنے والے کے عزیزوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔ لاوارث لاشوں کے تو دل' گردے اور آنکھیں نکال کر انہیں کہیں بھی پھینک دیں' کوئی پوچھنے نہیں آتا۔ بے رحمی اور درندگی کی انتہا یہ ہے کہ زندہ عورتوں' مردوں اور بچوں کو اغوا کر کے ان کے اہم اعضا نکال لیے جاتے ہیں۔

ڈی جان ہنٹر بھی یہی کر رہا تھا' ان کے علاوہ انسانی کھال' ٹشوز اور ہڈیوں کی بھی منافع بخش تجارت ہو رہی ہے۔ میڈیکل سائنس نے کمال دکھایا ہے۔ مُردوں کے ٹشوز سے زندوں کو نئی زندگی دی جاتی ہے۔ منافع زیادہ کمانے کے لیے زندوں کی بھی شامت آجاتی ہے۔

یہ چوری شاید پکڑی نہیں جاسکتی کہ ٹشوز کس طرح جائز اور ناجائز طریقوں سے حاصل کیے جاتے ہیں؟

جب مراد کو یہ معلوم ہوا تھا کہ ایک نوجوان کار کے حادثے میں ہلاک ہوگیا تھا۔ اسے لاوارث سمجھ کر ڈی جان

ہنٹر کے اس اسپتال میں پہنچایا گیا تھا۔ وہاں اس کے دل، گردے اور آنکھیں نکال لی گئیں۔ لاش کو کہیں پھینک دیا گیا تھا، تب مراد نے اس درندگی کی سزا اسے دی تھی۔ پورے اسپتال کو جلا کر کھنڈر بنا دیا تھا۔ عابی نے کہا تھا کہ وہ پیرس آکر ڈی جان ہنٹر کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ایسے تمام تاجروں کو جہنم میں پہنچائے گا جو زندہ لوگوں کے اندر سے ضروری اعضا چرالیا کرتے ہیں۔

اس وقت ڈی جان ہنٹر صوفے کے پاس کھڑا ٹی وی اسکرین پر عابی کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ ایک عجیب اور دلچسپ بات یہ تھی کہ جن آنکھوں سے گھور رہا تھا' وہ اس کی اپنی نہیں تھیں۔ انہیں کسی زندہ شخص کے چہرے سے چرایا گیا تھا۔ اس کا ایک گردہ بھی چوری کا مال تھا۔ سینے میں جو دل دھڑک رہا تھا' وہ اپنے مکین سے بچھڑ کر اس کے مکان میں آگیا تھا۔ اس کے ایک گھٹنے کی مرمت بون میرو کے ذریعے کی گئی تھی۔

اس دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں۔ اس وقت وہ تمام مُردوں کا مال متاع سمیٹ کر زندہ کھڑا ہوا تھا اور پچھلے دو برسوں سے بھیک میں مانگی ہوئی زندگی گزار رہا تھا۔

کوئی مرجائے تو اس کی قبر پر پھول بچھائے جاتے ہیں۔ اگر بتی جلائی جاتی ہے اور گلاب کا عرق چھڑکا جاتا ہے۔ ڈی جان ہنٹر نفسیاتی مریض تھا۔ آدھا مردہ تھا۔ اپنے اوپر پرفیوم اسپرے کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ جب اسپرے کی ہوئی خوشبو کم ہونے لگتی تو وہ گھبرا جاتا تھا۔ فوراً ہی پھر اسپرے کرتا تھا۔ اسی لیے خوشبوؤں کے شہر پیرس میں رہتا تھا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فون کے پاس آکر وہاں بیٹھ کر نمبر پڑھے۔ کوئی پراسرار اجنبی تھا۔ پہلے بھی کال کرچکا تھا۔ اس نے سوچا کال ریسیو کرے یا نہ کرے؟ تجسس تھا۔ کیسے ریسیو نہ کرتا؟ اس نے ریسیور کو اٹھا کر کان سے لگالیا۔

دوسری طرف سے اجنبی کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ''اسکرین پر پرنس کو دیکھ رہے ہو یا اپنی موت کو......؟ وہ پیرس کی زمین پر قدم رکھ چکا ہے۔''

ڈی جان ہنٹر نے کہا۔ ''اپنی بات کرو۔ تم دعویٰ کرتے ہو کہ پرنس مجھے ایک ذرا نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ تم ہو کون؟ میں کیسے یقین کروں؟''

''تمہیں یقین دلانا ضروری نہیں ہے۔ میں تمہیں موت کے گھاٹ اتار کر تمہارے پورے کاروبار پر قبضہ جما سکتا ہوں لیکن چاہتا ہوں تم راضی خوشی اپنی تمام تجارت میرے نام لکھ دو۔ اس کے عوض میں تمہیں عابی کے حملوں

سائیکل

جب سائیکل نئی نئی ایجاد ہوئی تو ایک آدمی نے اپنے بیٹے کو سائیکل لے کر دی، اس کا بیٹا سائیکل لے کر باہر نکلا، تو لوگوں نے دیکھا کہ لڑکے کو کوئی چیز اٹھا کر لے جارہی ہے اور لڑکا لاتیں چلا رہا ہے لیکن وہ چیز لڑکے کی جان چھوڑ نہیں رہی، لوگوں نے ڈنڈے مار مار کے سائیکل کو توڑ دیا لڑکے کے باپ کو پتا چلا تو غصے سے بھرا ہوا آیا اور لوگوں سے کہا۔ ''تم بختو تم نے میرے بیٹے کی سائیکل کو توڑ دیا۔''

لوگوں نے جواب دیا۔ ''چودھری جی اللہ کا شکر ادا کریں کہ آپ کے بیٹے کی جان بچ گئی، یہ عجیب چیز آپ کے بیٹے کو اٹھا کر لے جارہی تھی، ہم لوگ نہ ہوتے تو یہ پتا نہیں اسے کہاں لے جاتی۔''

پاکستانی

جہنم میں عذاب کے کنوؤں پر ایک ایک فرشتے کی ڈیوٹی تھی، جب کوئی جہنمی کنویں سے باہر نکلتا تو فرشتہ اسے دوبارہ دھکیل دیتا، ایک کنواں فرشتے کی ڈیوٹی کے بغیر تھا، ایک فرشتے نے پوچھا۔ ''ہر کنوئیں پر تو فرشتہ مقرر ہے پھر وہ کنواں فرشتے کے بغیر کیوں ہے۔'' جواب ملا۔ ''اس کنوئیں میں پاکستانی ہیں، جب بھی کوئی نکلنے کی کوشش کرتا ہے دوسرے اس کی ٹانگ پکڑ کے پھر اندر کھینچ لیتے ہیں۔''

ترکیب

کھلونوں کی دکان پر ایک جیسے دو ہرن رکھے تھے ان ہرنوں پر ان کی قیمتیں درج تھیں ایک ہرن کی قیمت پانچ سو جبکہ دوسرے ہرن کی قیمت دو سو درج تھی۔ ایک گاہک نے دونوں کو اچھی طرح دیکھا اور کم قیمت والا ہرن خرید لیا۔ جب گاہک دکان سے چلا گیا۔ سیلز مین نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''دیکھا ہماری سامان بیچنے کی یہ ترکیب، کبھی ناکام نہیں ہوئی۔''

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی۔ اورنگی ٹاؤن کراچی

سے بچاؤں گا۔ تم اپنی طبعی عمر تک آرام سے زندگی گزارتے رہو گے۔"

"میں کیا پاگل ہوں کہ ہر ماہ حاصل ہونے والا کروڑوں کا منافع تمہارے نام لکھ دوں؟ پہلے سامنے تو آؤ۔"

"میں روپوش رہنے پر مجبور ہوں اس لیے تمہارے ساتھ یہ گیم کھیل رہا ہوں۔ میرے سامنے ایک راستہ یہ بھی ہے کہ اپنے ہی ہاتھوں سے تمہیں ختم کر دوں۔ تمہارے بعد تمام منافع اپنے طور پر جبراً حاصل کرتا رہوں گا۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا تم خود کو سپر مین سمجھتے ہو؟"

"میری طاقت دیکھنا چاہتے ہو تو دیکھو۔ تم اچھل کر کھڑے ہو جاؤ گے۔ پھر اپنی واکنگ اسٹک کو اپنے سر پر مار کر بیٹھ جاؤ گے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی وہ یکبارگی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ واکنگ اسٹک کو اپنے سر پر نہیں مارنا چاہتا تھا لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے سر پر ماری پھر ٹیلیفون کے پاس بیٹھ گیا۔

وہ حیرانی سے منہ کھول کر خلا میں تکنے لگا۔ ریسیور کان سے لگا ہوا تھا۔ اجنبی کی آواز سنائی دی۔ "کیا ہوا......؟ دیکھ لیا......؟ یہ میں ہوں۔ جو کہہ دیتا ہوں' وہی ہوتا ہے۔ اب اٹھو اور اپنی موت کیسے آئے گی یہ دیکھو۔"

وہ یکلخت اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے کمرے میں نہیں جانا چاہتا تھا لیکن جانے لگا۔ وہاں اس نے ایک الماری کھولی۔ پھر ایک دراز کو کھول کر اس میں سے پستول نکال لیا۔

وہ دیکھ رہا تھا۔ سمجھ رہا تھا کہ جو نہیں چاہتا ہے، وہ بے اختیار کر رہا ہے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اپنا دماغ اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ کوئی اس پر قبضہ جما کر اپنے طور پر اسے استعمال کر رہا ہے۔

وہ الماری کی طرف سے گھوم کر قد آدم آئینے کے سامنے آ گیا۔ وہاں اس کے روبرو دوسرا ڈی جان ہنٹر بھی پستول لیے کھڑا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے نشانے پر تھے۔

پھر گولی چل گئی۔ فائرنگ کی زوردار آواز کے ساتھ ہی آئینہ ایک چھناکے سے کرچی کرچی ہو کر دور تک بکھر گیا۔ وہ چیخ مار کر گر پڑا۔ پستول کو پھینک کر اپنے آپ کو ٹٹولنے لگا پھر جلد ہی یقین ہو گیا کہ ابھی زندہ ہے۔

وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ فون سے رنگ ٹون ابھر رہی تھی۔ اس نے فون نکال کر ننھی سی اسکرین کو دیکھا۔ وہی اجنبی تھا۔ رابطہ کرنے پر بولا۔ "چند لمحوں میں موت بھی مل

اور زندگی بھی۔ یہ ہے میرا تماشا...... سوچو تمہارے جسم میں اپنا کوئی پیدائشی عضو نہیں ہے۔ چوری ڈکیتی کے مال سے کب تک جیو گے؟ تمہاری زندگی یوں بھی مختصر ہے۔ آئے دن اپنے اعضا کی مرمت کراتے رہتے ہو۔ دو بار گردے تبدیل کرا چکے ہو۔ سینے میں پرایا دل پریشان کرتا رہتا ہے۔ ڈاکٹروں اور دواؤں کے ذریعے اس کی دھڑکنیں قائم رکھتے ہو۔ بہتر ہے آرام سے میری چھاؤں میں عیش کرتے ہوئے دنیا سے جاؤ۔ اپنا تمام کاروبار میرے نام لکھ دو۔ میں آسانی چاہتا ہوں۔ مشکل پیدا کرو گے تو آج رات ٹھیک بارہ بجے تمہاری سانسیں روک دوں گا۔ سوچ لو۔ موت کس کے ہاتھوں سے چاہتے ہو؟ عابی کے ہاتھوں سے یا مجھے زحمت کرنی ہو گی؟"

فون خاموش ہو گیا۔ وہ گم صم سا بیٹھا ہوا تھا۔ فرش پر دور تک شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بکھر چکا تھا۔ اب تو وہی اجنبی اسے سمیٹ کر رہی سہی زندگی دے سکتا تھا۔

☆☆☆

ائرپورٹ میں وہی رونق تھی۔ وہی ہجوم تھا۔ پرنس عابی اور ماریہ کی سواری وہاں سے جا رہی تھی۔ ان کے آگے پیچھے یہودیوں کی گاڑیاں تھیں اور درجنوں مسلح محافظ تھے۔ ماسٹر کوبوبو کے کارندوں کی بھی کئی گاڑیاں تھیں۔ یہ شاہانہ جلوس ثابت کر رہا تھا کہ دوست ہوں یا دشمن، عابی کی شہ زوری کو تسلیم کر رہے ہیں۔

سپر پاور کے محل میں درجنوں اعلیٰ عہدیدار تھے۔ انہوں نے اسکائپ کے ذریعے اپنے اتحادیوں سے رابطہ رکھا تھا۔ وہ سب ٹی وی اسکرین پر عابی اور ماریہ کو دیکھ رہے تھے اور اپنے اپنے طور پر تبصرے کر رہے تھے۔

ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ "عابی ایک انتہا پسند مسلمان ہے۔ ہمارے یہودی اراکین اس کے آس پاس رہ کر دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ جب بھی حالتِ جنگ میں رہتا ہے، اپنی آسمانی کتاب کی آیتیں انگریزی ترجمے کے ساتھ پڑھتا ہے اور دشمنوں کو سمجھاتا ہے کہ اللہ انہیں کیسی منافع بخش ہدایات فرماتا ہے۔ ان ہدایات پر عمل کرنے والے کس طرح فلاح پائیں گے۔"

ایک عہدیدار نے کہا۔ "میں نے مالدوا جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تنہا عابی سے شکست کھانے والے فوجیوں میں دو افسر اور سات سپاہیوں نے دینِ اسلام قبول کیا تھا۔"

ایک نے کہا۔ "نوجوان نسل اس سے متاثر ہو رہی

ہے۔ ہم مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے اور ان سے متنفر کرنے کے ہتھکنڈے آزماتے رہتے ہیں اور یہ جنگ لڑتے ہوئے آیتوں کے ذریعے یہ تاثر دیتا رہتا ہے کہ مسلمان لڑتے وقت بھی محبت، امن و آشتی کی باتیں کرتے ہیں اور صرف باتیں ہی نہیں کرتے، امن و شانتی کا عملی ثبوت بھی دیتے ہیں۔''

ایک حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ''ہمارے لیے مشکل یہ ہے کہ اس سے کوئی غلطی نہیں ہورہی ہے۔ یہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھا رہا ہے۔ کسی کو اس پر انگلی اٹھانے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔ یہ صرف طاقت سے ہی نہیں، حسنِ سلوک سے بھی برتری حاصل کررہا ہے۔ یہ بہت گہرا ہے۔''

ایک نے پوچھا۔ ''ہم کب تک تماشائی بن کر رہیں گے؟''

دوسرے نے بے بسی سے کہا۔ ''ہاں، ہم تماشائی ہیں۔ خود اپنا تماشا دیکھ رہے ہیں۔''

دوسرے نے کہا۔ ''افسوس! ہم ایک کمزور قوم کی طرح دعائیں مانگ رہے ہیں اور اچھے دنوں کا انتظار کررہے ہیں۔''

''اور کیا کریں۔ دوا نہ ملے تو ایک دعا ہی رہ جاتی ہے۔''

اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ''شاید دعا قبول ہورہی ہے۔ کل رات میرے ساتھ عجیب سا واقعہ پیش آیا ہے؟''

سب ہی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا۔ ''میں سونے سے پہلے ڈائری لکھنے کا عادی ہوں۔ رات کو بیڈروم میں تنہا تھا۔ اچانک ہی محسوس ہوا کہ کوئی موجود ہے۔ ایسا کیوں محسوس ہوا' میں نہیں جانتا۔ بیڈروم کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کوئی آ نہیں سکتا تھا۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ یہ میرا وہم ہے۔ میں پھر لکھنے کے لیے ڈائری پر جھک گیا پھر عجیب سی بات ہوئی۔ اچانک ہی محسوس ہوا کہ میرا دماغ میرے اپنے قابو میں نہیں ہے۔ میں بے اختیار وہ لکھ رہا ہوں جو کبھی سوچا بھی نہیں تھا پھر میرے ذہن کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ نارمل ہوگیا ہوں۔ میں نے حیرانی سے ڈائری کے اس صفحے کو دیکھا میں نے وہاں لکھا تھا۔ ''طاقت کا توازن کبھی بڑھتا رہتا ہے۔ کبھی گھٹتا رہتا ہے۔ تم بڑھنے والے ہو۔ اس کے برابر ہونے والے ہو۔ اسے جھکا نہیں سکو گے، وہ بھی تمہیں جھکا نہیں سکے گا۔''

پھر اس تحریر کے نیچے لکھا تھا۔ ''تمہارا نجات دہندہ......''

حاکم اعلیٰ نے وہ ڈائری نکال کر اس صفحے کو کھول کر کیمرے کے سامنے لاکر کہا۔ ''آپ حضرات دیکھیں۔ اس

یوم آزادی

یوم آزادی ہی سے متعلق ایک بات اور ہے۔ اس موقعے پر چند روز پہلے سے اپیلیں شروع ہوجاتی ہیں جن میں کہا جاتا ہے۔

''یوم آزادی شایان شان طور پر منایا جائے۔''

''جھنڈیوں اور پرچموں سے اپنے مکان اور دکانیں سجائیں۔''

''پاکستانی پرچموں سے بازار سجائیں۔''

''پوری قوم کو اس پرمسرت موقعے پر بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔''

ٹیلی وژن پر کچھ لوگوں کو دکھایا جاتا ہے جن میں زیادہ تر بچے ہوتے ہیں۔ شاید ٹیلی وژن والوں کے ذہن میں ہو کہ یوم آزادی محض کھیل کا موقع ہے۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے، میں یوں کروں گا اور کوئی کہتا ہے کہ میں ووں کروں گا۔ اسی طرح ریڈیو پر بھی اپیلیں کی جاتی ہیں اور اخبارات میں بھی بیانات چھپتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں واقعی لوگ گھروں، مکانوں، دکانوں اور بازاروں میں پاکستانی پرچم کی جھنڈیاں لہرا کر خوشیاں مناتے ہیں۔ یہ بہار 14 اگست کو دیکھنے والی ہوتی ہے مگر اس کے دوسرے روز سے جھنڈیوں کی شکل میں چھپے ہوئے ان قومی پرچموں کا جو حشر دیکھنے میں آتا ہے، وہ ناقابل بیان ہے۔ کاش اپیلیں کرنے والے کچھ اس کے بارے میں بھی ذکر فرمادیا کریں۔ سڑکوں کے فٹ پاتھوں پر گلیوں اور نالیوں میں جس طرح پرچم والی ان جھنڈیوں کی توقیر ہوتی ہے، اسے دیکھ کر شرم سے سر جھک جاتا ہے۔

اقتباس: سرخ، سفید، سیاہ از شفیع عقیل

صفحے پر میں اپنی باتیں لکھ رہا تھا۔ اس کے نیچے اچانک تحریر بدل گئی ہے۔''

تمام اتحادی اپنے اپنے ٹی وی پر اس تحریر کو دیکھ رہے تھے اور پڑھ رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ''آپ ثبوت پیش کررہے ہیں۔ آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آرہا ہے کہ اچانک ہی آپ کے ساتھ ایسا جادو ہوچکا ہے۔''

ایک نے پوچھا۔ ''کیا اسے جادو کہیں گے؟ ایسا کس نے کیا ہوگا؟ آپ بتائیں، اس کے بعد کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔ پھر وہی بیڈروم کی خاموشی اور تنہائی تھی۔ میں نے اونچی آواز میں پوچھا۔ 'تم کون ہو؟ خود کو میرے نجات دہندہ کہتے ہو۔ پلیز سامنے آؤ۔' کوئی نہیں آیا۔ میں نے کہا۔ 'نہ آؤ۔ مگر کچھ بولو تو سہی۔'

''میں نے انتظار کیا لیکن ایسی خاموشی رہی جیسے وہاں میرے ساتھ کوئی عجیب سی غیر معمولی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ میری تو نیند اڑ گئی تھی۔ وہ خود کو نجات دہندہ کہنے والا مجھے تجسس اور اضطراب میں مبتلا کرکے چلا گیا تھا۔''

ایک نے کہا۔ ''یہ تو بڑی پراسراری قصے کہانیوں والی بات ہوگئی ہے۔ اگرچہ ثبوت ہے، یہ کہانی نہیں ہے پھر بھی کیا ہم بہلتے رہیں؟ کیا کسی نامعلوم نجات دہندہ سے اندھی امیدیں رکھیں؟''

ایک حاکم نے کہا۔ ''وہ تو ایک شوشہ چھوڑ گیا ہے۔ ہم نہ چاہنے کے باوجود اس کا آسرا کرتے رہیں گے۔''

''ہاں، یہی سمجھ میں آرہا ہے۔ ہم آسمان کی طرف دیکھتے رہیں گے لیکن من و سلویٰ نہیں اترے گا۔''

اس عہدیدار نے ایسا کہتے ہی ایک زور کا ہاتھ میز پر مارا پھر دوسری بار تیسری بار بھی یہی کیا۔ ایک حاکم نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے مسٹر ڈین! خود کو تکلیف کیوں پہنچا رہے ہو؟''

اس کا ہاتھ رک گیا۔ وہ شدید حیرانی سے بولا۔ ''میں ایسا نہیں کررہا تھا۔ اپنی مرضی کے بغیر بے اختیار ایسا ہورہا تھا۔''

دوسری اسکرین پر دیکھا گیا۔ وہاں ایک عہدیدار اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کے باہر گیا۔ پھر اسی طرح دوڑتا ہوا واپس اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا۔ دوسرے عہدیدار بھی یکے بعد دیگرے یہی کرنے لگے۔

حاکم اعلیٰ نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ''یہ کیا ہورہا ہے؟''

اچانک ایسی آواز ابھری جیسے کی بورڈ پر انگلیاں چل رہی ہوں۔ تمام ٹی وی اسکرین پر تحریر ابھرنے لگی۔

''کیا یقین آگیا؟ یہ قصہ کہانی نہیں ہے؟''

سب ہی کے سرہاں کے انداز میں ہلنے لگے۔ حاکم اعلیٰ فوراً اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ دوسرے بھی جہاں جہاں جن ملکوں میں تھے، وہاں اٹھ کر کھڑے ہوگئے تھے۔ حاکم اعلیٰ کہہ رہا تھا۔ ''ہم تعظیم و تکریم کے ساتھ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ سے التجا ہے کہ ہم سے بولیں۔ ہم سے متعارف ہوں۔ آپ ہمیں اپنا جاں نثار دوست پائیں گے۔''

اسکرین پر تحریر ابھرنے لگی۔ ''سیاست کی اور جرائم کی دنیا میں کوئی کسی کے لیے جان نثار نہیں کرتا۔ سب اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ کام کی باتیں کرو۔''

ایک نے کہا۔ ''ہم سپر پاور کہلاتے ہیں۔ پرنس عابی ہماری ساکھ کو نقصان پہنچا رہا ہے۔''

دوسرے اتحادی کہنے لگے۔ ''ہم امن و امان چاہتے ہیں۔ وہ جس ملک سے بھی گزرتا آرہا ہے، وہاں قانون کے خلاف ہنگامے برپا کررہا ہے۔ اب وہ پیرس میں رہے گا تو اپنی من مانی کرے گا۔ اپنے دینی احکامات کے مطابق حکومت فرانس کے قوانین کے خلاف دشمنوں کو سزائیں دیتا رہے گا۔''

تحریر ابھرنے لگی۔ ''انسان کے خیالات اور نظریات ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ مذاہب ایک دوسرے کے خلاف فسادات پھیلاتے ہیں۔ یہ ہلچل یہ ہنگامے قیامت تک رہیں گے۔''

اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ''یہ دنیا جیسی بھی رہے۔ ہم اپنی برتری قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ بڑی مشکل میں ہیں۔ پلیز اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے ہمارے کام آئیں۔''

تحریر ابھری۔ ''پرنس عابی کو دیکھو۔''

ان سب نے ٹی وی کے چینل تبدیل کیے۔ وہ چینل دیکھنے لگے۔ اسکرین پر عابی اور ماریہ کا لائیو پروگرام پیش کیا جارہا تھا۔ عابی اپنی مام کے اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ کار سے باہر آرہا تھا۔ اس کے چاروں طرف مسلح گارڈز تھے۔ اسی اسکرین پر کی بورڈ کی کھٹا کھٹ سنائی دی پھر تحریر ابھری۔ ''تماشا دیکھو۔ عابی نشانے پر آگیا ہے۔''

سب نے دیکھا۔ عابی کے سامنے جو سیکیورٹی افسر تھا۔ اس نے اچانک ہی عابی کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ''خبردار......! مجھ پر جوابا حملہ نہ کرنا۔ وعدہ کرتا ہوں، جان نہیں لوں گا۔ صرف زخمی کرکے دنیا والوں کو دکھاؤں گا کہ سیر پر سوا سیر آگیا ہے۔''

اچانک ایسی سچویشن پیدا ہوگئی تھی کہ اس وقت ٹی وی

دیکھنے والے کروڑوں افراد دم بخود رہ گئے۔ سپر پاور اور اس کے تمام اتحادی تو اچھل کر کھڑے ہو گئے تھے۔

ماریہ اچھل کر عابی کے سامنے آگئی۔ اس سے لپٹ کر ڈھال بن گئی تھی۔ سیکیورٹی افسر نے اپنی بات ختم کرتے ہی ٹریگر کو دبایا۔ یہ اب تک دیکھنے میں آیا تھا' کبھی ایک گولی بھی اس کے وجود کو چھو کر نہیں گزری تھی۔ موت اس سے کترا کر نکل جاتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ بالکل قریب سے نشانہ خالی گیا۔

پھر اسے دوسرا موقع کیسے ملتا۔ چاروں طرف سے تڑاتڑ گولیاں چلنے لگیں۔ وہ سیکیورٹی آفیسر چھلنی ہو کر زمین پر گر پڑا۔ ایک بہت بڑا یادگار رہنے والا ڈراما اچانک شروع ہو کر ختم ہو گیا۔ تمام مخالفین جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔

حاکم اعلیٰ نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے پکارا۔ ''مسٹر ان نون! کیا تم میری بات سن رہے ہو؟ یہ کیا ہو گیا؟ ایسا سنہری موقع ضائع ہو گیا۔ کیا عقل تسلیم کرتی ہے کہ قریب سے گولی چلائی جائے اور آدمی نہ مرے؟''

اسکرین پر تحریر ابھری۔ ''تمہیں تماشا دکھایا ہے۔ میں جب چاہوں گا، اس عجوبے کے سینے کو گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔ ابھی کر دیتا تو پھر کیا رہ جاتا؟ تمہارے سارے دلدّر دور ہو جاتے۔ پھر کیا میری پوجا کرنے کے لیے تم لوگ یہاں بیٹھے رہتے؟ کبھی نہیں۔ سوچو کہ میں تمہارے لیے کتنا اہم ہوں؟ یہ تو طے ہے کہ مسیحا ہوں۔ تم سب میرے بیمار ہو۔ بیمار رہو پھر کسی وقت تمہاری نبض ٹٹولنے آؤں گا۔''

اسکرین سے تحریر بجھ گئی، وہ چلا گیا۔ بے شک اس نے پرنس عابی کی شہ رگ تک پہنچ کر ثابت کر دیا تھا کہ وہ کسی وقت بھی اس کی یقینی موت بن سکتا ہے۔ اس کے موجودہ رویّے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بہت مغرور' ضدی' سرکش اور سر پھرا ہے۔ اتنی جلدی آسانی سے ان کے ہاتھ نہیں آئے گا۔

☆☆☆

مراد اور عابی کے لیے لمحۂ فکریہ تھا۔ ایسی حیرت انگیز چونکا دینے والی واردات ہوئی تھی، جس کی کبھی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ عابی اپنی ماں کے لیے بڑی عقیدت اور جذبوں سے اس اپارٹمنٹ میں آیا تھا لیکن حالات کی تلخی نے عقیدت اور جذبوں کا رخ دوسری طرف پھیر دیا تھا۔ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر انکوائری ہو رہی تھی کہ وہ وفادار اور جاں نثار سیکیورٹی افسر اچانک پرنس کا جانی دشمن کیوں بن گیا تھا؟

انکوائری کرنے والوں کو جلد ہی معلوم ہونے والا تھا کہ وہ افسر نہ جانی دشمن تھا، نہ اس نے بھاری رقم کے لالچ میں گولی چلائی تھی۔ وہ وفادار افسر احمق نہیں تھا کہ سخت سیکیورٹی کے درمیان رہ کر گولی مارتا اور خود مارا جاتا۔

مراد دور سے تماشا دیکھتا رہا تھا۔ اس نے فون پر کہا۔ ''بیٹے! وہ سیکیورٹی افسر ایبنارمل نہیں تھا۔ لیکن اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اس کا دماغ اس کے اپنے قابو میں نہیں تھا۔''

عابی نے کہا۔ ''میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ کسی پراسرار علم کے ذریعے اس کے دماغ کو جکڑ لیا گیا تھا۔ کوئی اسے اپنا آلۂ کار بنا کر مجھے مار ڈالنا چاہتا تھا۔''

مراد نے کہا۔ ''اگر اس سیکیورٹی افسر کو گولی نہ ماری جاتی تو ہم ضرور معلوم کر لیتے کہ اس نے تمہیں مار ڈالنے کے لیے اپنی جان کا خطرہ کیوں مول لیا تھا؟ کس نے اسے ٹریپ کیا تھا؟ شاید ہم اس پراسرار شخص تک پہنچ جاتے۔''

ہم زاد، زیب النساء، بشریٰ اور بلے سب ہی نے وہ منظر دیکھا تھا۔ پریشانی یہ تھی کہ عابی پر پہلی بار جیسا پراسرار حملہ ہوا تھا، اس کے پیش نظر یہ سمجھ میں آرہا تھا کہ آئندہ ایسے حملے ہوتے رہے تو وہ کسی نادیدہ دشمن پر جوابی حملہ نہیں کر سکیں گے اور یہی اس دشمن کی بہت بڑی کامیابی ہوگی۔

فی الحال یہ معلوم کرنا ممکن نہیں تھا کہ وہ کون ہے؟ کسی روپوش ہونے والے تک پہنچنے میں کچھ تو وقت لگتا ہے۔ اس وقت تک وہ نہ جانے اور کیا کرنے والا تھا۔

وہ سب یہی دعائیں مانگ رہے تھے کہ آئندہ کبھی حملے سے پہلے ہی وہ نظروں میں آجائے۔ یہودی اکابرین بھی پریشان تھے۔

عابی نے ماریہ کے ساتھ اپارٹمنٹ کے اندر آ کر کہا۔ ''مشکلیں پیش آتی رہتی ہیں۔ مصائب سے گزرتے وقت بھی زندگی کو اپنی روٹین کے مطابق گزارنا پڑتا ہے۔''

وہ ماریہ کو بازوؤں میں سمیٹ کر بولا۔ ''دشمن وار کرے ہم پیار کرتے رہیں گے۔ یہ میری ماں کا گھر ہے۔ میں اپنی ماں کے لیے ایک بہو کا خوبصورت تحفہ لایا ہوں۔ اپنی ماں کی چار دیواری میں' ان کی چھاؤں میں تمہیں مسرتیں دیتا رہوں گا۔''

وہ ایک دوسرے کو بڑے پیار سے وصول کرنے لگے۔ ماریہ نے دھیمی سی لرزتی ہوئی سرگوشی میں کہا۔ ''میں کیا کہوں کتنا اچھا لگ رہا ہے مگر ڈر بھی لگ رہا ہے۔''

عابی نے کہا۔ ''ہاں۔ ہمیں نادانی سے بچنا چاہیے۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔''

انتظار کی بات پر وہ اور قریب ہوگئی۔ الگ نہیں ہونا

چاہتی تھی۔ وہ بولا۔ ''جب خواہش بے لگام ہو جائے تو عقل بھی بے لگام ہو جاتی ہے۔ بندے کو اور زیادہ ترغیب دیتی ہے۔ ہم کوئی غلطی کریں گے تو بعد میں نقصان اٹھانا پڑے گا۔''

وہ اسے سمجھاتے ہوئے الگ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''تم بہت شہ زور ہو۔ تمہاری جیسی قوتِ ارادی مجھ میں نہیں ہے۔''

ماریہ نے آگے بڑھ کر ہاتھ تھام لیا۔ عابی نے کہا۔ ''میرے ساتھ ناموافق حالات میں بھی زندگی گزارنی ہوگی۔ جو خواہشات مچل رہی ہیں، ان پر قابو پانے کی کوششیں کرتی رہو۔ اگر ہم سنبھل کر رہ سکیں گے تو بہتری ہوگی ورنہ......''

ماریہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ''ہمارے درمیان دیوار اٹھانی ہوگی۔ اپنے اندر سے تحریص و ترغیب کی لعنت کو دور کرتے رہنے کی کوششیں کی جائیں تو خود اعتمادی اور قوتِ ارادی پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں خود پر جبر کرتے ہوئے نادانی سے بچنا ہے۔ یہاں آرام سے بیٹھ کر سوچو اچھی طرح سمجھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

وہ ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ وہاں کریگ ہوسٹن اور دو چار یہودی اکابرین اس کے منتظر تھے۔ اسے اپارٹمنٹ کے ایک ایک کمرے میں لے جا کر اس کی مام سے تعلق رکھنے والی تمام چیزیں دکھانے لگے۔ ہر کمرے کی دیواروں پر جینی کی مسکراتی ہوئی بڑی بڑی تصویریں تھیں۔ وہ بڑے جذبوں سے محبتوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

ایک کمرے میں بہت بڑی ٹی وی اسکرین تھی۔ کریگ ہوسٹن نے کہا۔ ''آپ یہاں بیٹھیں اور اپنی مام کو چلتے پھرتے اور بولتے ہوئے دیکھیں۔''

عابی ماریہ کو وہاں لے آیا۔ دونوں ایک صوفے پر بیٹھ کر جینیفر عرف جینی کو متحرک دیکھنے لگے۔ وہ اسکرین پر بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ ماں کو دیکھ کر وہ بھی خوشی سے کھل گیا۔

پہلا منظر یہ تھا کہ جینی رنگا رنگ فواروں کے سامنے خوشی سے رقص کرتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ''آج مجھے دنیا کی بہت بڑی خوشی مل رہی ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں ماں بننے والی ہوں۔''

وہ ایک سمت ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ''کیا اتنی بڑی خوش خبری سننے کے بعد بھی تم نادیدہ رہو گے؟ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں، کیا اپنے بچے کے سامنے بھی نہیں آؤ گے؟''

اپنی ماں کی بے چینی اور تڑپ دیکھ کر عابی نے دل میں کہا۔ ''بابا کو اب مام کے سامنے آنا چاہیے تھا۔''

منظر بدل گیا۔ جینی اسپتال کے بیڈ پر تھی۔ پیٹ پھولا ہوا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''میں ایک بیٹے کو جنم دوں گی لیکن بیٹا عام بچوں سے مختلف ہے۔ جسامت زیادہ ہے۔ میڈیکل رپورٹ اسے عجوبہ کہہ رہی ہے۔ میں اس پر قربان ہو رہی ہوں۔ کہتے ہیں زچگی ایبنارمل ہوگی، میجر آپریشن سے گزرنا ہوگا۔''

وہ بڑی ممتا سے بول رہی تھی۔ ''میں اپنے گاڈ سے دعا مانگتی رہتی ہوں۔ او گاڈ......! میں اپنے بچے کو دیکھنے کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں۔''

عابی ماں کی یہ بات سن کر تڑپ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''میرے بچے! میں یہ آڈیو ریکارڈنگ تمہارے لیے کرا رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے میں نہ رہوں، میری باتیں تو رہیں گی۔ میرا دل کہتا ہے 'میں نہیں رہوں گی تب بھی تم کہیں بیٹھے مجھے دیکھ رہے ہو گے۔ ان لمحات میں یقیناً میری روح کو سکون ملے گا۔''

ماں نے جو سوچا تھا، وہی ہو رہا تھا۔ وہ ان لمحات میں ماں کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں سے متحرک دیکھ رہا تھا پھر منظر بدل گیا۔ وہ ایک نیم تاریک کمرے میں بیڈ پر پڑی تھی۔ تکلیف سے کراہتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ''ڈاکٹر تھوڑی دیر کے لیے گئے ہیں۔ تھوڑی دیر تم سے آخری باتیں کر لوں۔ پھر یہ ویڈیو ریکارڈ نہیں رہے گی۔ صبح کی فلائٹ سے مجھے تمہارے بابا کے پاس ارضِ اسلام بھیجا جا رہا ہے۔ بیٹے! تم باپ کے دین پر چلو گے۔ ماں بڑے عذابوں سے گزر کر تمہیں جنم دینے والی ہے۔ کیا اس کی بے لوث ممتا کا انعام اسے نہیں دو گے؟ کیا ماں کے دین کو چھوڑ دو گے؟ بے شک تم جو دین چاہو اسے قبول کرو۔ مسلمان رہنا چاہو مسلمان رہو لیکن ایک وعدہ کرو، ماں کے دین سے کبھی دشمنی نہیں کرو گے۔ میرے بزرگانِ دین کی توہین نہیں کرو گے۔ تمام یہودی اکابرین کی تعظیم کرو گے۔ ایک بات ابھی اپنے دل پر لکھ لو' کبھی کسی یہودی کو پتھر مارو گے تو وہ پتھر تمہاری ماں کو آ کر لگے گا۔ اس سے زیادہ کچھ اور نہیں بولوں گی۔ میرے بچے! یہ کبھی نہ بھولنا کہ ایک زلزلے سے گزر کر تمہیں جنم دینے والی ہوں۔''

اس کی آخری باتیں دل میں اتر جانے والی اور گھر کر جانے والی تھیں۔ وہ اس لیے بھی متاثر ہو رہا تھا کہ ماں نے دینِ اسلام کے خلاف کوئی بات نہیں کی تھی۔ اسے باپ کا دین قبول کرنے کو ضرور کہا تھا لیکن بیٹے سے منصفانہ طور پر

اپنے دین کے تحفظ کی ضمانت چاہی تھی۔

ویڈیو ریکارڈنگ کے اختتام پر وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ یہودی اکابرین اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا رہے تھے کہ ماں کی باتوں نے اسے اسیر کرلیا ہے۔ آئندہ وہ مسلمان ہونے کے باوجود یہودیوں کا ہم نوا رہے گا۔ انہیں کبھی کسی وجہ سے بھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔

وہ اپنی مام کی ویڈیو ریکارڈنگ دیکھنے کے دوران ماریہ سے کچھ فاصلہ رکھ کر بیٹھا ہوا تھا پھر اسے بدن کی آنچ محسوس ہوئی۔ وہ اتنی دیر میں آہستہ آہستہ کھسک کر اس سے آ لگی تھی۔

اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ”تمہارے لیے سب سے پہلے دینی تربیت لازمی ہے۔ ہم جب تک اپنی عمر کے حساب سے معصوم رہ سکتے ہیں، ہمیں معصوم رہ کر غلطیوں سے پاک رہنے کی تربیت حاصل کرنی چاہیے۔ میرا فیصلہ ہے، تم بالغ ہونے تک ارضِ اسلام میں رہ کر دینی تعلیم و تربیت حاصل کرتی رہوگی۔“

وہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ ”میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ تمہاری توقع سے زیادہ یہیں رہ کر دینی تعلیم و تربیت حاصل کروں گی۔ تم جلد ہی مجھ پر فخر کروگے۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ الگ ہونے کی بات نہ کرو۔ میں جان دے دوں گی۔“

”تم میری شریکِ حیات ہو۔ میں تم پر ظلم نہیں کروں گا لیکن تمہارے فیصلے کی قوت بہت کمزور ہے۔ میرے ساتھ رہوگی تو بھٹکتی رہوگی مجھے بھی بہکاتی رہوگی۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں، تمہارے قریب نہیں آؤں گی۔ کبھی تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ جب تک تم میری قربت کے باوجود پارسا رہوگے، تب تک میں بھی پارسا رہ کر دکھاؤں گی۔“

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تمہارے اندر حوصلے اور ارادوں کی پختگی ہو۔ ٹھیک ہے ہم ساتھ رہیں گے لیکن ہمارے درمیان فاصلہ رہا کرے گا۔“

وہ دور ہوگیا۔ وہاں سے دوسرے بیڈروم میں آگیا۔

☆☆☆

کریگ ہوسٹن اپنی رہائش گاہ میں دوسرے اکابرین کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ان سب کو عابی پر ہونے والے ناکام حملے نے پریشان کردیا تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ آئندہ ہونے والا حملہ ناکام نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟ بچاؤ کی تدبیر کیسے کی جائے؟

انہوں نے سپر پاور اور ان کے اتحادیوں سے رابطہ کیا اس بلائے ناگہانی کے متعلق اس سے پوچھا۔ وہاں سے جواب ملا۔ ”ہاں۔ ایک پراسرار شخص نے تحریر کے ذریعے ہمیں مخاطب کیا تھا۔ اس نے اپنی غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت دینے کے لیے پرنس عابی پر قاتلانہ حملہ کرایا تھا۔ ہم سب ٹی وی اسکرین پر وہ منظر دیکھ رہے تھے اور حیران ہو رہے تھے۔ ہم نے اس سے ناکامی کی وجہ پوچھی کہ تم اتنی آسانی سے اس کے پاس پہنچ گئے تھے پھر قریب سے گولی چلانے کے باوجود اسے ہلاک کیوں نہ کرسکے؟ اس نے تحریر کے ذریعے جواب دیا۔ ”یہ تم لوگوں کو محض ایک تماشا دکھایا ہے۔ میں جب چاہوں گا، اس عجوبے کو گولیوں سے چھلنی کردوں گا۔ ابھی کردیتا تو پھر کیا رہ جاتا؟ تمہارے سارے دلدّر دور ہوجاتے پھر کیا میری پوجا کرنے کے لیے تم لوگ یہاں بیٹھے رہتے؟ کبھی نہیں..... سوچو کہ میں تمہارے لیے کتنا اہم ہوں؟ یہ تو طے ہے کہ مسیحا ہوں۔ تم سب میرے بیمار ہو۔ پھر کسی وقت تمہاری نبض ٹٹولنے آؤں گا۔“

”اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ اسکرین پر پھر کوئی تحریر نہیں ابھری۔“

کریگ ہوسٹن نے پوچھا۔ ”اس واردات کو چھ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ کیا اس نے پھر رابطہ نہیں کیا؟“

”نہیں، وہ اپنی اہمیت منوا کر گم ہوگیا ہے۔ پتا نہیں وہ کس طرح کا گیم کھیل رہا ہے؟ ہمیں یقین ہے کسی دن کسی وقت ہم سے رابطہ ضرور کرے گا۔“

سپر پاور اور اس کے اتحادیوں سے یہ باتیں سن کر کریگ ہوسٹن نے یہودی اکابرین کو دیکھا۔ ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ”وہ پراسرار شخص بہت لمبا گیم کھیل رہا ہے۔ سیاسی بساط پر بڑی طاقتوں کے لیے چیلنج بن چکا ہے۔“

دوسرے عہدیدار نے کہا۔ ”پرنس عابی پر حملہ کرکے ہمارے مقاصد کو ہماری پلاننگ کو خاک میں ملانا چاہتا ہے۔ ہمارے لیے بھی چیلنج بن گیا ہے۔“

”اس وقت دنیا کے تمام انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے جاسوس، تمام خفیہ ایجنسیاں اسے ڈھونڈ نکالنے کی ہر ممکن کوشش کررہی ہوں گی لیکن وہ بولتا نہیں ہے۔ تحریر کے ذریعے خود کو متعارف کرا رہا ہے۔ ابھی اس کا سراغ لگانا ممکن نہیں ہے۔“

تھوڑی دیر بعد ہی ڈی جان ہنٹر نے ان سے رابطہ کیا۔ اس انسانی اعضا کے تاجر سے یہودیوں کا گہرا

کاروباری رشتہ تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ پراسرار اجنبی پرنس عابی پر حملہ کرنے سے پہلے اس کے پاس آیا تھا اور ٹیلیفون کے ذریعے بات کی تھی۔

وہ تمام اکابرین حیرانی سے اس کی باتیں سننے لگے۔ چشم تصور سے دیکھنے لگے۔ ڈی جان ہنٹر کا دماغ اس کے شکنجے میں آگیا تھا۔ وہ بے اختیار اپنی الماری کے پاس گیا تھا۔ وہاں سے ایک پستول نکال کر اس نے آئینے کے سامنے آکر اپنے عکس کو گولی ماری تھی۔ یہ ثابت کیا تھا کہ وہ خود کو گولی مار کر حرام موت مر سکتا تھا لیکن اسے زندگی دی جارہی تھی۔ شرط یہ تھی کہ وہ انسانی اعضا کی تمام تجارت اس اجنبی کے نام لکھ دے۔ اگر انکار کرے گا تو آج رات بارہ بجے مارا جائے گا۔

ڈی جان ہنٹر کی یہ باتیں سنتے ہی ان اکابرین میں سے ایک نے کہا۔ ''فوراً اس کی بات مانو۔ اس کے نام اپنا کاروبار لکھو گے تو اس کا نام، پتا ٹھکانا معلوم ہو جائے گا۔''

کریگ ہوسٹن نے کہا۔ ''اس نے تمہیں کال کی تھی۔ اس کا نمبر تمہارے پاس ہوگا۔ اسے فوراً بھیجو۔''

اس نے نمبر بھیجنے کے بعد کہا۔ ''مجھے اس کی بات ماننی پڑے گی۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ جتنی زندگی مل سکتی ہے اسے جی لینا چاہتا ہوں۔ مجھے کوئی اس کے ہاتھوں سے بچا نہیں سکے گا۔''

کریگ ہوسٹن نے کہا۔ ''تمہارا کاروبار ہے، تم جانو۔''

انہوں نے ڈی جان ہنٹر سے رابطہ ختم کیا۔ اکابرین میں سے ایک نے کہا۔ ''کیا اس نمبر پر اس سے رابطہ ہو جائے گا؟''

دوسرے نے کہا۔ ''جسے پوری دنیا کے جاسوس ڈھونڈ رہے ہیں، کیا وہ ہمیں گھر بیٹھے آسانی سے مل جائے گا؟''

ایک نے کہا۔ ''یہ اس شخص کی ایکسٹرا سم ہوگی۔ اسے ضرورت کے وقت استعمال کرنے کے بعد فون سے نکال دیتا ہوگا۔''

اسی وقت کریگ ہوسٹن کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ وہ اسکرین پر نمبر پڑھتے ہی چونک کر بولا۔ ''وہی اجنبی ہے۔ وہی نمبر ہے جسے ڈی جان ہنٹر نے ابھی بھیجا ہے۔''

وہ سب ذرا سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ فون کا لاؤڈ اسپیکر آن ہو گیا۔ ایک بھاری بھرکم سی گرجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ہاں، درست سمجھ رہے ہو۔ یہ ایکسٹرا سم ہے۔ ابھی رابطہ ختم ہونے کے بعد میرے فون سے نکل جائے گی۔''

کریگ ہوسٹن نے باتیں سننے کے دوران اپنے پی اے کو اشارہ کیا کہ وہ اس نمبر کا سراغ لگائے۔ ادھر سے فون پر اس نے کہا۔ ''ہاں، یہ نمبر تمام انٹیلی جنس والوں کو بھیج دو۔ وہ میرے سائے کے پیچھے بھاگنا شروع کریں گے۔''

کریگ ہوسٹن چونک گیا۔ اس نے پی اے کو اشارے سے کہا تھا اور اجنبی نے دیکھ لیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ وہاں ہے اور ان سب کو دیکھ رہا ہے۔

اس نے جلدی سے کہا۔ ''مسٹر ان نون! ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ پلیز ہم سے دوستی کریں۔''

ادھر سے آواز آئی۔ ''یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں نے تمہارے سب سے بڑے بزنس ایجنٹ ڈی جان ہنٹر کو آج رات مار ڈالنے کی دھمکی دی ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ تمہارے ہر دل عزیز پرنس عابی کو میں نے گولی مارتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ آپ حضرات مجھے خوش آمدید کہہ رہے ہیں؟''

ہوسٹن نے کہا۔ ''اس دنیا میں سب ہی طاقت کو سلام کرتے ہیں۔ تمہاری طاقت کا کسی حد تک اندازہ ہو گیا ہے۔ پلیز اپنا مختصر سا تعارف پیش کرو۔''

''مختصر سا تعارف یہ ہے کہ میں طاقت تھا، طاقت ہوں اور طاقت رہوں گا۔ میرا نام طاقت ہے۔ طاقت کی صورت بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے میری کوئی صورت کوئی ایک رہائشی جگہ نہیں ہے۔ ہوا کسی ایک جگہ نہیں رہتی۔ میں جب چاہتا ہوں جہاں سے چاہتا ہوں ہوا ہو جاتا ہوں۔''

''تم ڈی جان ہنٹر کا کاروبار اپنے نام کرنا چاہتے ہو۔ پھر تو تمہیں اپنا نام پتا ٹھکانا ظاہر کرنا ہوگا۔''

''وہ میرے کسی آلۂ کار کے نام ہوگا۔''

''تم نے ہمارے پیشوائے اعظم اور ربیوں کے بیانات پڑھے ہوں گے۔ ہماری کتابوں اور بزرگان دین کی پیش گوئی کے مطابق پرنس عابد علی منگی ہمارے دجال معظم کا نمائندہ ہے۔ یہ ہمارے دین کا اور یہودی قوم کا بول بالا کرے گا۔ تم ہمارے مذہب سے کیوں دشمنی کر رہے ہو؟''

''مجھے کسی مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''پھر پرنس عابی کو کیوں ہلاک کرنا چاہتے ہو؟ کیا اس سے دشمنی کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

اس نے کہا۔ ''خاص وجہ طاقت کا توازن ہے۔ فی الحال ہماری اس دنیا میں صرف عابد علی منگی ہی میرے لیے چیلنج ہے۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا۔ اسے اپنے زیر اثر لاکر اسے اپنا تابعدار بنا کر رکھنا چاہتا ہوں اگر وہ زیر اثر

نہیں آئے گا تو آج پوری دنیا یہ تماشا دیکھ چکی ہے کہ میں چشم زدن میں پرنس کی شہ رگ تک پہنچ گیا تھا۔ ابھی اسی لمحے میں پھر پہنچ سکتا ہوں لیکن جلدی نہیں ہے۔ میں فاتح رہوں گا اسی لیے دشمن کو سوچنے اور دم لینے کی مہلت دے رہا ہوں۔''

ہوسٹن نے کہا۔ ''موجودہ حالات میں اندازہ ہوگیا ہے کہ تم فاتح ہوسکتے ہو لیکن تاریک پہلوؤں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اگر تم زیر ہو جاؤ گے تو مارے جاؤ گے یا پرنس سے سمجھوتا کرو گے۔ یہ دانشمندی ہوگی کہ ابھی سمجھوتا کرو۔ دوستی اور امن وامان کا راستہ اختیار کرو۔ اس طرح ہمارے صیہونی مقاصد کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ ہماری دوستی سے تمہیں فائدہ پہنچتا رہے گا۔''

وہ بولا۔ ''میں دشمنی سے فائدے حاصل کرنا جانتا ہوں۔ ایک بنیادی بات کہہ چکا ہوں۔ اس دنیا میں ابھی پرنس عابی اپنی طاقت کا لوہا منوا رہا ہے، اب میں سیر پر سوا سیر بن کر آ رہا ہوں۔ صرف ہم دو طاقتوں کے درمیان جنگ جاری رہے گی۔ باقی چھوٹی بڑی قوتیں ہماری آلۂ کار بن کر رہنے پر مجبور ہوا کریں گی۔''

ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ''ہمارا خیال ہے، پرنس عابی خون خرابا پسند نہیں کرے گا۔ ایک بار اس سے گفتگو کرو۔ ہوسکتا ہے، اس سے کسی طرح کا سمجھوتا ہو جائے۔''

''ہم آگ اور پانی ہیں۔ دوستی نہیں ہوسکے گی پھر بھی ایک بار اس سے بھی غائبانہ ملاقات ضروری ہے۔ اسے میری قوت کا اندازہ ہو چکا ہے۔ آئندہ اور ہوگا۔ میں کسی وقت اس سے بات کروں گا۔ اوکے، اب یہ فون نمبر ختم ہو رہا ہے۔''

فون خاموش ہوگیا۔ وہ سب خاموشی سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ''وہ جا چکا ہے۔''

ہوسٹن نے کہا۔ ''وہ یہاں موجود تھا۔ میں نے پی اے کو اشارے سے جو کہا، اسے وہ دیکھ رہا تھا۔''

وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہم کہہ نہیں سکتے کہ وہ جا چکا ہے۔ اس نے صرف فون کو آف کیا ہے۔''

ایک عہدیدار نے کہا۔ ''ہم کیسے مجبور اور بے بس ہوگئے ہیں۔ اس کے غیر معمولی علم کے آگے اندھے اور بہرے بن گئے ہیں۔ وہ بولے گا تو ہم سنیں گے اور ہم اس کی مرضی کے بغیر اسے دیکھ نہیں سکیں گے۔''

ایسے وقت کریگ ہوسٹن کا ایک ملازم کمرے میں آیا پھر دست بستہ ہو کر بولا۔ ''سر! میں بول رہا تھا۔''

ہوسٹن نے تعجب سے پوچھا۔ ''کیا بول رہے تھے؟ کب بول رہے تھے؟''

ملازم نے ان سب پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ابھی فون پر میں ہی بول رہا تھا۔''

سب ہی اسے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ اس نے کہا۔ ''میں نے اچانک ہی اپنے آپ کو مجبور اور بے بس پایا تھا اور یہ صاف سمجھ رہا تھا کہ آپ سے فون پر باتیں کر رہا ہوں۔ میں اس کھڑکی کے باہر کھڑا ہوا آپ حضرات کو دیکھ رہا تھا اور بڑی دلیری سے ناقابلِ گرفت کہلا رہا تھا۔''

ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ''او گاڈ! وہ ان نون اس کے اندر رہ کر بول رہا تھا اور ہمیں دیکھ رہا تھا۔''

کریگ ہوسٹن نے کہا۔ ''یہ صاف سمجھ میں آ رہا ہے کہ وہ کسی کے بھی دماغ میں گھس آتا ہے۔ پرنس عابی پر حملہ کرتے وقت سیکیورٹی آفیسر کے دماغ میں گھسا ہوا تھا۔''

ایک نے کہا۔ ''اور ڈی جان ہنٹر کے دماغ میں جا کر اس کے ہاتھوں سے اس کے ہی عکس پر گولی چلائی تھی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ ہمارے آپ کے کسی کے بھی اندر آ کر کچھ بھی کرسکتا ہے۔ ہم اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیاں بن کر رہ جائیں گے۔ سوچیں ایسا ہوگا تو ہماری اپنی حیثیت...... کیا رہ جائے گی؟ او گاڈ......! ہم صفر ہو جائیں گے۔''

یہ حقیقت سب ہی کے لیے انتہائی تشویش ناک تھی کہ انسانی کھوپڑیوں میں گھس کر جنگ لڑنے اور فاتح بننے والا شہ زور پیدا ہوگیا تھا اور جلد ہی اپنی طاقت کا لوہا منوانے والا تھا۔

موجودہ حالات میں یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ مقابلتاً پرنس عابی کی پوزیشن کیا ہوگی؟ کیا وہ اپنے دماغ میں گھس آنے والے طوفان کو روک سکے گا؟

کریگ ہوسٹن نے کہا۔ ''ایک بات سمجھنے کی ہے۔ یہ ان نون جس طرح ڈی جان ہنٹر کے سیکیورٹی آفیسر کے اور ہمارے ملازم کے دماغوں میں آ چکا ہے، اسی طرح پرنس عابی کے اندر بھی جا کر اس کے ہی ہاتھوں سے گولیاں چلا سکتا تھا۔ اسے آسانی سے ہلاک کرسکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں نہیں کیا؟''

ایک عہدیدار نے کہا۔ ''وہ کہہ چکا ہے کہ عابی کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ صرف اپنی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔''

''سوچنے سمجھنے کے لیے یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ وہ پرنس عابی کے دماغ میں بھی جا کر ایسا مظاہرہ کرسکتا تھا لیکن اب

تک پرنس سے دور ہے۔ اس سے فاصلہ رکھنے کی کوئی وجہ ہوسکتی ہے۔''

''بے شک ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارا پرنس عجوبہ ہے۔ غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے۔''

''ہمیں ان نون کے بارے میں ابھی جتنی معلومات حاصل ہوئی ہیں، انہیں پرنس کے علم میں لانا چاہیے۔''

کریگ ہوسٹن نے ماریہ کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر کہا۔''میڈم! پرنس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

اس نے کہا۔''ویٹ اے منٹ۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے پر آئی پھر دستک دے کر بولا۔''مسٹر ہوسٹن کی ضروری کال ہے۔''

عابی نے دوسری طرف سے دروازہ کھول کر اس سے فون لے کر کہا۔''اسے کھلا رہنے دو۔ ابھی فون واپس کروں گا۔''

اس نے اپنے بیڈروم میں آکر فون پر پوچھا۔''ویل مسٹر ہوسٹن! کیا بات ہے؟''

وہ بولا۔''آپ کے ان نون دشمن کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اس کی پراسرار قوت یہ ہے کہ وہ کسی کے بھی دماغ میں گھس جاتا ہے۔''

عابی نے کہا۔''اور جس کے دماغ میں گھستا ہے' اس سے اپنی مرضی کے مطابق عمل کراتا ہے۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔''آپ کیسے جانتے ہیں؟''

''یہ تو اسی وقت سمجھ میں آگیا تھا' جب اس سیکیورٹی آفیسر نے اپنے انجام سے بے خبر ہو کر مجھ پر گولی چلائی تھی۔ وہ اپنے ہوش میں، اپنے اختیار میں نہیں تھا۔ کوئی اس کے دماغ کو آپریٹ کررہا تھا۔''

''ہاں۔ ہمیں بھی اسی وقت اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ دماغوں میں گھسنے والا کھیل کھیل رہا ہے۔ پھر جب ڈی جان ہنٹر اور سپر پاور کے حکام کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے تو یقین ہوگیا ہے۔ پرنس! وہ صاف الفاظ میں کہہ رہا تھا کہ آج تم پوری دنیا میں اپنی طاقت کا لوہا منوا رہے ہو۔ اب وہ منوائے گا۔ یہاں اور کوئی تیسری سپر پاور نہیں ہوگی۔ صرف آپ دونوں ہی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہیں گے۔ باقی قوتیں تماشائی بن کر تابعدار بن کر رہا کریں گی۔''

''وہ اپنے ارادے بیان کررہا ہے۔ آپ سننے کے سوا اور کیا کرسکتے ہیں۔''

''ہم آپ کے لیے فکرمند ہیں۔ وہ کسی دن کسی وقت بھی آپ کے دماغ میں گھس آئے گا۔''

''تو پھر روکا کس نے ہے؟ آتا کیوں نہیں ہے؟''

''وہ کہہ رہا تھا' کسی دن آپ سے غائبانہ ملاقات کرے گا۔''

اچانک ہی کریگ ہوسٹن کی آواز اور لہجہ بدل گیا۔ وہ بولا۔''اور یہی ہماری غائبانہ ملاقات ہے۔''

عابی کسی حد تک سمجھ گیا پھر بھی اس نے پوچھا۔''مسٹر ہوسٹن! آپ کی آواز کیوں بدل گئی ہے؟''

بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔''میں ان نون بول رہا ہوں۔''

عابی نے کہا۔''اچھا تو تم ہو...... بولو۔''

وہ بولا۔''میں بہت اچھا دوست ہوں اور بہت برا دشمن ہوں۔ ابتدا میں دوستی کروں گا لیکن دشمنی دائمی ہوگی۔''

وہ ذرا چپ ہوا۔ عابی نے کہا۔''میں نے سن لیا...... اور کچھ؟''

''دوستی کروں گا اپنے مفادات کے لیے۔ دشمنی کروں گا تمہارے مفادات کچلنے کے لیے......''

''کچلنے کے لیے براہِ راست سامنے آؤ۔ مسٹر ہوسٹن کو بیساکھی بنا کر باتیں کیوں بنا رہے ہو؟''

اس نے جواب دیا۔''یہ میرا طریقۂ کار ہے۔ ابھی جو کہہ رہا ہوں، اسے سننے کے لیے کریگ ہوسٹن اور یہودی اکابرین کی موجودگی بھی لازمی ہے۔ پہلے تمہارے ساتھ تھوڑی نیکی کررہا ہوں۔ ان یہودیوں کا فراڈ تمہیں بتا رہا ہوں۔ آج تم نے ٹی وی اسکرین پر اپنی ماں جینیفر کو نہیں دیکھا ہے۔ وہ ایک کرائے کی ماڈل گرل تھی۔''

یہ ایسی دھماکا خیز اطلاع تھی کہ ادھر تمام یہودی اکابرین چیخ پڑے۔''مسٹر ہوسٹن! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

کریگ ہوسٹن فون کو کان سے لگائے ان سب کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنے اختیار میں نہیں تھا۔ ان نون کے شکنجے میں رہ کر اپنے ہی خلاف بول رہا تھا۔

وہ تمام اکابرین کے منع کرنے کے باوجود بے اختیار بولتا جارہا تھا۔''پرنس......! وہ ماڈل گرل تھرٹی کنگسٹن اسٹریٹ لندن میں رہتی ہے۔ اس کا نام مارتھا ہے۔ تم ابھی اس سے بات کرسکتے ہو۔ اس کا فون نمبر......''

کئی اکابرین دوڑتے ہوئے آگئے۔ انہوں نے کریگ ہوسٹن کا منہ بند کردیا۔ اس سے فون کو چھین کر دور پھینک دیا۔ اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہنے لگے۔''ہوش میں آؤ۔''

وہ تو ہوش میں آگیا لیکن وہ فون جہاں جا کر گرا تھا۔ وہاں سے ایک عہدیدار نے اٹھالیا تھا۔ اسے کان سے لگا کر مارتھا کا فون نمبر بتاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔''پرنس......! میں

ان نون بول رہا ہوں۔تم نہیں جانتے' یہاں کریگ ہوسٹن کا منہ بند کردیا گیا ہے۔اس سے پہلے کہ اس بے چاری مارتھا کا بھی منہ بند کردیا جائے، اس نمبر پر میری اطلاع کی تصدیق کرو۔"

کئی اکابرین اس عہدیدار پر بھی پل پڑے۔اس فون کا سوئچ آف کردیا گیا۔عابی نے اپنے خاموش فون کو دیکھا۔ یہ ایک عجیب سچویشن تھی۔اس کا جانی دشمن اسے یہودیوں کے فراڈ سے آگاہ کررہا تھا۔عابی نے مارتھا کے نمبر پنچ کیے۔فوراً ہی رابطہ ہوگیا۔اس کی آواز سنائی دی۔"ہیلو کون؟"

"میں پرنس عابد علی منگی بول رہا ہوں۔کیا تم مارتھا ہو؟"

وہ بہت ہی جوشیلے انداز میں بولی۔"کیا واقعی......؟ او مائی گاڈ......!تم پرنس عابد علی منگی ہو؟"

"ہاں۔ابھی میں نے تمہاری ویڈیو ریکارڈنگ دیکھی۔تم نے واقعی کمال کی ایکٹنگ کی ہے۔ہو بہو میری مام لگ رہی ہو۔"

"آں......؟" وہ ذرا گڑبڑائی پھر بولی۔"لیکن انہوں نے کہا تھا کہ میں کبھی تم سے نہیں ملوں گی۔کبھی کسی سے اس ویڈیو ریکارڈنگ کا ذکر نہیں کروں گی۔"

"بے شک انہوں نے کہا تھا لیکن اب اس معاملے کو راز نہیں رکھا جارہا ہے۔انہوں نے مجھے تمہارا یہ نمبر دیا ہے۔میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ خوش ہوکر بولی۔"او مائی گڈنس!یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔میں کل ہی پیرس آجاؤں گی۔"

"آجاؤ۔میں انتظار کروں گا۔"

عابی نے فون بند کردیا۔گہری سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ویڈیو ریکارڈنگ کے مناظر... یکے بعد دیگرے دکھائی دینے لگے۔اسے ماں کے حوالے سے دلی صدمہ پہنچنے لگا۔اب وہ مارتھا تھی۔آہ......!نہ ماں تھی، نہ ممتا کے سچے بھرپور جذبات تھے۔محض اداکاری تھی۔

یہودیوں نے ایک بیٹے کے جذبات سے کھیلنے کے لیے ایک کرائے کی ماں کو استعمال کیا تھا۔وہ ایسا ڈرامانہ بھی کرتے تو وہ جانتا تھا' سمجھتا تھا کہ اس کی مام اپنے بیٹے کے لیے کیسے جذبات رکھتی ہوگی لیکن اس نے ایک ماں کی صحیح تصویر نہیں دیکھی تھی۔

یہودیوں نے اسے اپنے دین سے باندھ کر رکھنے کے لیے اس کی فرضی ماں سے یہ کہلوایا تھا۔"وعدہ کرو' ماں کے دین سے کبھی دشمنی نہیں کروگے۔میرے بزرگان دین کی توہین نہیں کروگے' تمام یہودی اکابرین کی تعظیم کروگے۔میرے بیٹے ایک بات ابھی اپنے دل پر لکھ لو' کبھی کسی یہودی کو پتھر مارو گے تو وہ پتھر تمہاری ماں کو آکر لگے گا......"

انہوں نے واقعی دل میں اتر جانے والی باتیں ایک فرضی ماں کے ذریعے کہلوائی تھیں۔اب وہ تمام ڈرامانگاری کھل کر سامنے آگئی تھی۔عابی نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ فی الحال اس فریب کو خاموشی سے برداشت کرنا تھا۔

اس نے فون کے ذریعے مراد سے رابطہ کیا۔اسے تمام موجودہ حالات بتائے پھر کہا۔"بابا جانی!مجھے ان یہودیوں کے حصار سے چپ چاپ نکل جانا چاہیے۔"

"ہاں مگر جلدی نہ کرو۔جو حقیقت معلوم ہوچکی ہے' اس سے انجان بن کر رہو۔ابھی یہ سمجھنا ہے کہ ان نون جانی دشمن ہوکر تمہیں یہودیوں کی چالبازی سے آگاہ کیوں کررہا ہے؟وہ اس کھیل سے کیا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے؟"

"بابا جانی!آپ کی سمجھ میں کیا آتا ہے؟"

"سیدھی سی بات سمجھ میں آرہی ہے کہ تم یہودیوں کے دشمن ہوجاؤ گے تو وہ لوگ تم سے نمٹنے کے لیے ان نون سے دوستی اور سمجھوتا کریں گے۔"

"یہودیوں کی دشمنی کھلی کتاب کی طرح ہے۔میں آئندہ ان سے دوستی نباہتے ہوئے دشمنی کا جواب دیا کروں گا۔یہ سچ ہے کہ منافقوں سے بھری ہوئی دنیا میں دشمنی دوستی کی طرح اور دوستی دشمنی کی طرح ہوا کرتی ہے۔"

بعض اوقات زندگی میں ہر سمت سے مسائل و مصائب کی یلغار ہوتی ہے۔ایک پراسرار ان نون بہت ہی زبردست چیلنج بن گیا تھا۔پتا نہیں کتنے عرصے تک سر پر مسلط رہنے والا تھا۔

عابی نے اب تک اپنے دماغ میں ناگوار سی خلافِ معمول باتیں محسوس نہیں کی تھیں اور نہ ہی اپنے اختیار سے باہر ہوکر دماغی کمزوری محسوس کی تھی۔وہ خدا کا شکر ادا کررہا تھا اور معمول کے مطابق عبادت میں مصروف رہنے لگا تھا۔

ادھر ان نون بڑی واردات کرنے اور اپنی غیر معمولی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے باوجود عابی کے قریب نہیں آرہا تھا۔اس نے دور ہی سے فون کے ذریعے اس سے گفتگو کی تھی۔ وہ کسی وجہ سے مجبور ہوگیا یا اس کی اپنی حکمت عملی ہوگی۔وہ خود ہی فاصلہ رکھنا چاہتا ہوگا۔بہر حال وہ عابی کے اطراف گھیرا تنگ کررہا تھا لیکن قریب آکر تنگ نہیں کررہا تھا۔

☆☆☆

یہودی اکابرین بوکھلا گئے تھے۔یہ بھید کھل رہا تھا کہ

ایک کرائے کی جینیفر عرف جینی کی جھوٹی ممتا کے ذریعے پرنس عابی کو الو بنایا جارہا ہے۔

یہ سچ ثابت ہوگیا تھا کہ مارتھا نامی ایک ماڈل نے ویڈیو ریکارڈنگ میں اس کی ماں کا رول پلے کیا تھا۔ وہ یہودی اکابرین ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ عابی کو ان نون کی باتوں کا یقین نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ عابی مارتھا تک پہنچ کر اس کے منہ سے سچ سنے' اس کا منہ ہی بند کردینا چاہیے۔

ایسے نیک کاموں میں دیر نہیں کی جاتی۔ اس مقصد کے لیے خفیہ ایجنسی کے قاتل مارتھا کے اپارٹمنٹس میں پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ ان نون بھی وہاں پہنچ گیا۔ مارتھا نے اس یہودی شخص کو دو گن مینوں کے ساتھ دیکھا تو کہا۔ ''مسٹر والٹن! میں آپ کو کال کرنے والی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ میری وہ ویڈیو ریکارڈنگ راز میں رہے گی۔ کبھی اس بیٹے کو بھی معلوم نہیں ہوگا کہ میں اس کی ماں بن کر ایکٹنگ کررہی تھی۔''

والٹن نے کہا۔''ہاں، تمہیں یہ اچھی طرح سمجھادیا گیا تھا۔ کیا پرنس نے اس سلسلے میں تم سے کچھ کہا ہے؟''

''اس نے ابھی شام کو مجھے کال کی تھی۔ وہ جانتا ہے کہ اس ویڈیو میں، میں نے اس کی ماں کا رول پلے کیا ہے۔''

''کیا تم نے اعتراف کرلیا ہے کہ وہ درست کہہ رہا ہے؟''

''ہاں، جب وہ جانتا ہے تو میں اعتراف کیوں نہ کرتی؟''

والٹن نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کرتے ہوئے کہا۔''یو نان سنس! تم ابھی اسی وقت اپنی موت کو کال کرچکی ہو۔''

اس نے دوسرا ہاتھ مارتے ہوئے ایک شوٹر کو حکم دیا۔ ''اسے ختم کرو اور چلو یہاں سے۔''

اس شوٹر نے ایک الٹا ہاتھ والٹن کے منہ پر رسید کرتے ہوئے کہا۔''یہ مارتھا کے طمانچے کا جواب ہے۔''

وہ غصے سے تلملا کر گالیاں دینا چاہتا تھا پھر اس کی گن کا رخ اپنی طرف دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بے یقینی سے بولا۔ ''مجھے گولی ماروگے؟ کیا دماغ چل گیا ہے؟''

ان نون کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔''جہاں میں آجاتا ہوں وہاں دماغ ایسے ہی گھوم جاتا ہے۔ یہ سن لو کہ مارتھا میری آلۂ کار ہے۔ میں نے اس کے ذریعے ضروری معلومات حاصل کی ہیں۔ اس کے طمانچے کا جواب طمانچہ ہے تو اس کی موت کا جواب تم تینوں کی موت ہوگی۔''

والٹن ایک تھپڑ کے بعد ہی سہا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔''ہم مارتھا سے دشمنی نہیں کریں گے۔ ہمیں سلامتی سے جانے دو۔''

انہوں نے سلامتی سے اپنے اکابرین کے پاس آکر وہاں کی روداد سنائی۔ یہ ان کے لیے انتہائی فکروتردد میں مبتلا کرنے والی بات تھی کہ ان نون ان سے بہت ہی سنگین دشمنی کررہا تھا۔ عابی کو ان سے متنفر کررہا تھا۔

ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔''ان نون نے یہ کہا تھا کہ اس دنیا میں دو ہی طاقتیں ہوں گی۔ ایک تو وہ خود ہوگا اور دوسرا پرنس عابی رہے گا۔ وہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہیں گے۔ باقی قوتیں ان کے زیر اثر' تماشائی بن کر رہیں گی لیکن وہ تو عابی سے نہیں، ہم سے لڑ رہا ہے۔ عابی کو فائدہ اور ہمیں نقصان پہنچا رہا ہے۔ وہ ایسا کیوں کررہا ہے؟''

کریگ ہوسٹن نے کہا۔''اس کا جواب تو وہی دے گا۔ اگر وہ سن رہا ہے تو پلیز اتنا بتادے' ہم سے دشمنی کیوں کررہا ہے؟''

ایک عہدیدار نے کہا۔''مسٹر ان نون! ہم تمہیں نہیں جانتے۔ شاید انجانے میں بھی تمہیں کبھی نقصان نہیں پہنچایا ہے پھر تم پرنس عابی کو کیوں ہم سے بدظن اور متنفر کررہے ہو؟''

وہ سب چپ رہ کر انتظار کرنے لگے۔ اس کی طرف سے خاموشی تھی۔ انہوں نے کئی بار خوشامدانہ انداز میں اسے مخاطب کیا لیکن مایوس ہوتے رہے۔ پھر کریگ ہوسٹن نے عابی سے فون پر رابطہ کیا۔''پرنس! ہم بہت پریشان ہیں۔ یہ ان نون بڑی مکاری سے تمہیں ہمارے خلاف بھڑکا رہا ہے۔''

عابی نے کہا۔''میں بھڑک جانے والا نادان بچہ نہیں ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔''

ہوسٹن نے کہا۔''میں ان نون کی یہ چالاکی بتادوں کہ اس نے کسی مارتھا کے دماغ میں گھس کر اسے تمہاری مام جینی بنایا ہے۔ تمہارے پاس اس کا فون نمبر پہنچایا ہے۔''

عابی نے کہا۔''میں مارتھا سے باتیں کرچکا ہوں۔ مسٹر ہوسٹن! جو لاکھوں' کروڑوں ناظرین کے سامنے مجھے گولی مارنے اور جانی دشمن ہونے کا اعلان کرچکا ہو' وہ کبھی دوست ہو ہی نہیں سکتا۔ اتنی تو عقل ہے مجھ میں......''

وہ بولا۔''تم پر خدا کی رحمت ہو۔ تم اس مکار دشمن کو خوب سمجھ رہے ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ تم ہمارے جیسے نیک نیت اور محبت کرنے والوں سے دور ہوجاؤ۔ خدا کا شکر ہے۔ نہ تم نادان ہو' نہ ہم تمہارا ساتھ کبھی چھوڑیں گے۔''

فی الحال عابی کی یہی حکمتِ عملی تھی کہ دشمنوں کی چال بازیاں سمجھ میں آجائیں اور کسی چال بازی کے جواب میں فوری کارروائی ضروری نہ ہو تو کوئی ردعمل پیش نہ کیا جائے۔ انجان

بن کر دشمنوں کو خوش فہمی میں رکھا جائے کہ اگلا نادان ہے۔
عابی نے نادان اور انجان بن کر انہیں مطمئن کر دیا۔
وہ فون تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ کسی سے بھی بات کرنا ہو تو وہ ماریہ کے فون پر بولتا تھا۔ اس نے ماریہ کے دروازے پر دستک دی۔ اسے فون واپس کرتا تھا۔
وہ دونوں تنہا ایک چھت کے نیچے صرف کھانے پینے اور ضروری باتیں کرنے کے لیے یکجا ہوتے تھے۔ باقی وقت اپنے اپنے بیڈروم میں رہا کرتے تھے۔ ماریہ نے فون لینے کے لیے اپنی خواب گاہ کا دروازہ کھولا تو خوشبو کا ایک تازہ جھونکا سا آیا۔
اس نے بہت ہی دیدہ زیب لباس پہنا ہوا تھا۔ نگاہوں کو کھینچ رہی تھی۔ عابی نے اسے بڑی محبت سے دیکھ کر کہا۔ ”بہت حسین بہت ہی دل نشین لگ رہی ہو۔ تم میری زندگی ہو۔ میرے ساتھ رہنے آئی ہو۔ ایک بات کہوں؟“
”کہو۔ دل سے سنوں گی۔“
”اگر میری طرح مستقل مزاج رہو گی۔ مضبوط ارادے رکھو گی تو ہم ابھی آؤٹنگ کے لیے جائیں گے۔“
وہ فوراً ہی خوش ہو کر بولی۔ ”میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتی ہوں۔ آپ اپنی ماریہ کو فولاد پائیں گے۔“
ایسے وقت فون پر میسیج کی ٹون سنائی دی۔ عابی نے بٹن کو دبایا، اسکرین پر لکھا تھا۔ ”میں رنگ میں بھنگ نہیں ڈالنا چاہتا۔ جاؤ خوب انجوائے کرو۔“
یہ بات تشویش ناک تھی کہ وہ ماریہ کے دماغ میں آکر ان میاں بیوی کی باتیں سن رہا تھا۔ عابی نے کہا۔ ”تم میرے دماغ میں نہیں آسکتے۔ ابھی ماریہ کے اندر موجود ہو۔“
اسے جواب نہیں ملا۔ عابی نے یہی بات میسیج کے ذریعے کہی تو فون پر اس کی تحریر ابھری۔ اس نے لکھا تھا۔ ”ماریہ تم سے دور رہے تو اس کے دماغ میں پہنچ جاتا ہوں۔“
عابی نے فوراً ہی مراد سے رابطہ کر کے کہا۔ ”بابا جانی! وہ دشمن ماریہ کے دماغ میں آجاتا ہے۔ آپ فوراً... ہپناٹائز کرنے والے کی خدمات حاصل کریں۔ وہ اس کے دماغ کو لاک کر دے گا تو پھر وہ خبیث میری شریک حیات کے قریب نہیں آسکے گا۔“
باپ نے اسے تسلی دی۔ ”انتظار کرو۔ ابھی ایک تنویمی عمل کرنے والا آجائے گا۔“
اس نے ماریہ سے کہا۔ ”ہم تنویمی عمل کے بعد آؤٹنگ کے لیے جائیں گے۔“
ادھر ان نون نے ایک اور میسیج ارسال کیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ”آج رات سونے سے پہلے ایک ایسا دھماکا کروں گا کہ تم ہل کر رہ جاؤ گے پھر ان یہودیوں کو ہلا کر رکھ دو گے۔“
اس نے ماریہ کو فون دیتے ہوئے کہا۔ ”یہی زندگی ہے۔ شیطانی معاملات پیچھے پیچھے آتے رہتے ہیں۔ ہم حوصلے سے آگے آگے چلتے رہیں گے۔“

☆☆☆

دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حسن بکھرا پڑا ہے۔ حسین نظارے پکارتے ہیں...... آؤ ہم سے لطف اندوز ہونے کے لیے آؤ۔ یہی زندگی ہے۔ ہم ایک محدود ماحول تک رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔
عابی کو بھی حالات نے جکڑ دیا تھا۔ وہ پیرس جیسے خوبصورت شہر میں آکر ماریہ کے ساتھ ایک اپارٹمنٹ میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنی تھی۔ نامحرم نہیں تھی۔ اسے اپنی دھڑکنوں سے لگا سکتا تھا لیکن لاکھ شہ زور ہونے کے باوجود اسے چھو بھی نہیں سکتا تھا۔
حالات تقاضا کر رہے تھے کہ وہ صرف جنگ جاری رکھے اپنی زندگی میں تفریح کے لمحات کو نظر انداز کرتا رہے۔ اس کی زندگی میں ایکشن ہی ایکشن رہے۔ پیار و محبت کا ایکشن اور ری ایکشن نہ رہے اور یہ سراسر ظلم ہو رہا تھا اور وہ اپنے آپ پر ظلم کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ آخر تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ماریہ کو لے کر حالات کے زنداں سے نکل آیا تھا۔
پیرس کا حسن دیکھنے سے نظر آتا ہے۔ تصویروں میں دیکھو تو یہی حسن آدھے سے بھی آدھا رہ جاتا ہے۔ الفاظ میں تعریفیں سنو تو خواب جیسا لگتا ہے۔ جو دیکھنے کی چیز ہے، اسے آنکھوں سے ضرور دیکھنا چاہیے۔
وہ دونوں پہلی بار اس شہر کی خوبصورتی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ ایفل ٹاور کی بلندی پر آگئے تھے۔ وہ روشنیوں سے جگمگاتا ہوا پورا شہر یوں لگ رہا تھا جیسے ان کے قدموں تلے دور تک جادوئی شطرنج کی طرح بچھتا چلا گیا ہے۔
وہ سحر زدہ سے ہو کر ٹاور کے دائرے میں پھر سو جاتے رہے اور بدلتے ہوئے نظارے دیکھتے رہے۔ وہ صحیح معنوں میں سحر زدہ سے ہو رہے تھے۔ اپنے آپ میں نہیں رہے تھے۔ ممنوعہ قربت کو بھول گئے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔ وہ کبھی اس کے بازو سے لگ جاتی تھی اور وہ کبھی سرگوشی کے لیے بے اختیار اس پر جھک جاتا تھا۔

پیرس کا حسن اور ان دونوں کی اپنی ذات میں رچے بسے ہوئے جذبے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ ایسی بے خودی میں کوئی نہ ہونے والی بات ہو سکتی تھی۔

پیرس کی خوبی اور خاصیت یہ ہے کہ یہ پھولوں کا اور خوشبوؤں کا شہر ہے۔ پوری دنیا میں جتنے معروف و مقبول پرفیومز ہیں' وہ سب پیرس میں تیار ہوتے ہیں۔

عابی نے ایفل ٹاور کی بلندی سے آسمان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم تمام مخلوقات میں اس لیے افضل اور اعلیٰ ہیں کہ پاکیزگی اور غلاظت' خوشبو اور بدبو میں تمیز کر سکتے ہیں۔''

اس نے ماریہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو اولین حس دی ہے' وہ سونگھنے کی ہے اور خوشبو کی لطافت کو سمجھ لینے کی ہے۔''

ماریہ نے کہا۔ ''ہاں۔ میرے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔ کچھ کھٹی میٹھی باتیں تم سے بول نہیں پاتی۔ موجودہ حالات کہتے ہیں' ابھی بولنے کا موسم نہیں ہے۔ انتظار کرو۔ یہ انتظار میرے اندر خوشبو کی طرح بسا ہوا ہے۔''

عابی نے کہا۔ ''اے رب عظیم......! تو نے کیسے احساسات پیدا کیے ہیں۔ جب ہم اذان سنتے ہیں تو ایمان پرور خوشبو کا احساس ہمارے ذہن کو چھو کر گزرتا ہے۔''

وہ گھومنے پھرنے کے دوران میں کبھی ایک دوسرے سے لگ رہے تھے' کبھی الگ ہو رہے تھے۔ اسے کہتے ہیں بے لگامی اور ایسے وقت کچھ ہو ہی جاتا ہے۔ ہاں' جو نہ سوچو وہ ہو جاتا ہے اور اچانک ہی کچھ ہو گیا۔

اچانک ماریہ نے تکلیف محسوس کی۔ اس کا ایک ہاتھ عابی کی گرفت میں تھا۔ وہ دوسرا ہاتھ پیٹ پر رکھ کر کراہتی ہوئی فرش کی طرف جھکنے لگی۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ اپنی ناف پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''بہت تکلیف ہو رہی ہے۔''

اس نے دونوں بازوؤں میں اسے اٹھا لیا۔ دوڑتا ہوا لفٹ کے پاس آیا۔ پھر نیچے گراؤنڈ فلور کی طرف جانے لگا۔ اسپتال وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں ایک لیڈی ڈاکٹر نے اسے اٹینڈ کیا پھر اپنے چیمبر میں آ کر عابی کو تکلیف کے بارے میں آگاہ کیا۔

عابی حیرانی سے دیدے پھاڑ کر خلا میں تکنے لگا۔ ماریہ کو بالغ ہونے کی سند حاصل ہو گئی تھی۔ وہ دونوں اپارٹمنٹ سے باہر آ کر صرف چار گھنٹے تک ایک دوسرے سے لگے پھرتے رہے تھے۔ وہ خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔

وہ اپارٹمنٹ میں آ کر بڑی دیر تک اس کے سینے سے لگی رہی۔ عابی بہت خوش تھا۔ اسے سمیٹ لینا اور بار بار چوم لینا چاہتا تھا لیکن بہت زیادہ محتاط رہنے کا عادی تھا۔

اس نے سمجھایا۔ ''صرف کچھ دنوں کی بات ہے۔ ابھی دور ہو جاؤ اور مستقل مزاجی کا ثبوت دو۔ ہم خلافِ اصول' خلافِ عقل جلد بازی سے پرہیز کریں گے۔''

وہ دوسرے بیڈ روم میں آ گیا۔ آدھی رات گزرنے والی تھی۔ ایسے وقت ماریہ نے دروازے پر دستک دی۔ اس نے دروازے کو کھولا۔ اس نے اپنا فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''وہی کمبخت ان نون ہے......''

وہ فون دے کر چلی گئی۔ عابی نے اسے کان سے لگا کر کہا۔ ''پلیز! میں بہت اچھے موڈ میں ہوں۔ یہ میرے آرام کا اور نیند کا وقت ہے۔ جو بولنا ہے' کم سے کم الفاظ میں بولو۔''

وہ بولا۔ ''ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ جواب ملے گا تو کتنے ہی راز کھلتے چلے جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ تمہاری مام کی وفات کے بعد اس کی لاش یہودی ڈاکٹروں کے حوالے کیوں کر دی گئی؟ اس کی آخری رسومات ادا ہونے تک تمہارے بابا جانی کو یا کسی اہم رشتے دار کو وہاں موجود رہنا چاہیے تھا۔ یا تمہاری مام کی تدفین ارضِ اسلام میں ہو سکتی تھی۔ وہاں کیوں نہ ہوئی؟''

یہ ایسی باتیں تھیں کہ عابی بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تم بہت ہی اہم سوالات کر رہے ہو۔ میں نے اس پہلو سے کبھی سوچا نہیں تھا۔ میں بابا جانی سے پوچھوں گا کہ میری مام کی میت کو اہمیت کیوں نہیں دی گئی تھی؟''

''مجھے پتا ہے۔ تمہارے بابا جانی جو جواب دیں گے' اسے ابھی میں سنا دیتا ہوں۔''

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''جتنے اہم افراد تمہاری مام کی زندگی سے اور اس کی موت سے دلچسپی لیتے رہے' میں ان سب کی کھوپڑیوں میں گھس کر بہت سے اہم راز معلوم کرتا رہا ہوں۔ تم نے ابھی کہا ہے کہ یہ تمہاری نیند کا وقت ہے۔ مجھے مختصر بولنا چاہیے لیکن یہ روداد ذرا لمبی ہے۔ اب بولو کہ آگے بولوں یا تمہیں سونے دوں؟''

''تم نے نیند اڑا دی ہے۔ آگے بولو۔''

''بات تمہاری مام سے شروع کرتا ہوں۔ جینی ایک بہت ہی ٹاپ کی کامیاب ماڈل گرل تھی۔ وہ یہودی تھی لیکن اسے اپنے مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔''

عابی نے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ' کیا تم میری مام کے دماغ

میں بھی جاتے رہے ہو؟''

''نہیں۔ یہ بارہ برس پہلے کی باتیں ہیں۔ ان دنوں میں تمہارے بابا مراد علی منگی کی کھوپڑی میں پہنچنے کی کوششیں کرتا رہتا تھا اور ناکام ہوتا رہتا تھا۔ بابا صلاح الدین اجمیری کی روحانی قوتیں آڑے آتی رہتی تھیں۔ جب تمہاری مام کی زچگی کا وقت قریب آنے لگا اور مجھے ڈاکٹروں کے ذریعے معلوم ہوا کہ وہ ایک عجیب وغریب بچے کو جنم دینے والی ہے، تب میں نے جینی میں دلچسپی لی۔ اس کے اندر پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ جینی سے تمہارے باپ کا جسمانی رابطہ بہت پہلے ہی ختم ہوگیا تھا۔ اسے جلد ہی ارضِ اسلام بھیجا جائے گا۔''

عابی نے کہا۔ ''تم نے میری مام کی اچھی بری باتوں کو ان کے اندر رہ کر معلوم کیا ہے۔ پہلے میری ماں کے بارے میں بولو۔''

''وہ کوئی مذہبی عورت نہیں تھی۔ اسے نہ یہودیت سے اور نہ ہی اسلام سے کوئی لگاؤ تھا لیکن وہ بہت ہی محبت کرنے والی فرمانبردار عورت تھی اور زندگی کے آخری ایام میں تو صرف تمہارے تصور میں کھوئی رہتی تھی۔

''وہ بڑی ممتا سے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر صرف تم سے بولتی رہتی تھی۔ وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔ خیالوں میں تمہیں دیکھتی تھی اور تمہیں سینے سے لگاتی تھی۔ اس کی ممتا کے بارے میں بولنے کے لیے بہت سی باتیں ہیں لیکن فی الحال جذبات کو نظرانداز کرو اور حقائق کی طرف آؤ۔''

وہ ذرا چپ رہ کر بولا۔ ''اچانک ہی تمہاری مام سیاسی اور مذہبی حلقوں میں اہمیت حاصل کرنے لگی۔ جب میڈیکل رپورٹ سے معلوم ہوا کہ تین ماہ کا بچہ پیٹ میں متحرک ہوگیا ہے۔ اس کے چہرے کا کچھ حصہ جھلک رہا ہے اور وہ جسامت میں تمام بچوں سے کچھ بڑا ہے تو صیہونی تنظیم کے اکابرین اچھل پڑے۔ یہودیوں کے پیشوائے اعظم نے اور دیگر ربیوں نے بیانات دیے۔ قدیم عبرانی تحریر کے نسخے پیش کیے کہ قیامت سے پہلے دنیا میں عجیب وغریب بچے جنم لیں گے۔ ان میں ایک بچہ دجال معظم کا نمائندہ ہوگا اور اس بچے کی نشانی یہ ہوگی کہ اسے ایک یہودی ماں جنم دے گی اور بچے کا کوئی باپ نہیں ہوگا۔ ان کی پیش کردہ دونوں نشانیاں درست تھیں۔ میں نے تمہاری مام کے دماغ میں رہ کر معلوم کیا ہے۔ جب تمہارے بابا اس سے ملنے آتے تھے تو نادیدہ ہوتے تھے۔ تمہاری ماں نے مرتے دم تک تمہارے باپ کی صورت نہیں دیکھی۔ وہ دنیا والوں سے یہی کہتی رہی کہ اس کی زندگی میں آنے والا مرد نادیدہ ہے۔ اس کو یا کسی کو بھی نظر نہیں آتا ہے۔ اس کے نظر نہ آنے سے یہودی پیشوا اور ربیوں نے کہا' کوئی ہے ہی نہیں تو نظر کیسے آئے گا؟ وہ اپنے دعوے کو درست ثابت کر رہے تھے کہ بچے کا کوئی باپ نہیں ہے۔ وہ اپنے دینی علوم کی سچائی کو اور قدیم عبرانی نسخوں کی اہمیت کو منوانے کی جی جان سے کوششیں کر رہے تھے۔

''وہ اپنے وسیع ذرائع اور اختیارات کے ذریعے سپر پاور اور دوسرے بڑے ممالک کو اپنا حمایتی بنا رہے تھے۔ ڈاکٹروں کی جو بھی ٹیم تمہاری ماں کا علاج کرنے آتی جاتی رہتی تھی، اس ٹیم میں یہودی ڈاکٹرز زیادہ تعداد میں رہا کرتے تھے۔ وہ تمہیں ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ تمہارے باپ مراد سے کہتے تھے کہ جینی سے ہونے والے بچے کا کوئی باپ نہیں ہے۔ لہٰذا بچے پر صرف یہودی ماں کا یہودی پیشوا اور ربیوں کا اور پوری یہودی قوم کا حق ہے۔ تمہارے بابا جانی ان کے مطالبات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ یہودی پوری دنیا میں منظم اور مستحکم ہونے کے باوجود تمہیں ان سے چھین کر نہیں لے جاسکیں گے۔ زچگی کے لمحات میں تمہاری ماں کی وفات نے حالات کو بدل دیا۔ تمہارے باپ کی نظروں میں صرف تم اہم تھے۔ تمہاری ماں کی اہمیت موت کے بعد ثانوی تھی۔ یہودی اکابرین اس کی میت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ سپر پاور اور دیگر بڑے ممالک نے ان کی حمایت میں تمہارے باپ کو سمجھایا کہ جینی آخری دم تک یہودی رہی تھی۔ اسے یہودیوں کے حوالے کر دیں۔ تمہارے باپ نے ان سے کہا..... جینی کی روح ہم سے محبت کرتی تھی۔ اس کا جسم یہودی تھا۔ ہم ایک یہودی کی قبر کی دیکھ بھال تو کرسکیں گے لیکن فاتحہ نہیں پڑھیں گے۔ ارضِ اسلام میں اس کی قبر ہو یا نہ ہو۔ ہم اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہیں گے۔ اس طرح مراد علی منگی نے تمہاری ماں کی میت کو وہاں سے لے جانے کی اجازت دے دی اور وہ اسے لے گئے۔''

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''میں نے یہ باتیں شروع کرنے سے پہلے ایک سوال کیا تھا، اسے پھر دہراتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ تمہاری مام کی وفات کے بعد اس کی لاش یہودی ڈاکٹروں کے حوالے کیوں کردی گئی؟ اس کی آخری رسومات ادا ہونے تک تمہارے بابا جانی کو یا کسی اہم رشتے دار کو وہاں موجود رہنا چاہیے تھا۔''

عابی نے کہا۔ ''تم اصولاً درست کہتے ہو لیکن بابا جانی

نے یہودیوں کے اور ان کے حمایت کرنے والوں کے پیہم اصرار پر ان کی یہودی عورت یعنی میری یہودی مام کو ان کے حوالے کر دیا تھا۔''

''اور یہی بہت بڑی غلطی کی تھی۔''

عابی نے تعجب سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو...... ان کی یہودی بیٹی کو ان کے حوالے کرنا کیا غلطی ہے؟''

''بہت بڑی غلطی...... ایک شوہر کو مرحوم بیوی سے اتنا لگاؤ نہیں ہوتا لیکن ایک مرحوم ماں سے بیٹے کو روحانی لگاؤ رہتا ہے۔ تمہیں اپنی ماں سے روحانی لگاؤ ہے۔''

وہ اچانک ہی طنزیہ انداز میں بولا۔ ''ماں کے روحانی لاڈلے! تیری ماں کی قبر کہاں ہے؟ اس دنیا کی کسی زمین پر ہے بھی یا نہیں؟''

''ہے۔ وہ اکابرین کہہ رہے تھے کہ جہاں ان کے ربیوں کو اور اکابرین کو دفن کیا جاتا ہے، وہیں مام کی قبر ہے۔ میں جلد ہی ان کے ساتھ وہاں جاؤں گا۔''

''جاؤ گے اور قبر کو دیکھو گے...... کیا ماں نظر آئے گی؟ کوئی قبر کے اندر جا کر مُردے کو نہیں دیکھتا۔ میں نے زندہ انسانوں کی کھوپڑیوں میں جا کر معلوم کیا ہے۔ تمہاری اس ماں کی قبر میں کسی لاوارث کی ہڈیاں پڑی ہیں۔''

وہ بڑی بے چینی سے پہلو بدل کر بولا۔ ''میں تمہاری بات کا کیسے یقین کروں؟''

''میں نے مارتھا کے ذریعے اپنی ایک بات کو سچ ثابت کیا تھا۔ جن لوگوں نے تمہاری ماں کی قبر میں کسی لاوارث کی لاش رکھی تھی، میں ان کے نام پتے اور فون نمبر بتاؤں گا۔ اگر ان سے سچ اگلوا سکو تو پھر میری سچائی ثابت ہوگی۔''

اس نے پوچھا۔ ''مام کی لاش وہاں نہیں ہے، پھر کہاں ہے؟''

وہ عادتاً ذرا چپ رہا پھر بولا۔ ''میں نے کہا تھا۔ آج رات سونے سے پہلے ایسا دھماکا کروں گا کہ تم ہل کر رہ جاؤ گے پھر ان یہودیوں کو ہلا کر رکھ دو گے۔ اب جگر تھام کے سنو۔ تمہاری ماں کی لاش میں کچھ نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھیں، دل اور گردے بیچ دیے گئے تھے۔''

یہ ایسی اطلاع تھی کہ بیٹے کے وجود میں زلزلہ سا آ گیا۔ اس کے حلق سے دل دہلا دینے والی ایسی آواز نکلی جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ ''نہیں...... یہ جھوٹ ہے۔''

انہوں نے بھی چیخ کر کہا۔ ''یہ سچ ہے۔''

عابی کے گرجنے سے در و دیوار ہل رہے تھے۔ ''میری ماں کے بدن کی کوئی تجارت نہیں کر سکتا۔ تو اگر جھوٹ بول رہا ہے تو تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ اگر سچ ہے تو اس روئے زمین پر کسی بھی ایسے تاجر کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے ان کے نام اور پتے بتاؤ۔ ابھی بتاؤ۔''

ماریہ ایسی دل دہلا دینے والی گرج دار آواز سے گھبرا گئی۔ باہر سے سیکیورٹی گارڈز دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ وہ دروازے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ''عابی! کیا ہوا ہے؟ دروازہ کھولو۔''

باہر سے ایک گارڈ نے کہا۔ ''سر! ہم حاضر ہیں۔ حکم کریں۔''

وہ دہاڑتے ہوئے بولا۔ ''کوئی حکم نہیں ہے۔ کوئی نہ بولے۔ جاؤ یہاں سے۔''

ماریہ نے کہا۔ ''میں نہیں جاؤں گی۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ دروازہ نہیں کھولو گے تو رونے لگوں گی۔''

وہ فون پر بولا۔ ''چپ کیوں ہو؟ ان کے نام اور پتے بتاؤ۔''

وہ بولا۔ ''کل صبح تک تمام مطلوبہ افراد کے نام پتے اور فون نمبر تمہارے اس نمبر پر بھیج دوں گا۔ ابھی اپنی زندگی کی بدترین رات گزارو۔''

فون بند ہو گیا۔ عابی پہلی بار غصے سے بے قابو ہو گیا تھا۔ ہانپنے کے انداز میں سانسیں لے رہا تھا۔ اپنی فطری ذہانت کی بدولت بہت ہی حاضر دماغ تھا۔ جذبات سے مغلوب ہونے کے باوجود اپنی غلطی کو سمجھ کر غصے پر قابو پانے کی کوششیں کر رہا تھا۔

ماریہ نے پھر دروازے پر دستک دی۔ وہ ذرا سنبھل گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ماریہ نے سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے خلافِ توقع اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ کر بازوؤں میں بھر لیا۔ اسے تھپکتے ہوئے بولا۔ ''میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ میری شریکِ حیات میرے غصے سے ڈر جائے۔ خدا کا شکر ہے۔ میں نے فوراً ہی اپنی غلطی سمجھ لی ہے۔''

''تمہیں کس بات پر غصہ آیا ہے؟''

''میں ابھی تنہا رہ کر اپنا محاسبہ کروں گا۔ جس بات پر مجھے غصہ آیا ہے، اس بات پر مجھے نارمل رہنا ہوگا۔ کیسے رہنا ہوگا؟ یہ مجھے اچھی طرح سوچنا سمجھنا ہے۔ پلیز مائنڈ نہ کرو۔ مجھے تنہا رہنے دو۔ میں ابھی تک بکھرا ہوا ہوں۔ مجھے خود کو سنبھالنے دو۔''

وہ چپ چاپ اٹھ کر چلی گئی۔ عابی نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ لائٹس آف کیں۔ پھر بیڈ پر آ کر چاروں شانے چت لیٹ گیا۔ اس نے سوچا، جو بات سوچنے سے بری لگتی ہے اور غصہ آتا ہے، اس بات کو اہمیت نہ دی جائے۔

مثلاً میں اس بات پر تلملا گیا کہ میری مام کی آنکھیں، دل اور گردے بیچ دیے گئے۔ اب کہتا ہوں۔ بے شمار ماؤں اور بہنوں کے ساتھ ایسا کیا گیا ہوگا۔ یہ ہم سنتے رہے ہیں، پڑھتے رہے ہیں۔ ایسی خبریں پڑھتے اور سنتے وقت ہمیں غصہ کیوں نہیں آتا؟ کیا اس لیے کہ وہ مائیں اور بہنیں پرائی ہوتی ہیں؟

یہ خوش فہمی ہمارے ذہن میں ہوتی ہے کہ ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا پھر ایک دن ہمارے ساتھ بھی ہو جاتا ہے۔ تب ہمیں غصہ آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے ذہانت بھی دی ہے اور شہ زوری بھی۔ میں ٹھنڈے دماغ سے بڑی سہولت سے جسمانی اعضا کے تاجروں کو خاک میں ملا دوں گا لیکن ان سے اپنی ماں کی آنکھیں، دل اور گردے چھین کر نہیں لاسکوں گا۔ کیونکہ میری مام کے اعضا حاصل کر کے جو نئی زندگی گزار رہے ہیں، وہ جینے کا حق رکھتے ہیں۔ غلط راستے سے ہی سہی ان کے ساتھ نیکی ہو رہی ہے۔ انہیں نقصان پہنچانا غیر انسانی عمل ہوگا۔

غصہ تھوک دیا تو گویا دشمنوں پر تھوک دیا۔ ان پر تھوکنے کا مطلب ہے۔ جوش میں نہیں آئے، ہوش میں آئے۔ یہی دانشمندی ہے۔ ہوش میں رہ کر ہی ان سے نمٹنے کی صحیح اور مستحکم پلاننگ کی جاتی ہے۔ ہوش مندی نے سمجھایا، انتقام فوراً نہیں لیا جاتا۔ دشمنوں کو نگل جانے کی حماقت نہ کرو۔ انہیں دانہ دانہ چباتے رہو اور تھوکتے رہو اور میں یہی کروں گا۔

وہ ٹھنڈے دماغ سے سوچتے سوچتے سو گیا۔ فجر کی اذان تک گہری پُرسکون نیند سوتا رہا۔ پھر اس نے بیدار ہو کر تازہ دم ہو کر نماز پڑھی۔ اپنے رب سے سکونِ قلب کی دعائیں مانگیں۔ دینی احکامات کی روٹین کے مطابق دن رات گزرتے رہیں تو ناقابلِ بیان روحانی سکون حاصل ہوتا رہتا ہے۔ جو مسائل پیش آتے رہتے ہیں، انہیں حل کرنے کا بھرپور اعتماد حاصل ہوتا رہتا ہے۔

ان نون نے اسے کال کی۔ ماریہ کا فون عابی کے پاس رکھا تھا۔ دشمن نے وعدے کے مطابق اسے مخاطب کیا۔ ''ہیلو پرنس! میں نے ایک ناقابلِ برداشت راز کو فاش کر کے تمہاری نیند اڑا دی ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم تمام رات سو نہیں سکے ہو۔ اب تک جاگ رہے ہو۔''

عابی نے کہا۔ ''تم سب ہی کے دماغوں میں گھس جاتے ہو۔ میرے اندر بھی آؤ۔ معلوم کرو کہ نیند اڑ گئی تھی یا نہیں؟''

''یہ تو موٹی سی عقل سے سمجھنے والی بات ہے۔ تم جاگ رہے تھے۔ جب کوئی اہم معاملہ ہوگا تو تمہارے دماغ میں آکر بیٹھ جاؤں گا۔ یہ نہ سمجھو کہ تمہارے دماغ میں نہیں آسکوں گا۔''

''میرے دماغ میں بیٹھنے کی تو کیا کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہیں ملے گی۔ کیسے آؤ گے؟''

وہ ذرا چپ رہا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تم سے فاصلہ رکھا ہے تو اس خوش فہمی میں نہ رہو کہ تمہارے دماغ کو اپنی مٹھی میں نہیں لے سکوں گا۔''

''پلیز! میری خوش فہمی دور کردو۔ یونہی دھمکی دینے کے لیے آکر ہیلو کردو۔''

''یہ میرا اپنا طریقہ کار ہے۔ یہ میری اپنی حکمتِ عملی ہے۔ تم سے دور رہ کر تمہیں تجسس میں مبتلا رکھوں گا پھر اچانک ہی کبھی شب خون ماروں گا۔''

''بھئی جواب نہیں ہے۔ کیا خوب حکمتِ عملی ہے۔ شب خون مارنے والے دشمن بھی ہو اور یہودیوں کے خلاف مجھ سے دوستانہ رویہ بھی اختیار کر رہے ہو۔''

''بے شک میرے اس رویے سے تم تشویش میں مبتلا رہو گے اور یہ تسلیم بھی کرو گے کہ میرے ذریعے تمہاری ماں سے دشمنی کرنے والے بے نقاب ہو رہے ہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ ابھی میسج کے ذریعے ان کے نام اور پتے بھیج رہا ہوں۔ میرا یہ احسان یاد رکھنا۔''

وہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد کئی نام اور ان کے رہائشی پتے اور ان کے فون نمبر ننھی سی اسکرین پر آنے لگے۔ ہر نام کے ساتھ یہ لکھا ہوا تھا کہ کس نے جینیفر عرف جینی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ بہت ہی طیش دلانے والی باتیں بھی لکھی گئی تھیں۔

عابی نے مراد کو فون پر مخاطب کیا۔ اسے جینی کے ساتھ ہونے والے مظالم کی وہ تمام روداد سنائی جو ان نون سے سن چکا تھا۔ اس نے سر جھکا کر کہا۔ ''بیٹے! ہم بھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تمہاری مام کے ساتھ ایسی زیادتی کی جائے گی۔ یہ تمہاری ذہانت اور قوتِ ارادی ہے کہ تم نے غصے کو پی لیا ہے۔ ہم بڑی سہولت سے سوچ سمجھ کر تمہاری ماں کے دشمنوں کو عبرتناک انجام تک پہنچائیں گے۔''

''بابا جانی! سوچنے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ان نون صرف مجھ سے مقابلہ کرنے اور مجھے مار ڈالنے کا دعویٰ کر رہا ہے اور مام کے حوالے سے میرے ساتھ ہمدردی اور مہربانیاں بھی کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے ایسی دوغلی چال کے پیچھے ادھر یہودیوں کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ ادھر میرے سامنے ہمدردی کا چارا ڈال کر میرے دماغ میں پہنچنے کا کوئی

راستہ تلاش کررہا ہے۔ اب تک کے حالات سے یقین ہوگیا ہے کہ وہ میرے دماغ کے اندر پہنچنے میں ناکام ہورہا ہے۔ فی الحال یہ اس کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ شاید یہ سمجھ رہا ہے کہ وہ اپنی موجودہ حکمت عملی کے ذریعے کسی طرح مجھے زیر کرسکے گا۔''

مراد نے کہا۔ ''انشاء اللہ۔ ہم جلد ہی معلوم کرلیں گے کہ وہ تمہارے خلاف کیا کرتا پھر رہا ہے۔ تم ان دشمنوں کے نام اور پتے بھیجو۔''

بیٹے نے تمام معلومات پہنچادیں۔ مراد نے اسکرین پر لکھا ہوا پہلا نام روڈنی وزڈم پڑھا۔ وہ یورپ میں انسانی اعضا کا بہت بڑا ڈیلر تھا۔ جو ضرورت مند ہوتے تھے' وہ اس سے رابطہ رکھتے تھے۔ اس کے آفس میں جاتے تھے اور اپنے مطلوبہ اعضا کی بکنگ کراتے تھے اور معقول معاوضہ ادا کرکے اپنے ٹوٹے پھوٹے وجود کی مرمت کرالیا کرتے تھے۔

روڈنی وزڈم کا نام پتا اور فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ مراد اس سے باتیں کرسکتا تھا۔ اس کی رہائش گاہ میں بھی پہنچ سکتا تھا لیکن اس سے یہ سچ نہیں اگلوا سکتا تھا کہ اس نے جینی کی آنکھیں' دل اور گردوں کی مارکیٹنگ کی ہے۔ اگلوانے کے لیے لازمی تھا کہ مجرم کے ساتھ مجرمانہ سلوک کیا جائے۔

اس نے ماسٹر کو بوبو سے جینی کے ساتھ ہونے والی زیادتی بیان کی۔ اسے روڈنی وزڈم کا نام بتایا تو اس نے کہا۔ ''وزڈم انسانی اعضا کا باقاعدہ ڈیلر نہیں ہے۔ ایک خفیہ ایجنسی کا سربراہ ہے۔ مال کمانے کے لیے کچھ بھی کرگزرتا ہے۔''

''ماسٹر! وہ بہت سخت جان ہوگا۔ آسانی سے اپنے جرم کا اعتراف نہیں کرے گا۔ میں چاہتا ہوں' اسے اغوا کراکے کسی خفیہ مقام پر پہنچایا جائے۔''

''یہ ہوجائے گا لیکن وہ ان نون ایسے وقت اس کے دماغ میں گھسا ہوگا۔ اسے یہ معلوم ہوتا رہے گا کہ تم یہ واردات کرارہے ہو۔ پھر وزڈم تم سے وہی باتیں کہے گا' جو ٹیلی پیتھی کے ذریعے اسے سمجھایا جائے گا۔''

''اسے معلوم نہ ہو تو اچھا ہوگا لیکن وہ وزڈم کو اغوا کرنے والوں کے دماغوں میں پہنچ کر معلوم کرلے گا کہ آپ نے وہ واردات کرائی ہے۔''

ماسٹر نے کہا۔ ''اس کی فکر نہ کرو۔ میں ایسے لوگوں سے یہ کام کراؤں گا جو مجھے نہیں جانتے۔ وہ معاوضہ لے کر کسی کا بھی کام کرتے رہتے ہیں۔''

''یہ مناسب ہوگا۔ آپ یہی کریں۔''

مراد نے عابی سے فون پر کہا۔ ''میرے ذہن میں بار بار یہ بات آرہی ہے کہ ان نون تمہارے اندر پہنچ نہیں پارہا ہے۔ لہٰذا ایسی چالیں چل رہا ہے کہ دوسروں کے ذریعے تمہیں اپنی گرفت میں لے آئے۔ اس کی چالوں کو سمجھتا ہوگا۔''

''میرے ذہن میں بھی یہی بات آتی ہے کہ وہ مجھ سے دشمنی' دوستی یا ہمدردی جو بھی کررہا ہے' وہ صرف میرے دماغ میں گھسنے کے لیے کررہا ہے۔''

''بیٹے! میں جو واردات کرارہا ہوں' اس سے تم انجان بن جاؤ۔ ان نون کو یہی معلوم ہو کہ تم اپنی ماں کے دشمن روڈنی وزڈم کو ڈھونڈ رہے ہو۔''

''او کے۔ میں یہی کہوں گا۔''

باپ سے رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ ماریہ کے پاس آیا۔ ڈائننگ ٹیبل پر ناشتا تیار تھا۔ وہ ایک دوسرے کے قریب بیٹھ کر کھانے لگے۔ پیچیدہ مسائل سے اور ناگوار مراحل سے گزرنے کے دوران ان کی زندگی میں مسرتوں بھری ملن کی رات آنے والی تھی۔

عابی بہت خوش تھا۔ اس نے ماریہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اتنی اجازت تو مل گئی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو چھوسکیں۔''

وہ مسکرانے لگی۔ کہنے لگی۔ ''میرے اللہ نے میری سن لی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا اپنے معبود کا شکر کیسے ادا کروں۔''

''دل سے عبادت کرتی رہو اور زیادہ سے زیادہ آیتیں یاد کرتی رہو۔ شکر ادا ہوتا رہے گا۔ کیا تم نے محل میں امی (زیب النساء) سے بات کی ہے؟''

''یہاں پہنچ کر انہیں بتایا تھا کہ ہم پیرس میں ہیں۔ اس وقت نئی جگہ آکر زیادہ باتیں نہ کرسکی۔ ابھی کرنا چاہتی ہوں۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''خوشی برداشت نہیں ہورہی ہے۔ امی کو بتانا چاہتی ہو۔''

اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔ جھومتے ہوئے لہراتے ہوئے۔ صحیح معنوں میں زندگی گزارنے کا لطف حاصل ہورہا تھا۔

وہ ناشتے کے بعد واش بیسن کے پاس آئے۔ منہ صاف کرنے کے لیے برش کرنے لگے۔ عابی نے کہا۔ ''امی سے باتیں کرنے کے بعد تیار ہوجاؤ۔ ہم آؤٹنگ کے لیے جائیں گے۔''

وہ خوش ہوکر بولی۔ ''آئی لو یو۔''

اسے بھی جواباً کہنا تھا۔ ”آئی لو یو ٹو......“ لیکن منہ میں پانی بھرا ہوا تھا۔ وہ کلی کرنے کے لیے بیسن پر جھکا تو ایسے وقت ماریہ نے نلکے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کلی کی دھار اس کی ہتھیلی کی پشت پر آکر ایسے لگی جیسے تیر پیوست ہو رہا ہو۔ وہ تکلیف کے مارے چیخ پڑی۔

وہ بھول گئی تھی کہ اس کا مجازی خدا انسان کی کھال میں ایک روبوٹ ہے۔ ہولے سے ہاتھ پکڑتا ہے تو لگتا ہے' جکڑ لیا ہے۔

عابی نے فوراً ہی اس کی ہتھیلی کو اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلاتے ہوئے پوچھا۔ ”یا خدا......! رحم فرما۔ کیا ہو گیا؟ تم نے چیخ کیوں ماری ہے؟“

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولی۔ ”آپ کی کلّی نیزے کی طرح آکر لگی ہے۔ ہتھیلی بہت دکھ رہی ہے۔“

اس نے دیکھا، ہتھیلی کی پشت کا وہ حصہ سرخ ہو گیا تھا اور جہاں کلی کی دھار پڑی تھی' وہاں ہلکا گڑھا سا پڑ گیا تھا۔ وہ اسے ایک بازو کے حصار میں لے کر پچکارتے ہوئے بولا۔ ”برداشت کرو۔ ابھی ہم آؤٹنگ کے لیے جائیں گے تو ایک پین کلر ٹیبلٹ کھاتے ہی تکلیف دور ہو جائے گی۔“

ماریہ نے بیڈروم میں آکر زیب النساء کے نمبر پنچ کیے۔ اس سے باتیں کرنے کے بعد عابی کے ساتھ تفریح کے لیے کھلی فضاؤں میں جانا تھا۔

☆☆☆

زیب النساء نے ننھی سی اسکرین پر ماریہ کا نام پڑھا پھر بٹن کو دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”السلام علیکم۔“

وہ سلام کا جواب دے کر بولی۔ ”آپ بزرگ ہیں۔ پہلے مجھے سلام کرنا چاہیے۔ آپ نے مجھے موقع ہی نہیں دیا۔“

اس نے کہا۔ ”بزرگ اپنے بچوں کی سلامتی چاہتے ہیں اور السلام علیکم کے معنی ہیں تم پر سلامتی ہو۔ ہمارے دین میں صرف بچے ہی بڑوں کو نہیں' بڑے بھی بچوں کو سلام کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ کیا حال ہے؟ میرا بیٹا کیسا ہے؟“

”یہ نہ پوچھیں کیسا ہے؟ وہ تو ایسے ہیں، جیسا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک بہت بڑی خوش خبری سنا رہی ہوں۔“

”فوراً سناؤ۔“

وہ ذرا جھجکتے ہوئے زیب النساء کو ساری تفصیل سنانے لگی اور لیڈی ڈاکٹر سے ہونے والی بات بھی بتائی۔ زیب النساء نے ساری تفصیل سن کر خوشی کا اظہار کیا۔

رابطہ ختم ہو گیا۔ زیب النساء کرسی پر نیم دراز تھی۔ اس نے فون کو ایک سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ پھر اپنی ہونے والی بیٹی کو خیالی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

ممتا بھری مسرتوں میں کبھی یوں لگتا تھا جیسے وہ پیٹ میں نہیں ہے۔ گود میں آگئی ہے۔ اس کے وجود پر چھا گئی ہے۔ تب ہی تو اس کی گرتی ہوئی صحت سنبھل رہی تھی۔ اس نے جینے کے انجام کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ آرام سے چلتی پھرتی تھی۔ صبح چھت پر اور کبھی گارڈن میں واک کرتی تھی۔ چہرے پر رونق آگئی تھی۔

اسے دن رات نگرانی میں رکھنے والے تمام ڈاکٹر حیران تھے۔ حاملہ عورتوں کو جو چھوٹے بڑے مسائل پیش آتے ہیں۔ وہ زیب النساء کے پاس بھی نہیں پھٹک رہے تھے۔ نہ وہ کوئی دوا پیتی تھی۔ نہ ہی کبھی انجکشن لگانا ضروری ہوتا تھا۔

وہ اپنے حالات کے پیش نظر سوچتی تھی۔ ”رب کریم مجھے صحت اور توانائی عطا فرما رہا ہے۔ مجھے دوسروں کی دکھ بیماریوں میں کام آنا چاہیے۔ میں ڈاکٹر نہیں ہوں لیکن مریضوں پر توجہ دوں گی۔ ان کی تیمارداری کروں گی۔ ان کے کام آتی رہوں گی تو ان کی آدھی بیماریاں ختم ہوتی رہیں گی۔“

وہ ان دنوں کئی بار محل سے نکل کر مختلف اسپتالوں میں جا کر مریضوں کی مزاج پرسی کرنے لگی تھی۔ ان کے علاج اور ان کی مہنگی دواؤں کا خاص خیال رکھتی تھی۔ دوائیں ریاست میں نہ ہوں تو بیرونی ممالک سے منگواتی تھی۔ اس کی توجہ اور کوششوں سے علاج سستا اور آسان ہو جاتا تھا۔ یوں اسے اور زیادہ دلی مسرتیں اور روحانی سکون ملتا رہتا تھا۔

ایک رات تہجد پڑھنے کے لیے آنکھ کھلی تو اس نے عادت کے مطابق زیر لب اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ کہا۔ اس کے ساتھ ہی پیٹ میں وائبریشن محسوس ہوئی۔ یکلخت اس کے روحانی احساسات بیدار ہو گئے۔ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر خلا میں تکنے لگی۔

کئی دنوں کے بعد پھر ویسی ہی صوتی لہر کی گنگناہٹ سی سنائی دی تھی۔ حروف کے بغیر بہت دھیمی سی منمناہٹ سی ابھری تھی۔ اس نے پھر اللہ اکبر کہا۔ اس بار بھی ویسی ہی دھیمی سی وائبریشن ہوئی۔ کیسا ایمان افروز کرشمہ اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ وہ مسرتوں سے سرشار ہو رہی تھی۔

اس کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔ اسے فجر تک نیند پوری کرنی تھی۔ وہ سو گئی۔ اس نے مختصر سی نیند میں چار سال کی ایک بچی کو دیکھا وہ اسے مما کہہ رہی تھی۔ ماں کو اپنی ننھی سی انگلی پکڑا کر چلا رہی تھی۔ یہ عجیب سی بات تھی۔ بچے ماں

باپ کی انگلیاں پکڑ کر چلتے ہیں اور وہ بچی ماں کو اپنی انگلی تھما کر کہیں لے جا رہی تھی۔

اس خواب کے دوسرے منظر میں ایک خاتون کہیں بیٹھی روٹیاں کھا رہی تھی۔ اس کے پاس ایک گڑیا رکھی تھی۔ اس بچی نے خاتون کے پاس جا کر کھانے کی پلیٹ کو اس کے سامنے سے ہٹا دیا۔ خاتون بھوکی تھی پھر اسے اٹھا کر کھانا چاہتی تھی۔ اس نے پھر اسے دور کر دیا۔

اس خواب سے پکا نا ضد ظاہر ہو رہی تھی پھر خواب کا منظر بدل گیا۔ وہ بچی کی انگلی تھام کر اجمیر شریف پہنچ گئی تھی۔ وہاں ایک کالی کلوٹی سی عورت گائڈ بن کر ان کی راہنمائی کرنے لگی۔ اس عورت نے زیب النساء سے کہا۔ ''خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دربار میں جانے سے پہلے غسل کرو۔''

اس بات پر کالے بادل اُمڈ کر آنے لگے۔ بجلیاں کڑکنے لگیں پھر وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ آسمان سے لہو کی بارش ہونے لگی۔ وہ بچی فوراً ہی ماں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی سائے میں لے آئی۔ اس پر لہو کا ایک قطرہ بھی پڑنے نہیں دیا۔

خواب ادھورے ہی رہ جاتے ہیں۔ آنکھ کھلتے ہی وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ لہو کی بارش کیوں دیکھی ہے؟ خواب سمجھ میں نہیں آتے۔ کبھی تعبیر ملے تو ایسے خواب سمجھ میں آتے ہیں۔ اس نے ہم زاد سے دونوں خواب بیان کیے۔ اس نے کہا عجیب سی بات ہے۔ میں کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں۔ بابا صلاح الدین اجمیری بہت یاد آ رہے ہیں۔ ان کی دعائیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہی ہیں۔ خدا جانے وہ اس دنیا میں ہیں بھی یا نہیں؟ ان کی دعاؤں سے تمہیں صحت یابی نصیب ہو رہی ہے۔ میں کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں۔ تمہیں وہاں لے جانا چاہتا ہوں، جہاں وہ عبادت کیا کرتے تھے۔''

وہ خوش ہو کر ہم زاد کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہوگی کہ جہاں بابا اجمیری کے قدم پڑتے رہے، وہاں میں جاؤں گی۔ نیک بندے دنیا میں رہیں یا نہ رہیں ان کی نیکیاں ہمارے ساتھ قائم رہتی ہیں۔''

پھر وہ بولی۔ ''لیکن یہ خواب تشویش میں مبتلا کر رہا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''ہم نہیں جانتے کہ زندگی کے راستوں میں کہاں ٹھوکر لگتی ہے اور کیسے لگتی ہے۔ اب ہمیں ٹھوکر کا علم ہو گیا ہے تو اچھی بات ہے۔ ہم محتاط رہیں گے۔''

''بے شک شیطانی رکاوٹیں پیش آتی رہتی ہیں۔ میرا دل کہتا ہے، مجھے جلد سے جلد بابا صاحب کے در پر جانا چاہیے۔''

''اتنی جلدی ممکن نہیں ہے۔ مراد وہاں بیٹے کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ یہاں مملکت کی تمام ذمے داریاں مجھ پر اور بلے پر آپڑی ہیں پھر بھی ہم اسی ماہ کے آخر تک جا سکیں گے۔''

زیب النساء نے دو طرح کے خواب دیکھے تھے۔ وہ بچی اسے اپنی انگلی تھما کر دو مقامات پر لے گئی تھی۔ اس پہلے مقام سے متعلق رکھنے والی تعبیر اسی دن مل گئی۔

وہ مریضوں کی تیمارداری اور دلجوئی کے لیے ایک اسپتال میں آئی۔ وہاں ایک ماں بننے والی خاتون کی حالت تشویش ناک تھی۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق بچہ پیٹ میں بہت کمزور تھا۔ دوائیں خاطر خواہ اثر نہیں کر رہی تھیں۔ وہ زچگی کے مراحل تک پہنچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ پھر بھی ڈاکٹر اسے اپنے تجربات اور توجہ سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔

زیب النساء نے اس خاتون کے پاس آ کر اس کا حال دریافت کیا۔ ''تم میڈیکل رپورٹ کے مطابق حاملہ ہونے سے پہلے صحت مند تھیں۔ پھر اچانک ایسا کیا روگ لگ گیا ہے کہ تجربہ کار ڈاکٹر بھی تمہارا علاج کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں؟''

اس نے کہا۔ ''میں کیا بولوں؟ میری کوئی نہیں سنتا میری سوکن مجھ پر جادو کرا رہی ہے۔ اس نے تین بیٹیاں پیدا کی ہیں اور یہ نہیں چاہتی کہ میں خوش قسمتی سے ایک بیٹا پیدا کر کے شوہر کی نظروں میں اہم ہو جاؤں۔''

زیب النساء نے پوچھا۔ ''تم نے جادو کا توڑ کرایا ہوگا؟''

''ہاں میرے شوہر بھی ایک وارث کے لیے بہت بے چین ہیں۔ دعائیں بھی کرا رہے ہیں اور جادو کے مقابلے میں جادو بھی کرا رہے ہیں لیکن آپ دیکھ رہی ہیں۔ ڈاکٹروں سے بھی سن چکی ہیں۔ بچہ زچگی سے پہلے کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اگرچہ سوکن کو اور اس کے رشتے داروں کو مجھ سے دور رکھا گیا ہے۔ پھر بھی میں یہی کہوں گی کہ وہ مجھ سے عداوت کر رہی ہے۔''

وہ بول رہی تھی۔ ایسے وقت وارڈ بوائے ایک ٹرالی پر اس کے لیے کھانا لے آیا۔ زیب النساء نے کہا۔ ''تم روٹی کھاؤ۔ میں ڈاکٹر سے مل کر ابھی آتی ہوں۔''

وہ پلٹ کر جانا چاہتی تھی پھر یکلخت رک گئی۔ پچھلی رات کے خواب نے اسے چونکا دیا۔ اس خاتون کے سرہانے ایک گڑیا رکھی تھی۔ وہ گڑیا ویسا ہی سرخ رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ یہ یاد آیا کہ خاتون بھی اس خواب

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



والی سے مشابہت رکھتی ہے۔

خاتون نے پوچھا۔ ”آپ جاتے جاتے کیوں رک گئیں؟“

اس نے کہا۔ ”یہ کھانا گھر کا ہے یا اسپتال کا؟“

وہ بولی۔ ”اسپتال میں سختی ہے۔ باہر سے یا گھر سے کھانا لانے کی اجازت نہیں دی جاتی اور یہ میرے لیے اچھا ہی ہے۔“

زیب النسا اس کے سامنے رکھے ہوئے کھانے کو توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ اس بچی نے کھانے کی اس پلیٹ کو خاتون کے سامنے سے ہٹا دیا تھا اور وہ ماں بننے والی مریضہ لقمہ اٹھانے جا رہی تھی۔

وہ فوراً ہی بولی۔ ”رک جاؤ۔“

خاتون اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس نے ڈاکٹر اور اسپتال کے انچارج کو بلا کر کہا۔ ”میں ابھی ان کھانوں کی میڈیکل رپورٹ چاہتی ہوں۔ یہاں سے مطمئن ہو کر جاؤں گی۔“

فوراً ہی حکم کی تعمیل کی گئی۔ کھانے پینے کی تمام چیزوں کو لیب میں بھیجا گیا۔ ملکہ معظمہ آئی ہوئی تھیں۔ لہٰذا سینئر ڈاکٹرز بھی آگئے تھے۔ انہوں نے جلد ہی رپورٹ پیش کی۔ چکن سوپ میں اور ایک سالن میں مضر رساں دوائیں ملائی گئی تھیں۔

یہ بڑی دھماکا خیز رپورٹ تھی۔ اسپتال میں کچن کے تمام عملے کو گرفتار کر کے سختی سے انکوائری ہونے لگی۔ جلد یا بہ دیر ایک سوکن کی سازش کو بے نقاب ہونا تھا۔ معلوم ہوا کہ کچن کا ایک باورچی خاتون کی سوکن سے بھاری رشوت لے کر ایک مضر رساں دوا کم سے کم مقدار میں کھانے پینے کے ذریعے دیا کرتا تھا۔

اس سوکن سمیت سازش میں شریک رہنے والوں کو آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا گیا۔ عدالت دینی احکامات کے مطابق فیصلہ سنانے والی تھی۔ ڈاکٹرز ازسرنو اس ماں بننے والی پر بھرپور توجہ دینے والے تھے۔ اب کسی شک و شبہے کے بغیر وہ پیدا ہونے والا بچہ شر سے محفوظ ہو گیا تھا۔

زیب النساء نے ہم زاد سے کہا۔ ”میڈیکل رپورٹ سے پہلے کوئی ڈاکٹر سمجھ نہیں پایا کہ اسے سلو پوائزن دیا جا رہا ہے۔ کیا خدا کی قدرت ہے، میری بیٹی نے میری ماروی نے سمجھ لیا تھا۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”آج تم بڑے جذبے اور عقیدت سے ماروی کا نام لے رہی ہو۔“

”بے شک۔ اس پر میرا عقیدہ پختہ ہو گیا ہے۔ وہ نیک روح میرے اندر سما گئی ہے۔ جس سازش تک کوئی پہنچ نہیں سکتا تھا، اس نے اپنی انگلی پکڑا کر مجھے وہاں پہنچا دیا۔ اے میرے پاک پروردگار! تیرا شکر ہے۔ میں ماروی کے نام سے ایک مسیحا بیٹی کو جنم دینے والی ہوں۔“

اس نے اپنا سر ہم زاد کے شانے پر رکھ دیا۔ وہ اپنی کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھے محل کی سمت جا رہے تھے۔ ابھی حالات کتنی ہی سمتیں بدلنے والے تھے۔ ایک خواب کی تعبیر مل گئی تھی۔ دوسرا خواب ہیبت ناک تھا۔ کوئی صحیح تعبیر بتا نہیں سکتا تھا کہ لہو کی بارش کے پیچھے کیا اسرار ہے؟

☆☆☆

روڈنی وزڈم اپنی ایک خفیہ ایجنسی آر ڈبلیو کا سربراہ تھا۔ اچھا خاصا معاوضہ لے کر سپر پاور اور دوسرے بڑے ممالک کے اہم خفیہ معاملات کو بڑی رازداری سے نمٹاتا تھا۔

اس کے ریکارڈ میں صرف کمی یہ رہ گئی تھی کہ وہ مراد علی منگی کو ٹریپ کرنے میں کئی بار ناکام رہا تھا۔ ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی کہ وہ بہت محتاط رہنے کا عادی تھا۔ اس نے مراد کے سامنے کبھی خود کو ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ اس سے چھپ کر اس سے دور رہ کر اسے کسی شکنجے میں لینے کی حسرت رہ گئی تھی۔

اس نے اس ایک ناکامی کو درگزر کیا تھا۔ باقی تمام مجرمانہ ڈیلنگز میں لاکھوں ڈالرز کما رہا تھا۔ ایک ماہ پہلے کسی اجنبی نے فون پر کہا تھا۔ ”میرے آلۂ کار بن کر رہو۔ فائدے میں رہو گے۔ تم اپنے کسی بھی مشکل ٹارگٹ تک پہنچنے میں ناکام نہیں رہو گے۔ میں تمہیں وہاں آسانی سے پہنچا دیا کروں گا۔“

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”کیا تم جادو جانتے ہو؟ مجھے کہیں بھی کیسے پہنچا دیا کرو گے؟“

”تم اپنی کوئی مشکل بیان کرو۔ پھر تماشا دیکھو۔“

وزڈم نے کہا۔ ”ایک ڈیلر نے میری ایک لاکھ دس ہزار ڈالرز کی پیمنٹ روک لی ہے۔ اس سے رقم وصول کرنے کے......“

اجنبی نے بات کاٹ کر کہا۔ ”آگے نہ بولو۔ اسے کال کرو۔ میں اس کی آواز سننا چاہتا ہوں۔“

”وہ میری کال اٹینڈ نہیں کرتا ہے۔“

”اس کا نمبر بتاؤ۔“

وزڈم نے اس کے نمبر بتائے۔ اس نے کہا۔ ”انتظار کرو۔ وہ ایک گھنٹے کے اندر رقم لے کر تمہارے دروازے پر آئے گا۔“

وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ ”کیا تم اسے کوئی جوہا سمجھ رہے ہو؟“

فون بند ہوگیا۔ اسے جواب نہیں ملا۔ ایک گھنٹے بعد ہی کال بیل کی آواز سنائی دی۔ اس نے دروازہ کھولا تو اس دشمن ڈیلر کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ایک پیپر بیگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لو..... گن لو' پورے ایک لاکھ دس ہزار ڈالرز ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ اپنی کار میں واپس جاکر بیٹھ گیا۔ کچھ اور کہے سنے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ وزڈم شدید حیرانی سے دشمن کو دیکھتا رہا۔ اس سے کچھ پوچھ نہ سکا۔ جب وہ چلا گیا تو اس نے دروازہ بند کرکے رقم گنی۔ وہ پوری تھی۔

وہ شدید حیرانی سے خلا میں تکتے ہوئے بولا۔ ”اے بھائی! کون ہو تم؟ واقعی جادوگر ہو۔ اس نے سچ مچ میرے دروازے پر آکر پیمنٹ کی ہے۔“

اسے اپنے دماغ کے اندر آواز سنائی دی۔ ”میں ہوں بے نام' بے شناخت' مجھے ان نون کہہ سکتے ہو۔ میرا کمال دیکھو۔ ابھی جہاں ہو، وہاں سے ایک انچ بھی ہل نہیں سکو گے۔“

اس نے فوراً ہی ہلنے کی کوشش کی۔ یوں لگا جیسے دماغ پتھر ہوگیا ہے۔ اس کی نہیں سن رہا ہے۔ اس کی مرضی سے ذرا سی بھی جنبش نہیں کر رہا ہے۔

پھر آواز سنائی دی۔ ”تم اچھل پڑو گے۔“

وہ یکبارگی اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ ان نون نے کہا۔ ”تم یہودی ہو۔ بائبل نہیں پڑھتے۔ ابھی اس کی ایک لائن پڑھو گے۔“

”مائی گاڈ! تم ٹیلی پیتھی جانتے ہو؟“

”آج سے تم میرے آلۂ کار بن کر رہو گے۔ میرے کام آتے رہو گے اور مفادات بھی حاصل کرتے رہو گے۔“

”میں حاضر ہوں۔ یہ تو سراسر منافع کا سودا ہے۔“

”میں آئندہ چند دنوں کے بعد تمہیں پرنس عابد علی منگی کے خلاف استعمال کروں گا۔“

وہ پریشان ہوکر بولا۔ ”ایں...... پرنس عابی کے خلاف؟“

”ہاں، کیا اس سے ڈرتے ہو؟“

”فی الحال پرنس کا بہت چرچا سن رہا ہوں۔ اس سے پہلے اس کے باپ کو کئی بار ٹریپ کرنے میں ناکام رہا ہوں۔“

”آئندہ ناکام نہیں رہو گے۔“

”کیا تم نے کبھی اسے زیر کیا ہے؟ تم تو آسانی سے اس کے اندر جاکر اسے اپنا آلۂ کار بنا سکتے ہو۔“

وہ ذرا چپ رہا پھر جلدی سے بولا۔ ”میں کیا نہیں کر سکتا لیکن ابھی وہ نہیں' اس کا بیٹا میرا ٹارگٹ ہے۔ میں اس بلند پرواز کے پر کاٹوں گا تو باپ آپ ہی زمین پر آگرے گا۔“

پھر وہ ناگواری سے بولا۔ ”مجھ سے صرف کام کی بات کرو۔ کام کی بات یہ ہے کہ پرنس عابی کی ماں کے جسمانی اعضا فروخت کرنے والے کا نام روڈنی وائز تھا۔ وہ مر چکا ہے۔ تمہارا نام روڈنی وزڈم ہے۔ تم بھی جرائم کے زبردست کھلاڑی ہو۔“

”مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا ہوگا؟“

”میں پرنس عابی کو یہ کہہ کر تمہارے پیچھے لگانا چاہتا ہوں کہ تم نے ہی اس کی ماں سے زیادتی کی ہے۔ اگر اسے یہ معلوم ہوگا کہ زیادتی کرنے والا مر گیا ہے تو انتقام کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے گی اور میں اسے یہودیوں کے خلاف بھڑکانا چاہتا ہوں۔“

وزڈم نے کہا۔ ”سنا ہے' پرنس انسان نہیں روبوٹ ہے۔ ایک چٹکی میں مسل دیتا ہے۔“

”میں تمہیں بچانے والا ہوں۔ تم پر ذرا آنچ نہیں آئے گی۔ جب میرا مشن مکمل ہوجائے گا تو تم عابی کو گولی مار دو گے۔“

اس نے کہا۔ ”جو کہو گے وہ کروں گا لیکن تم تو اسے بڑی آسانی سے مار سکتے ہو۔“

وہ جھنجلا کر بولا۔ ”میں اسے نہیں مار سکتا۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”تعجب ہے۔ کیا اس کے دماغ کے اندر گھس کر نہیں مار سکو گے؟“

وہ جیسے پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولا۔ ”ضرور مار سکتا ہوں لیکن میں نے آج تک ایک چیونٹی بھی نہیں ماری ہے۔ اپنے آلۂ کاروں کے ذریعے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارتا ہوں۔ مجھ سے زیادہ بحث نہ کرو۔ انتظار کرو پھر کسی وقت رابطہ کروں گا۔“

وہ چلا گیا۔ وزڈم اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ اس سے راضی ہوتا یا نہ ہوتا' اس کا آلۂ کار اور تابعدار بن کر رہنا ہی تھا لیکن یہ بات اسے عجیب سی لگ رہی تھی کہ وہ کسی کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک نہیں کرتا ہے۔ یہ ماننے والی بات نہیں تھی کہ بے شمار مخالفین کا لہو اچھالنے والا اپنے ہاتھ میں گن نہیں پکڑتا ہوگا۔

ایک ہفتے بعد ہی ان نون نے اس کے دماغ میں آکر کہا۔ ”میں نے پرنس عابی کے سامنے تمہارے نام کا چارا ڈال دیا۔ وہ اپنی ماں سے ہونے والی زیادتی کا انتقام لینے

کسی وقت بھی تمہاری طرف آنے والا ہے۔''
''میں اپنے اطراف سخت سیکیورٹی رکھوں گا۔''
''ایسی حماقت نہ کرنا۔ اسے شبہ ہوگا کہ میں نے تمہیں اس کی طرف سے محتاط کر دیا ہے۔ تم معمول کے مطابق سیکیورٹی کے بغیر رہا کرو گے۔ میں خاموشی سے تمہارے اندر موجود رہا کروں گا۔''
''کیا تم دن رات موجود رہو گے؟''
''یہ ضروری نہیں ہے۔ میری غیر موجودگی میں جیسے ہی خطرہ محسوس کرو، اسی وقت مس کال دو۔ میں فوراً آجاؤں گا۔''
وزڈم مطمئن ہوگیا۔ ان نون ایک نظر نہ آنے والا باڈی گارڈ تھا۔ مسلح سیکیورٹی گارڈ سے زیادہ معتبر تھا۔ وہ دوسری رات کلب میں رمی کھیلتا رہا اور خوب پیتا رہا پھر باہر آکر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ بڑے موڈ میں میڈونا کا ایک گیت گاتے ہوئے ڈرائیو کرنے لگا۔
تھوڑی دور جاتے ہی ایک ریوالور اس کی گردن سے آلگا۔ پچھلی سیٹ اور اگلی سیٹ کے درمیان سے دو شخص ابھر آئے تھے۔ ایک نے کہا۔ ''تمہیں یقیناً اپنی زندگی سے پیار ہوگا۔ ہم جدھر کہتے ہیں، ادھر گاڑی موڑتے رہو گے تو زندہ رہو گے۔''
وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ان کے حکم کے مطابق رفتار بڑھانے لگا۔ اپنے دماغ میں کہنے لگا۔ ''مسٹر ان نون! کہاں ہو؟''
وہ پریشان ہوگیا۔ شراب کی مستی پانی ہونے لگی۔ اس نے پوچھا۔ ''کون ہو تم لوگ؟ مجھ سے جتنی رقم وصول کرنا چاہتے ہو، یہاں ادا کردوں گا۔''
ایک نے کہا۔ ''ہم جان لینا چاہتے ہیں۔ یہاں ادا کرو گے تو ہم پھنس جائیں گے۔ کہیں جاکر آرام سے لین دین کریں گے۔''
وہ لوگ مار ڈالنے کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ تھوک نگل کر اپنے اندر بولا۔ ''کہاں ہو تم؟ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔''
وہ کار کے عقب نما آئینے میں دشمنوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک کال کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز ایک مس کال ہی کرنے دو۔''
ایک نے اگلی سیٹ کی طرف جھک کر اس کے لباس سے ایک فون اور ایک پستول نکال لیا۔ ایسے ہی وقت ان نون آگیا۔ اس نے کہا۔ ''فکر نہ کرو۔ میں آگیا ہوں۔''
وہ اطمینان کی سانس لے کر بولا۔ ''ان کتوں کو مار ڈالو۔''
''مجھے ان کتوں سے نہیں پرنس سے نمٹنا ہے۔ یہ لوگ تمہیں جہاں لے جارہے ہیں، وہاں پرنس ہوگا۔ تم ان دونوں سے باتیں کرو۔ میں ان کی آواز اور لہجوں کو اپنی گرفت میں لوں گا۔''
وہ ان سے بولنے لگا۔ وہ اسے جہاں لے جانا چاہتے تھے، وہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ ایک چھوٹے سے مکان میں آئے تھے۔ اسے ایک کمرے کے اندر دھکا دے کر باہر سے بند کر دیا۔ وہ سہما ہوا تھا۔ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم موجود ہونا؟ ان سے نمٹتے کیوں نہیں ہو؟''
''کیوں جان نکل رہی ہے؟ میں موجود ہوں۔ انتظار کرو۔ یہاں شاید عالی آئے گا۔''
تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ اس بار دو مسلح افراد جو آئے، وہ چہروں پر ماسک پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے وزڈم کو ایک سیاہ کپڑے کی ٹوپی سر سے گردن تک پہنائی۔ وہ عارضی طور پر اندھا ہوگیا۔ کسی کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے آنے والوں سے پوچھا۔ ''میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے ہو؟''
کسی نے جواب نہیں دیا۔ ان نون ان دو افراد میں سے ایک کے اندر پہنچا، جو اسے وہاں لائے تھے۔ وہ پریشان ہوگیا۔ اسے وہاں لانے والے اب ایک کار میں بیٹھ کر کہیں جا رہے تھے۔ ان کی سوچ نے بتایا کہ ان کا کام ختم ہو چکا ہے۔ وہ وزڈم کو اس مکان میں بند کرکے اپنے گھر جا رہے ہیں۔
ان نون نے غصے سے کہا۔ ''مجھے دھوکا دے کر بھاگ رہے ہو۔ واپس وزڈم کے پاس چلو۔''
دونوں گن مینوں کے دماغ اس کے شکنجے میں آگئے۔ وہ اپنی کار کو یوٹرن دے کر پھر اسی مکان کی طرف جانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچے تو دیر ہو چکی تھی۔ مکان کھلا ہوا تھا۔ خالی تھا۔ وزڈم کا وجود لاپتا ہوگیا تھا۔
ان نون نے ان سے پوچھا۔ ''وزڈم کہاں ہے؟''
ایک نے کہا۔ ''ہم نہیں جانتے۔ ہم نے وزڈم کو صرف اس مکان تک پہنچانے کا سودا کیا تھا۔''
''سودے بازی کس سے ہوئی تھی؟''
''کسی خفیہ ایجنسی نے ہم سے کام لیا ہے۔ ہمیں بڑی رقم ملتی ہے تو ہم کسی خفیہ ایجنسی کا نام پتا معلوم نہیں کرتے۔ کام کرتے ہیں، دام لیتے ہیں پھر چھٹی کر لیتے ہیں۔''
ایسا جرائم کی دنیا میں اکثر ہوتا ہے۔ ان نون ان واردات کرنے والوں سے معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ماسک پہن کر آنے والے اسے کہاں لے گئے ہیں؟

وہ وزڈم کے دماغ میں آیا۔ پتا چلا' وہ کسی فوروہیل میں سفر کررہا ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''تم کہاں جارہے ہو؟''

وہ پریشان ہوکر بولا۔ ''میں کیسے بتاؤں؟ میری آنکھیں میرا چہرہ کن ٹوپ میں چھپا ہوا ہے۔ تم تو آزاد ہو۔ کہیں بھی دماغ میں پہنچ کر معلوم کرسکتے ہو۔''

''ان ماسک مینوں سے باتیں کرو۔ میں انہیں سن کر ان کے دماغوں میں پہنچ سکوں گا۔''

''میں نے کئی بار انہیں آواز دی ہے۔ وہ کچھ بولتے نہیں ہیں۔ ایسے چپ ہیں جیسے موجود نہ ہوں۔''

''ان سے جھگڑا کرو۔ انہیں بولنے پر مجبور کرو۔''

وہ جھگڑا کرنے لگا۔ ''اے! تم دونوں گونگے بہرے کیوں بن گئے ہو؟ مجھ سے بات نہیں کروگے تو چیخنا شروع کردوں گا۔''

جواباً اس کے سر پر ایک چپت پڑی۔ ایک گن کی نال اس کے منہ میں گھس کر حلق سے آکر لگ گئی۔ وہ سہم کر سوچ کے ذریعے بولا۔ ''اے بھائی! کہاں لاکر پھنسادیا؟ یہ مجھے مارڈالیں گے مگر کبھی نہیں بولیں گے۔''

ان نون نے کہا۔ ''ان کی خاموشی کا مطلب ہے' یہ میرے بارے میں جانتے ہیں کہ میں تمہارے دماغ میں چھپا ہوا ہوں۔ یہ بولنے کی غلطی نہیں کریں گے۔''

وزڈم نے کہا۔ ''یہ غلطی نہیں کریں گے تو میرا کیا بنے گا؟''

''مجھے سوچنے دو۔ یہ پچویشن میری توقع کے بالکل خلاف ہے۔ میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ ایسا ہوگا۔''

''ارے وہ مراد علی منگی کا بیٹا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو کبھی تمہارے ہاتھ لگنے نہیں دے گا۔''

''فضول باتیں نہ کرو۔ میں اب تک دیکھتا آرہا ہوں' پرنس عابی کے کسی معاملے میں مراد نے مداخلت نہیں کی ہے۔ وہ مصلحتاً ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں۔''

''مسٹر ان نون! وہ باپ بیٹے بظاہر دور ہوں گے لیکن درپردہ قریب رہتے ہوں گے۔ تم ان کے دماغوں میں جاکر حقیقت کیوں معلوم نہیں کرتے؟ تعجب ہے' تم نہ بیٹے کے اندر نہ باپ کے اندر جاتے ہو۔ کیا بات ہے؟ کیوں نہیں جاتے ہو؟ میری یہ بات لکھ لو کہ تم ٹیلی پیتھی جیسی طاقت رکھتے ہوئے بھی دھوکا کھا رہے ہو۔ یہ سمجھ رہے ہو کہ پرنس سے نمٹ رہے ہو جبکہ اس کا باپ تم سے نمٹ رہا ہے۔''

وہ جھنجلا کر بولا۔ ''مجھے ایسی باتوں میں نہ الجھاؤ۔ سوچنے سمجھنے دو۔ میں جارہا ہوں پھر آؤں گا۔ اطمینان رکھو' تمہیں ان کے شکنجے سے نکال کرلے جاؤں گا۔''

وہ دماغی طور پر اپنی جگہ حاضر ہوگیا۔ جہاں حاضر ہوا' وہاں گہری تاریکی تھی۔ وہ لائٹ آن کرسکتا تھا لیکن گھپ اندھیرے میں بیٹھا ہوا تھا۔

وہ ایسی گہری تاریکی میں کیوں تھا؟ اس کی ایک پراسرار بنیادی وجہ تھی۔ آگے کسی مرحلے پر اس کی ہسٹری معلوم ہونے والی تھی۔ وہ ان لمحات میں سوچ رہا تھا کہ پرنس نے اپنی ماں پر ظلم کرنے والے وزڈم کو ہلاک کیوں نہیں کیا؟ اسے اغوا کیوں کرایا ہے؟ وہ کیا گیم کھیل رہا ہے؟ اور کیسی زبردست چال چل رہا ہے۔ میری ٹیلی پیتھی کا راستہ کاٹ دیا ہے۔ مجھے اس کے کسی بھی کارندے کے دماغ میں پہنچنے کا راستہ نہیں مل رہا ہے۔ کیا اسے شبہ ہوگیا ہے کہ میں اس کی ماں سے ہمدردی کرنے کی آڑ میں اس سے کوئی خطرناک کھیل کھیل رہا ہوں؟

اس نے ماریہ کے نمبر پر کال کی۔ رابطہ ہونے پر بولا۔ ''ہیلو پرنس! روڈنی وزڈم کہاں ہے؟ کیا تم ماں کا انتقام لینے کے لیے اسے ہلاک نہیں کرنا چاہتے؟ یہ کیا کررہے ہو؟ اسے کہیں لے جاکر کیوں چھپادیا ہے؟''

عابی نے کہا۔ ''کیوں بکواس کررہے ہو؟ میں نے ابھی تک وزڈم کی صورت تک نہیں دیکھی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنی رہائش گاہ میں نہیں ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ کل اس سے نمٹ لوں گا اور تم کہہ رہے ہو کہ میں نے اسے کہیں چھپادیا ہے۔ میں کیوں چھپاؤں گا؟ کیا وہ بیش بہا خزانہ ہے؟ کیا اس مجرم قاتل سے مجھے کسی طرح کا فائدہ حاصل ہونے والا ہے؟''

وہ حیرانی اور بے یقینی سے بولا۔ ''او گاڈ! تم نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے اور وہ کہیں قیدی بنا ہوا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ایسا کس نے کیا ہوگا؟''

''مجرموں کے ایک نہیں کئی دشمن ہوتے ہیں۔ جاؤ ان سب کے دماغوں میں ٹیلی پیتھی کی چھلانگیں لگاؤ۔ تم تو آسانی سے معلوم کرسکتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟ اور اسے کس طرح وہاں سے لاسکتے ہو؟ اور مجھے نادان نہ سمجھنا۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ مجھ سے ڈبل گیم کھیل رہے ہو۔ اسے کہیں چھپا کر ایسی چال چل رہے ہو' جو میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ یہ اچھی طرح سمجھ گیا ہوں' تم دوغلے ہو۔ بہتر ہے' دفع ہوجاؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔''

عابی نے فون بند کردیا۔ اس نے جیسی سختی سے باتیں سنائی تھیں، ان سے ان نون کو کسی حد تک یقین ہوگیا کہ عابی نے وزڈم کو اغوا نہیں کرایا ہے۔ کوئی تیسرا ان کے درمیان

کود پڑا ہے۔

وہ سوچنے لگا کہ وہ جو تیسرا ہے، اسے معلوم ہے کہ کسی ٹیلی پیتھی جاننے والے سے مقابلہ ہے۔ اسی لیے اس کے کارندے گونگے بہرے بنے ہوئے تھے۔ کوئی اسے اپنے اندر آنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔

ان نون پھر وزڈم کے دماغ میں آیا۔ اب وہ کسی چار دیواری میں تھا۔ اس کے چہرے سے اور آنکھوں سے کن ٹوپ ہٹا دیا گیا تھا۔ وہ دیکھ سکتا تھا اور اس کی آنکھوں سے ان نون صرف بند دروازوں کو اور کھڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ اسے کہاں لا کر قیدی بنایا گیا ہے۔

اس نے وزڈم سے کہا۔ ''میں آگیا ہوں۔ کسی کو آواز دو۔''

اس نے کہا۔ ''جب وہ ماسک پوش میرے سامنے تھے، تب نہیں بولتے تھے۔ اب دور سے کیا بولیں گے۔''

پھر بھی اس نے پکارا۔ ''کوئی ہے؟ یہاں کوئی ہے؟''

اس نے کھڑکیوں اور دروازوں کے پاس جا کر کہا۔ ''فارگا ڈسیک، مجھے رہائی نہ دو۔ کم از کم بات تو کرو۔ مجھ سے عداوت کی کوئی وجہ معلوم تو ہو۔''

جواباً کوئی آواز کوئی آہٹ بھی نہیں تھی۔ یوں لگ رہا تھا، اسے کسی ویرانے میں لا کر قیدی بنایا گیا ہے۔ وزڈم نے دیوار پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''اے مسٹر ان نون! تم نے مجھے کہاں پھنسا دیا ہے۔ یہاں سے کیسے نکلوں گا؟''

وہ فرش پر پاؤں مارتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری ٹیلی پیتھی بھی مجھے یہاں سے نہیں نکال سکے گی۔ یہ یقین کر لو کہ تم نے مجھے مراد علی منگی کے جال میں پھنسا دیا ہے۔''

''بکواس مت کرو۔ صبر کرو۔ جو تم سے دشمنی کر رہا ہے، اس نے تمہیں یہاں لا کر پھینکنے اور بھول جانے کے لیے اغوا نہیں کرایا ہے۔ وہ تم سے بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوگا۔ وہ ابھی نہ سہی کل صبح تک ضرور آئے گا۔''

اس کمرے میں ٹی وی اور کمپیوٹر کے علاوہ اٹھنے بیٹھنے اور سونے کا بھی سامان تھا۔ ایسے ہی وقت میز پر رکھا ہوا کمپیوٹر آن ہو گیا۔ وزڈم نے چونک کر روشن دان کی طرف دیکھا۔ کسی نے باہر سے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے اسے آن کیا ہوگا۔

اس نے روشن دان کی طرف منہ کر کے چیختے ہوئے کہا۔ ''باہر کوئی ہے۔ پلیز! فارگا ڈسیک مجھ سے بات کرو۔''

وہ کمپیوٹر کو آپریٹ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسکرین پر تحریر ابھری۔ ''ہم کون ہیں، تم نہیں جانتے۔ تم کون ہو، ہم نہیں جانتے۔ ایک دوسرے سے متعارف ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا پہلے اپنی مکمل ہسٹری بیان کرو۔''

وہ فوراً کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر کی بورڈ پر انگلیاں دوڑانے لگا۔ تحریر کے ذریعے کہنے لگا۔ ''میں اپنے بارے میں بتا رہا ہوں پھر تم اپنے متعلق بتاؤ گے پھر امید کرتا ہوں ہمارے درمیان سمجھوتا ہوگا۔ دوستی ہوگی۔ شکریہ۔''

اس کی انگلیاں کی بورڈ پر چل رہی تھیں۔ وہ رہائی پانے کی جلدی میں تیزی سے اپنے بارے میں بہت کچھ لکھ رہا تھا۔ ان نون نے کہا۔ ''محتاط رہو۔ میرے بارے میں کچھ نہ لکھنا۔''

اس نے جھنجلا کر کہا۔ ''میں نہ لکھوں، تب بھی وہ جانتے ہیں کہ تم میرے اندر گھسے رہتے ہو۔''

''جانتے ہیں تو جاننے دو لیکن انہیں یہ نہ معلوم ہو کہ میں پرنس عابی سے پلے کر رہا ہوں۔''

وہاں سے دور مراد ایک کار کی پچھلی سیٹ پر لیپ ٹاپ سے پلے کر رہا تھا۔ اس نے وزڈم کی مختصر سی ہسٹری پڑھنے کے بعد لکھا۔ ''ہماری دلچسپی یہ ہے کہ کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا تمہارے پاس آتا ہے۔ ہمیں اس کے متعلق بتاؤ۔''

اس نے جواباً لکھا۔ ''وہ بہت پُراسرار ہے۔ اپنا نام اور پتا نہیں بتاتا ہے۔ ان نون کہلاتا ہے۔ وہ مجھ سے ضرورت کے مطابق کام لیتا ہے۔ میں بھی اس سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔''

''ہمیں بتاؤ کہ وہ تم سے کیا کام لے رہا ہے؟''

''تم سمجھ سکتے ہو۔ جرائم کی دنیا میں کوئی نیک کام تو ہوتا نہیں ہے۔ جو بھی ہوتا ہے، کوئی اسے تحریر میں لا کر قانون کی گرفت میں آنے کی حماقت نہیں کرتا۔''

مراد نے لکھا۔ ''میں تمہیں اپنی گرفت میں رکھنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا ان نون کے لیے جو کر رہے ہو، اسے وضاحت سے لکھو۔''

''میں رہائی پانے کے لیے تمہارے شکنجے میں رہ سکتا ہوں۔ بہت کچھ لکھ سکتا ہوں لیکن میرا دماغ ان نون کی مٹھی میں ہے۔ یہ مجھے لکھنے نہیں دے گا۔ میری مجبوری کو سمجھو۔''

''پھر تو وہ ان نون تمہیں یہاں سے کبھی نہیں لے جا سکے گا۔ تم یہاں بھوکے پیاسے مرتے رہو گے۔ اس ویرانے میں کوئی تمہیں پوچھنے نہیں آئے گا۔''

''یہ مجھ پر ظلم ہوگا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف مجھے کوئی بات لکھنے نہیں دے گا اور تم مجھے جینے نہیں دو گے۔ میں دونوں طرف سے مارا جا رہا ہوں۔ مجھ پر رحم کرو۔''

''اسے تمہاری ضرورت ہوگی تو رحم کرے گا۔ مجھے تم

سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں کل کسی وقت آؤں گا۔"

مراد نے رابطہ ختم کردیا۔ وہ چیخ کر بولا۔ "مسٹر ان نون! واقعی اسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ وہ مجھے یہاں مرنے کے لیے چھوڑ دے گا۔ میں تمہارے کام کا آدمی ہوں۔ مجھے بچاؤ۔ اس سے سمجھوتا کرو گے تب ہی مجھے یہاں سے نکال سکو گے۔"

وہ پریشان ہوگیا تھا۔ بے بسی سے بولا۔ "پتا نہیں، وہ کون ہے؟ مجھ سے براہ راست نہیں بول رہا ہے اور اپنے دماغ میں آنے کا راستہ بھی روک رہا ہے۔ شاید ڈرتا ہے کہ ایک بار مجھے راستہ مل جائے گا تو میں اسے بھی اپنا تابعدار اور آلۂ کار بنالوں گا۔"

"وہ کیا سوچتا ہے کیا کرنا چاہتا ہے، یہی معلوم کرنے کے لیے اس سے بات کرو۔ مجھے یہاں سے نکالو۔"

وہ جھڑکنے کے انداز میں بولا۔ "زیادہ نہ بولو۔ جلدی نہ کرو۔ چپ چاپ یہ رات گزارو۔ کل دیکھا جائے گا۔"

وہ چلا گیا۔ وزڈم نے اسے آواز دی۔ جواب نہیں ملا۔ یہ سمجھ میں آگیا کہ اس کی کوئی اوقات نہیں ہے۔ ان نون اگر اسے ضروری نہیں سمجھے گا تو مرنے کے لیے وہیں چھوڑ دے گا۔

وہ بری طرح پھنس گیا تھا۔ سر تھام کر سوچنے لگا کیا کرے؟ ایک خیال یہ آرہا تھا کہ انجانے دشمن کو چپ چاپ ان نون کے بارے میں بتادے اور وہاں سے رہائی حاصل کرلے لیکن ایک دماغ میں آنے والے سے اس کی چوری اور دھوکے بازی چھپی نہ رہتی۔ وہ اسے ذہنی مریض بنا کر مار ڈالتا۔

پھر اس نے سوچا۔ 'میری چالبازی چھپی رہ جائے اور ان نون کو بھی معلوم نہ ہو، بات کسی اور طرح بن جائے تو میں یہاں بھوکا پیاسا نہیں مروں گا۔'

اس نے فوراً ہی کمپیوٹر آن کیا۔ یہ پورا یقین تھا کہ ان نون اس کے اندر موجود نہیں ہے۔ اس نے میسج لکھا۔ "وہ ان نون ابھی میرے اندر نہیں ہے۔ میں ابھی حقائق بیان کروں گا تو اسے بعد میں معلوم ہوجائے گا۔ میں کیا کروں؟"

مراد سونے جارہا تھا۔ وہ لیپ ٹاپ ماسٹر کے ایک معتمدِ خاص کے پاس تھا۔ اس نے فون پر وزڈم کی تحریر پڑھ کر سنائی۔ مراد نے کہا۔ "فوراً جواب لکھو۔ وہ سچ بولے گا تو ابھی ہپناٹزم کا ماہر وہاں آئے گا اور تنویمی عمل کے ذریعے اس کے دماغ کو مقفل کردے گا۔ ان نون پھر کبھی اس کے اندر نہیں آسکے گا۔"

یہ ہوتی ہے ذہانت اور حکمتِ عملی۔ مراد کی حاضر دماغی نے ہی اسے اب تک ناقابلِ شکست بنا رکھا تھا۔ فوراً ہی اس کی ہدایت پر عمل کیا گیا... دو ماسک پوش ایک ہپناٹزم کے ماہر کو وزڈم کے پاس لے آئے۔ اس قیدی کو اپنی سلامتی کی ضمانت مل گئی۔

ان نون نے اب سے پہلے کبھی دھوکا نہیں کھایا تھا۔ وہ مطمئن تھا کہ وزڈم کا دماغ کبھی اس کے شکنجے سے نکل نہیں پائے گا۔ وہ بڑے اعتماد سے کہیں گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔

وزڈم دوسری صبح تنویمی نیند سے بیدار ہوا تو دیکھا اس کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے کھل گئے تھے۔ ایک ملازمہ اور دو ملازم اس کی خدمت کے لیے موجود تھے۔ اسے یاد آیا کہ پچھلی رات اس پر تنویمی عمل کیا گیا تھا۔ یہ یاد آتے ہی وہ خود کو آزاد اور ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگا پھر فون کی رنگ ٹون نے اسے چونکا دیا۔ اس کا اپنا فون سرہانے کی میز پر رکھا تھا۔

اس نے فون کو اٹھا کر کال اٹینڈ کی۔ آواز سنائی دی۔ "تم آزاد ہو۔ ان نون تمہارے دماغ میں نہیں آسکے گا۔ چلو فریش ہو کر ناشتے کی میز پر آجاؤ۔"

یہ ایسی خوش خبری تھی کہ وہ خوشی سے جھوم گیا۔ "مینی مینی تھینکس مسٹر......! ابھی آرہا ہوں۔"

وہ فریش ہوکر ڈائننگ روم میں آیا۔ وہاں مراد بیٹھا ہوا تھا۔ حماد کے روپ میں تھا اس لیے پہچانا نہیں جاسکتا تھا۔ وہ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "کوئی رسمی گفتگو نہیں ہوگی۔ ناشتا شروع کرو اور ان نون کے متعلق جو جانتے ہو وہ بولتے جاؤ۔"

وہ مراد کے قد و جسامت سے، اس کی شخصیت اور بھاری بھر کم آواز سے متاثر ہوگیا تھا۔ کھانے سے پہلے ہی بولنا چاہتا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "پہلے رزق قبول کرو اور خدا کا شکر ادا کرو۔"

اس نے اپنے گاڈ کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک لقمہ منہ میں رکھا پھر اسے چباتے ہوئے بولنے لگا۔ "وہ ان نون اچانک ہی ایک دن میرے دماغ میں گھس آیا تھا۔ یہ ٹیلی پیتھی بڑا خطرناک علم ہے۔ میں اپنی مرضی کے خلاف اس کا غلام بن گیا۔ اس نے کہا تھا، میں اس کے احکامات کی تعمیل کرتا رہوں گا تو مجھے بھی اس کی ذات سے فائدہ پہنچتا رہے گا۔ اور واقعی اس نے اسی وقت مجھے فائدہ پہنچایا۔ میری ایک لاکھ دس ہزار کی پیمنٹ رکی ہوئی تھی۔ وہ پیمنٹ روکنے والا خود ہی رقم لے کر میرے دروازے پر آگیا تھا۔

وہ اپنی ٹیلی پیتھی کے ذریعے آئندہ بھی میرے دشمنوں کے خلاف کام آسکتا تھا۔ میں بڑی خوشی سے اس کا غلام بن گیا۔ وہ مجھے پرنس عابد علی منگی کے خلاف استعمال کررہا ہے۔ وہ کہتا ہے، اس کی ماں کی آنکھیں، دل اور گردے فروخت کیے گئے ہیں۔ فروخت کرنے والے ایک ڈیلر کا نام روڈنی وائز تھا۔ وہ یہودیوں کا بہت ہی قابلِ اعتماد کارندہ تھا۔ ان نون پرنس کو یہودیوں کے خلاف بھڑکانے کے لیے روڈنی وائز کے پیچھے لگانا چاہتا تھا۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ وہ مرچکا ہے۔ میرا نام روڈنی وزڈم ہے۔ پھر میرا بھی تعلق انسانی اعضا کے دھندے سے رہا ہے۔ ان نون نے پرنس کو میرے پیچھے لگا دیا ہے۔ اس سے جھوٹ کہا گیا ہے کہ میں نے ہی اس کی ماں کے اعضا فروخت کیے ہیں۔ وہ چاہتا ہے پرنس مجھے ہلاک کرنے کی کوششیں کرتا رہے۔ یہودیوں سے بھی نفرت کرتا رہے۔ میں اسی دوران میں کسی موقع پر پرنس کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔''

مراد نے پوچھا۔ ''وہ خود پرنس کے دماغ میں کیوں نہیں جاتا؟ اپنے دشمن کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کیوں نہیں کرتا؟''

''میں نے اس سے یہی سوال کیا تھا۔ اس نے بے تکا سا جواب دیا تھا۔ کہتا ہے اس نے بھی ایک چیونٹی کو بھی اپنے ہاتھ سے نہیں مارا ہے۔ وہ پرنس کو میرے ہاتھ سے یا کسی دوسرے کے ذریعے ہلاک کرائے گا۔''

مراد نے کہا۔ ''وہ اپنی کمزوری چھپا رہا ہے۔ اس کے سامنے ایسی رکاوٹیں ہیں، جو اسے پرنس تک پہنچنے سے روک رہی ہیں۔''

''جی ہاں۔ جس طرح آپ نے اسے میرے اندر آنے سے روک دیا ہے، اسی طرح پرنس کا دماغ بھی شاید قدرتی طور پر مقفل ہوگا۔ کوئی زبردست رکاوٹ ہے۔ اسی لیے وہ دوسرے ذرائع سے پرنس کو مات دینے کی فکر میں ہے۔''

''اب وہ تمہارے دماغ کو پھر جکڑنے کی کوشش کرے گا۔ کسی دوسرے آلۂ کار کے ذریعے تمہیں ٹریپ کرے گا۔ کسی ہتھکنڈے سے تمہیں کمزور بنا کر تم پر کیے ہوئے ہپناٹزم کے عمل کو ختم کر کے پھر تمہیں غلام بنالے گا۔''

''میں اس کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا۔ پلیز میری مدد کرو۔''

''کچھ عرصے کے لیے رازداری سے یہ ملک چھوڑ کر کہیں چلے جاؤ۔ اپنا نام اپنی شناخت بدل لو۔ ہم اس سے جلد از جلد نمٹنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ جب کامیاب ہو جائیں گے تو تم اصلی چہرے کے ساتھ واپس آجانا۔''

''میں یہی کروں گا۔ تم بہت مہربان ہو۔ میرے کام آرہے ہو اور مجھ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کررہے ہو۔''

''اس دنیا میں کچھ لوگ ہیں، جو نیکی کرتے ہیں اور اس کا صلہ بندوں سے نہیں، خدا سے چاہتے ہیں۔''

''تم صرف مجھ سے ہی نہیں، پرنس عابی سے بھی نیکی کررہے ہو۔ اگر اسی طرح رکاوٹیں بنتے رہے تو ان نون پرنس کو کبھی چھو بھی نہیں سکے گا۔''

''خدا نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔''

''ایک بات کہوں؟''

''جو کہنا چاہتے ہو، کہو۔''

''تم مسلمان ہو۔ پرنس عابد علی منگی بھی مسلمان ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کو ضرور جانتے ہوگے۔''

''پرنس کو ساری دنیا جانتی ہے۔ اسی طرح میں بھی جانتا ہوں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ بھی مجھے جانتا ہو۔''

''تم نے اس کی بہتری کے لیے ان نون سے ٹکر لی ہے۔ مجھے اغوا کرایا ہے۔ اسے بری طرح مات دی ہے۔ میرے دل میں ہلچل سی ہو رہی ہے۔ میرا دل بار بار کہہ رہا ہے۔ پرنس سے تمہارا کوئی گہرا رشتہ ہے۔''

''ایک مسلمان کو تحفظ اور سلامتی دینے کا گہرا رشتہ پرنس عابی سے ہے۔ آئندہ بھی اس کے کام آتا رہوں گا۔''

وہ ناشتے کے بعد چائے پی رہا تھا۔ بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ مراد نے پوچھا۔ ''تمہارے اندر بے چینی سی کیوں ہے؟''

وہ پیالی کو سامنے سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ان نون سے کہا تھا کہ تم نے پرنس عابی کو نہیں، اس کے باپ مراد علی منگی کو چھیڑا ہے۔ تم ٹیلی پیتھی جاننے کے باوجود دھوکا کھا رہے ہو۔ اگر دھوکے میں انجانے میں مراد سے ٹکرا رہے ہو تو توقع کے خلاف اچانک ہی ناکامی کا منہ دیکھو گے۔''

وہ مراد کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور وہ تم سے ٹکرا کر بری طرح ناکام ہو چکا ہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم مراد علی منگی ہو۔''

وہ ہنستے ہوئے سر ہلا کر بولا۔ ''تمہارا اندازہ اس حد تک درست ہے کہ میں مراد صاحب کا خاص ماتحت ہوں۔ ابھی ان کا ہی کام کررہا ہوں۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''میں مراد صاحب کو سلام کرتا ہوں۔ انہوں نے مجھے ان نون کی غلامی سے رہائی دلائی ہے۔ کیا میں ان سے دو باتیں کرسکتا ہوں۔''

''سوری۔ وہ ضروری سمجھیں گے تو گفتگو کریں گے۔ تم اپنی حفاظت اور سلامتی کی فکر کرو۔''

مراد وہاں سے اٹھ کر اس مکان سے باہر آیا پھر اس سے مصافحہ کر کے اپنی کار میں بیٹھ کر جانے لگا۔ ان نون کئی بار ماریہ کے فون پر عابی سے باتیں کر چکا تھا۔ اس کا فون نمبر مراد کے پاس بھی تھا۔ وہ ابھی اس سے باتیں کرنے والا تھا۔

اس وقت ان نون وزڈم کے دماغ میں پہنچ نہیں پا رہا تھا۔ جیسے ہی سوچ کی لہریں اس کے اندر جاتی تھیں، وہ سانسیں روک لیتا تھا۔ ایسا کئی بار ہوا۔ ٹیلی پیتھی کی لہریں کسی انجانی رکاوٹ سے ٹکرا کر واپس آتی رہیں۔ آخر یہ سمجھ میں آ گیا کہ اس کے دماغ کو تنویمی عمل کے ذریعے لاکڈ کر دیا گیا ہے۔

وہ شدید حیرانی سے تاریکی میں تکتا رہ گیا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق دن کے وقت بھی ایک بند کمرے کی گہری تاریکی میں تھا۔ وہ ایسی گہری تاریکی میں کیوں تھا؟ اس کی ایک پراسرار بنیادی وجہ تھی۔ آگے کسی مرحلے پر اس کی ہسٹری معلوم ہونے والی تھی۔

وہ ان لمحات میں جھنجلا رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کس نے تنویمی عمل کے ذریعے اس کے دماغ کو لاکڈ کیا ہے؟ کس نے ایسی چال چلی ہے؟ اس کا ذہن چیخ رہا تھا۔ ”کوئی بہت ہی شاطر مجرم ہے۔ ٹیلی پیتھی کو کمزور بنانے والی چالبازیاں جانتا ہے۔ میں اب معلوم نہیں کر سکوں گا کہ وزڈم کہاں ہے؟ وہ اس شاطر کو بتا چکا ہوگا کہ میں عابی کو کیسی چالوں میں الجھا کر ہلاک کرنا چاہتا ہوں۔ اوگاڈ! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پلک جھپکتے ہی عابی کے مقابلے میں کمزور ہو گیا ہوں۔ کیا عابی نے ایسی چال چلی ہے؟ اس کے متعلق یہی سنتا اور دیکھتا آ رہا ہوں کہ وہ عجوبہ ہے۔ عجیب و غریب صلاحیتوں کا مالک ہے۔ ذہانت بھی غیر معمولی رکھتا ہوگا۔“

ایسے وقت اسے وزڈم کی باتیں یاد آئیں۔ ایک بار اس نے مراد علی منگی کے متعلق کہا تھا۔ ”مسٹر ان نون! وہ باپ بیٹے بظاہر ایک دوسرے سے دور نظر آتے ہیں لیکن در پردہ قریب رہتے ہوں گے۔ تم ان کے دماغوں میں جا کر حقیقت معلوم کرو۔ میری یہ بات لکھ لو کہ تم ٹیلی پیتھی جیسی طاقت رکھتے ہوئے بھی دھوکا کھا رہے ہو۔ یہ سمجھ رہے ہو کہ پرنس سے نمٹ رہے ہو جبکہ اس کا باپ تم سے نمٹ رہا ہے۔“

وہ بے یقینی سے سر کھجاتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”کیا میں مراد علی منگی سے ٹکرا رہا ہوں؟ مراد کے لائن آف ایکشن اور چالبازی کے سب ہی قائل ہیں۔ وہ صرف خطرناک فائٹر ہی نہیں، خطرناک پلان میکر بھی ہے۔ ایسی چالیں چل جاتا ہے کہ دشمن حیران رہ جاتے ہیں۔ اور میں حیران ہو رہا ہوں۔

جو سوچا بھی نہیں تھا، وہ میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ مجھے مان لینا چاہیے۔ نہ مانوں تب بھی ماننا پڑے گا کہ لاعلمی میں مراد سے مات کھا چکا ہوں۔ بائی گاڈ! کوئی اور ایسا شاطر ہو ہی نہیں سکتا۔ ویسے وزڈم کا دماغ میری گرفت سے نکلا ہے۔ اس کا وجود تو اسی شہر میں رہے گا۔ وہ اپنے گھر میں رہے گا۔ اسے کاروباری معاملات میں منظرِ عام پر رہنا ہوگا۔ مجھ سے چھپ کر نہیں رہ سکے گا۔ میں پھر اسے دماغی طور پر کمزور کر کے تابعدار بناؤں گا تو اس کا دماغ بے اختیار بتائے گا کہ میرے مقابلے میں شاطر کون ہے؟"

اس کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اسکرین پر نئے انجانے نمبر تھے۔ اس نے بٹن کو دبا کر اسے کان سے لگایا لیکن خاموش رہا۔ پہلے کال کرنے والے کی آواز سننا چاہتا تھا۔

مراد نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "اونو مسٹر وزڈم! میرے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کسی کا باپ بھی میرے دماغ میں نہیں آسکے گا۔ میں یوگا کا ماہر ہوں۔ پرائی سوچ کی لہروں کو محسوس کرتے ہی سانس روک کر انہیں بھگا دیتا ہوں۔"

ان نون چپ رہ کر کسی اجنبی کے چیلنج کو سن رہا تھا۔ مراد نے کہا۔ "نہیں مسٹر وزڈم! وہ ابھی تک خاموش ہے۔ سوچ رہا ہے کہ میرے اندر تشریف لانا چاہیے یا نہیں؟"

ان نون نے مراد کی آواز اور لہجے کو گرفت میں لے کر خیالی پرواز کی۔ پھر نامعلوم رکاوٹ سے ٹکرا کر واپس آگیا۔

مراد نے کہا۔ "آیا رے آیا۔ ماں کا لعل ابھی آیا تھا پھر کوشش کرے گا۔"

ایک ہی ناکامی نے اسے سمجھا دیا کہ کال کرنے والا لوہے کا چنا ہے، چبا نہیں سکے گا۔

اس نے غرانے کے انداز میں پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

"کیوں پوچھ رہے ہو؟ میں نے تو نہیں پوچھا کہ تم کون ہو؟"

"تم مجھ سے کیوں دشمنی کر رہے ہو؟"

"میں نے تو نہیں پوچھا کہ تم پرنس عابد علی منگی سے کیوں دشمنی کر رہے ہو؟"

"میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں، تم کون ہو؟ تم پرنس عابی کے باپ مراد علی منگی ہو۔"

"تم مجھے اپنا بھی باپ سمجھ لو تو میں کچھ نہیں کہوں گا۔ اگر مجھے جوڑ کا توڑ سمجھتے ہو تو بولو دوستی کرو گے؟"

"ہاں۔ میں جوابی حملہ نہیں کرنا چاہتا۔ دوستی سے بات بن جائے تو راضی ہوں۔"

"تو پھر ہاتھ ملانے کہاں آرہے ہو؟"

"دوستی ہوگی لیکن روبرو ملاقات کبھی نہیں ہوگی۔"

"میں کسی منہ چھپانے والے پر کبھی اعتماد نہیں کروں گا۔ انتظار کرو۔ کسی دن کسی وقت تمہاری شہ رگ تک پہنچنے والا ہوں۔"

مراد نے فون کا بٹن دبایا۔ دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆

ان نون کہلانے والا واقعی ایسا پُراسرار اجنبی، ایسا گمنام تھا کہ مراد اور عابی کبھی نہ اس کا نام معلوم کر سکتے تھے نہ کبھی اس کے سائے تک پہنچ سکتے تھے۔ وہ بازی گر جو دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کسی کے بھی دماغ میں پہنچ جاتا تھا، وہ بھی فی الحال باپ بیٹے کے سامنے مجبور ہو گیا تھا اور مجبور کیوں ہو گیا تھا؟ یہ وہی جانتا تھا۔

اس کی یہ کمزوری ہمیشہ چھپنے والی نہیں تھی۔ کبھی نہ کبھی ظاہر ہونے والی تھی۔ خدا کے سوا کوئی راز، راز نہیں رہتا، جو رہتا ہے، ایک دن کھل جاتا ہے۔ ابھی مراد سے فون پر باتیں کر کے اسے کسی حد تک پہچان لینے کے باوجود نہ اس کے اندر جا سکتا تھا، نہ پوری طرح یقین ہو رہا تھا کہ وہ اپنے دشمن پرنس عابی کے باپ سے باتیں کرتا رہا ہے۔

مراد نے اس اعتماد اور چیلنج کے ساتھ فون کو بند کر دیا تھا کہ وہ جلد ہی ان نون کی شہ رگ تک پہنچ جائے گا۔ فی الحال اسے بری طرح الجھا دیا تھا۔

ان نون اپنے گونگے فون کو دیکھ رہا تھا۔ فکر میں مبتلا ہو گیا تھا۔ مراد وزڈم کو اغوا کر کے اسے ٹیلی پیتھی کی گرفت سے نکال کر یہ ثابت کر چکا تھا کہ وہ آئندہ بھی اس... خیال خوانی کرنے والے پر بھاری پڑنے والا ہے۔

وہ خاموش فون کو ہاتھ میں لیے گہری تاریکی میں بیٹھا تھا۔ یہ عجیب سی تجسس میں مبتلا کرنے والی بات تھی کہ وہ اندھیرے میں کیوں رہتا ہے؟ کیا روشنی میں دیکھ نہیں سکتا تھا؟ معلوم نہیں کیا تھا۔ ابھی تو بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ یہ معلوم کرنے کی بے تابی تھی کہ کس نے وزڈم جیسے اہم مہرے کو اس سے چھین لیا ہے؟ وہ کون ہو سکتا ہے؟

اس نے ماریہ کے نمبر پنچ کیے۔ اسی کے فون پر عابی سے رابطہ ہوتا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی عابی نے پوچھا۔ "کیا وزڈم واپس آگیا ہے یا پھر فضول باتیں کرنے آئے ہو کہ میں نے اسے اغوا کروایا ہے؟"

وہ بولا۔ ”ابھی معلوم ہوا ہے کہ اسے تم نے نہیں، تمہارے باپ نے اغوا کروایا ہے۔“

عابی نے کہا۔ ”یہ ناقابلِ یقین معلومات مبارک ہو اور کیا معلوم ہوا ہے؟“

”تمہارے باپ نے تنویمی عمل کے ذریعے اس کے دماغ کو لاک کردیا ہے۔ وہ میری خیال خوانی کا راستہ کاٹ چکا ہے۔“

”تمہیں کوئی شکایت ہے تو بابا جانی سے بولو۔ میرے پاس کیوں آئے ہو؟“

”یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں دوستی کرنا چاہتا ہوں اور تم دشمنی کررہے ہو۔ میں نے تمہاری ماں سے دشمنی کرنے والے یہودی کی نشان دہی کی۔ ایک کرائے کی ماڈل کے ذریعے تمہاری مام کی ویڈیو بنا کر تمہیں دھوکا دیا گیا لیکن اتنے بڑے فراڈ پر تمہیں غصہ نہیں آیا۔ تم اب تک ان یہودیوں کی گود میں بیٹھے ہو۔“

”یہ میری بہت بڑی قوت ہے کہ مجھے غصہ نہیں آتا۔ اگر آتا تو تم پر بھی آتا کیونکہ تم بھی دھوکا دے رہے ہو۔ جس شخص نے میری مام کے اعضا فروخت کیے تھے، وہ روڈنی وائز مرچکا ہے۔ تم اس کی جگہ روڈنی وزڈم کو پیش کررہے ہو۔ تم اپنے آلۂ کاروں کے ذریعے مجھے گھیر کر پتا نہیں کب اور کیسے ہلاک کرنا چاہتے ہو۔ یہ تو اچھی طرح یقین ہوگیا کہ براہِ راست میرے پاس آکر مجھے چھو بھی نہیں سکو گے۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”تم اسی خوش فہمی میں رہو۔ یہی سنتے رہو کہ شیر آرہا ہے۔ شیر آرہا ہے۔ ایک دن سچ مچ آجائے گا اور چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔“

”بھئی آجاؤ، کب تک نئی دلہنیا کی طرح شرماتے رہوگے۔ آج سے تین دن بعد ماریہ میری تنہائی کی ساتھی بننے والی ہے۔ میں جشن منانے والا ہوں۔ یہ تمہارے لیے اچھا موقع ہوگا۔ مجھے چیرنے پھاڑنے کے لیے آجانا۔ تمہیں اپنی حسرت پوری کرنے کے لیے میری ایک یادگار رات ملے گی۔“

اس نے فون بند کردیا۔ عابی نے اپنے فون کو دیکھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ ساری دنیا کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ ایک محبت کرنے والی البیلی دوشیزہ اس کی زندگی میں آگئی ہے۔ وہ سب ہی کو اپنی خوشیوں میں شریک کرنا چاہتا تھا۔

اس نے فون پر مراد سے کہا۔ ”بابا جانی! یہ اعلان کردیں کہ آج سے چوتھے دن ارضِ اسلام میں دعوتِ عام ہے۔ عام تعطیل ہوگی اور ہمارے چاہنے والے میری اور ماریہ کی کامیاب ازدواجی زندگی کے لیے دعا کریں گے۔“

مراد نے ہم زاد، بشریٰ اور بلے سے کہا۔ بشریٰ نے خوشی سے اچھل کر کہا۔ ”میں تو آج ہی اپنے عابی اور اپنی بہو کے پاس جاؤں گی۔ وہاں جشن مناؤں گی۔“

بلے نے کہا۔ ”میں کب پیچھے رہوں گا۔ میں بھی اپنے بھتیجے اور بہو سے ملنے جاؤں گا۔“

زیب النساء نے کہا۔ ”میرا بھی جی چاہتا ہے لیکن سفر کرنے کے قابل نہیں ہوں۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”اور میں مراد کی غیر موجودگی میں یہاں کی ذمے داریوں کو چھوڑ کر نہیں جاسکوں گا لیکن ہم آج ہی سے یہاں جشن منانے کی تیاریاں کریں گے۔“

ماسٹر کوبوبو نے سنا تو کہا۔ ”آج سے ن سٹی میں بھی ناچ گانے اور دھوم دھڑاکے شروع ہوں گے۔ عابد علی منگی کی پہلی خوشی کو یادگار بنایا جائے گا۔“

کیا دوست اور کیا دشمن جو بھی سن رہا تھا، وہ خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے بڑی اپنایت کا اظہار کررہا تھا۔ دشمن اس لیے بھی خوش ہورہے تھے کہ اکثر خوشیوں کے میلے میں ہی جھمیلے ہوتے ہیں۔ عابی جنگل میں منگل مناتا تو ان نون وہاں بھی دنگل کے لیے آجاتا۔

سپر پاورز اس کے اتحادی اور جرائم کی دنیا میں رہنے والے بھی شریک ہوکر دیکھنا چاہتے تھے کہ ان نون اس میلے میں دکھائی دے گا یا نہیں؟

دونوں زبردست حریف تھے۔ جشنِ طرب میں کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ دو میں سے کوئی جیتا کوئی مرتا۔ بلا سے کسی کی جان جاتی تماشا تو سب ہی دیکھ لیتے۔

یہودی اکابرین بھی جشن منانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ درِ پردہ دشمنی کرنے والے اور بظاہر واری واری جانے والے حکمران بھی اپنے اپنے ملک میں چراغاں کرنے لگے۔

پیرس کے اس علاقے میں میلوں دور تک جشن منانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سیاست کی اور جرائم کی دنیا کی تمام تنظیموں کے سربراہ اور اکابرین ان باپ بیٹے کو یہ دکھا رہے تھے کہ وہ انہیں کس قدر چاہتے ہیں؟

تمام چاہنے اور جشن منانے والے ماریہ اور عابی کو وہاں ہر سمت لگی ہوئی بڑی بڑی اسکرینز پر دیکھ رہے تھے۔ ٹی وی چینلز کے کیمرے انہیں دنیا کے ہر ملک میں دکھا رہے تھے۔ ان لاکھوں افراد کی بھیڑ میں ان نون بھی موجود تھا۔ کوئی اسے صورت شکل سے پہچانتا نہیں تھا اور وہ کسی سے جان پہچان رکھنے والا نہیں تھا۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق

کسی ایسے وی آئی پی کے دماغ میں پہنچ جانا چاہتا تھا جو عابی کے قریب ہوتا۔

عابی کے اطراف دور تک سخت سیکیورٹی تھی۔ سیکیورٹی گارڈز بھی فون کے اور اسکائپ کے ذریعے اجازت لے کر اس کے سامنے آتے تھے۔ وہ ایسے سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود کسی گارڈ کے دماغ میں رہ کر عابی کے قریب پہنچ جاتا تھا پھر ناکام کیوں ہوتا تھا؟ یہ فی الحال ... وہی جانتا تھا۔

عابی پر کامیاب حملہ کرنے کا کوئی راستہ ضرور ہوگا۔ ان نون وہ راستہ جانتا ہوگا۔ اسے یقین ہوگا کہ وہ کسی دن کسی خاص ہتھکنڈے سے عابی کو ختم کردے گا۔ اسی لیے وہ اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

شائلہ جنیوا کے اسپتال میں زخمی پڑی تھی۔ عابی نے اسے وہاں پہنچا کر نئی زندگی دی تھی۔ اس خطرناک عورت نے اسے داماد بنانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اور ناکام رہی تھی۔ اب بھی اس کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اب اسے معلوم ہو رہا تھا کہ عابی نے اس کی بیٹی جمائلہ کو ٹھکرا کر ماریہ کو دلہن بنالیا ہے۔ وہ اسپتال کے بیڈ پر پڑی ٹی وی پر جشن منانے کی دھوم دھام دیکھ رہی تھی۔ اندر ہی اندر انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ اس کے پاس سونے کا اتنا ذخیرہ تھا کہ وہ ایک چھوٹے سے ملک کو خرید سکتی تھی۔ اب بھی وہ جس ملک کے جس علاقے میں بھی رہتی تھی' وہاں کی بے تاج ملکہ بن کر اپنی چھوٹی سی آرمی کے ساتھ رہا کرتی تھی۔

وہ چاہتی تھی کہ اس کے بے حساب سونے کے ذخیرے کو سنبھالنے کے لیے عابی اس کا داماد بن جائے۔ اس وقت ٹی وی اسکرین پر عابی کے ساتھ نظر آنے والی ماریہ اس کی جان جلا رہی تھی۔ نہ طاقت' نہ وسیع ذرائع اور نہ سونے کا ذخیرہ کام آرہا تھا۔ ایسے وقت صرف خوش نصیبی ہی کام آتی ہے۔ اچانک ہی اس کے نصیب خوش ہوگئے۔ ان نون اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ اپنے کام کے لوگوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ شائلہ کا چرچا سن کر اس کے اندر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت ہی کام آنے والی بلا ہے۔ لہو اچھالنے والی درندہ صفت ضدی عورت ہے اور بے حساب سونے کا ذخیرہ رکھتی ہے۔

شائلہ بیڈ پر نیم دراز تھی۔ اس نے جھنجلا کر ٹی وی کا سوئچ آف کردیا تھا۔ ایسے وقت فون کی رنگ ٹون نے اسے پکارا۔ اسکرین پر انجانے نمبر تھے۔ اس نے بٹن کو دبا کر اسے کان سے لگایا پھر پوچھا۔ ”ہیلو کون ہے؟“

ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ”لوگ خوامخواہ خدا کو تقدیر کا مالک کہتے ہیں۔ تقدیر تو انسان ایک دوسرے کی بگاڑتا اور بناتا ہے۔ پتا نہیں تم نے اپنی دولت سے' طاقت سے اور درندگی سے کتنوں کو موت دی ہے اور اپنے مفادات کی خاطر کتنوں کو زندہ چھوڑ دیا ہے۔ یہ درست ہے نا؟“

شائلہ نے ناگواری سے کہا۔ ”کام کی بات کرو۔“

”تمہارے لیے خوش خبری ہے۔ آج سے میں تمہاری تقدیر کا مالک بن گیا ہوں۔“

وہ غصے سے اور بڑی حقارت سے بولی۔ ”کون ہے رے تو؟ پاگل کے......“

وہ آگے نہ بول سکی۔ یکلخت زبان چپ ہوگئی۔ ہونٹ بند ہوگئے۔ وہ فون پر کہہ رہا تھا۔ ”اب اگر گستاخی کروگی ادب سے نہیں بولوگی تو سزا پاؤ گی۔“

وہ سمجھ نہیں پائی کہ بولتے بولتے کیوں چپ ہوگئی تھی پھر جھنجلا کر بولی۔ ”تو مجھے سزا دے گا؟ لوڈرٹی ڈاگ......“

اتنا کہتے ہی وہ چیخ مار کر تلملانے لگی۔ اس کی زبان دانتوں تلے آگئی تھی۔ وہ بول رہا تھا۔ ”میں نے کہا نا' تمہاری تقدیر کا مالک بن چکا ہوں۔ میں جو چاہوں گا وہ تمہارے ساتھ ہوگا۔ تم میری مرضی کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکوگی۔ تم نے فون کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے لیکن یہ تمہارے ہاتھ سے گر جائے گا۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی فون ہاتھ سے چھوٹ کر بیڈ پر آگیا۔ اس بار اسے اپنے دماغ کے اندر آواز سنائی دی۔ ”فون ضروری نہیں ہے۔ میں تمہارے اندر بول رہا ہوں۔“

اس کا منہ شدید حیرانی سے کھل گیا۔ وہ بولا۔ ”تم نے مجھے گالی دی۔ مجھے ڈرٹی ڈاگ کہا۔ اپنے منہ کو سزا دو۔“

اس نے مراد کے کہنے سے تھوک کر نہیں چاٹا تھا۔ کوئی اس سے اپنی بات نہیں منوا سکتا تھا لیکن دماغ اس کے اپنے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے اپنے منہ پر ہاتھ مارنے لگی۔ تین گھونسے مارتے ہی ہونٹ پھٹ گئے۔ باچھوں سے لہو بہنے لگا۔

وہ پریشان ہو کر کہنے لگی۔ ”پلیز مجھے چھوڑ دو۔ میں سمجھ گئی ہوں۔ میرا دماغ تمہارے شکنجے میں ہے۔ میں تمہارے حکم کے بغیر ہل بھی نہیں سکوں گی۔ میں مانتی ہوں' تم زبردست ہو۔ تم میری تقدیر کے مالک بن گئے ہو۔“

”تم نہ مانو، تب بھی میرے قدموں تلے رہوگی۔ تم نے گالی دی۔ اس لیے سزا پا رہی ہو۔ آئندہ میری موجودگی میں غرور اور غصہ نہیں دکھا سکوگی۔ میں جسے اپنا محکوم اور

تابعدار بناتا ہوں اسے ذلیل نہیں کرتا۔ اسے فائدہ پہنچاتا ہوں۔ اس کے بگڑے ہوئے کام بناتا ہوں۔ میں نے تمہارے مختصر خیالات پڑھ کر معلوم کیا ہے کہ تم میرے دشمن کی دشمن ہو اور سونے کا بے حساب ذخیرہ رکھتی ہو۔ میں چپ چاپ تمہارے خیالات پڑھتا رہا تھا۔ تمہارے دماغ نے بتایا ہے کہ وہ ذخیرہ کہاں ہے؟ کس تہ خانے میں ہے؟ چور دروازہ کہاں ہے اور کن نمبروں کی ترتیب سے کھلتا ہے۔"

وہ تہ خانے کا پتا اور مقفل دروازے کو کھولنے کے خفیہ نمبر بتانے لگا۔ وہ شدید حیرانی سے منہ کھولے سن رہی تھی اور یقین کر رہی تھی کہ وہ اس کے تمام خزانے پر قبضہ جما چکا تھا۔

اس کی تو آدھی جان نکل گئی۔ وہ بیٹھے بٹھائے آدھی کنگال اور پوری طرح محکوم ہو گئی تھی۔ اس کا رنگ ایسے سفید پڑ گیا جیسے بدن کا تمام لہو چوس لیا گیا ہو۔

وہ بول رہا تھا۔ "اتنے بڑے نقصان کا ماتم نہ کرو۔ وہ تمام سونا تمہارے ہی پاس رہے گا۔ میں ضرورت کے وقت خرچ کروں گا اور کبھی کبھی اس ذخیرے میں اضافہ بھی کرتا رہوں گا۔ جب بھی چور بازاری سے اور اسمگلنگ کے ذریعے سونا حاصل کرنا چاہو گی' میں مخالفین کی کھوپڑیوں پر قبضہ جما کر تمہاری تمام مشکلات کو آسان بناتا رہوں گا۔"

یہ ماننے والی بات تھی، وہ ایسا کر سکتا تھا۔ شائلہ کے اندر پھر سے جان پیدا ہوئی۔ وہ جلدی سے بولی۔ "کیا تم میرے تمام مخالفین کے دماغوں کو لاک کر کے ان کا تمام سونا میرے ذخیرے میں لا سکو گے؟"

"میرے نہیں' ہمارے کہو۔ اب سونے کا بڑھتا ہوا ذخیرہ ہمارا ہو گا۔ تم مکار اور خود غرض ہو۔ تم نے اپنے شوہر کو جہیز دار بن کر رہنے نہیں دیا۔ اسے مار ڈالا۔ مجھے مار ڈالنے کے خواب ہی دیکھتی رہ جاؤ گی۔"

"جب وہ سونا میرے ہی پاس رہے گا اور اس میں اضافہ ہوتا رہے گا تو میں تمہارے خلاف کبھی غلط نہیں سوچوں گی۔ ہمیشہ تمہاری وفادار بن کر رہوں گی۔"

"میں نے تمہارے خیالات پڑھ کر یہ بھی معلوم کیا ہے کہ پرنس عالی کو اپنا داماد بنانے میں ناکام رہی ہو۔"

وہ جلدی سے بولی۔ "تم تو اس کی کھوپڑی میں گھس کر اسے میرے قدموں میں جھکا سکتے ہو۔ او گاڈ! تم اسے میرے تلوے چاٹنے والا داماد بنا سکتے ہو؟"

"میں جب چاہوں گا' تمہاری یہ حسرت پوری کر دوں گا لیکن اپنی پلاننگ کے مطابق جلدی نہیں کروں گا۔ ایک طویل عرصے تک عالی سے دور رہ کر اسے پریشان اور ہلکان کرتا رہوں گا۔ دنیا کو دکھاؤں گا کہ وہ خود ہی کمزور ہوتے ہوتے میرے سامنے جھک رہا ہے۔ دراصل میں عالی جیسے شہ زور کو ہلاک کرنا نہیں چاہتا۔ اسے اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔"

"جو کام ابھی ہو سکتا ہے اس میں دیر کیوں کرنا چاہتے ہو؟"

"وہ ناقابلِ شکست کہلاتا ہے۔ میں اسے رفتہ رفتہ توڑتا رہوں گا تو دوسرے تمام خطرناک شہ زوروں پر میرا خوف طاری ہوتا رہے گا۔ دنیا دیکھتی رہے گی کہ میں کس طرح ٹیلی پیتھی کے ہتھکنڈوں سے عالی کو بے بس اور مجبور بنا رہا ہوں۔ اس شہ زور کے پیچھے مراد علی منگی جیسا شہ زور باپ ہے۔ انہیں مات دینے میں کچھ وقت لگے گا۔"

وہ بولی۔ "ماریہ نے میری بیٹی کا حق چھین لیا ہے۔ آج سے تین دن بعد اسے سہاگ رات نہ منانے دو۔ عالی کو ابھی نہ سہی ماریہ کو تو ابھی ختم کر سکتے ہو؟"

"یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میں اپنی پلاننگ کے مطابق ماریہ کو بھی ہلاک نہیں کروں گا۔ اس کی موت ضروری نہیں ہے۔ میں اسے عالی کی زندگی سے نکال دوں گا۔"

"میں یہی چاہتی ہوں۔ ہر حال میں اسے اپنا داماد بنانے کی قسم پوری کرنا چاہتی ہوں۔ جس دن قسم پوری ہو گی، اس دن اس پر تھوک دوں گی۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تم میری طرح کمینی اور حرام زادی ہو۔ ہم اپنے یہ فطری تقاضے ضرور پورے کریں گے۔"

پیرس میں جشنِ مسرت شروع ہو چکا تھا۔ مسرتوں کے اس میلے میں عالی کے دوست کم تھے، دشمن زیادہ تھے اور تمام دشمن یہ جانتے تھے کہ ان نون بھی وہاں ہے۔

سب ہی اسے ڈھونڈ لینا اور پہچان لینا چاہتے تھے۔ سب ہی کو عالی سے زیادہ اس سے دلچسپی تھی۔ عالی کے دشمنوں کے لیے ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا ہیرو آ گیا تھا۔ اگرچہ اب تک اسے نقصان نہیں پہنچا سکا تھا پھر بھی ایک زبردست چیلنج بنا ہوا تھا۔

وہ یہی کہتا رہتا تھا۔ "انتظار کرو۔ عابد علی منگی کی موت بہت ہی عبرت ناک ہو گی اور میں اسے غلام بنا کر دنیا والوں کے سامنے زندہ بھی رکھ سکتا ہوں۔ مجھے یہ تماشا دکھانے کی جلدی نہیں ہے۔"

تماشا تو وہ واقعی دکھانے والا تھا۔ وہ خیال خوانی کی چھلانگ لگا کر ارضِ اسلام میں پہنچ گیا۔ ادھر بلّے بشریٰ اور کئی جاں باز مراد کے ذاتی طیارے میں وہاں سے پیرس آنے

والے تھے۔ ہم زاد نے طیارے کی روانگی سے پہلے کہا۔

''بلے......! اپنی بشریٰ اور جاں نثاروں کے ساتھ بہت محتاط رہو۔ اس ان نون نے میرے اور زیب النساء کے دماغوں میں آنے کی کوششیں کی تھیں۔ ہم نے سانسیں روک کر اسے بھگا دیا ہے۔ وہ تمہارے اندر بھی آنا چاہے گا۔''

بلے نے کہا۔ ''وہ کمبخت آیا تھا۔ میں نے کہا۔ خوش آمدید ضرور آؤ مگر پہلے یہ دیکھ لو کہ کسی وقت بھی تمہیں بھگا سکتا ہوں۔ پھر میں نے سانس روکی تو خیال خوانی کی لہریں واپس چلی گئیں۔ اس کے بعد وہ نہیں آیا۔''

بشریٰ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''ایم آل رائٹ، وہ میری طرف نہیں آیا ہے۔ آئے گا تو میں اس کا مذاق اڑاؤں گی۔''

وہ سب ہنسنے لگے۔ ہم زاد نے مطمئن ہو کر انہیں وہاں سے رخصت کیا۔ وہ شاہی طیارہ پیرس کی طرف پرواز کرنے لگا۔

بشریٰ نے بلے اور ہم زاد سے جھوٹ کہا تھا۔ وہ جھوٹ کہنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ خلافِ توقع اس کی سوچ اور اس کی ذہانت ان نون کے شکنجے میں آ گئی تھی۔

ویسے تو وہ بہت ہی مضبوط قوتِ ارادی رکھتی تھی۔ ایسی حاضر دماغ اور زبردست فائٹر تھی کہ دشمنوں کے چھکے چھڑا دیتی تھی۔ ایک فائٹر کی حیثیت سے دیر تک سانس روکنے میں بھی مہارت حاصل تھی۔ اس کے باوجود وہ سانس روک کر اسے بھگانے میں ناکام رہی تھی۔

ناکامی کی ایک وجہ سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ پچھلے چار دنوں سے بیمار تھی۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''آج سے یہ جان لو کہ جہاں ناپاکی ہوتی ہے' وہاں میری سوچ کی لہریں آسانی سے پہنچ جاتی ہیں۔ تم سانس روک کر بھی مجھ سے پیچھا نہیں چھڑا سکو گی۔''

اس نے کہا۔ ''میں تمہارے جیسے دشمنوں سے مات نہیں کھاتی، یہ عارضی شکست ہے۔ جلد تمہارے شکنجے سے نکل جاؤں گی۔''

وہ پھر ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں نادان نہیں ہوں کہ تمہیں نکلنے دوں گا۔ اگر سفر کے دوران طیارے میں موقع نہ ملا تو پیرس پہنچتے ہی تم پر تنویمی عمل کر کے تمہیں اپنا تابعدار بنا لوں گا۔ تم میرے شکنجے سے نکلنا ہی بھول جاؤ گی۔''

وہ چپ رہی۔ سوچنے لگی کہ موجودہ حالات میں کیا کر سکے گی۔ اس نے کہا۔ ''سوچتی رہو۔ تمہاری کوئی سوچ مجھ سے چھپی نہیں رہے گی۔ میری مرضی کے بغیر اپنی کسی تدبیر پر عمل کر کے رہائی حاصل نہیں کر سکو گی۔''

وہ دیکھ رہی تھی کہ کتنی مجبور ہو گئی ہے۔ دن رات ساتھ رہنے والے بلے کو بھی ان نون کے متعلق کچھ بتا نہیں پا رہی تھی۔ کسی چالاکی سے کوئی اشارہ بھی نہیں دے پا رہی تھی۔

بشریٰ نے پوچھا۔ ''کب تک جکڑ کر رکھو گے؟ کیا تمہاری اور دوسری مصروفیات نہیں ہیں؟ کسی بھی ضرورت کے لیے مجھے چھوڑ کر جانا ہی ہوگا۔ بعد میں پھر آؤ گے پھر مجھ پر قبضہ جماؤ گے، تب تک میں اپنے تمام ساتھیوں کو تمہاری طرف سے ہوشیار کر دوں گی۔''

وہ بولا۔ ''بے شک میری یہ مجبوری ہے۔ میں دیر تک تمہارے اندر نہیں رہ سکوں گا۔ میری اور بھی مصروفیات ہیں۔ میں تمہیں وارننگ دے رہا ہوں۔ میرے جانے کے بعد اپنے لوگوں کو میرے بارے میں کچھ بھی بتاؤ گی تو میں واپس آ کر تمہارے دماغ میں زلزلے پیدا کر دوں گا۔ خیال خوانی کے ایسے جھٹکے دوں گا کہ تم دماغی مریضہ بن جاؤ گی۔''

وہ ایسا کر سکتا تھا۔ بشریٰ پریشان ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ''سوچ لو۔ جس کی خوشیوں میں شریک ہونے جا رہی ہو وہ پرنس اور اس کا باپ بھی تمہیں دماغی مریضہ بننے سے اور میرے ہاتھوں مرنے سے بچا نہیں سکے گا۔''

وہ سفر کے دوران اسے دھمکی دے کر چلا گیا۔ اس کا دماغ عارضی طور پر خیال خوانی کے شکنجے سے نکل گیا۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ کیا کرے؟

طیارہ اپنی مخصوص بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے پاس بیٹھے ہوئے بلے کو دیکھا۔ اس کا ایک ذرا سا اشارہ پا کر وہ سمجھ لیتا کہ وہ کسی پرابلم میں ہے۔

اس وقت ان نون نہیں تھا۔ وہ کھل کر بول سکتی تھی لیکن وہ کسی وقت بھی واپس آ کر اس کے دماغ کے چیتھڑے اڑا دیتا پھر وہ دماغ کے بغیر ایک پاگل عورت بن کر رہ جاتی اور اگر چپ رہتی تو ان نون اس کے ذریعے مراد اور عابی کو کمزور بنانے کا موقع حاصل کرتا رہتا۔

وہ باپ بیٹے مشکل میں پڑ جاتے۔ کبھی یہ نہ چاہتے کہ بشریٰ ان نون کے ہاتھوں تباہ ہو جائے۔ وہ اس کی سلامتی کی خاطر واقعی ان نون کے آگے کمزور اور کمتر ہو جاتے۔

وہ ایسی خود غرض نہیں تھی کہ اپنی سلامتی کی خاطر اپنے مہربانوں کو' پرنس عابی کو اور مراد علی منگی جیسے پہاڑوں کو گرا دیتی۔ وہ ان کی خاطر جان دینے والی تھی۔ ابھی تو صرف سوچ ہی رہی تھی کہ ان نون کی دشمنی مول لیے بغیر کس

طرح اس کی ٹیلی پیتھی کے عذاب سے خود کو بچا سکے گی؟

ان نون کی یہ ایک اہم کمزوری معلوم ہو گئی تھی کہ جو پاک وصاف اور عبادت گزار ہوتے ہیں ان کے دماغوں میں وہ پہنچ نہیں پاتا ہے۔ اسی لیے وہ مراد عابی، ہم زاد زیب النساء، بلے اور بشریٰ تک پہنچ نہیں پاتا تھا۔

ادھر بیماری کے باعث بشریٰ عبادت سے محروم ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ شیطان دماغ میں گھس آیا تھا۔

وہ مطمئن تھی کہ جلد نماز پڑھنے کے قابل ہو سکتی تھی اور تب ہی شیطانی سوچ کی لہریں اس کے دماغ میں آنے سے معذور ہو جاتیں۔ اس نے سوچا، ابھی ذرا انتظار کرے گی۔ ان نون کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہے گی۔ اسے دشمنی کرنے کا موقع نہیں دے گی۔ ہو سکتا ہے آپ ہی آپ اس کا راستہ رک جائے۔ ایسا نہ ہوا تو وہ آئندہ شکنجے میں آنے سے پہلے چیخ کر بلے کو خطرے سے آگاہ کر دے گی۔

عابی، ماریہ کے ساتھ ایک وسیع وعریض پیلس میں تھا۔ اس پیلس کے تیس ہزار گز کے اطراف میں صرف ٹی وی چینلز کے عملے کو آکر لائیو پروگرام پیش کرنے کی اجازت تھی۔ وہ سب مسلح گارڈز کی نگرانی میں تھے اور مسلح گارڈز بھی فون کے یا اسکائپ کے ذریعے اجازت لے کر پیلس کے اندر جا سکتے تھے۔

ایسی سخت سیکیورٹی میں رہنے کے باوجود وہ دونوں تمام دنیا والوں کو دکھائی دے رہے تھے۔ شہر کے چوراہوں اور شاہراہوں کے کنارے بڑی بڑی اسکرینز پر انہیں دیکھا جا رہا تھا۔ ماریہ اور عابی اپنے چاہنے والوں سے کبھی کبھی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔

جدید الیکٹرونک سیکیورٹی کے انتظامات بھی ٹیلی پیتھی کی لہروں کو نہیں روک سکتے تھے۔ ان نون کسی بھی گارڈ کی کھوپڑی میں گھس کر پیلس کے اندر آ سکتا تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد وہ عابی کو چیلنج کر سکتا تھا۔ اس پیلس کی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا۔ وہ کیا نہیں کر سکتا تھا؟ اس کے قریب رہنے والے گارڈز کو ہلاک کر دیتا۔ اس محل میں آگ لگا سکتا تھا لیکن عابی کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ ایک بار سیکیورٹی افسر کے ذریعے اس پر گولی چلانے کا نتیجہ دیکھ چکا تھا۔

وہ فی الحال مجبوراً تماشائی بنا ہوا تھا۔ عابی کے گارڈز کو ہلاک کرتا یا پیلس میں آگ لگاتا تو سب یہی کہتے کہ کھسیانی بلی کھمبا نوچ رہی ہے۔ وہ کچھ اور کر نہیں پا رہا ہے۔

اسے یقین تھا کہ وہ ایک دن اسے اپنے قدموں میں ضرور گرائے گا اور یہ ارادہ تھا کہ دُولہا دُلہن کو سہاگ رات منانے نہیں دے گا۔ اپنے دشمن کی سب سے پہلی خوشی کو ماتم میں بدل دے گا اور ایسا کرنے کے لیے بشریٰ اس کی گرفت میں آ گئی تھی۔

وہ ارضِ اسلام کے شاہی طیارے میں پیرس پہنچ گئی۔ بلے کے اور اپنے جاں بازوں کے ساتھ لگیج ہال سے باہر آئی۔ عابی اپنی پھوپی ماں کے استقبال کے لیے آیا تھا۔ بشریٰ نے اسے گلے سے لگا کر چوما۔ ایسے ہی وقت ان نون اس کے اندر پہنچا ہوا تھا۔ بڑی خاموشی سے اس کے خیالات پڑھ رہا تھا۔

اسے معلوم ہوا کہ بشریٰ اس کے خلاف سوچتی رہی ہے۔ وہ طے کر چکی ہے کہ کسی بھی حال میں ان نون کی تابعدار بن کر اسے عابی تک پہنچنے نہیں دے گی۔ اس سے پہلے ہی یہ انکشاف کر دے گی کہ دشمن ٹیلی پیتھی جاننے والا اس کے اندر چھپا ہوا ہے۔

ان نون نے حقارت سے کہا۔ ”بھتیجے کو گلے لگا رہی ہو۔ یہ بھید کھولنا چاہتی ہو کہ میں تمہارے اندر چھپا ہوا ہوں۔ لو میں ہی دھما کا کرتا ہوں۔ اب تماشا بنو اور تماشا دیکھو۔“

اس نے سوچ کی لہروں سے ایک زور کا دماغی جھٹکا اسے پہنچایا تو وہ تکلیف کی شدت سے حلق پھاڑ کر چیخ پڑی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فولادی حوصلہ رکھنے والی یوں کمزور عورت کی طرح چلائے گی۔

وہ دماغی تکلیف کی شدت سے بری طرح لرزتی ہوئی فرش پر گرنے والی تھی۔ بلے نے اسے تھام لیا۔ عابی نے اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا۔ ”پھوپی اماں......! کیا ہوا......؟ آپ اس طرح کیوں لرز رہی ہیں؟“

وہ اٹک اٹک کر بولی۔ ”وہ......وہ ان نون......“

وہ سب محتاط ہو گئے۔ مسرتوں کے ہجوم میں سب ہی بھول جاتے ہیں کہ شامت کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔ دماغی جھٹکا ایسا تھا کہ وہ بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ کئی ڈاکٹر دوڑتے ہوئے آ گئے تھے لیکن وہ علاج کیا کرتے؟ دماغ کی اندرونی تکلیف کو کم کرنے کے لیے کوئی دوا دے رہے تھے۔

ایسے وقت دوا دینے والے ڈاکٹر کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ دوسرے ڈاکٹرز سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ گویا یہ خاموش وارننگ تھی کہ بشریٰ سے ہمدردی نہ کی جائے۔ ورنہ اس کا علاج کرنے والے بھی عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔

عابی نے بے بسی سے اپنی پھوپی اماں کو دیکھا پھر

اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر اپنی گاڑی کی طرف جانے لگا۔ ایک دبلا پتلا سا آدمی اچانک ہی اچھل کر اس کے سامنے آ گیا۔ وہ ہنستے ہوئے ناچتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں نے تیری آنٹی کی کھوپڑی ہلا دی ہے۔ تو بڑا شہ زور ہے۔ آ...... اور مجھے ایک چٹکی میں مسل دے۔''

کئی چینلز کے کیمرے آن تھے۔ ایک دنیا وہ منظر دیکھ رہی تھی۔ حیران ہو رہی تھی کہ ایک شخص جو ہڈیوں کا ڈھانچا ہے اور جو پھونک مارنے سے اڑ جائے گا' وہ شہ زور پرنس کو چیلنج کر رہا تھا۔ ڈنکے کی چوٹ پر سب کے سامنے کہہ رہا تھا کہ اس نے بشریٰ کے دماغ میں زلزلہ پیدا کیا ہے۔

لاکھوں دیکھنے والے حیرانی سے سوچ رہے تھے۔ کیا وہ ہڈیوں کا ڈھانچا ہی ان نون ہے؟ وہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک مسلح گارڈ اس کی پتلی گردن کو دبوچ کر جھٹکے دیتے ہوئے' اسے دھکے دیتے ہوئے وہاں سے لے جانے لگا۔ عابی' بشریٰ کو اٹھائے پھر اپنی گاڑی کی سمت جانا چاہتا تھا لیکن پھر رک گیا۔

ایک خسرا ناچتا ہوا سامنے آ کر بولا۔ ''اے ہے' ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔ ہمیں بھی گود میں اٹھا لے۔ ہم نے تیری آنٹی کی کھوپڑی ہلا دی اور تو انتقام نہیں لے رہا ہے۔ کیوں میدان چھوڑ کر بھاگ رہا ہے؟''

تب دیکھنے والے سمجھ گئے کہ ان نون ایسے تماشے کر رہا ہے۔ وہ مضحکہ خیز لوگوں کو آلۂ کار بنا کر نا قابلِ شکست کہلانے والے پرنس کو زچ کر رہا ہے۔ تماشے کر کے اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ وہ ایک ہی حملہ کر کے ثابت کر رہا تھا کہ اس نے پرنس کو مجبور اور لاچار بنا دیا ہے۔ آئندہ بھی اس پر بھاری پڑتا رہے گا۔

گارڈز اس خسرے کو بھی وہاں سے کھینچ کر لے گئے۔ عابی' بشریٰ کو اٹھائے گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ بلے اور جاں بازوں کے ساتھ اپنے پیلس کی طرف جانے لگا۔ حالات ایسے تھے کہ وہ ان نون کی ایسی چھیڑ چھاڑ کا کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ نہ اسے دیکھ سکتا تھا، نہ پکڑ سکتا تھا۔ ان حالات میں اسے اپنی پھوپی ماں کی سلامتی کی فکر تھی۔

ان نون مختلف چینلز کے نیوز کاسٹر وغیرہ کے دماغوں میں جا رہا تھا اور لاکھوں ناظرین سے کہہ رہا تھا۔ ''لوگو......! میں ان نون بول رہا ہوں۔ ان نون کے معنی ہیں جسے کوئی نہیں جانتا مگر تم سب جاننے لگے ہو کہ میں کتنا پراسرار اور پاور فل ہوں۔ دیکھتے رہو کہ میں کیسے کھیل رہا ہوں۔ آئندہ بھی ایسے تماشے دکھاتا رہوں گا۔ تم سب کے سامنے پرنس کو تگنی کا ناچ نچاتا رہوں گا۔''

پھر وہ ڈینگیں مارنے لگا۔ ''لوگو......! میں چاہوں تو ابھی پرنس کی کھوپڑی میں گھس کر زلزلہ پیدا کر دوں۔ میں چشمِ زدن میں اسے دماغی مریض بنا سکتا ہوں۔''

وہ جو نہیں کر سکتا تھا' وہ کرنے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ ''یقین کر لو کہ میں اسے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہوں لیکن نہیں...... میں پوری دنیا کے سامنے اسے اپنا غلام بنانا چاہتا ہوں اسی لیے اس کے ساتھ تماشے کرتا رہوں گا۔ اسے اچھی طرح ذلیل اور دو کوڑی کا بنا کر فیصلہ کروں گا کہ اسے مار دیا جائے یا چھوڑ دیا جائے۔''

وہ بڑی دیر تک بولتا رہا پھر بولتے بولتے یکلخت چپ ہو گیا۔ ٹی وی اسکرین پر جو نیوز کاسٹر بولتا ہوا دکھائی دے رہا تھا، اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا اور کہنے لگا۔ ''او گاڈ......! وہ شاید جا چکا ہے۔ مجھے بولنے پر مجبور نہیں کر رہا ہے۔ ابھی میں کسی طرح کی جکڑ بندی محسوس نہیں کر رہا ہوں۔''

ان نون بڑی اہم باتیں کر رہا تھا۔ ڈینگیں مارتے ہوئے لاکھوں ناظرین کو یقین دلا رہا تھا کہ وہ پرنس عابی کو ایک کٹھ پتلی کی طرح اپنی انگلیوں پر نچاتا رہے گا۔ ایسا دعویٰ کرنے والا بولتے بولتے یکلخت خاموش ہو گیا تھا۔

یہ وہی جانتا تھا کہ وہ کیوں خاموش ہو گیا تھا اور کہاں چلا گیا تھا؟ اس کے اپنے معاملات تھے۔ اس کی اپنی مجبوریاں تھیں۔ بشریٰ کو آرام آ گیا تھا۔ وہ پیلس کے ایک بیڈ روم میں گم صم سی لیٹی ہوئی تھی۔ بلے اور عابی پریشان تھے۔ یہ جانتے تھے کہ وہ دشمن کہیں جا کر مصروف ہو گیا ہے۔ کسی وقت پھر بشریٰ کو ٹارچر کرنے آئے گا اور وہ بے بسی سے دیکھتے رہیں گے۔

عابی کو پہلی بار ایسا تجربہ ہو رہا تھا کہ دشمن موجود ہو کر نظر نہیں آ رہا تھا اور وہ اسے حملہ کرنے سے روک نہیں پا رہا تھا۔ بشریٰ کو اس سے بچانے کی کوئی تدبیر ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ پریشانی کے باعث ذہن سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

بشریٰ بیڈ سے اتر کر اٹیچی سے ایک لباس نکال کر باتھ روم میں چلی گئی۔ بلے نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''یا اللہ! یہ تیری نیک بندی ہے۔ دشمن کو اس سے دور کر دے۔ اس نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی ہے، یا میرے اللہ......! دشمن اسے تکلیف نہ پہنچائے، اب اور اس

کے دماغ میں نہ آئے۔''

مصائب یا بیماریاں لاعلاج ہوں، ساری دوائیں بے اثر ہوجائیں تو صرف دعا ہی رہ جاتی ہے۔ بشریٰ پاک وصاف ہوکر مصلے پر آگئی تھی۔ عبادت میں گم ہوگئی تھی۔ تقدیر کے کھیل ہیں۔ ان نون اچانک ہی اس کے راستے سے پھسل کر دور چلا گیا تھا۔ کسی مسئلے نے کسی مجبوری نے اسے کہیں روک رکھا تھا۔ جب وہ دماغ میں آیا تو بشریٰ کے سانس روکتے ہی ایک جھٹکے سے باہر نکل گیا۔

کامیاب ہونے کے بعد اچانک ناکامی کی لات پڑی تو وہ جھنجلا گیا۔ یقین نہیں ہوا کہ پرنس عابی کا ایک بہت اہم مہرہ ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ اس نے پھر خیال خوانی کی چھلانگ لگائی۔ بشریٰ کے اندر پہنچا تو وہ بولی۔ ''آخ تھو.....''

پھر اسے یہی لگا کہ وہ تھوک کی طرح اس کے منہ سے نکل آیا ہے۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ ''یہ کیا ہوگیا؟''

بشریٰ نے خوش ہوکر مصلے پر سے کہا۔ ''بلے......! اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میں نے رہائی پالی ہے۔ میں نے اسے بھگا دیا ہے۔ وہ مردود دوبارہ ناکام ہوکر گیا ہے۔''

بلا دوڑتا ہوا عابی کے پاس آیا۔ اسے یہ خوش خبری سنائی۔ وہ سب جہاں تھے، وہیں سجدے میں چلے گئے۔ اس شیطانی گرفت سے نکلنا ناممکن تھا۔ پاکیزگی اور دعاؤں نے ممکن بنا دیا تھا۔ ان سب کے ذہنوں سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔

پھر بشریٰ کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ مات کھا کر جانے والا انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ وہ فون پر چیخ پڑا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو، مجھ سے رہائی مل گئی ہے؟ میں کسی بھی آلۂ کار کے ذریعے تمہیں زخمی کرکے تمہیں کمزور بنا کے پھر تمہیں اپنا تابعدار بنالوں گا۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''یہ تو ہم اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ میرے بھتیجے عابی پر اللہ تعالیٰ مہربان ہے۔ وہ معبود عابی کے ایسے تمام چاہنے والوں کو تمہارے شر سے محفوظ رکھتا ہے، جو جسمانی اور باطنی پاکیزگی کے ساتھ صوم وصلوٰۃ کے پابند رہتے ہیں۔ دیکھ لو کہ تم آج تک اپنے کسی آلۂ کار کے ذریعے ہم میں سے کسی کو نقصان پہنچانے میں ناکام ہورہے ہو۔ ہم نہیں جانتے ہمارا معبود تمہیں کس طرح مجبور کردیتا ہے۔ ہمیں اپنے پاک پروردگار پر کامل اور مستحکم اعتماد ہے۔ تم دیکھ رہے ہو، وہ ہمیں عزت اور تمہیں ذلت دے رہا ہے۔''

عابی نے وہاں آکر بشریٰ سے فون لے کر کہا۔ ''مرد ہو، مردوں سے باتیں کرو۔ ایک عورت سے پنجہ لڑا کر سبق حاصل کرو۔ اب مجھے دور ہی دور سے دیکھ کر تلملاتے رہو گے۔ اپنی بہتری چاہو...... مجھ سے دشمنی سے باز آجاؤ۔''

اس نے کہا۔ ''میں یہی مشورہ تمہیں دوں گا۔ اپنی بہتری چاہو تو میرے تابعدار بن جاؤ۔ یہ فاصلہ جو میں نے تم سے رکھا ہے، اسے چشم زدن میں ختم کرسکتا ہوں۔ تم پلک جھپکتے ہی اپنے دماغ کو میری گرفت میں پاؤ گے پھر تمہاری خوش نصیبی لکھنے والا کاتب تقدیر بھی میرے شکنجے سے تمہیں نہیں نکال سکے گا۔ تم دیکھ چکے ہو کہ میں نے بشریٰ کے ذریعے کس طرح تمہارے ہوش اڑا دیے تھے۔ اب ایک اور حملہ کروں گا۔ میں ابھی چینلز کے ذریعے یہ اعلان کرنے جارہا ہوں۔ اسے سنو، تمہارا یہ تمام جشنِ طرب دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔''

اس نے یہ چیلنج کرتے ہی رابطہ ختم کردیا۔ پتا نہیں وہ کیا کہنے والا اور کیا کرنے والا تھا؟ اگرچہ وہ جان لینے والا حملہ نہیں کرسکتا تھا تاہم پھر ایک بار جان کا عذاب بن سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی مختلف چینلز کے ذریعے خصوصی خبریں جاری ہونے لگیں۔ نیوز کاسٹر کہہ رہے تھے۔ ''ان نون کی جانب سے ہمارے لیے احکامات جاری ہورہے ہیں۔ وہ جو کہہ رہا ہے، وہی ہم ناظرین سے کہہ رہے ہیں۔''

اور وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں ان نون تمام ناظرین سے مخاطب ہوں۔ تم سب نے دیکھا ہے میں نے پرنس عابی کی آنٹی بشریٰ کو اپنی خیال خوانی کے شکنجے میں لے لیا تھا۔ یہ پرنس بے بس ہوگیا تھا۔ اپنی ماں جیسی آنٹی کو میری گرفت سے نہیں نکال سکتا تھا۔ میں نے کئی گھنٹوں تک پوری دنیا کو یہ حقیقت دکھائی ہے اور سمجھائی ہے کہ پرنس کو جب چاہوں بے بس اور مجبور بنا سکتا ہوں۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اس ناقابلِ شکست شہ زور کو ہلاک کرنے کا ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اسے صرف شکست دینا اور توڑ دینا چاہتا ہوں۔ اسے قدموں میں جھکا کر جوتوں کی طرح پہن کر رہنا چاہتا ہوں اور یہ دنیا دیکھے گی۔ لوگو! میرا کھیل تماشا دیکھو۔ ایسے وقت جبکہ پرنس بے بس اور مجبور ہوگیا ہے۔ اپنی آنٹی کو رہائی نہیں دلاسکتا ہے۔ میں اس پر رحم کھا رہا ہوں۔ میں نے اس کی آنٹی بشریٰ کو خیال خوانی کے شکنجے سے رہا کردیا ہے۔''

وہ بڑی مکاری سے جھوٹ بول کر اپنی ناکامی کو چھپا رہا تھا۔ اپنے دشمن پر مہربان ہونے کی نیکی اور شرافت کا اور اپنی حکمتِ عملی کا مظاہرہ کررہا تھا۔

''لوگو! میں آئندہ بھی پرنس کو ٹھوکریں مار کر اسے سنبھلنے اور اپنے آگے جھکنے کے مواقع دیتا رہوں گا۔ اگلے

ایک گھنٹے تک انتظار کروں گا۔ وہ میری طاقت کو اور غیر معمولی صلاحیت کو تسلیم کرلے گا تو میں اسے اپنا تابعدار بنا کر دشمنی کا یہ سلسلہ ختم کردوں گا۔ ورنہ کیا کروں گا، یہ ایک گھنٹے بعد بتاؤں گا۔''

بلے نے فون پر مراد سے کہا۔ ''یار! میں سمجھ رہا تھا وہ کمبخت مات کھا کر تلملا رہا ہوگا۔ آئندہ عابی سے منہ چھپائے گا لیکن اس نے تو ڈھٹائی کی حد کردی۔ ناکامی کو اپنی کامیابی بنا رہا ہے۔''

مراد اور ہم زاد مختلف چینلز کے ذریعے لاکھوں ناظرین سے کہنے لگے۔ ''یہ ان نون جھوٹا اور فریبی ہے۔ یقین کریں' اس نے کوئی مہربانی نہیں کی ہے۔ میری بہن بشریٰ نے اسے لات مار کر اپنے دماغ سے نکالا ہے۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ ہمارے رب نے بشریٰ کو اس کے شکنجے سے رہائی دلائی ہے۔ وہ ایک عورت سے مات کھا کر تلملا رہا ہے۔ میرے بیٹے کو دھمکیاں دے رہا ہے کہ آئندہ اسے کسی اور طرح سے نقصان پہنچانے والا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ کیا کرنے والا ہے؟ اور آپ حضرات بھی دیکھیں گے کہ ہم کیا کر گزریں گے۔''

عابی کی خوشیوں میں سب ہی شریک تھے۔ بڑی زندہ دلی سے رقص و موسیقی اور کھیل تماشوں سے دل بہلا رہے تھے۔ ایسے وقت یہ ٹینشن' یہ تجسس پیدا ہوگیا تھا کہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟

پھر ان نون نے مختلف چینلز کے ذریعے کہا۔ ''سنو کہ میں حاکم مطلق ہوں۔ نہ مجھ سے کوئی اوپر ہے نہ کوئی مجھ سے زیادہ قوی ہے۔ میرا حکم پتھر کی لکیر ہے۔ اس حکم کی تعمیل ہر حال میں کی جائے گی اور یہ اٹل حکم ہے کہ پرنس عابی سہاگ رات نہیں منائے گا۔ اب یہ جشن مسرت یہ کھیل تماشے ختم کرو۔ عابی......! اب سے بارہ گھنٹے بعد تم اپنی دلہن کے کمرے میں جاؤ گے۔ میں کہتا ہوں نہیں جاسکو گے۔ کبھی نہیں جاسکو گے۔''

عابی نے ایک چینل کے ذریعے پوچھا۔ ''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ یہ تو دیکھ چکے ہو اور اچھی طرح سمجھ گئے ہو کہ میرے آس پاس رہنے والی ہستیوں کو نقصان پہنچانے میں ناکام رہتے ہو۔ ماریہ تک بھی نہیں پہنچ سکو گے پھر کیا کرو گے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں جشنِ مسرت کو ماتم میں بدل دوں گا۔ جب خوشیوں کے میلے میں جگہ جگہ بم دھماکے ہوں گے تو سب ہی اپنی سلامتی کے لیے بھاگ جائیں گے اور بھاگنے سے پہلے مارے جائیں گے پھر بولو تمہاری سہاگ رات کتنی لاشوں کا بوجھ اٹھائے گی؟''

یہ تو ہوش اڑا دینے والی دھمکی تھی۔ ماریہ اور عابی اپنی پہلی جذباتی اور فطری خوشیاں پوری کرنے کے لیے پیلس کے باہر بے گناہوں کی لاشیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ان نون نے کہا۔ ''میں چھ گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں۔ ماریہ سے دور ہوجاؤ یا اسے پیلس سے دور کہیں بھیج دو۔ تمہاری یہ دوری عارضی نہیں دائمی ہوگی۔ آئندہ اپنی دلہن کے پاس جانا چاہو گے تو میرے ایک اور حکم کی تعمیل کرنی ہوگی، اس کے بعد ہی ماریہ کو چھو سکو گے۔''

''تم فرعون بن چکے ہو۔ دشمنی کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ تم مجھ سے عداوت کرو لیکن میرے چاہنے والوں نے، ان خوشیاں منانے والوں نے، تمہارا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ ان کی زندگیوں سے کھیلنے کی بات نہ کرو۔''

اس نے کہا۔ ''تم اپنے چاہنے والوں سے محبت کرو۔ میں تو عداوت کرنا جانتا ہوں۔ تمہیں بے دست و پا بنانے کے لیے ہر طرح کے حربے آزماؤں گا۔ مان لو کہ میں نے اس وقت تمہیں طاقت سے خالی اور کھوکھلا کردیا ہے۔''

عابی نے کہا۔ ''لاکھوں ناظرین اور سامعین تمہاری یہ باتیں سن رہے ہیں۔ یہ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں کہ تم مجھ سے براہ راست دشمنی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہو۔ اس لیے بے گناہوں کی جان لینے کی دھمکی دے رہے ہو۔ میری شرافت اور میرے ایمان کو مجبور کر رہے ہو کہ انہیں زندہ سلامت رکھنے کے لیے اپنی سہاگ رات کو ہار جاؤں۔''

''فی الحال ناظرین کچھ بھی سمجھیں، جب تم میرے احکامات کی تعمیل کرو گے تو میرے محکوم کہلاؤ گے اور یہی میری جیت ہوگی۔''

''یہ میرا خدا جانتا ہے کہ میں سہاگ رات منانے کے لیے ایک چیونٹی کی بھی ہلاکت نہیں چاہوں گا۔ ہاں تم سے سمجھوتا کروں گا۔ تم نے ابھی کہا ہے کہ میں تمہارے ایک اور حکم کی تعمیل کروں گا تو اپنی ماریہ کے ساتھ رہ سکوں گا؟''

''بے شک ماریہ کے ساتھ رہ سکو گے لیکن اس سے پہلے میری پسند کی ایک لڑکی سے شادی کرو گے۔ پہلی سہاگ رات اس کے ساتھ مناؤ گے۔''

عابی نے پوچھا۔ ''کون ہے وہ لڑکی؟''

''وہ مشہور و معروف سونے کی ایک بہت بڑی تاجر شائلہ شانی کی بیٹی جمائلہ ہے۔''

عابی نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔ ''تم اس سونے

JBD

جہانگیر بکس

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ -/550
جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مسافر -/475
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی المناک داستان

ثقافت کی تلاش -/300
نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

قیصر و کسریٰ -/625
ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی -/550
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کردی

گمشدہ قافلے -/500
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیئے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز داستان

داستانِ مجاہد -/300
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکتہ الآرا داستان

پردیسی درخت -/450
اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یوسف بن تاشفین -/500
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

معظم علی -/475
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون -/550
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ -/450
فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلہ حجاز -/599
راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم -/425
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی -/300
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں ہندوؤں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

انسان اور دیوتا -/450
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک -/300
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان -/450
سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستانِ شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد -/225
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ -/325
بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین -/475
اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

سبق آموز کتب سلسلہ

دو رنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین



- اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ -/165
- اقوالِ آئمہ کرامؒ -/165
- حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ -/195
- اقوالِ شیخ سعدیؒ -/140
- حکایاتِ رومیؒ -/180
- دلچسپ و عجیب حقائق -/170
- حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ -/199
- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں -/150
- ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات -/180
- بڑے لوگوں کے روشن واقعات -/165



جہانگیر
اردو لغت
(جامع ترین)

ملفوظی طریقے سے تلفظ کے اندراج کے ساتھ اردو زبان کا پہلا لغت

جہانگیر بک ڈپو

042-35757086 | 022-2780128
021-32765086 | 051-5539609 | 042-37220879

کی اسمگلر سے میرا رشتہ کیوں جوڑنا چاہتے ہو؟''

''مجھ سے سوال نہ کرو۔ میرے اس سوال کا جواب دو کہ تمہارا وہ گروگھنٹال، وہ پیرومرشد حماد کون ہے جو شائلہ کو تھوک کر چاٹنے پر مجبور کررہا تھا؟''

یہ باتیں چینلز کے ذریعے ہورہی تھیں۔ حماد بن کر رہنے والا مراد بھی سن رہا تھا۔ عابی نے کہا۔ ''میرے پیرومرشد کچھ عرصہ پہلے تک گوشہ نشین رہے تھے۔ شائلہ مجھے داماد بنانا چاہتی ہے تو ان کے حکم کے مطابق اسے تھوک کر چاٹنا ہوگا۔''

ان نون نے کہا۔ ''ایسے کسی حکم کی تعمیل نہیں ہوگی۔ تم جمائلہ سے شادی کروگے۔ پہلے اس کے ساتھ سہاگ رات گزاروگے، اس کے بعد ماریہ کو ہاتھ لگا سکو گے۔''

شائلہ اور اس کی بیٹی جمائلہ بھی ان نون کی باتیں سن رہی تھیں اور خوشی سے کھل رہی تھیں۔ دل ہی دل میں اس ٹیلی پیتھی جاننے والے پر قربان ہورہی تھیں۔ وہ ان ماں بیٹی کو سیاست کی اور جرائم کی دنیا میں بہت اہم بنا رہا تھا۔

عابی نے کہا۔ ''سوری۔ میری شادی ہوچکی ہے۔ میں جمائلہ سے تو کیا دنیا کی کسی بھی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔''

ان نون نے کہا۔ ''تو پھر چھ گھنٹے کے اندر ماریہ سے دور ہوجاؤ ورنہ بے گناہ مارے جائیں گے۔''

''میں کسی کو ہلاک نہیں ہونے دوں گا۔ چھ گھنٹے کے اندر ماریہ کو کسی محفوظ پناہ گاہ میں بھیج دوں گا۔''

''یہ یاد رکھو کہ آئندہ کبھی ماریہ سے باتیں بھی نہیں کرسکوگے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے تمہیں جمائلہ کے ساتھ میرج سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہوگا۔''

چینلز کے ذریعے ان کا رابطہ ختم ہوگیا۔ مراد، ہم زاد، بشریٰ اور بلے سب ہی پریشان ہوگئے۔ وہ سب فون کے ذریعے ایک دوسرے سے بولنے لگے۔ حالات ایسے ہوگئے تھے کہ وہ صرف بول سکتے تھے۔ ان نون سے نمٹ نہیں سکتے تھے۔

ماریہ روتی ہوئی آکر عابی سے لپٹ گئی تھی۔ ابھی چھ گھنٹے تک وہ اسی چھت کے نیچے اسی چار دیواری کے اندر رہنے والے تھے۔ اگلے چھ گھنٹے بعد سہاگ رات شروع ہونے والی تھی۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ عابی صدمے سے نڈھال ہورہا تھا۔ اسے تھپک رہا تھا۔

وہ تڑپ کر بولی۔ ''ہائے عابی......! تم سے دور کیسے رہوں گی؟ میں مرجاؤں گی۔''

وہ گردن میں بانہیں ڈال کر مقناطیس کی طرح چپک گئی تھی۔ وہ کوئی غلطی یا گناہ کرنے والے نہیں تھے۔ شرعاً رشتہ ازدواج میں منسلک ہوچکے تھے۔ وہ شرپسند تھا جو شریعت کے خلاف حکم صادر کررہا تھا۔ جائز کو ناجائز قرار دے رہا تھا۔ ان حالات میں یہ بڑی عجیب اور افسوس ناک بات تھی کہ وہ جائز لمحات گزارنے کے لیے چوروں کی طرح ازدواجی فرائض ادا کرنے لگے۔

وہ انسانی کھوپڑیوں میں گھس آنے والا یقیناً بے خبر ہوگا۔ کیونکہ ماریہ اور عابی کے دماغوں میں نہیں آرہا تھا۔ ابھی ان سے دور تھا۔ اس وقت وہ اس خوش فہمی میں ہوگا کہ اس نے عابی کو سہاگ رات کی مسرتیں حاصل کرنے سے روک دیا ہے۔

چوری کے متعلق کہا جاتا ہے اور یہ دیکھا بھی گیا ہے کہ یہ اچانک پکڑی جاتی ہے جبکہ کہیں سے کسی پہلو سے گرفت میں آنے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

ایسے ہی وقت قدرتی تماشے دیکھنے میں آتے ہیں۔

خواب گاہ کی خاموشی بڑی پراسرار اور بڑی ہی مسرتوں بھری تھی۔ ایسے ہی وقت یکبارگی ماریہ کے حلق سے چیخ نکلی۔ دوسرے ہی لمحے میں اس کے دیدے پھیل کر ساکت ہوگئے۔ سانس اوپر کی اوپر ہی رہ گئی پھر اس نے دوسری سانس نہیں لی۔ یہ اچانک کیا ہوگیا تھا؟ جو بات سوچی بھی نہیں جاسکتی وہ ہوگئی تھی۔

عابی فوراً ہی سمجھ نہ سکا کہ کیا ہوگیا ہے؟ اس نے تڑپ کر اس کے بازو کو جھنجوڑ کر پوچھا۔ ''ماریہ......! کیا ہوا......؟ سانس لو ماریہ...... سانس لو۔''

وہ اس کی آواز سے بہت دور جاچکی تھی۔ موت اسی کو کہتے ہیں۔ آناً فاناً آتی ہے اور اپنا سامان لے جاتی ہے پھر سوچتے رہو کہ کیا ہوچکا ہے؟ ایسا تو نہیں ہونا تھا پھر کیسے ہوگیا ہے؟

یہ ابھی اپنے شہ زور کے مضبوط بازوؤں میں کھیل رہی تھی۔ کسی بھی صدمے کا، کسی بھی المیے کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پھر یہ اچانک موت کا جھٹکا کیسے لگ گیا تھا؟ کیا دشمن کی ٹیلی پیتھی کام کرگئی ہے؟ وہ غصے سے لرز گیا۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ ایسی اچانک موت اور کہیں سے آنہیں سکتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے عابی کو ذہانت اور حاضر دماغی دی تھی۔ وہ اپنے غصے پر قابو پانے لگا۔ ایسے وقت اس کی ذہانت اسے سمجھاتی تھی کہ انسان کا پہلا اور آخری دشمن غصہ ہے۔ نارمل رہنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آدمی خواہ کتنا ہی

طاقت ور، با اقتدار اور با اختیار ہو وہ دشمن سے فوراً انتقام نہیں لے سکتا۔ فوری کارروائی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا طیش میں آنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ غصے کی آگ اپنی ہی ذہانت کو جلا دیتی ہے۔ جب یہ طے ہے کہ غصہ حرام ہے تو پھر حرام ہے۔ وہ اسی وقت وہاں سے اٹھ کر باتھ روم میں آگیا فوراً ہی طہارت لازمی تھی۔ وہ شاور کو کھول کر غسل کرنے لگا اور.... تر بتر ہونے لگا۔

ماریہ کی آخری چیخ بیڈ روم کے باہر دور تک گئی ہوگی۔ تمام سیکیورٹی گارڈز مستعد ہوگئے لیکن خاموش اور منتظر رہے کہ کوئی پریشان کرنے والا معاملہ ہوگا تو پرنس انہیں کال کرے گا۔

اس نے پاک و صاف ہو کر مراد کو فون پر کہا۔ ''بابا جانی! آپ کا بیٹا صدمات سے ٹوٹ رہا ہے۔''

باپ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو بیٹے؟ تم اور صدمات......؟''

''ہاں بابا جانی! زندگی میں پہلی بار دل کو اور دماغ کو دھچکا لگا ہے۔ میری ماریہ...... آپ کی بہو اچانک ہی وفات پا چکی ہے۔''

یہ ایسی خبر تھی کہ مراد ہل کر رہ گیا۔ ''میرے بیٹے! یہ کیا بول رہے ہو؟ یہ اچانک کیسے ہوگیا؟ وہ صحت مند تھی کوئی مرض نہیں تھا، کوئی حادثہ پیش نہیں آیا ہے؟''

''بابا جانی! حادثہ نہیں...... عداوت۔''

''کیا......؟'' مراد نے چونک کر کہا۔ ''یا خدا...... میں اس ٹیلی پیتھی جاننے والے شیطان کو بھول گیا تھا۔ میں...... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔''

''پلیز آپ طیش میں نہ آئیں۔ ہم اس کے سائے تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ میں ماریہ کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجنے کے بعد ان نون سے نمٹنا چاہوں گا۔''

پھر یہ خبر آگ کے شعلوں کی طرح بھڑکتی، لپکتی اور پھیلتی چلی گئی کہ عشرت کدہ اچانک ماتم کدہ بن گیا ہے۔

شمائلہ شانی نے فون پر ان نون سے کہا۔ ''میں صدقے میں واری، میں تم پر قربان...... تم نے میرا کلیجا ٹھنڈا کر دیا ہے۔ بس اسی طرح کسی دن عابی کو میرے قدموں میں جھکا دو۔ میری بیٹی بھی تمہاری، سونے کا ذخیرہ بھی تمہارا......''

ان نون چپ تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ ماریہ اچانک کیسے مر گئی ہے؟ وہ چپ چاپ اس کی ہلاکت کا سہرا اپنے سر لے رہا تھا۔

یہ ایک نئی اور عجیب سی سچویشن پیدا ہوگئی تھی۔ جسے قاتل سمجھا جا رہا تھا، اس کے ہاتھوں پر ماریہ کا لہو نہیں تھا اور دوست ہوں یا دشمن، سب ہی پورے یقین کے ساتھ ان نون کو قاتل سمجھ رہے تھے۔

اس نے فون پر عابی کو مخاطب کیا پھر کسی تمہید کے بغیر فوراً ہی بولا۔ ''میں نے ماریہ کو ہلاک نہیں کیا ہے۔''

عابی نے کہا۔ ''دشمنی کرنے کے بعد موت سے ڈر رہے ہو۔ جانتے ہو کہ آج سے میں تمہارا جینا حرام کردوں گا۔''

''تمہارے فرشتے بھی میرے سائے تک پہنچ نہیں پائیں گے۔ میں ڈرتا نہیں، مارنا اور مرنا جانتا ہوں۔ میں تم پر برتری حاصل کرنے کے لیے دنیا والوں کے سامنے اعتراف کروں گا کہ میں نے تمہیں بہت بڑی پہلی مات دی ہے جبکہ ماریہ کو میں نے ہلاک نہیں کیا ہے۔''

عابی نے کہا۔ ''تمہارا سچ یا جھوٹ تم جانو۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے حقیقت معلوم ہوجائے گی۔''

حقیقت کچھ بھی ہو، مراد اور عابی کے دشمن خوش تھے۔ انہیں اب تک یہ شکایت تھی کہ ان نون عابی کے مقابلے میں کمزور ہے۔ اسے نقصان پہنچانے میں ناکام رہتا ہے۔ یہ شکایت دور ہوگئی تھی۔ اس نے پہلی بار صرف عابی ہی کو نہیں، مراد علی منگی کے پورے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

تمام دشمن بھی عجیب الجھن میں رہتے تھے۔ وہ عابی جیسے بارہ برس کے بچے کی برتری برداشت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مجبوراً دوستی اور سمجھوتا کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی تیسری طاقت آکر اسے مات دے اور ان کی برتری پھر سے بحال ہوجائے۔

ایسے میں ان نون آگیا تھا۔ اس نے ایک طویل انتظار کے بعد عابی کو نقصان پہنچا کر اپنی برتری منوائی تو یہ فکر لاحق ہوگئی کہ عابی کی جگہ وہ آئے گا تو سب ہی کے دماغوں میں بیٹھ کر حکومت کرے گا اور وہ سب نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے غلام بن کر رہیں گے۔

پہلے تو صرف عابی ہی تھا۔ کسی حد تک قابلِ قبول تھا لیکن ان نون آئندہ ان سے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں چھین لینے والا تھا۔ صرف وہی ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا دماغ پوری دنیا پر حکومت کرنے والا تھا۔

سپر پاور اور دیگر بڑے ممالک اور جرائم کی دنیا سے تعلق رکھنے والی خطرناک تنظیمیں دو طاقتوں کے درمیان دو پاٹوں کے بیچ تھے۔ اپنے اوپر کسی کا مسلط ہونا منظور نہیں تھا لیکن اقتدار کے کھیل میں سب کچھ اپنی منظوری سے نہیں ہوتا۔ آخری منظوری کاتبِ تقدیر کی ہوتی ہے۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی۔ عابد علی منگی عرف عابی کی زندگی میں حیران کردینے والے واقعات پیش آرہے تھے۔ خلافِ توقع اس میڈیکل رپورٹ نے بھی حیران کردیا۔ ماریہ کی موت دشمنی سے نہیں' دوستی سے ہوئی تھی۔ نفرت سے نہیں محبت سے کھیلتے کھیلتے ہوئی تھی۔ پیار کے مراحل میں ایسی گھڑی آئی تھی جو ماریہ کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی تھی۔ رپورٹ کے مطابق وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ عابی کے دماغ کو زبردست جھٹکا پہنچا۔ اب سے پہلے اس نے پیدا ہوتے وقت ماں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا اور اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی محبوبہ کو چھلنی کرچکا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ ادھر سے ادھر پاؤں پٹختے ہوئے جانے لگا۔ ''یا میرے خدا! کیا میں ظالم ہوں؟ کیا مظالم ڈھانے کے لیے پیدا ہوا ہوں؟ میں تو دشمنوں سے بدتر ہوں۔ دشمن دشمنی سے مارتے ہیں۔ میں نے ماں کو اور محبوبہ کو محبتوں سے مارا ہے۔''

''نہیں......!'' وہ حلق پھاڑ کر چیخ پڑا۔ تیزی سے باہر جانے لگا۔ بلے نے فوراً ہی دروازے کو بند کردیا۔ اس طوفان کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ جو بھی اسے روکنے آتا' وہ اٹھا کر اسے پھینک دیتا اسی لیے بلّا سامنے نہیں آیا۔ اس نے دروازے کو باہر سے بند کردیا تھا۔

لیکن وہ دروازہ تو ایک روبوٹ کے لیے کاغذ جیسا تھا۔ اس کی ایک لات پڑتے ہی ٹوٹ کر ایک طرف جھول گیا۔ وہ دروازے سے گزرتا ہوا فرش پر دھمکے کرتا ہوا آگے جانے لگا۔

بشریٰ نے چیخ کر کہا۔ ''رک جاؤ عابی......! اپنی پھوپی ماں کی بات سن لو۔ تم کہتے ہو نا کہ غصہ حرام ہوتا ہے۔ آخر تمہیں کس پر غصہ آرہا ہے؟''

اسے اپنی ماں کے دشمن پر اپنی محبوبہ کے دشمن پر یعنی...... اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کہاں جارہا ہے اور کیا کرنے والا ہے؟ اور بشریٰ ایسی نہیں تھی کہ اسے جنون کی حالت میں کہیں جانے دیتی۔ اس نے فوراً ہی ایک لکڑی اٹھا کر اس کے پیروں میں پھنسائی تو وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی وہ بھی جھپٹتی ہوئی اس کے قدموں سے آکر لپٹ گئی۔ ''تو اپنی پھوپی ماں کو لات مار کر ہی جاسکے گا۔ اگر تو نے لات ماردی تو سمجھ لینا کہ غصہ تجھے ایمان سے اور اخلاق سے دور لے گیا ہے۔ آج تیری آزمائش ہے۔ رشتے کو جلادے یا غصے کو راکھ کردے۔''

وہ فرش پر سے اٹھ نہ سکا۔ بالکل ساکت رہ گیا۔ پھوپی ماں بھولا ہوا سبق یاد دلا رہی تھی۔ جب آگ لگتی ہے، بدن جلتا ہے اور چربی کی طرح پگھلتا ہے تب برداشت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کسی کی نصیحت کام نہیں آتی۔ غصے کی آگ ایسی ہی ہوتی ہے' ہزاروں میں کوئی ایک ایسا ہوتا ہے جو ایسی جلن کو برداشت کرلیتا ہے۔

عابی کمال قوتِ ارادی سے برداشت کرنے لگا۔ ایسے وقت اپنے حالات کو اور اپنے آپ کو بھلا دینے کا ایک آسان راستہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو خود پر حاوی کیا جائے۔ اور وہ یہی کررہا تھا۔ وہ آیت الکرسی کی گہرائی میں ڈوب رہا تھا اور آیت کہہ رہی تھی۔

''پوری دنیا میں اور پوری کائنات میں جو ہوچکا ہے جو ہورہا ہے اور جو ہونے والا ہے، ان کے بارے میں صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معلومات کا احاطہ کوئی نہیں کرسکتا۔ وہ معبود جسے چاہتا ہے، اسے علوم عطا کرتا ہے......''

اور ان لمحات میں عابی کو علم ہورہا تھا کہ انسان سے جانے انجانے میں جو غلطیاں ہوتی ہیں وہ اس وقت معلوم ہوتی ہیں' جب ان کے نتائج سامنے آتے ہیں۔

وہ ماریہ کو چاہنے کی لگن میں بھول گیا تھا کہ وہ صنفِ نازک تھی اور وہ فولاد ہے۔ کسی پہلوان کو ایک ہاتھ سے مارتا ہے تو وہ اپاہج بن جاتا ہے۔ کسی پر ایک پاؤں رکھ دیتا ہے تو وہ پھڑ پھڑا کر مرجاتا ہے۔ اس کی انگلی ایک خنجر کی طرح دشمنوں کے اندر پیوست ہوجاتی ہے۔

چند روز پہلے یہ قدرتی اشارہ ملا تھا کہ ماریہ اسے برداشت نہیں کرپائے گی۔ اس کی ایک کلّی کی دھار ماریہ کی ہتھیلی کی پشت پر تیر کی طرح آکر لگی تھی۔ ہتھیلی کا وہ حصہ زخمی ہوگیا تھا۔ اس ایک دھار نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا لیکن اکثر اشارے کنایے سمجھ میں نہیں آتے۔ آخر میڈیکل رپورٹ نے سمجھا دیا کہ ماریہ کس طرح زخمی ہوگئی تھی۔

اور اللہ کا کلام سمجھا رہا تھا کہ اس نے ماں پر اور نہ ہی ماریہ پر کوئی ظلم کیا ہے۔ لوگ قضائے الٰہی سے زلزلے میں ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ سیلاب میں غرق ہوجاتے ہیں۔ ماریہ کو عابی نے نہیں' اس کی غیر معمولی قدرتی قوت نے مارا تھا۔ جو بھی ہوا، وہ مشیت ایزدی سے ہوا تھا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں



منظر امام

آگ کا دریا

شاعروں نے عشق کو آگ کے دریا سے تشبیہ دی ہے... شاید وہ سب اس دریا سے گزر کر اپنی منزل تک پہنچنے کا تجربہ کر بیٹھے ہوں... مگر وہ نہ تو شاعر تھا نہ مصور پھر بھی اس دریا میں چھلانگ لگادی اور ثابت کردیا کہ چاہت کے لیے صرف خلوص اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے باقی قسمت کا کرشمہ... اور قسمت کی دیوی اس پر بھی مہربان ہوگئی تھی کیونکہ عشق کے نام پر صحیح کو غلط سمجھنا درست ہرگز نہیں ہوتا۔

عشق میں سربلند کرنے والے ایک معصوم عاشق کی کارفرمائیاں

مولوی صاحب کے سامنے تین چار افراد بیٹھے تھے۔ یہ گاؤں کی ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس کا صحن تو پختہ تھا لیکن دیواریں کچی تھیں۔ اس مسجد میں ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ سو، سوا سو افراد کی گنجائش تھی۔

مغرب کی نماز ختم ہوچکی تھی۔ یہ معمول تھا۔ مغرب کی ہر نماز کے بعد مولوی صاحب گاؤں کے چند افراد کو لے کر بیٹھ جاتے اور مختلف موضوعات پر باتیں کیا کرتے، انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے۔ یہ افراد گاؤں کے دکاندار

تھے، کسان تھے، مزدور تھے۔ سیدھے سادے لوگ جن کی زندگی سیدھی سادی تھی، کسی ریا اور منافقت سے پاک۔

آج ان لوگوں کے حلقے میں ایک ایسا نوجوان دکھائی دے رہا تھا جس کو مولوی صاحب نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے انداز یہ بتا رہے تھے کہ وہ نوجوان شہر سے آیا ہوا ہے۔ چلنے پھرنے اور بیٹھنے اٹھنے کا انداز بہت کچھ بتا دیا کرتا ہے۔ اچانک اس نوجوان نے ایک سوال کیا۔

''مولوی صاحب! محبت کسے کہتے ہیں؟''

سب لوگ اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ اس نے مولوی صاحب سے یہ کیسا سوال کر دیا تھا۔ لیکن مولوی صاحب کے ہونٹوں پر بڑی دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔

''بیٹا، پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام اسلم ہے مولوی صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''میرا باپ وڈیرے کا منشی ہے...... رب نواز۔''

''اوہ...... تو تم رب نواز کے بیٹے ہو؟''

''جی مولوی صاحب! اب سے تقریباً سات آٹھ سال پہلے میرے باپ نے مجھے پڑھائی کے لیے شہر بھیج دیا تھا۔ میں کل ہی واپس آیا ہوں۔ یہاں کے لوگوں نے بتایا تھا کہ آپ ہر مغرب کی نماز کے بعد مجلس کرتے ہیں تو میں بھی کچھ حاصل کرنے کے لیے چلا آیا ہوں۔''

اسلم نے بڑی شائستگی کے ساتھ اپنا تعارف بھی کروا دیا تھا اور اپنا مدعا بھی ظاہر کر دیا تھا۔

''ہاں تو بیٹے...... کیا تھا تمہارا سوال؟'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

''یہ بتائیں کہ محبت کیا ہوتی ہے؟'' اسلم نے اپنا سوال دہرایا۔ ''کیا یہ انسان کے اندر ہوتی ہے یا باہر کہیں پائی جاتی ہے؟''

''جزاک اللہ۔ بہت اچھا سوال ہے تمہارا۔'' مولوی صاحب نے کہا۔ ''تم نے جو سوال کیا ہے، وہ اس جذبے کے بارے میں ہے جس جذبے کی وجہ سے یہ کائنات بنی ہے۔''

''مولوی صاحب! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔'' گاؤں کا ایک شخص جز بز سا ہو گیا۔ ''یہ تو کوئی اچھی چیز نہیں ہے اور یہ کائنات اور یہ دنیا تو ہمارے نبی ﷺ کی وجہ سے بنائی گئی ہے۔''

''تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ نبیؐ کی وجہ سے اس لیے بنائی گئی کہ مالک کائنات نے نبیؐ سے بے پناہ محبت کی ہے اور اپنے محبوب ﷺ کے لیے اس نے پوری کائنات، پھولوں، دریاؤں، پہاڑوں اور آبشاروں سے سجا دی۔ اتنی سجاوٹ تو اس کے لیے ہوتی ہے نا جس سے بے پناہ محبت کی جائے۔''

''جزاک اللہ...... سبحان اللہ۔'' ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

''مولوی صاحب! یہ تو عشق اور محبت کا بہت اعلیٰ مقام ہے۔'' اسلم نے کہا۔ ''میں تو اس محبت کی بات کر رہا ہوں جو ایک انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے۔''

''نوجوان، میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔'' مولوی صاحب مسکرائے۔ ''اب ایک بات یہاں یہ جان لو کہ محبت کوئی اختیاری فعل نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم کسی کے سر پر ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جاؤ اور کسی کی طرف اشارہ کر کے کہو کہ اس سے محبت کرو۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا اور ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ تم کسی سے یہ کہو کہ فلاں سے محبت نہ کرو۔ یہ ناممکن ہے۔ محبت کی نہیں جاتی بلکہ یہ تو ہو جاتی ہے۔ محبت فطرت کا ایک روپ ہے۔ اس روپ میں ہر حال میں سلامت رہنا چاہیے۔''

''تو پھر ہمارے یہاں بہت سے لوگ اس محبت کو برا کیوں سمجھتے ہیں؟'' اسلم نے پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ ایک تو وہ محبت کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اور دوسری طرف اس جذبے کی پاکیزگی کو نہیں سمجھ پاتے۔ وہ محبت کا اظہار اپنے جسم سے کرنا چاہتے ہیں اور یہیں سے خرابیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔''

''اور اگر محبت میں کسی قسم کا جسمانی اظہار نہ ہو تو؟''

''پھر تو...... ایسی محبت بہت مبارک ہوتی ہے۔'' مولوی صاحب نے کہا۔

''مولوی صاحب! گستاخی معاف...... کیا آپ نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟''

مولوی صاحب کے ساتھ ساتھ وہاں موجود دوسرے لوگ بھی پہلو بدل کر رہ گئے۔ ویسے ان سبھی کو آج کی باتوں میں بہت مزہ آ رہا تھا۔

آج تک کسی نے بھی مولوی صاحب سے اس قسم کی باتیں کرنے اور اس قسم کے سوالات کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ وہ بے چارے تو مولوی صاحب کی باتیں سن کر صرف گردنیں ہلا کر رہ جاتے۔ ان میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ وہ مولوی صاحب سے ایسی باتیں پوچھیں۔

''ہاں، میں نے بھی محبت کی ہے۔'' کچھ دیر بعد مولوی صاحب کی آواز گونجی۔ ''محبت تو انسان کی ضرورت ہے۔ وہ محبت نہ کرے تو گھٹ کر مر جائے۔''

☆☆☆

محبت کے لیے دو باتیں ضروری تھیں۔ پہلی بات تو یہی تھی کہ محبت انسان کی ضرورت تھی۔ وہ اگر محبت نہ کرتا تو گھٹ کر مرجاتا اور دوسری اہم بات یہ تھی کہ محبت کے لیے جسمانی اظہار ضروری نہیں تھا۔

اسلم نے اپنی محبت میں ان دونوں کا خیال رکھا تھا۔ اس نے شہر میں تعلیم پائی تھی۔ وہ جس ماحول میں تھا، وہاں لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ لڑکیاں اس کے اردگرد رہا کرتیں لیکن اس نے نہ جانے کس کے لیے اپنے آپ کو اور اپنی محبت کو بچا کر رکھا ہوا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آخر کیوں؟ وہ شہر میں رہ کر کسی سے انوالو کیوں نہیں ہوا؟

یہ بات گاؤں واپس آکر پتا چلی تھی۔ وہ آٹھ برسوں کے بعد واپس آیا تھا۔ ان آٹھ برسوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا اور وہ بھی بدل چکی تھی جس کو قدرت نے اس کی محبت کے لیے تیار کیا تھا۔ وہ دین محمد کی بیٹی تھی...... ناجو۔

دین محمد گاؤں کا دکاندار تھا۔ اچھی خاصی بڑی دکان تھی اس کی۔ اسلم کو یاد تھا کہ جب وہ چھوٹا سا تھا اس وقت بھی وہ دین محمد کی دکان کو دیکھا کرتا۔ اس وقت بھی وہ دکان بہت چلتی تھی اور آج بھی اس کی دکان میں رش لگا رہتا تھا۔

اسلم کو دین محمد کی دکان سے زیادہ اس کی شوخ سی بیٹی ناجو یاد تھی جو گاؤں کی گلیوں میں اچھلتی کودتی پھرا کرتی اور اسلم کو چھیڑا کرتی۔ اسلم اس زمانے میں بہت دبلا پتلا اور سیدھا سادہ ہوا کرتا تھا لیکن یہ باتیں آٹھ برس پہلے کی تھیں۔

جانے کیوں ان آٹھ برسوں میں وہ ناجو کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکا تھا۔ شہر کے ہنگاموں میں بھی وہ اس کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ اس کی آواز اس کے کانوں میں گونجا کرتی اور جب وہ آٹھ برسوں کے بعد واپس آیا تو ناجو کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ تو کچھ اور ہی ہوگئی تھی۔ پہلے وہ ایک چھوٹی سی گڑیا تھی اور اب وہ ایک بڑی سی بے بی ڈول تھی۔

ہوسکتا تھا کہ گاؤں کے نوجوانوں نے اس کو دیکھ کر آہیں بھی بھری ہوں۔ اس کو اشارے بھی کیے ہوں، اس کے قریب ہونے کی کوشش بھی کی ہو لیکن اس نے بھی اپنے آپ کو بچا کر رکھا تھا۔ شاید اسلم کے لیے......

ہوسکتا ہے کہ اسلم اسے یاد ہی نہ ہو۔ اتنے دنوں تک کوئی کیسے یاد رکھتا ہے۔ لیکن جب آٹھ برسوں کے بعد دونوں ایک دوسرے کے سامنے آئے تو انہیں تعارف کروانے کی ضرورت ہی نہیں ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔

''تم...... تم ناجو ہو نا؟'' اسلم نے پوچھا۔

''اور تم اسلم ہو نا؟''

''ہاں، میں اسلم ہی ہوں۔''

گاؤں میں یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد ملاقاتیں ہونے لگیں۔ کبھی دکان پر، کبھی پرانے کنویں کے پاس، کبھی کھیتوں کے درمیان...... اور کبھی کسی درخت کے نیچے۔

وہ اس بات کو تو جانتے تھے کہ ان کے درمیان ایک ایسی محبت کا کھیل شروع ہوچکا ہے جس میں آنکھیں بند کرلی جاتی ہیں اور خوابوں کو زندگی سمجھ لیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ جس ماحول میں محبت کی روایت تازہ کررہے ہیں، اس ماحول میں محبت اتنی مضبوط روایت نہیں ہے بلکہ پرانے سخت اور بے رحم قسم کے اصولوں کی اہمیت ہے۔ وہ جب ایک دوسرے سے ملتے تو وقت کی روانی میں تیزی آجاتی۔ انہیں احساس نہیں ہوتا کہ انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر کتنے لمحے گزار دیے ہیں۔

وہ صرف ایک دوسرے کی محبت کو محسوس کرتے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہتے۔ اس وقت انہیں ہر طرف سے ہواؤں کی سرگوشیاں سنائی دیتیں۔ یہ ہوائیں مبارک باد دیتیں کہ انہوں نے محبت حاصل کرلی ہے۔ محبت جو ایک مضبوط جذبہ ہے۔ ایک اعلیٰ وارفع جذبہ ہے۔ ان دونوں کا تعلق دو مختلف خاندانوں اور برادری سے تھا اور پرانی روایتوں اور رسومات کے مطابق یہ خاندان آپس میں نہیں مل سکتے تھے۔ ان کے یہاں محبت اور پیار وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ دونوں کو ہر وقت بچھڑ جانے کا دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ خاص طور پر ناجو کو...... وہ بہت پریشان رہتی۔ اس کے برعکس اسلم بہت پُرامید تھا۔ نہ جانے کیوں، اسے یہ اطمینان تھا کہ وہ جلد یا بدیر ناجو کو حاصل کرلے گا۔ مگر کس طرح...... اس بات کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

وہ ناجو سے یہی کہا کرتا۔ ''نہ جانے کیوں مجھے اطمینان ہے کہ ہم ایک ہوجائیں گے۔''

''لیکن کس طرح، ہمارا خاندان تو ایک دوسرے کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔''

''بالکل سب کچھ ایسا ہی ہے۔ اس کے باوجود کوئی میرے کانوں میں کہتا ہے کہ پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا اور اس کے بعد مجھے سکون سا مل جاتا ہے۔''

گاؤں میں آنے کے بعد اسلم نے ایک نئے مولوی کی خبر سنی۔ وہ اس گاؤں کی مسجد میں نیا نیا آیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کے بارے میں بتاتے تھے کہ وہ بہت قابل انسان ہے۔ اس کی باتیں دل میں اتر جاتی ہیں۔ وہ دوسرے مولویوں سے بالکل الگ ہے وغیرہ وغیرہ......

اسلم کو ایسی باتوں پر یقین نہیں تھا۔ یہ بے چارے سیدھے سادے لوگ کسی کی علمیت کا کیا اندازہ لگا سکتے تھے۔

ایک بار مغرب کی نماز کے وقت وہ خود مسجد میں پہنچ گیا۔ اس دن مولوی صاحب عشق اور محبت کے حوالے سے باتیں کر رہے تھے اور اس دن اسلم کو احساس ہوا کہ یہ مولوی صاحب کوئی عام آدمی نہیں ہیں۔

مولوی صاحب نے محبت کی بات کی تھی کہ یہ کوئی گناہ نہیں تھا۔ کوئی جرم نہیں تھا۔ خدا نے انسان سے محبت کی تھی اس لیے اس نے پوری کائنات کو سجا دیا۔

سجاوٹ تو اس کے لیے کی جاتی ہے جس سے محبت ہوتی ہے۔ جن سے نفرت یا بیزاری ہو ان کے لیے سجاوٹ کہاں ہوتی ہے۔ اس لیے اسلم اور ناجو کوئی گناہ نہیں کر رہے تھے بلکہ محبت کے راستے اپنی تکمیل کے مراحل طے کر رہے تھے۔ کوئی گناہ نہیں تھا۔ کوئی جرم نہیں تھا تو پھر یہ سب کیا تھا؟ یہ خونخوار غصے بھری آنکھوں والے لوگ کون تھے جنہوں نے ان دونوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ناجو کو زبردستی اٹھا کر اس کے گھر پہنچا دیا گیا تھا جبکہ اسلم کو بری طرح مارا جا رہا تھا۔ ٹھوکروں سے، تھپڑوں سے، گھونسوں سے۔

اس وقت بھی وہ دونوں اپنے ماحول سے بے خبر ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ جب کسی نے گاؤں والوں کو خبر دے دی اور کچھ ہی دیر میں بہت سے لوگ ان کے اردگرد جمع ہو گئے۔

''مار و ان کو...... ٹکڑے کر دو۔''

''یہیں مار کر کھیت میں دبا دو۔''

طرح طرح کی آوازیں تھیں۔ پھر کسی کے کہنے پر ناجو کو اس کے گھر پہنچا دیا گیا اور اسلم کو ایک کوٹھری میں بند کر کے پہرے لگا دیے گئے۔

یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ یہ دونوں کاروکاری ہیں اور پنچایت میں ان کی قسمتوں کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اسلم اگرچہ بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ اس کے زخموں سے خون رس رہا تھا۔ اس کے باوجود ہوائیں سرگوشیوں میں اسے بتا رہی تھیں۔ ''مبارک ہو کہ تم اپنی منزل کے قریب ہو۔ ثابت قدم رہو کہ تمہارا کچھ نہیں ہوگا۔ قدرت کا فیصلہ گاؤں والوں کے فیصلے سے بالکل مختلف ہے۔''

اس کو مارتے پیٹتے ہوئے لانے والے یہ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔ ویسے تو وہ ٹوٹ پھوٹ چکا تھا لیکن اس کے وجود میں توانائی موجود تھی۔

اسے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا لیکن اسے اپنے آپ سے زیادہ ناجو کی فکر تھی۔ وہ ایک کمزور لڑکی تھی۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ کس طرح سب کے سامنے کھڑی ہوگی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں سے کوئی غیرت کے نام پر اس کا خون ہی کر دے۔ ان علاقوں میں اس قسم کی وارداتیں تو بہت عام تھیں۔ کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا تھا۔ کوئی کیس نہیں بنتا تھا۔ کسی کو کوئی سزا نہیں ہوتی تھی۔ کچھ بھی نہیں ہوتا اور دو محبت کرنے والوں کی کہانی خاموشی سے ختم ہو جاتی ہے۔ وہ رات اسلم کے لیے بہت کرب کی رات تھی۔ جو کسی نہ کسی طرح گزر رہی گئی تھی۔

☆☆☆

دوسری شام کو وہ بہت سے لوگوں کے درمیان تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس کی اور ناجو کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ ان لوگوں میں گاؤں کے بزرگوں کے علاوہ، بھڑکے ہوئے ایسے نوجوان بھی تھے جو ناجو کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہے ہوں گے۔ گاؤں کا بڑا آدمی تھا۔ یہ وہ آدمی تھا جس نے خود کبھی محبت نہیں کی تھی اور وہ دوسروں کو بھی اس کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا۔

اس آدمی نے نفرتوں کے درمیان آنکھیں کھولی تھیں اور اس نے انہی نفرتوں کو اپنا سایہ بنا رکھا تھا اور بس کچھ ایسے لوگ تھے جو تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔

جرم یہ سنا دیا گیا تھا...... گناہ یہ تھا کہ اسلم نام کے ایک نوجوان نے ناجو نام کی ایک لڑکی کے ساتھ نفرتوں کے ماحول میں پیار کرنے کی کوشش کی تھی اور اس سے پہلے کہ فیصلہ سنایا جاتا اسلم بول پڑا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ مجھے تم لوگوں نے مجرم سمجھ لیا ہے لیکن اگر تم لوگ واقعی سچے دل سے انصاف کرنا چاہتے ہو تو میری ایک بات کا جواب دو۔ اس کے بعد تم جو بھی سزا دو گے، مجھے منظور ہوگی۔''

ایسا شاید پہلی بار ہوا ہوگا کہ کسی مجرم نے پنچایت سے کوئی سوال کرنے کی ہمت کی ہوگی۔ ورنہ عام طور پر تو ایسے مجرم روتے اور گڑگڑاتے ہی رہتے تھے۔ اس لیے لوگوں کے لیے یہ بھی دلچسپی کا سبب بن گیا تھا کہ مجرم کیا پوچھنا چاہتا ہے۔

’’ہاں ، بتا کیا بات ہے...... کیا پوچھنا ہے تجھے؟‘‘ گاؤں کا بڑا آدمی بول پڑا۔

’’مجھے جو لوگ پکڑ کر لائے ہیں، ذرا ان سے یہ پوچھو کہ انہوں نے ہم دونوں کو کس حال میں پکڑا تھا۔ کیا ہم ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے یا ہم ایک دوسرے سے الگ الگ بیٹھے تھے۔‘‘

’’چلو بتاؤ۔‘‘ بڑے نے پکڑ کر لانے والوں سے پوچھا۔

’’الگ الگ بیٹھے تھے۔‘‘ ان میں سے ایک نے بتایا۔

’’اور اب دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا گاؤں کی ہر لڑکی پردہ کرتی ہے؟‘‘ اسلم نے پوچھا۔

’’نہیں، کوئی پردہ نہیں کرتی۔‘‘

’’کیا لڑکا اور لڑکی، مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے سامنے نہیں آتے ہیں؟ گلیوں میں، بازاروں میں، دکانوں پر، بلکہ کھیتوں میں تو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ کیا ایسا ہوتا ہے یا نہیں؟‘‘

’’ہاں ہوتا تو ایسا ہی ہے۔‘‘ کسی نے کہا۔

’’پھر اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس گاؤں کا ہر آدمی کارو اور ہر عورت کاری ہے۔‘‘

گاؤں کا بڑا اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا۔ اس نوجوان نے کیسی بات کہہ دی تھی۔ واقعی یہاں کے مرد اور عورتیں تو ایک دوسرے کے سامنے آتے ہی رہتے تھے۔ ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرتے۔ سلام دعا کرتے۔ اس کا مطلب یہ کہاں سے ہوتا تھا کہ وہ گناہ گار بھی ہیں۔

اچانک گاؤں کا ایک نوجوان بول پڑا۔ ’’بات سن...... یہ ہم سب گاؤں والوں کی آپس کی بات ہے۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اسی لیے اگر راستے میں بات بھی کرلیں تو بھی ایسی کوئی کہانی نہیں ہوتی۔‘‘

’’شاید تم یہ بھول گئے کہ میرا تعلق بھی اسی گاؤں سے ہے۔‘‘ اسلم نے کہا۔ ’’میں اسی گاؤں میں پیدا ہوا اور صرف آٹھ برس پہلے ہی یہاں سے باہر گیا ہوں۔ تم لوگوں نے جس لڑکی کے لیے مجھ پر الزام لگایا ہے، میں اس کو بچپن سے جانتا ہوں۔ اگر میں نے راستے میں اس سے ملاقات کرلی یا اس سے باتیں کرلیں تو کیا اس میں کوئی برائی ہے؟‘‘

وہ لوگ خاموش ہوگئے۔ اسلم نے بہت خوب صورتی سے اپنا اور اپنی محبت کا دفاع کیا تھا۔

’’چلو مان لیا کہ تم یہاں کے لیے اجنبی نہیں ہو۔ تم اس لڑکی کو اس کے بچپن سے جانتے ہو...... تو قسم کھا کر بتاؤ کہ تم اس سے محبت نہیں کرتے۔‘‘

’’میں اس کی قسم کبھی نہیں کھاؤں گا کیونکہ اس سے محبت کرتا ہوں۔‘‘ اسلم نے جواب دیا۔

ایک بار پھر سناٹا طاری ہوگیا۔ لوگوں کے چہروں کی سختیاں اور بڑھ گئی تھیں۔

’’تو بات وہی ہوئی نا۔‘‘

’’نہیں۔ بات یہ نہیں ہوئی۔‘‘ اسلم نے کہا۔ ’’کیونکہ میں برملا کہہ رہا ہوں کہ میں نے اس سے محبت کی ہے اور محبت کوئی جرم نہیں ہے۔‘‘

’’بکواس نہیں کرو۔‘‘ کسی نے چلا کر کہا۔ ’’یہ ہمارے یہاں جرم ہے۔‘‘

اس آواز میں اور آوازیں بھی شامل ہوگئیں۔ اسلم

معاوضہ

مصنف بننے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے ایک نوجوان نے ایک روز اپنے دوست کے پاس پہنچ کر خوشی سے نعرہ لگاتے ہوئے کہا۔

’’آخرکار مجھے اپنی ایک کہانی ’’دلِ ناداں‘‘ کے عوض ایک ہزار روپیا مل ہی گیا۔ قلم کے ذریعے یہ میری پہلی کمائی ہے۔‘‘

’’کس رسالے نے دیا ہے یہ معاوضہ؟‘‘ دوست نے حیرت سے پوچھا۔

’’رسالے نے نہیں، یہ پیسے کوریئر سروس والوں نے ہرجانے کے طور پر دیے ہیں۔ انہوں نے میری کہانی کا مسودہ گم کردیا ہے۔‘‘ نوجوان نے بتایا۔

☆☆☆

تھپڑ

فلم شو کے دوران ہیرو نے اچانک ہیروئن کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ ہال میں مکمل سناٹا چھا گیا اور ہیروئن نے سسکیاں لے کر رونا شروع کردیا۔ سناٹے سے کسی بچے کی آواز ابھری جو اپنی ماں سے کہہ رہا تھا۔ ’’امی! یہ بھی کیوں نہیں چانٹا ماردیتی جیسا آپ کرتی ہیں۔‘‘

☆☆☆

نے اب تک جو بھی کہا تھا، اس کا اثر زائل ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

تنے ہوئے سخت چہرے، شعلے اگلتی ہوئی آنکھیں۔ ان خونخوار آنکھوں میں دو آنکھیں ناجو کے باپ کی بھی تھیں جو کھا جانے والی نگاہوں سے اسلم کو دیکھ رہا تھا اور اسی وقت ہلچل سی مچ گئی۔ مولوی صاحب مسجد سے نکل کر اس پنچایت میں آگئے تھے۔ پہلا موقع تھا کہ مولوی صاحب اس طرح کسی گھر میں آئے ہوں۔ ورنہ وہ اپنی مسجد سے باہر کہاں نکلتے تھے۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ انہیں دیکھ کر ادب سے خاموش ہو گئے تھے۔

انہوں نے ایک نظر سب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں بھائی، کیا ہو رہا ہے' یہاں؟''

''مولوی صاحب یہ بہت سنگین مسئلہ ہے۔'' کسی نے کہا۔

''کیا مسئلہ ہے؟''

''مولوی صاحب! یہ آدمی گاؤں کی ایک لڑکی سے محبت کی بات کرتا ہے۔'' کسی نے اسلم کی طرف اشارہ کیا۔

''کیوں بھائی، کیا سن رہا ہوں میں؟'' مولوی صاحب نے اسلم سے پوچھا۔

مولوی صاحب کو وہاں دیکھ کر اسلم کو شاید حوصلہ مل گیا تھا۔ ''جی جناب! میں نے اس لڑکی سے محبت کی ہے۔'' اسلم نے بتایا۔ ''اور اس محبت میں جسم کے اظہار کو شامل نہیں ہونے دیا ہے۔''

''اور یہ محبت کتنے دنوں کے لیے ہے؟'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

''زندگی بھر کے لیے ہے جناب'' اسلم نے کہا۔ ''کیونکہ کچھ محبتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے لیے آسمانوں پر فیصلے ہو جاتے ہیں۔''

''مبارک ہو۔'' مولوی صاحب نے اپنی گردن ہلائی۔ ''خدا کرے تم اپنے ارادوں پر قائم رہو۔''

''مولوی صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' ناجو کا باپ کھڑا ہو گیا۔ ''یہ تو بالکل الٹی بات ہے۔''

''الٹی بات نہیں ہے بے وقوف...... سیدھی بات ہے۔'' مولوی صاحب نے کہا۔ ''جتنے لوگ بھی یہاں بیٹھے ہیں، ان سے میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں...... صرف ایک بات۔''

''جی پوچھیں، کون سی بات؟''

''کسی کی جب شادی ہوتی ہے تو اس وقت نئے جوڑے کے لیے کون سی دعائیں مانگی جاتی ہیں؟'' مولوی صاحب نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مولوی صاحب! یہ تو سب کو معلوم ہے کہ کیا دعائیں ہوتی ہیں۔'' ناجو کے باپ نے کہا۔

''وہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کیا دعائیں ہوتی ہیں؟''

''یہی کہ اللہ دونوں کے درمیان محبت پیدا کرے۔''

''مبارک ہو کہ تمہاری آدھی دعا تو شادی سے پہلے پوری ہو چکی ہے۔'' مولوی صاحب نے کہا۔ ''کیونکہ دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ ایک مضبوط محبت کیونکہ میں نے اس نوجوان کی آنکھوں میں سچائی دیکھ لی ہے۔ اب صرف شادی ہونا باقی ہے۔ محبت والی دعا مولا سائیں نے قبول کرلی ہے۔ کیا مولا سائیں کے فیصلے پر کسی کو اعتراض ہے؟''

مولوی صاحب نے چاروں طرف دیکھا۔ سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ تنے ہوئے چہرے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اسی وقت مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی۔

''یہ لو بھائی، میرو نے اذان دینی شروع کردی ہے۔'' مولوی صاحب نے کہا۔ ''تم لوگ اپنے ایمان اور انصاف کی روشنی میں خود فیصلہ کرلو اور رسم و رواج پر مت جاؤ کیونکہ تم اگر اپنے نبی ﷺ کو ماننے والے ہو تو یاد رکھو وہ ایسی ہی رسموں کو مٹانے کے لیے دنیا میں تشریف لائے تھے۔ اب یا تو ان کی اور مولا سائیں کی بات مانو یا پھر اپنے پرانے اور جہالت والے اصولوں کی بات کرلو۔ میں تو چلتا ہوں...... اور ہاں، ایک بات اور میں نے ایک بار تم لوگوں کو یہ بتایا تھا کہ میں نے بھی محبت کی ہے۔ تو چلو، آج یہ راز بھی بتا دوں کہ میں نے کس سے محبت کی ہے۔ میری محبت اس مولا سائیں سے ہے جو اپنی عبادت کے لیے مجھے مسجد کی طرف بلا رہا ہے۔ تم میں سے بھی جو میرے ساتھ آنا چاہے تو آجائے۔''

ناجو کے باپ نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ اسلم کی طرف بڑھا دیا۔ ''چلو بیٹے، مسجد کی طرف چلتے ہیں۔''

اسلم نے ناجو کے باپ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اب بہت سے لوگ مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ مولوی صاحب سب سے آگے تھے اور ان کے پیچھے وہ لوگ تھے جن کی گردنیں کچھ دیر پہلے تنی ہوئی تھیں لیکن اب وہ سب جھکی گردنوں اور تیز قدموں کے ساتھ مسجد کی طرف جا رہے تھے اور ان کے درمیان اسلم چل رہا تھا...... جس کا ایک ہاتھ ناجو کے باپ نے تھام رکھا تھا۔

شیخ نجیب الدین متوکل

ضیا تسنیم بلگرامی

کچھ لوگ زمین پر اتنے خوش قسمت اتارے گئے ہیں کہ ان کے بارے میں سوچ کر انسان ششدر رہ جاتا ہے۔ جیسے کہ بی بی قرسن خاتون... جن کا زہد و تقویٰ بہت مشہور تھا جن کے تین بیٹے تھے اور تینوں اللہ کے برگزیدہ بندے... سبحان اللہ... انہی میں شیخ نجیب الدین بھی شامل تھے جو تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہوئے اپنے منجھلے بھائی بابا فرید گنج شکر سے بیعت ہوئے اور متوکل کا خطاب پایا۔ وہ کتنی خوش قسمت ماں تھیں جن کے بیٹوں کے نام سلسلۂ بزرگان دین میں ستاروں کے مانند روشن ہوئے۔

اللہ پر توکل کرنے والے ایک متوکل ولی کی مستقل مزاجی



کابل پر فرخ شاہ کی حکومت تھی۔ شب و روز شان و شوکت سے گزر رہے تھے۔ شاہی خاندان اپنے اقتدار اور جاہ و ثروت کو اپنے لیے دائمی سمجھتا تھا مگر کارکنانِ قضا و قدر نے غزنوی خاندان کو اقبال اور اقتدار کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ فرخ شاہ سے زمامِ حکومت چھین کر سبکتگین کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ فرخ شاہ اپنے خاندان کے ساتھ گمنامی میں چلا گیا۔ ان حالات میں عام طور پر لوگ جلاوطن ہو جانا اپنی تقدیر سمجھتے ہیں لیکن فرخ شاہ نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے خدا کے فیصلے کو خندہ پیشانی سے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

قبول کر لیا اور کابل ہی میں رہائش برقرار رکھی۔ سابق شاہی خاندان اپنی قسمت پر شاکر رہا۔ یہاں تک کہ غزنویوں کا اقتدار بھی چھن گیا اور چنگیز خان نے صحرائے گوبی کو عبور کر کے مشرق اور مغرب کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ کابل بھی اس سے متاثر ہوا اور ہر طرف تباہی و بربادی نے ڈیرا ڈال دیا۔ وہ خاندان جس کو غزنویوں کا اقتدار متزلزل نہیں کر سکا تھا، چنگیز خانی سیلاب نے ہلا کر رکھ دیا۔ ان لوگوں نے کابل سے ہجرت کی اور لاہور چلے آئے۔ لاہور کچھ دن رہے اور پھر قصور کا رخ کیا۔ قصور کا قاضی اس خاندان کی عظمت اور شاندار ماضی سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے اس خاندان کی سفارش برصغیر کے بادشاہ سے کی اور بادشاہ نے اس خاندان کے قاضی شعیب فاروقی کو ٹیسوال کا قاضی مقرر کر دیا۔ قاضی شعیب فاروقی نے یہیں شادی کی اور ان سے خاندان کا سلسلہ چل نکلا۔ ان کے ایک بیٹے کا نام شیخ جمال الدین سلیمان تھا۔ جب شیخ جمال سن شعور کو پہنچا تو ان کے باپ نے ان کی شادی مولانا وجیہہ الدین خجندی کی صاحبزادی بی بی قرسن خاتون سے کر دی۔ بی بی قرسن خاتون کا زہد و تقویٰ بہت مشہور تھا، لوگ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔

شادی کے بعد شیخ جمال الدین سلیمان نے اپنی بیوی میں کیا دیکھا؟ شاید ان کی زبان اس کے بیان پر قادر نہ تھی۔ شوہر نے اپنی بیوی کو صوم وصلوٰۃ کا حد درجہ پابند دیکھا۔ وہ ہر وقت باوضو رہتیں اور اپنی زبان کی حفاظت فرماتیں۔

اندھیری رات تھی، رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ پورا محلہ بلکہ پورا قصبہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں صاف آ رہی تھیں۔ اسی عالم میں ایک چور نے بی بی قرسن خاتون کے گھر کا انتخاب کیا۔ آپ اس وقت بھی محوِ عبادت تھیں۔ آپ جس حصے میں نمازِ تہجد ادا فرما رہی تھیں چور اس طرف گیا اور جھانک کر آپ کو دیکھنا چاہا مگر اس کو اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا اور بینائی جواب دے گئی۔ اس کی دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر بصارت کام نہیں کر رہی تھی۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے مگر ناکام رہا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا اور پورے وجود میں دہشت دوڑ گئی۔ جب وہ بالکل مایوس ہو گیا تو اس نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ”اہلِ خانہ! میں نہیں جانتا کہ یہ کس کا گھر ہے اور اس میں کس اللہ والے نے اپنے تقدس کا سایہ ڈال رکھا ہے۔ میں اس گھر میں چوری کی نیت سے داخل ہوا تھا لیکن میں اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ اب میں کسی نادیدہ غیر مرئی عظمت اور تقدس کا شکار ہو چکا ہوں۔ میری بینائی چلی گئی اور میں اس لائق بھی نہیں رہ گیا کہ راستہ تلاش کر کے مکان سے باہر جا سکوں۔ بھگوان کے لیے مجھ پر رحم کیجیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میری بینائی واپس آ گئی تو میں چوری کے پیشے سے ہمیشہ کے لیے تائب ہو جاؤں گا۔“

آپ نے چور کی آواز سنی مگر آپ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آپ نے چور کے حق میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

”مولا! یہ شخص بشریت کا شکار ہو گیا ہے، اس پر رحم فرما دے اور اس کی بینائی واپس فرما دے۔ میں اس وقت تک سجدے میں پڑی رہوں گی، جب تک تو میری درخواست پر توجہ نہیں فرمائے گا۔ متقی اور پرہیزگار تیرے الطاف و اکرام کے مستحق ہوتے ہی ہیں، یہ گناہ گار کہاں جائیں اے اللہ! ان پر رحم فرما۔“

آپ سجدے میں پڑی گڑگڑا رہی تھیں۔ چور نے اپنی بینائی کو بحال ہوتے محسوس کیا، ذرا سی دیر میں وہ اس لائق ہو چکا تھا کہ سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ وہ اب بھی اتنا خوفزدہ اور مرعوب تھا کہ بہ آوازِ بلند عرض کیا۔ ”صاحبانِ خانہ! میں نہیں جانتا کہ میری بینائی کیوں چلی گئی تھی اور پھر واپس کیونکر آ گئی لیکن میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اس وقت تو میں جا رہا ہوں لیکن بھگوان نے چاہا تو صبح پھر حاضری دوں گا اور اپنی توبہ کا ایک بار پھر اعلان کروں گا۔“

اس وقت تو چور چلا گیا لیکن دوسرے دن صبح دوبارہ آ گیا اور آپ کے در پر دستک دی۔

آپ نے آڑ سے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

چور نے جواب دیا۔ ”میں ہوں گنگا پرشاد۔ میں رات کو چوری کی نیت سے اس گھر میں داخل ہوا تھا مگر میری بینائی چلی گئی تھی۔ میں اسی وقت کسی حد تک اس راز سے واقف ہو چکا تھا پھر میری بینائی واپس آ گئی اور اب میں حسبِ وعدہ واپس آ چکا ہوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تیرا توبہ کر کے ارادتاً یہاں تک آ جانا ہی بہت اچھا ہے، میں خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ تیری اصلاح کرے اور تجھے صحیح راستے پر ڈال دے تاکہ تو کل قیامت کے دن لوگوں کے سامنے شرمندہ نہ ہو۔“

چور نے پوچھا۔ ”میرے لیے کیا حکم ہے؟ میں اپنی رات والی حرکت پر بہت زیادہ نادم ہوں۔ میں اپنے خاندان کے ساتھ مسلمان ہو جانا چاہتا ہوں، کہیے کیا حکم ہے؟“

آپ نے اس چور کو اس کے خاندان کے ساتھ مسلمان کرلیا اور اس کے حق میں بڑی دعا کی۔

ان خاتون کو خدا نے تین بیٹے دیے۔ ایک کا نام رکھا گیا اعزالدین محمود۔ یہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ دوسرے کا نام رکھا گیا فریدالدین مسعود۔ یہ مجھلے تھے اور بعد میں بابا فریدالدین گنج شکر ہو گئے۔ سب سے چھوٹے بیٹے کا نام رکھا گیا نجیب الدین، یہ بعد میں نجیب الدین متوکل ہو گئے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت عمر بن الخطابؓ سے مل جاتا تھا۔

یہ تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہوئے اپنے منجھلے بھائی بابا فرید گنج شکر سے بیعت ہو گئے۔ ان دنوں دہلی میں دور دور سے بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام تشریف لایا کرتے تھے۔ ان میں بابا فرید گنج شکر کا نام بھی شامل تھا۔ ان کے ساتھ نجیب الدین بھی ہوتے تھے۔ ان دونوں کو دہلی آئے ہوئے کئی مہینے گزر چکے تھے۔ آخر بابا فریدالدین نے واپسی کے لیے اپنا سامان سنبھالا۔ نجیب الدین بھی ان کے ہم رکاب تھے۔ بابا فرید نے انہیں تیار جو دیکھا تو مسکرا کر پوچھا۔ ’’نجیب الدین! کہاں...... کیا ارادے ہیں؟‘‘

نجیب الدین نے جواب دیا۔ ’’بھائی! میرا کیا ارادہ؟ میں تو آپ کا تابع ہوں۔ جہاں لے جائیں گے، چلا جاؤں گا۔‘‘

بابا فرید نے فرمایا۔ ’’نجیب الدین! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تم دہلی ہی میں رہو، تم یہیں رک جاؤ۔‘‘

نجیب الدین نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ ’’جیسا آپ کا حکم، مجھے کیا انکار ہوسکتا ہے۔‘‘

بابا فرید مسکرائے، فرمایا۔ ’’بھائی نجیب الدین! تم دہلی میں کس طرح رہو گے؟ یہاں تمہارا ذریعۂ معاش کیا ہوگا؟‘‘

انہوں نے جواب دیا۔ ’’میں کیا جانوں کہ میرا ذریعۂ معاش کیا ہوگا۔‘‘

بابا فرید نے فرمایا۔ ’’پھر بھی...... یہ دہلی ہے، ایک بڑا شہر ہے، یہاں جب تک ذریعۂ معاش قابلِ اطمینان نہ ہو، آدمی کس طرح عزت دار زندگی گزارے گا؟‘‘

انہوں نے جواب دیا۔ ’’بھائی صاحب! میں نے اللہ پر توکل کیا، میرے لیے یہی کافی ہے۔‘‘

بابا فرید نے دعائیہ انداز میں فرمایا۔ ’’خدا تمہیں متوکل کرے۔‘‘

اس طرح نجیب الدین متوکل ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے متوکل کہلائے۔ آپ نے دہلی میں جس جگہ قیام فرمایا تھا، وہیں ایتمر نامی ایک ترک رہتا تھا۔ اس ترک نے یہاں ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی اور مسجد کے پہلو میں ایک مکان بھی تعمیر کرا دیا۔ جب یہ سارا کام مکمل ہو گیا تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ ’’حضرت! میں ایک درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں۔ کیا آپ اس پر توجہ فرمائیں گے؟‘‘

آپ نے جواب دیا۔ ’’اگر وہ اس لائق ہوئی کہ اس پر توجہ دی جائے تو میں ضرور توجہ دوں گا۔‘‘

ایتمر ترک نے عرض کیا۔ ’’حضرت! میری خواہش ہے کہ اس مسجد کی امامت آپ فرمائیں۔ مسجد سے ملحقہ مکان آپ کی رہائش کے لیے حاضر ہے۔‘‘

آپ نے فرمایا۔ ’’اس نیک کام سے میں کس طرح انکار کرسکتا ہوں، مجھے منظور ہے۔‘‘

ترک نے کہا۔ ’’مسجد کی طرف سے میں ماہانہ ہدیہ بھی پیش کر دیا کروں گا۔‘‘

آپ کے معاملات طے پا گئے اور آپ مسجد والے مکان میں منتقل ہو گئے اور مسجد میں فرائضِ امامت انجام دینے لگے۔ یہ سلسلہ کئی سال جاری رہا۔ ترک آپ سے بے حد خوش تھا اور علاقے کے لوگ بھی بہت زیادہ مطمئن نظر آتے تھے۔

اسی دوران ایتمر نامی ترک ایک بار پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ ’’بابا! عنقریب میری بیٹی کی شادی ہونے والی ہے، میری خواہش ہے کہ اس میں آپ بھی شرکت فرمائیں۔‘‘

آپ نے فرمایا۔ ’’واہ! میں اس میں شرکت کیوں نہیں کروں گا؟ میں اس میں ضرور آؤں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔‘‘

شادی کا دن آیا، براتیوں کا ہجوم ایسا تھا کہ پورا علاقہ میلے کا میدان بن گیا۔ آپ بھی وقت پر پہنچ گئے اور برات کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ آپ نے ہزاروں آدمیوں کو اس حال میں دیکھا کہ وہ جن برتنوں میں کھانا کھا رہے تھے، وہ برتن بھی اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ یہ سارے برتن چاندی کے تھے۔ آتش بازی نے رات کو دن میں بدل دیا تھا۔ نجیب الدین متوکل جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اس پر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایتمر ترک کو ایک کونے میں لے جا کر سوال کیا۔ ’’میاں ایتمر! میری ایک بات کا جواب دو گے؟‘‘

ایتمر ترک نے جواب دیا۔ ’’آپ جواب کی بات کر رہے ہیں، میں نے چاندی کے برتن تک براتیوں کو دے دیے۔‘‘

آپ نے پوچھا۔ ''اس تقریب پر کُل کتنا خرچہ آیا ہوگا؟''
ایتمر ترک نے جواب دیا۔ ''تقریباً ایک لاکھ بائیس ہزار تنکہ۔''
آپ نے فرمایا۔ ''میاں ایتمر! تمہارا مال ہے جس طرح چاہو خرچ کرو لیکن مومن کامل وہ ہے جس کی دوستی خدا سے ہو۔ ایسی دوستی کہ اس پر اولاد کی محبت بھی غالب نہ آسکے۔ تم نے ایک لاکھ بائیس ہزار تنکے لڑکی کی شادی پر خرچ کردیے حالانکہ یہ شادی نہایت سادگی سے بھی انجام پاسکتی تھی اور اس خطیر رقم کو خلقِ خدا کی خدمت میں صرف کیا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔''
ایتمر ترک نے گھور کر آپ کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ''اس وقت تو میں شادی میں مشغول ہوں۔ میں صبح اس موضوع پر بات کروں گا۔''
آپ اپنے گھر چلے گئے۔ صبح نمازِ فجر کے بعد ایتمر ترک آپ کے پاس پہنچا، بولا۔ ''ہاں جناب...... تو کل رات آپ کیا فرمارہے تھے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''یہ کہ مومن کامل وہ ہے جو خدا سے دوستی کرے۔ یہ رقم جو تم نے اپنی بیٹی کی شادی پر خرچ کی ہے اگر اسے یا اس میں کچھ اور ملا کر تم خدا کی مخلوق کی خدمت میں صرف کردیتے تو اس سے مخلوق بھی خوش ہوجاتی اور اللہ بھی راضی ہوجاتا۔''
ایتمر ترک نے پوچھا۔ ''تمہیں جو کچھ بھی کہنا تھا کہہ چکے یا ابھی کچھ اور بھی کہنا ہے؟''
آپ نے فرمایا۔ ''نہیں، مجھ کو اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں کہنا۔''
ایتمر ترک نے جواب دیا۔ ''اچھا اب میری سنو! اب تم میری مسجد سے نکل جاؤ اور میرا گھر بھی خالی کردو، تم حاسد معلوم ہوتے ہو۔''
آپ نے فرمایا۔ ''میں حاسد نہیں ہوں ایتمر! میں نے جو کچھ کہا ہے نصیحت اور ہدایت کے طور پر کہا ہے۔''
ایتمر نے سختی سے کہا۔ ''لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں حکماً کہہ رہا ہوں۔ تم مسجد اور گھر اسی وقت خالی کردو ورنہ مجھے سختی کرنا پڑے گی۔''
آپ نے پوچھا۔ ''کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟''
ایتمر نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ تم اسی وقت دفع ہوجاؤ۔''
آپ نے اسی وقت مکان خالی کردیا اور مسجد سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ فرصت پاتے ہی آپ نے اجودھن کا رخ کیا کیونکہ ان کے بڑے بھائی بابا مسعود گنج شکر کا اجودھن ہی میں قیام تھا۔ آپ اجودھن پاک روانہ ہوگئے اور وہاں اپنے بھائی مسعود گنج شکر کے پاس قیام فرمایا۔
بابا فرید نے پوچھا۔ ''ہاں بابا نجیب الدین! کہو، دہلی سے بال بچوں سمیت کیوں آگئے؟''
بابا نجیب نے حسرت بھری نظروں سے بھائی کی طرف دیکھا اور پورا واقعہ بتادیا۔ بابا مسعود نے قرآن پاک کی ایک آیت پڑھی جس کا ترجمہ تھا۔ ''ہم کسی آیت کو منسوخ نہیں کرتے اور نہ ہی اس کو لوگوں کے ذہنوں سے محو کرتے ہیں مگر اس سے بہتر یا اس جیسی دوسری آیت لے آتے ہیں۔''
نجیب الدین متوکل نے پوچھا۔ ''بھائی! میں کیا کروں؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''
بابا مسعود نے جواب دیا۔ ''میرا مطلب ہے کہ تم فکر نہ کرو۔ اللہ کوئی دوسری صورت پیدا کردے گا۔ یہ ایتمر تھا، خدا ایتمر کو منسوخ کر کے کوئی اینکر پیدا کردے گا۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے، تم اینکر کا انتظار کرو۔''
نجیب الدین نے عرض کیا۔ ''بھائی! میں ان باتوں سے بالکل نہیں گھبراتا۔ اپنی معیشت کے بارے میں، میں ذرا بھی پریشان نہیں ہوتا۔ مجھے تو ایتمر کا رویہ برا لگا اور کچھ نہیں۔''
نجیب الدین نے اجودھن سے دہلی کا رخ کیا۔ جب وہ دہلی میں داخل ہوئے تو ان کے کئی جاننے والوں نے انہیں خوش آمدید کرتے ہوئے کہا۔ ''بابا! آپ کہاں چلے گئے تھے؟ ایتمر مرگیا، ایک نیا ترک اینکر آیا ہوا ہے۔ وہ معلوم نہیں کیوں آپ کے بارے میں پوچھتا پھرتا ہے۔''
نجیب الدین نے جواب دیا۔ ''میں ان امراء سے گھبرانے لگا ہوں، میں اینکر سے نہیں ملوں گا۔''
ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک ترک سردار ان کے پیچھے آکھڑا ہوا، اس نے کہا۔ ''بابا متوکل! میری طرف

دیکھیے ......ادھر، میں آپ سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔“
نجیب الدین نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا۔ ”شاید تیرا ہی نام اینکر ہے؟“
ترک سردار نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں ہی اینکر ہوں۔“
متوکل نے پوچھا۔ ”مجھ سے کوئی کام؟“
ترک سردار نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں آپ کا ارادت مند ہوں۔ میں نے آپ کی عدم موجودگی میں ایک مکان تعمیر کرایا ہے۔ آپ اس میں قیام فرمائیں اور مجھے اپنا مرید بنالیں۔“
نجیب الدین متوکل نے کہا۔ ”میں تیرے مکان میں کس طرح رہوں کیونکہ میں جب بھی تجھ کو کوئی نصیحت کروں گا تو تُو ناراض ہو کر مجھے اپنے مکان سے نکال باہر کرے گا۔“
ترک سردار تلملا گیا، بولا۔ ”ایسا نہیں ہوگا پیرو مرشد...... میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔“
آپ اس کے اصرار پر نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس شخص نے آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا اور آپ کا مرید ہو گیا۔

☆☆☆

ایک دن آپ کے پڑوس سے ایک نوجوان آپ سے ملنے آیا، اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”بابا متوکل! میرا نام نظام الدین ہے۔ میں بدایوں سے آیا ہوں اور آپ کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں۔“
آپ نے اس نوجوان کو بڑے تپاک سے لیا اور دیر تک مزے مزے کی باتیں کرتے رہے اور آخر میں فرمایا۔ ”نظام الدین! تم اسی طرح میرے پاس آتے رہو۔“
نظام الدین کو آپ سے کچھ ایسی عقیدت ہو گئی کہ اپنا بیشتر وقت آپ کی صحبت میں گزارتا۔
ایک دن نظام الدین نے تخلیہ میں آپ سے کہا۔ ”بابا متوکل! آپ میرے حق میں دعا کیجیے کہ میں کہیں کا قاضی ہو جاؤں۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”قاضی...... کیا قاضی بہت بڑا ہوتا ہے؟“
نظام الدین نے عرض کیا۔ ”بہت بڑا بھی ہوتا ہے اور عزت والا بھی ہوتا ہے۔“
آپ نے فرمایا۔ ”نظام الدین! تم قاضی ہرگز نہ بننا کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تو جو کچھ بھی بنے گا، وہ بادشاہوں سے بڑا مرتبہ ہوگا۔ لوگ عقیدت اور احترام سے تیرا نام لیں گے اور تیری جگہ ادنیٰ و اعلیٰ کے دلوں میں ہوگی، بادشاہوں کی وہ عزت نہ ہوگی جو تیری ہوگی۔“
نظام الدین نے پوچھا۔ ”یعنی...... یعنی میں کیا بنوں گا؟“
آپ نے فرمایا۔ ”تم اللہ کے محبوب اور انسانوں کے اولیاء بن جاؤ گے۔“
بعد میں دنیا نے یہ دیکھا کہ نظام الدین شیخ المشائخ محبوبِ الٰہی نظام الدین اولیاء بن گئے اور ان کا مقام ہر ادنیٰ و اعلیٰ کا دل قرار پایا۔
بابا مسعود نے اجودھن میں قیام کے دوران آپ سے فرمایا۔ ”نجیب الدین! تم ٹیسوال چلے جاؤ اور والدہ کو اجودھن لے آؤ۔“
نجیب الدین ٹیسوال چلے گئے اور والدہ کو اپنے ساتھ لیا اور اجودھن روانہ ہو گئے۔ راستے میں دوپہر کے وقت درختوں کے سائے میں آپ نے قیام کیا۔ ماں نے کہا۔ ”بیٹے نجیب الدین! مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ کیا یہاں کہیں ٹھنڈا پانی مل جائے گا؟“
نجیب الدین نے جواب دیا۔ ”پانی کیوں نہیں ملے گا، میں ابھی لاتا ہوں۔“
نجیب الدین کو پانی کی تلاش میں کافی دور جانا پڑا۔ جب وہ پانی لے کر واپس آئے تو ماں کا کہیں پتا نہ تھا۔ وہ پریشان ہو کر اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگے مگر گھنٹوں کی تلاش اور جستجو کے بعد بھی ماں کا پتا نہ چلا۔ جب وہ ہر طرح سے مایوس ہو گئے تو اپنے بھائی مسعود گنج شکر کے پاس گئے اور انہیں پورا واقعہ سنا دیا۔ دونوں بھائیوں کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ نجیب الدین کو قرار نہ تھا۔ انہوں نے چشم تصور سے ایک بار پھر پورے جنگل کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ اس کا کچھ حصہ دیکھنے سے باقی رہ گیا ہے۔ دوبارہ اسی جنگل میں پہنچے اور ایک بار پھر پورا جنگل کھنگال ڈالا۔ آخر ایک جگہ جھاڑی میں

انہیں بہت ساری ہڈیاں پڑی ملیں۔ یہ ان ہڈیوں کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اب انہیں اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ ان کی ماں کو کوئی درندہ کھا گیا ہے۔

نجیب الدین نے ساری ہڈیاں ایک کپڑے میں باندھ لیں اور بھائی مسعود گنج شکر کی خدمت میں پہنچے۔ ہڈیوں والی پوٹلی ان کے سامنے رکھ دی اور عرض کیا۔ ''بھائی! مجھ کو یہ ہڈیاں ایک جھاڑی سے ملی ہیں۔ میرا خیال ہے والدہ ماجدہ کو کسی درندے نے......''

بابا مسعود نے پوٹلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اس پوٹلی میں کیا ہے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''میں نے عرض جو کیا غالباً والدہ مرحومہ کی ہڈیاں۔''

بابا مسعود نے فرمایا۔ ''پوٹلی کھول کر ہڈیاں دکھاؤ۔''

نجیب الدین نے پوٹلی جو کھولی تو اس میں ہڈیاں نہیں تھیں۔ وہ حیرت سے خالی کپڑے کو دیکھنے لگے۔

بابا مسعود نے پوچھا۔ ''کہاں ہیں وہ ہڈیاں؟''

نجیب الدین نے جواب دیا۔ ''شاید خداوند تعالیٰ والدہ محترمہ کو اس طرح رسوا نہیں کرنا چاہتا۔''

بابا مسعود نے کہا۔ ''اس سانحے کو بھول جاؤ اور دہلی واپس جاؤ۔ اپنا کام جاری رکھو۔''

نجیب الدین متوکل دہلی چلے گئے۔

☆☆☆

عسرت اور تنگدستی پر آپ فخر کیا کرتے تھے۔ عید کا دن تھا اور گھر میں کچھ بھی نہ تھا۔ آپ نے عیدگاہ میں عید کی نماز ادا کی۔ راستے میں آپ کے ارادت مندوں نے آپ کو گھیر لیا۔ وہ آپ کے ہاتھوں کو بوسے دے رہے تھے۔ اس ہجوم میں قلندروں کی ایک جماعت بھی موجود تھی۔ یہ قلندر خراسان سے آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کسی شخص سے پوچھا۔ ''بھائی! یہ کون ہے جس کی پرستش کی جارہی ہے؟''

قلندر کو جواب ملا۔ ''شیخ نجیب الدین متوکل، انہیں متوکل اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے توکل کا کوئی جواب نہیں۔''

قلندروں نے آپس میں مشورہ کیا۔ ایک نے کہا۔ ''ہمیں بھی ان سے ملنا چاہیے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''لیکن یہاں سر راہ نہیں۔''

کسی قلندر نے پوچھا۔ ''اگر یہاں نہیں تو پھر کہاں؟''

دوسرے قلندر نے جواب دیا۔ ''ہمیں ان کے گھر چلنا چاہیے۔''

چنانچہ قلندروں نے یہ طے کر کے ان کے گھر کا رخ کیا۔ جب یہ سب ان کے گھر پہنچے تو دروازے پر دستک دی۔ آپ باہر نکلے اور قلندروں کو اپنے سامنے دیکھ کر پوچھا۔ ''حضرات آپ؟ آپ لوگوں نے کیوں زحمت کی؟''

ایک قلندر نے جواب دیا۔ ''بھائی! ہم سب نے لوگوں کو دیکھا کہ لوگ آپ کے ہاتھوں اور پیروں کو بے تحاشا بوسے دے رہے ہیں، پھر ہم نے آپ کے گھر کا انتخاب کیا۔ اب ہم کھانا یہیں کھائیں گے پھر کہیں جائیں گے۔''

متوکل کو معلوم تھا کہ گھر میں کچھ بھی نہیں۔ قلندروں کی باتیں سن کر اندر گئے اور بیوی سے پوچھا۔ ''نیک بخت! چند مہمان آگئے ہیں اور یہ مہمان قلندر ہیں۔ ان کے کھانے پینے کا کچھ انتظام ہونا چاہیے۔''

بیوی نے جواب دیا۔ ''آپ تو گھر کے حالات سے اچھی طرح واقف ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ گھر میں کچھ بھی نہیں، پھر یہ اس قسم کی باتیں کیوں؟''

متوکل نے کہا۔ ''تمہارے پاس دوپٹا وغیرہ تو ہوگا ہی، وہی دے دو۔ بازار میں بیچ دوں گا اور جو رقم ملے گی اس سے قلندروں کے لیے کھانا آجائے گا۔''

بیوی نے پیوندوں سے آراستہ دوپٹا شوہر کے حوالے کر دیا اور کہا۔ ''یہ دوپٹا بازار میں کس طرح اور کتنی قیمت میں بکے گا۔ اس کا حلیہ خود ہی ملاحظہ کرلو، اب میں کیا عرض کروں؟''

آپ نے دوپٹے کو دیکھا تو شرمندہ ہوگئے، فرمایا۔ ''واقعی یہ تو بازار میں بک ہی نہیں سکتا۔''

آپ ایک بار پھر قلندروں کی صحبت میں تشریف لے گئے۔

قلندروں نے آپ کو دیکھا اور طنزاً پوچھا۔ ''کیا ہوا بھائی؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''مہمانو! مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔''
قلندروں نے کہا۔ ''ہم تو تمہارے مہمان ہیں، ہمیں کچھ کھلاؤ پلاؤ۔''
آپ دوبارہ اندر گئے اور وہاں سے واپس آئے تو بھرا ہوا لوٹا اور دوسرے ہاتھ میں ایک خالی پیالہ لیے ہوئے تھے۔ آپ نے اس حلیے میں نمودار ہو کر قلندروں سے کہا۔ ''صاحبان! میں آپ کے لیے جو کچھ کر سکتا تھا کر چکا ہوں، آپ یہ سادہ پانی نوش فرما سکتے ہیں، پانی حاضر ہے۔''
قلندروں نے پانی لیا اور نہایت ادب واحترام سے باری باری پینے لگے۔ اس کے بعد آپ کے ہاتھوں اور پاؤں کو بوسے دیے اور باہر نکل گئے۔
آپ اپنے اوپری حجرے میں تشریف لے گئے۔ اس وقت وہ بہت ملول تھے۔ وہ دل میں سوچ رہے تھے اور خدا سے کہہ رہے تھے۔ ''خدایا! یہ کیا ہو رہا ہے؟ عید کا دن ہے، دنیا خوش وخرم ہے اور میرے گھر میں بچوں کے لیے کچھ بھی نہیں۔ وہ تو کئی وقتوں کے بھوکے ہیں، ان پر رحم فرما، خدایا! میرے لیے یہ کیسی شرمناک بات ہے کہ مہمان آئیں اور نامراد واپس جائیں۔''
آپ انہی خیالوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ آپ نے زینے پر کسی کے چڑھنے کی آہٹ محسوس کی۔ کچھ دیر بعد ایک بوڑھا شخص ان کے سامنے آکھڑا ہوا، آپ نے پوچھا۔ ''حضرت! آپ کون ہیں؟ آپ کی تعریف؟''
اس بوڑھے نے ایک شعر پڑھا۔

با دلِ گفتم دلا خضر راہمنی
دل گفت اگر مرا نماید بینم

(میں نے اپنے دل سے کہا کیا تو خضر کو دیکھتا ہے؟ دل نے جواب دیا اگر وہ مجھے دکھائی دیں تو ضرور دیکھوں)
آپ نے فرمایا۔ ''آپ کا تعارف تو ابھی باقی ہے۔''
بزرگ نے پوچھا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے آپ زیرِلب کس کا شکوہ کر رہے تھے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''میں شکوہ کسی کا بھی نہیں کر رہا تھا، میں اپنے رب سے یہ کہہ رہا تھا کہ آج عید کے دن بھی میرے بچے بھوکے ہیں اور مہمان نامراد واپس جا رہے ہیں۔''
بزرگ نے فرمایا۔ ''متوکل! عرش پر فرشتے آپ کے توکل کی تعریفیں کر رہے ہیں اور آپ دنیاداری میں پھنسے ہوئے ہیں۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''یہ بات نہیں ہے، میں دنیاداری کی باتیں نہیں کر رہا تھا بلکہ دوستوں کی ضروریات نے مجھ کو اس طرف مائل کر دیا۔''
اتنے میں آپ کسی ضرورت سے نیچے تشریف لے گئے۔ وہاں صحن میں کھانے کا خوان رکھا ہوا دیکھا۔ آپ نے بیوی سے پوچھا۔ ''یہ کون لایا؟''
بیوی نے لاعلمی ظاہر کی۔ ''مجھے نہیں معلوم کیونکہ میں غیر مردوں کے سامنے نہیں جاتی۔''
آپ نے پوچھا۔ ''کیا تم آج صبح سے باہر نہیں نکلیں؟''
بیوی نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں آج صبح سے باہر نہیں نکلی۔''
آپ دوبارہ اوپر تشریف لے گئے تاکہ ان بزرگ سے پوچھیں کہ کہیں آپ تو یہ خوان نہیں لائے۔
اوپر پہنچے تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ بزرگ کا کہیں پتا نہ تھا، انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ یہ بزرگ نیچے بھی نہیں اترے، پھر یہ کہاں اور کدھر سے چلے گئے؟
کچھ دیر بعد انہوں نے کسی کی آواز سنی، کوئی سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔ ''متوکل! کیا تم نے خضر کو نہیں پہچانا؟''
آپ نے زیرِلب فرمایا۔ ''تو یہ تھے خواجہ خضر۔ خوب!''

☆☆☆

آپ کے ایک بھائی بدایوں میں رہتے تھے۔ آپ ہر سال ان سے ملنے کے لیے بدایوں جایا کرتے تھے۔ بدایوں میں قیام کے دوران دونوں بھائیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ چلو آج شیخ علی سے ملاقات کریں۔

شیخ علی ایک بزرگ تھے اور ان کا بڑا شہرہ تھا۔ یہ دونوں بھائی جب ان بزرگ کی صحبت میں پہنچے تو کچھ خالی فرش پر چلے اور اس کے بعد وہاں بچھے ہوئے بوریے پر پاؤں رکھ دیے۔ شیخ علی واویلا مچانے لگے، بولے۔ ''تم دونوں نے یہ کیا غضب کردیا۔ یہ بوریا نہیں مصلٰی ہے۔''

دونوں بھائیوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا اور ذرا سے کھسک گئے۔

وہاں مصلّے پر ایک کتاب بھی رکھی تھی۔ آپ نے شیخ علی سے پوچھا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کو پڑھ لوں؟''

شیخ علی نے جواب دیا۔ ''تمہیں روکا کس نے ہے، پڑھ لو۔''

آپ نے جیسے ہی کتاب کو کھولا، اس میں نمایاں طور پر لکھا ہوا تھا۔

''ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ اس دور کے مشائخ تنہائی میں تو گناہ کریں گے اور جب یہ لوگوں کے سامنے ہوں گے تو اگر ان کے سامنے کوئی بوریے پر اپنا پاؤں رکھ دے گا تو یہ قیامت کھڑی کردیں گے۔''

شیخ علی نے پوچھا۔ ''شیخ کیا پڑھ رہے ہو؟''

انہوں نے کتاب کا مذکورہ صفحہ ان کے سامنے کردیا، فرمایا۔ ''پڑھ لیجیے، کچھ آپ ہی کی بابت لکھا گیا ہے۔''

شیخ علی نے وہ حصہ پڑھا تو شرم سے زمین میں گڑ گئے، بولے۔ ''شیخ! میں نادم ہوں، مجھے معاف کردو۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں نے معاف کیا، میری دعا ہے کہ میرا خدا بھی معاف کرے۔''

ایک روز آپ اپنے مریدوں سے فرمارہے تھے۔ ''لوگو! جب دنیا تمہارے پاس آئے تو خوب خرچ کرو کیونکہ ایسا کرنے سے کمی نہیں آئے گی اور اگر یہ چلی جائے تو اس کا غم نہ کرو اور اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو کیونکہ یہ پائیدار نہیں ہوتی۔''

آپ اپنے بھائی بابا فرید گنج شکر کی صحبت میں بیٹھے باتیں کررہے تھے، دوران گفتگو پوچھا۔ ''بھائی! میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ آپ جب مناجات میں 'یارب' کہتے ہیں تو آپ کو اس کا جواب 'لبیک یا عبدی' (اے میرے بندے میں حاضر ہوں) ملتا ہے۔''

بابا فرید نے فرمایا۔ ''نہیں۔'' پھر قدرے تامل کے بعد فرمایا۔ ''الارجاف مقدمۃ الکون (لوگوں کی زبان پر کسی بات کا مشہور ہوجانا اس چیز کے ہوجانے کا مقدمہ (واقعہ) ہے)''

آپ نے نہایت معصومیت سے ایک سوال اور کیا۔ ''بھائی! میں نے لوگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ حضرت خضر آپ کے پاس تشریف لاتے ہیں؟''

بابا فرید نے جواب دیا۔ ''نہیں۔''

آپ نے مزید سوال کیا۔ ''لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ابدال آپ کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔''

بابا فرید نے جواب دیا۔ ''یہ درست ہے کیونکہ تم ابدال ہو۔''

نجیب الدین نے اپنا سر جھکا دیا اور آنکھیں بند کرکے بیٹھ گئے۔

☆☆☆

غیاث پور کے نزدیک اندرپت میں بی بی فاطمہ سام نامی ایک بزرگ خاتون رہتی تھیں۔ یہ نجیب الدین متوکل کو اپنا بھائی کہتی تھیں۔ ان کی ایک کنیز تھی۔ وہ محنت مزدوری کرکے بی بی فاطمہ سام کا خرچہ پورا کرتی تھی۔

نجیب الدین متوکل کا حال غیر تھا۔ کئی دن سے فاقہ ہورہا تھا۔ بظاہر فاقہ ٹوٹنے کا کوئی امکان بھی نظر نہ آتا تھا۔ صابر و شاکر بیوی اور بچے خاموش اللہ پر توکل کیے ہوئے تھے۔ آپ اپنے بالائی حجرے میں اللہ پر توکل کیے سجدے میں پڑے تھے۔

اتنے میں ایک مرید آیا اور عرض کیا۔ ''حضرت! میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیں تاکہ میں کسی کام آؤں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں چپ رہوں گا کیونکہ میرا جو حال ہے اس سے میرا رب آگاہ ہے اور میرے رب نے میری بہن بی بی فاطمہ سام کو بھی اس سے آگاہ کردیا ہے۔''

مرید نے تعجب سے کہا۔ ''لیکن پیر و مرشد! بی بی فاطمہ سام تو یہاں سے دور رہتی ہیں۔ انہیں آپ کا حال کیا معلوم؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ اللہ کے بعد بی بی فاطمہ سام ہی میرے حال سے باخبر ہیں۔''

مرید کو پھر بھی یقین نہ آیا، بولا۔ ''آپ فرماتے ہیں تو میں مانے لیتا ہوں ورنہ بات سمجھ میں نہیں آرہی۔''

ابھی یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ کسی شخص نے دروازے پر دستک دی۔ آپ نے مرید سے فرمایا۔ ''دیکھ بی بی فاطمہ سام کا پیغام آگیا۔''

مرید باہر گیا تو دیکھا، دروازے پر ایک شخص کھانے پینے کا وافر سامان لیے کھڑا ہے۔ اس نے کہا۔ ''پیرومرشد سے کہہ دو کہ ان کی بہن بی بی فاطمہ سام نے انہیں یہ سامان بھیجا ہے کیونکہ انہیں اپنے کشف سے معلوم ہوا ہے کہ ان کے بھائی اور بیوی بچے بہت پریشان ہیں اور یہ سارا کچھ حلال کی کمائی کا ہے۔''

جب یہ سامان آپ کو ملا تو آپ نے مرید سے کہا۔ ''تو نے میری بہن کے کشف کا حال دیکھا اور سنا۔'' اس کے بعد فرمایا۔ ''لوگو! میرے فقر کا حال اس نیک خاتون پر جس طرح عیاں اور روشن ہے اگر خلیفۂ وقت پر اپنی رعایا کا حال اس طرح روشن اور عیاں ہوجائے تو اندرونِ حدودِ خلافت کوئی ننگا بھوکا نہ رہے۔''

ایک دن آپ اندر تشریف لے گئے۔ آپ نے دیکھا وہ مصلّے پر سربسجود تھیں اور ان کے سامنے دو روٹیاں رکھی ہوئی ہیں۔ بی بی فاطمہ کی کنیز ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ آپ نے اس سے آہستہ سے پوچھا۔ ''بی بی! یہ کیا معاملہ ہے؟''

کنیز نے جواب دیا۔ ''کیا عرض کروں، معلوم نہیں بی بی میں کون سی قوت ہے جو غذا کے بغیر بھی انہیں زندہ رکھے ہوئے ہے۔ میں ہر روز دو روٹیاں اسی طرح سامنے رکھ دیتی ہوں۔ یہ دن بھر روزہ رکھتی ہیں۔ شام کو دو لقموں سے روزہ افطارتی ہیں اور بقیہ روٹیاں کسی بھوکے کو دے دیتی ہیں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟''

کنیز نے جواب دیا۔ ''کئی ماہ سے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میری بہن رابعۂ دوراں ہے، اس عہد کی رابعہ بصری۔''

کافی دیر بعد جب بی بی فاطمہ نے سجدے سے سر اٹھایا تو بہ آوازِ بلند متوکل سے پوچھا۔ ''بھائی! آپ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ میں یہ کیا سن رہی ہوں؟''

متوکل نے جواب دیا۔ ''بہن! میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی، جس پر آپ فکرمند ہوں۔''

بی بی فاطمہ نے کہا۔ ''میں اور رابعہ بصری۔ اس پاک طینت اور جید ترین ہستی کا مجھ گناہ گار سے موازنہ اور مقابلہ کرتے ہیں۔ میں تو شرم سے پانی پانی ہوئی جارہی ہوں۔''

شیخ متوکل نے جواب دیا۔ ''بہن! یہ آپ کا عجز و انکسار ہے جو آپ اس طرح باتیں کررہی ہیں ورنہ ایک زمانہ آپ کے مرتبے و مقام سے واقف ہے۔''

بی بی فاطمہ نے کہا۔ ''بھائی متوکل! یہ غیر متوقع تشریف آوری کا مطلب؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''بہن! میرا دل گھبرایا تو چلا آیا۔ اندر دل ایک آواز کافی دنوں سے سن رہا ہے۔ کوئی کہہ رہا ہے، متوکل جا اپنی بہن سے ملاقات کرلے، پھر پتا نہیں کہ ملاقات ہو بھی یا نہ ہو۔''

بی بی فاطمہ نے ٹھنڈی سانس بھری، کہا۔ ''تم بھی ٹھیک ہی کہتے ہو بھائی متوکل! زندگی کا کیا بھروسا ہے۔ اس کا انحصار دو سانسوں پر ہے۔ ایک اندر جاتی ہے دوسری باہر آتی ہے۔ معلوم نہیں کب کوئی سانس بے وفائی کرجائے۔''

شیخ متوکل نے کہا۔ ''میں کچھ عرصہ یہیں رہوں گا۔''

بی بی فاطمہ نے جواب دیا۔ ''کچھ عرصہ! ارے آپ پوری زندگی یہاں رہ سکتے ہیں۔''

شیخ متوکل نے بات چیت کا سلسلہ بند کردیا۔ بی بی فاطمہ بھی چپ ہوگئیں۔ رات کو کنیز سے کہا۔ ''کیا تو جانتی ہے کہ بھائی متوکل میرے پاس کیوں آئے ہیں؟''

کنیز نے جواب دیا۔ ''بی بی جی! میں کیا جانوں؟''

بی بی فاطمہ نے کہا۔ ''اگر نہیں جانتی تو کچھ دنوں بعد جان جائے گی۔''

کنیز چپ ہوگئی۔ چند دنوں کے اندر ہی کنیز نے یہ بات محسوس کرلی کہ بی بی فاطمہ نے کھانا چھوڑ دیا ہے اور عبادت گزاری میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے۔ وہ پوری پوری رات سربسجود رہنے لگیں، وہ اس طرح گڑگڑا کر الحاح وزاری کرتیں، گویا وہ خدا سے مخاطب ہیں۔

رات کے پچھلے پہر آپ نے بی بی فاطمہ کی سسکیوں کی آواز سنی، وہ رو رہی تھیں اور اپنے رب سے کہہ رہی تھیں۔ ''اے اللہ العالمین! میری کنیز مجھ سے کہتی ہے کہ میں روٹی کھاؤں اور پانی پیوں لیکن میں تیری جدائی سے پریشان ہوں۔ تو کب تک مجھے دور دور رکھے گا۔ کیا میں خوب کھا پی کر خود کو تندرست و توانا کرلوں اور جدائی کے لمحات کو طول دیتی رہوں۔ میں جسم کی قید سے عاجز ہوں، خودکشی نہیں کرسکتی، بس تجھ سے یہی درخواست کرسکتی ہوں کہ میری مشکل آسان کردے۔''

اس خطرناک صورتِ حال میں بی بی فاطمہ نے چالیس دن گزار دیے۔ شیخ متوکل نے پوچھا۔ ''بی بی فاطمہ! کیا آپ دنیا سے اتنی ہی بیزار ہوچکی ہیں جو اس طرح اپنے خالقِ حقیقی سے ملنے کا منصوبہ بنالیا ہے۔''

بی بی فاطمہ نے جواب دیا۔ ''بھائی متوکل! اب میں یکسانیت اور تنہائی سے تنگ آچکی ہوں۔ وہ جس کی مجھے تلاش ہے جسم کی قید میں موجود روح اس کو نہیں پاسکتی۔ پھر کیوں نہ زندگی کو داؤ پر لگا کر میں جیت کا مزہ حاصل کرلوں۔''

ادھر بات چیت بند ہوئی، ادھر بی بی فاطمہ نے ایک نورانی چہرہ انسان کو گھر کے صحن میں کھڑا دیکھا۔ آپ کو ذرا شرم سی آئی، پوچھا۔ ''اے شخص! تو کون ہے اور یہاں کیا لینے آیا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''بی بی فاطمہ! میں عزرائیل ہوں۔ آپ کی روح قبض کرنے آیا ہوں۔''

بی بی فاطمہ مسکرانے لگیں، بولیں۔ ''اچھا تو یہ بات ہے۔ میرے اللہ نے میری سن لی۔ میں کس زبان سے اس کا شکریہ ادا کروں اور کس طرح ادا کروں؟''

عزرائیل نے کہا۔ ''بی بی! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

بی بی فاطمہ نے کہا۔ ''میں آپ سے زیادہ وقت مانگوں گی بھی نہیں۔ میں ان آخری لمحات میں تجدیدِ وضو کرنا چاہتی ہوں۔ تجدیدِ وضو کے بعد میں دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کروں گی۔ دو رکعت شکرانہ کے بعد دو رکعت مزید پڑھوں گی۔''

عزرائیل نے جواب دیا۔ ''آپ کو یہ وقت دیا گیا، میں انتظار کرلوں گا۔''

شیخ متوکل نے پوچھا۔ ''بہن! یہ تم کس سے باتیں کررہی تھیں؟''

بی بی فاطمہ نے جواب دیا۔ ''خدا کے ایک بندے سے، جو نوری ہے اور جسے ہر ذی روح کے پاس جانا پڑتا ہے۔''

شیخ متوکل نے کہا۔ ''تو گویا اس کا یہ مطلب ہوا کہ تمہاری دعا قبول ہوگئی۔''

بی بی فاطمہ نے وضو کیا اور دو رکعت شکرانہ ادا کرنے لگیں۔ نمازِ شکرانہ کے بعد دو رکعت مزید ادا کیں۔ جب آپ دوسری رکعت میں سجدے میں گئیں تو عزرائیل نے کہا۔ ''بی بی فاطمہ! میں نے آپ کی خواہش پوری کردی تھی۔ اب میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔''

چنانچہ سجدے ہی میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ کنیز پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آناً فاناً یہ خبر پھیل گئی اور لوگ جمع ہونے لگے۔ جب جنازہ تیار ہوگیا تو لوگوں نے چہ میگوئیاں شروع کردیں کہ ان کی نمازِ جنازہ کون پڑھائے گا۔

اچانک شیخ متوکل اٹھے اور اعلان کیا۔ ''بی بی فاطمہ سام میری عزیز ترین بہن تھیں۔ اب اگر ان کی نمازِ جنازہ میں نہیں پڑھاؤں گا تو پھر کون پڑھائے گا۔''

شیخ متوکل نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے، لوگوں نے کہا۔ ''پیر و مرشد! کیا اس طرح رونا جائز ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''نہیں لیکن دل پر موجود غبار کو میں آنسوؤں ہی کے ذریعے بہا سکتا تھا۔''

تجہیز و تکفین کے بعد آپ نے بی بی فاطمہ کو خواب میں دیکھا، پوچھا۔ ''بہن! آپ کا کیا حال ہے؟''

بی بی فاطمہ نے جواب دیا۔ ''کم از کم میں تو بہت خوش ہوں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''وہ کس طرح؟''

بی بی فاطمہ نے کہا۔ ''ذرا ادھر میری طرف دیکھو۔''

شیخ متوکل نے اس طرف دیکھا تو پتا نہیں کیا دیکھا کہ دل پر ہیبت سی طاری ہوگئی۔ اس وقت بی بی فاطمہ نماز پڑھ رہی تھیں۔

انہوں نے پوچھا۔ ''بہن! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟''

انہوں نے سلام پھیرنے کے بعد جواب دیا۔ ''بھائی متوکل! میں یہاں عرش پر نماز پڑھتی ہوں۔ خدا نے مجھ پر مہربانی

کی جو میں نے یہ مقام حاصل کرلیا۔"
آپ اپنے گھر واپس تشریف لے گئے۔

☆☆☆

نِکلش نامی ایک ترک آپ کی خدمت میں بہت پابندی سے آیا کرتا تھا۔ یہ شخص نہایت خوش عقیدہ، متقی اور صالح تھا۔
ایک دن اس شخص نے خواب میں دیکھا، اللہ تعالیٰ اس کے سامنے موجود ہے اور وہ اللہ سے باتیں کررہا ہے۔

نِکلش کو اس خواب نے پریشان کردیا، وہ شخص جس سے بھی یہ کہتا کہ اس نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے، وہی نکلش سے ناخوش، بلکہ برہم ہوجاتا۔ اس نے اپنا یہ خواب شیخ متوکل کے سامنے بیان کردیا اور درخواست کی کہ جب تک میں زندہ ہوں، اس کو کسی کے سامنے بیان نہ کیجیے گا۔ آپ نے وعدہ فرمایا۔

نکلش چالیس سال زندہ رہا مگر آپ نے یہ خواب کسی کو بھی نہیں بتایا۔ جب اس کا آخری وقت آیا تو آپ اس کی عیادت کو گئے اور اس کا حال پوچھنے لگے۔ نکلش نے جواب دیا۔ "پیرومرشد! میرا حال بہت اچھا ہے اور میں اس وقت بھی اپنے اندر ایک کیف سا محسوس کررہا ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔ "خدا تیری اس حالت کو برقرار رکھے۔"

نکلش نے پوچھا۔ "پیرومرشد! میں نے چالیس سال پہلے ایک خواب دیکھا تھا، کیا آپ کو یاد ہے؟"

آپ نے فرمایا۔ "خوب اچھی طرح یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ تو نے مجھ سے اس کا عہد لیا تھا کہ میں اس کو کسی کے سامنے بیان نہ کروں۔"

نکلش نے کہا۔ "پیرومرشد! اب میں اپنے خالقِ حقیقی کے پاس جارہا ہوں لیکن میں نے جو خواب چالیس سال پہلے دیکھا تھا اس کی لذت اور اس کا سرور آج بھی محسوس کررہا ہوں۔"

اس کے بعد اس کا انتقال ہوگیا، آپ نے فرمایا۔ "یہ دولت... کسی کسی خوش نصیب کو اچانک مل جاتی ہے۔ اللہ ہم سب پر کرم فرمائے، آمین۔"

آپ کے دو بیٹے تھے۔ آپ نے ایک کا نام احمد رکھا تھا اور دوسرے کا محمد۔ آپ ان دونوں ناموں کا بے حد احترام کرتے تھے۔ آپ اپنے مریدوں کے درمیان گھرے بیٹھے تھے کہ کسی بات پر ان دونوں سے ناراض ہوگئے۔ آپ نے اسی وقت ان دونوں کو آواز دی۔ "اے خواجہ احمد اور محمد!"

کسی مرید نے پوچھا۔ "آپ ان دونوں سے بے حد ناراض ہیں مگر آواز اس طرح دے رہے ہیں گویا درمیان میں ادب اور تکلف آڑے آرہا ہے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "کیا تم ان دونوں کے ناموں میں کوئی ایسی بات محسوس نہیں کررہے کہ جن کا ادب اور احترام کیا جائے؟ میں انہیں احمد اور محمد کہہ کر مخاطب نہیں کرسکتا، اسی لیے لفظ خواجہ نام کے ساتھ لگا دیتا ہوں۔"

☆☆☆

آپ دہلی سے اجودھن پاک بڑی پابندی سے جایا کرتے تھے۔ اجودھن پاک میں بابا فرید گنج شکر انہیں بڑی محبت اور شفقت سے رکھتے تھے۔

جب آپ پہلی بار اجودھن تشریف لے گئے تھے تو واپسی سے پہلے عرض کیا۔ "بھائی! میں دہلی واپس جارہا ہوں۔"

بابا فرید نے فرمایا۔ "فی امان اللہ۔ اللہ تجھے حفظ و امان میں رکھے۔"

شیخ متوکل نے فرمایا۔ "کیا آپ فاتحہ نہیں پڑھیں گے تاکہ میں آپ سے پھر ملنے آؤں۔"

آپ نے فاتحہ پڑھی اور شیخ متوکل پر دم کیا، فرمایا۔ "نجیب الدین! تم بے فکر رہو، تم اگلے سال پھر آؤ گے بلکہ بار بار آؤ گے۔"

آپ دہلی چلے گئے اور دوسرے سال پھر آئے۔

آپ نے اس بار پھر وہی درخواست کی۔ "بھائی! کیا آپ فاتحہ نہیں پڑھیں گے تاکہ میں اگلے سال پھر شرفِ ملاقات حاصل کروں۔"

بابا فرید نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں، میری دعا ہے کہ تم بار بار اجودھن آؤ اور میں جانتا ہوں کہ تم اسی طرح آتے

جاتے رہو گے۔"

تیسری بار، چوتھی بار، پانچویں بار...... یہاں تک کہ شیخ متوکل نے بابا فرید کی خدمت میں انیس بار حاضریاں دیں۔ وقتِ رخصت آپ بابا فرید کے سامنے مؤدب کھڑے ہو گئے۔

بابا فرید نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "بھائی! میں دہلی جا رہا ہوں اور میری خواہش ہے کہ آپ ایک بار پھر فاتحہ پڑھیں اور مجھ کو اگلے سال آنے کی خوش خبری سنائیں تا کہ میں بیسویں بار بھی شرفِ ملاقات کروں۔"

بابا فرید نے فرمایا۔ "میں جو کچھ بھی کہتا ہوں بحکمِ ربی کہتا ہوں۔ اس بار میں فاتحہ نہیں پڑھوں گا۔"

شیخ متوکل نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

بابا فرید نے جواب دیا۔ "طبیعت نہیں چاہ رہی۔"

شیخ متوکل نے کہا۔ "کیا میں یوں ہی چلا جاؤں؟"

بابا فرید نے فرمایا۔ "ہاں، تم یوں ہی چلے جاؤ۔"

شیخ متوکل کچھ دیر پس و پیش میں ڈوبے رہے پھر کہا۔ "اچھا پھر یہی کہہ دیجیے کہ تم بار بار آؤ گے۔"

بابا فرید نے فرمایا۔ "افسوس کہ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔"

شیخ متوکل بہت بے چین ہو رہے تھے، پوچھا۔ "مگر بھائی کیوں؟ ایسا کیوں؟"

بابا فرید نے جواب دیا۔ "خدا کے لیے ان باتوں کو طول نہ دو۔ میں مشیتِ ایزدی کے خلاف کوئی کام کس طرح کر سکتا ہوں۔"

شیخ متوکل اپنے گھر دہلی چلے گئے۔ اسی دوران حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء اجودھن تشریف لے گئے، بابا فرید ان سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ "بابا نظام! میں تمہیں سندِ خلافت دینا چاہتا ہوں۔"

محبوب الٰہی نے کہا۔ "پیر و مرشد! یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ میں سندِ خلافت اور دستارِ خلافت حاصل کر لوں۔"

چنانچہ انہوں نے محبوب الٰہی کو سندِ خلافت دی اور دستارِ خلافت سر پر باندھ دی اور آخر میں فرمایا۔ "اب تو اگر دہلی جانا چاہے تو چلا جا، میری طرف سے اجازت ہے۔"

جب محبوب الٰہی دہلی جانے لگے تو بابا فرید نے فرمایا۔ "دیکھو نظام الدین! یہ خلافت نامہ جو میں نے تمہیں عطا کیا ہے، راستے میں ہانسی پڑے گا۔ تم ہانسی میں حضرت مولانا جمال الدین ہانسوی کو میرا خلافت نامہ ضرور دکھا دینا۔ پھر جب تم دہلی میں داخل ہو جاؤ تو وہاں قاضی منتخب کے پاس چلے جانا اور میرا خلافت نامہ انہیں بھی دکھا دینا۔"

محبوب الٰہی نے دبی زبان میں پوچھا۔ "اور پیر و مرشد! بابا متوکل کی بابت کیا ارشاد ہے۔ کیا انہیں یہ خلافت نامہ نہیں دکھانا ہے؟"

بابا فرید نے جواب دیا۔ "وہاں تک تمہاری رسائی نہیں ہوگی۔ میں مشکل کام نہیں بتاتا۔"

حضرت محبوب الٰہی ہانسی ہوتے ہوئے دہلی میں داخل ہوئے تو انہیں پہلی خبر یہ ملی کہ حضرت نجیب الدین متوکل کا 19 رمضان 671ھ کو انتقال ہو گیا۔

محبوب الٰہی آپ کے مزار پر تشریف لے گئے اور سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا۔

"میں نے اس شہر میں آپ جیسا کوئی آدمی نہیں دیکھا۔ آپ کو کبھی یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ آج دن کون سا ہے، مہینا کون سا ہے؟ آپ کو کبھی یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ غلہ کس بھاؤ بکتا ہے یا گوشت کا نرخ کیا ہے...... کیوں؟ صرف اس لیے کہ آپ ہر وقت یادِ الٰہی میں مستغرق رہتے تھے۔"

دہلی میں آپ کا مزار شیخ نجیب الدین شیر سوار کے نام سے مشہور ہے۔

ماخذات

سیر الاولیاء، امیر خورد۔ سیر العارفین، حامد بن فضل اللہ جمالی۔ اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث۔ فوائد الفواد، امیر حسن سنجری۔ گلزارِ ابرار، محمد غوث مانڈوی۔ خیر المجالس، ملفوظات چراغ دہلی



ڈھونگ

سلیم انور

یہ حقیقت ہے کہ قانون کہیں کا بھی ہو اگر... اس کا نفاذ مکمل دیانتداری سے کیا جائے تو معاشرے میں بہت نمایاں تبدیلی آتی ہے... معاشرہ افراد کے اجتماع کا نام ہے اور وہ بھی اسی معاشرے کی ایک کڑی تھا جس کا ہر فرد اپنی ذمہ داری کو بخیر خوبی نبھانا جانتا تھا اور اسی وجہ سے جب ذرا ڈھونگ سے کام لیا تو اس مجرم کے چہرے پر پڑی نقاب بھی بآسانی اتر گئی۔

مجرمانہ بساط پر قانون کی چالیں چلنے والے کچھ ذمہ دار افسران کا قصہ

پولیس کی بڑی سی اسپورٹ یوٹیلٹی وہیکل سبک رفتاری سے چلتی ہوئی گھوسٹ ٹاؤن سروس اسٹیشن کے ڈرائیو وے پر آ کر رک گئی۔ ایس یو وی کا ڈرائیور آفیسر ولبرٹ گاڑی سے نیچے اترا تو اس کی مڈبھیڑ سروس اسٹیشن کے مالک سے ہو گئی۔

کچھ دیر بعد آفیسر ولبرٹ پلٹ کر واپس گاڑی کے پاس پہنچا اور بولا۔ ''اس کے خیال میں گاڑی کی ٹرانسمیشن میں کچھ خرابی ہے۔ اسے ٹھیک کرنے میں ایک دو دن لگ

جائیں گے۔ گاڑی کے ساتھ ہمیں بھی کچھ وقت کے لیے یہاں گھوسٹ ٹاؤن میں رکنا پڑے گا۔''

یہ اتوار کا دن تھا اور سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ کار میں سوار افسران کو گرمی کی شدت کا احساس نہیں تھا کیونکہ کار کا ایئر کنڈیشنر صحیح کام کر رہا تھا۔ کار سے باہر موجود آفیسر ولبرٹ .... اپنی پیشانی سے پسینا پونچھنے لگا۔ وہ کلین شیو اور دراز قامت آدمی تھا۔ اس نے گرے رنگ کے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور سر پر ویسٹرن اسٹائل کا ایک ہیٹ تھا۔

پولیس اسپورٹ یوٹیلٹی وہیکل کی عقبی نشست پر تین افراد موجود تھے۔ آفیسر جونسن اور آفیسر ٹرولر۔ ان دونوں کے درمیان بیٹھا ہوا شخص زیویئر بیلی تھا جس کے چہرے پر افسردگی طاری تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔

''اس کا کیا کریں گے؟'' آفیسر جونسن نے اپنے قیدی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''جیل سڑک کے اس پار ہے۔ وہاں چل کر اس بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔'' آفیسر ولبرٹ نے جواب دیا۔

آفیسر جونسن اور آفیسر ٹرولر دونوں ہی نے پولیس کی مخصوص گرے رنگ کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ دونوں کی مونچھیں گھنی تھیں اور کم روشنی میں انہیں الگ الگ شناخت کرنا دشوار تھا۔ انہوں نے چھجے دار ٹوپی بھی پہن رکھی تھی۔

ان کا قیدی زیویئر بیلی جو کہ بوچ بیلی کے نام سے بھی شہرت رکھتا تھا، نیلے رنگ کی میلی کچیلی پتلون اور سفید قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس کی عمر پینتالیس برس کے لگ بھگ تھی۔

وہ چاروں افراد مین اسٹریٹ کراس کر کے گھوسٹ ٹاؤن کے جیل کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ اندر جیل کی تین کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں جو خالی دکھائی دے رہی تھیں۔ دروازے کے قریب شاہ بلوط کی پائیدار لکڑی کی ایک بڑی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ اس میز پر ایک بھاری بھرکم شخص بیٹھا کاغذات پر کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا ایک سوٹ پہنا ہوا تھا جس کی رنگت مدھم پڑ چکی تھی۔ یہ سوٹ اس کے جسم پر چھوٹا لگ رہا تھا۔ اس کی جیکٹ کے اوپر ایک گن بیلٹ بندھا ہوا تھا جس کے ہولسٹر میں ایک ریوالور نمایاں تھا۔

ان چاروں کی آمد پر اس شخص نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''ویل؟'' اس کا سوال ان چاروں میں سے کسی خاص سے نہیں تھا۔

''ہمیں اس شخص مسٹر بیلی کو یہاں ٹھہرانے کے لیے جگہ درکار ہے...... اتنے وقت کے لیے جب تک ہماری کار ٹھیک نہ ہو جائے۔'' آفیسر ولبرٹ نے کہا۔ کمرے میں چلنے والے ایئر کنڈیشنر کے شور میں اس کی آواز دب سی گئی تھی۔

''ہم اسے صحرا کے پار ویلینشیا لے جا رہے ہیں اور راستے میں کار کے خراب ہونے کا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔ کیا تم اسے...... عارضی طور پر یہاں ٹھہرا سکتے ہو؟''

بھاری بھرکم شخص نے قیدی زیویئر بیلی کا سرتاپا جائزہ لیا اور اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اوہ اس شخص کو...... ہاں، میں یہ کر سکتا ہوں۔''

پھر بغیر کسی تردد کے اس نے فوری طور پر اپنے ہولسٹر میں سے اپنا ریوالور نکالا اور پولیس افسران پر تانتے ہوئے بولا۔ ''اس شخص کی بیڑیاں کھول دو۔'' لہجہ تحکمانہ تھا۔ ''تم سب اپنے ہتھیار میز پر رکھ دو اور اندر کال کوٹھریوں میں چلے جاؤ۔''

یہ سن کر پولیس افسران حیرت زدہ رہ گئے لیکن اب ان کے پاس حکم بجا لانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس بھاری بھرکم شخص نے تینوں پولیس افسران کو کوٹھریوں میں بند کرنے کے بعد ان کے دروازوں پر تالے ڈال دیے۔

قیدی زیویئر بیلی مبہوت کھڑا تھا۔ حالات کے اس طرح پلٹا کھانے پر وہ سخت الجھن میں پڑ گیا تھا۔

''میں میئر ایڈم گورڈن ہوں۔'' بھاری بھرکم شخص نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اور چیف آف پولیس بھی۔ یہاں گھوسٹ ٹاؤن میں میرا ہی قانون چلتا ہے۔''

وہ بھاری بھرکم ہونے کے ساتھ ساتھ لمبا چوڑا اور کمرے میں موجود تمام افراد پر حاوی دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اس شخص نے اپنی توجہ قیدی زیویئر بیلی کی جانب مبذول کر لی۔ ''جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے اخبارات میں تمہارے جارحانہ انداز اور آپے سے باہر ہونے کے بارے میں سب کچھ پڑھا ہوا ہے اور تمہاری باتدبیری اور حاضر دماغی کے حوالے سے میں کسی حد تک تمہاری قدر بھی کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم ایک قاتل ہو لیکن مجھے اس بات پر بھی یقین ہے کہ انصاف کے سلسلے میں جلد بازی سے کام لیا گیا ہے۔ اس ملک میں ہر کوئی بے گناہ اور معصوم ہے تاوقتیکہ جرم ثابت نہ ہو جائے۔ اس سے قبل کہ یہ مسخرے تم سے نمٹنے کے لیے تمہیں صحرا پار لے جائیں، میں تمہیں آزادی کے

آخری چند گھنٹے دے رہا ہوں۔''

زیویئر بیلی ابھی تک حیران کھڑا تھا۔

''میرے لیے تم صرف اور صرف بوچ بیلی ہو۔'' ایڈم گورڈن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس ٹاؤن میں بیشتر لوگ ایسے ہیں جو تمہاری طرف ہیں۔ تمہیں ان کی رفاقت میں لطف اندوز ہونے کا چانس مل رہا ہے۔ ہم تمہیں کھلائیں گے، پلائیں گے، تمہیں تفریح فراہم کریں گے اور گھوسٹ ٹاؤن سیلون کی دوسری منزل کے لگژری کوارٹرز میں رہائش دیں گے لیکن یہ خیال مت کرنا کہ تمہیں بھاگ نکلنے کا کوئی موقع ملے گا۔ ہمارے پاس یہاں اچھے شہریوں کی ایک سو چوراسی آنکھیں ہیں جو تمہاری ہر ایک حرکت پر نظر رکھے رہیں گی۔ یہ تمام شہری مہمان نواز ہیں اور تمہاری مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے لیکن ان کے پاس ہتھیار بھی ہیں اور وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ان ہتھیاروں کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے باوجود بھی اگر تم نے ان پرانی کھٹارا کاروں میں جو لوگ اس ٹاؤن میں چلاتے ہیں، صحرا عبور کرنے کی کوشش کی تو تم صحرا کی تپش میں جل بھن کر رہ جاؤ گے اور یوں تمہارا خاتمہ ہوجائے گا۔ اس دروازے سے باہر واقع صحرا کے مقابلے میں ڈیتھ ویلی، نوم الاسکا کے مانند محسوس ہوگی۔''

گھوسٹ ٹاؤن میں ہر قسم کا ضروری کاروبار موجود تھا، ایک ریسٹورنٹ، بیوٹی پارلر، باربر شاپ حتیٰ کہ اخبار بھی!

ریسٹورنٹ میں اسٹیک سے لطف اندوز ہونے کے بعد زیویئر بیلی نے رات سرائے کی اوپری منزل پر واقع کمرے میں بڑے اطمینان سے گزاری۔ وہ رات بھر بے فکر سوتا رہا۔

پیر کی صبح اس نے ناشتے سے پہلے چل پھر کر ٹاؤن کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ مسٹر ایڈم گورڈن نے فرار کی کوشش کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ صحیح تھا۔ لہٰذا اس نے خود کو ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار کرلیا تھا کہ وہ اس ٹاؤن کے باشندوں کو بس اپنے رویے سے متاثر کرنے کی کوشش کرے گا اور جہاں تک ممکن ہوسکے گا، اپنی اس نئی آزادی سے بھرپور لطف اٹھائے گا اور کیا پتا حالات کچھ اس طرح پلٹا کھا جائیں کہ اسے یہاں سے فرار ہونے کا موقع بھی مل جائے۔ یہ خیال بھی اسے حوصلہ دے رہا تھا۔

وہ باربر شاپ میں داخل ہوگیا۔ عمر رسیدہ پستہ قد باربر تیزی سے اس کی جانب آیا اور ہمدردانہ لہجے میں

رانگ نمبر

ایک شخص نے تھیٹر والوں کو فون کیا کہ اسے دو افراد کے لیے بکس چاہیے۔

فوراً جواب ملا۔ ''معاف کیجیے جناب ہم دو افراد کے لیے مشترکہ بکس کا انتظام نہیں کرسکتے۔''

''عجیب بات ہے! کیا آپ گلوب تھیٹر سے بول رہے ہیں؟''

''نہیں جناب یہ تو تابوت ساز کمپنی کا دفتر ہے۔''

ڈس مس

ماسٹر لڑکوں کو سمجھا رہا تھا۔ جب میں ''ڈس۔ مس'' کہوں تو تمام لڑکے بھاگ جائیں۔ ابھی ماسٹر نے صرف ڈس ہی کہا تھا تمام لڑکے بھاگ گئے صرف ایک لڑکا وہیں کھڑا رہا۔

ماسٹر نے پوچھا۔ ''تم یہاں کیوں کھڑے ہو۔'' لڑکے نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

''جناب میں آپ کی مس کا انتظار کر رہا ہوں۔''

ازدواجیات

بیوی نے شوہر سے کہا۔ ''دیکھو تم ہمیشہ کتنے اداس اور پریشان رہتے ہو۔ اس بلبل کو دیکھو ہمیشہ خوش رہتی ہے۔'' شوہر نے کہا۔

''وہ اس لیے خوش رہتی ہے کہ اس کی شادی نہیں ہوئی اس پر کوئی قرضہ نہیں۔ اسے کام کرنے کے لیے دفتر نہیں جانا پڑتا اور نہ ہی اس کے دانتوں میں درد ہوتا ہے۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

سردار جی

سردار ہوٹل میں سوپ پی رہا تھا۔ کسی نے کہا۔ ''سردار جی سوپ میں مکھی ہے۔''

سردار۔ ''اوئے کاکے دل بڑا ہونا چاہیے۔ مکھی کونسا سارا سوپ پی جائے گی۔''

مرسلہ۔ محمد انعام، لودھراں

مخاطب ہوا۔ ''مسٹر بیلی، سر آپ یقین نہیں کر سکتے کہ ہم آپ کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں۔ اب تک کے تمام کلاسک قانون شکنوں میں آپ سب سے زیادہ تخلیقی صلاحیت کے حامل ہیں۔ ہمیں اسی پر عمل کرنا ہے جیسا کہ میئر ایڈم گورڈن نے کہا ہے لیکن یقین کریں اگر ہمیں آپ کو فرار کرانے کا موقع ملا تو ہم آپ کو ضرور فرار کرا دیں گے۔''

''میں اس کے لیے ممنون ہوں۔'' بیلی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

پھر وہ برابر میں واقع بیوٹی پارلر کے سامنے سے گزرنے لگا تو اس نے کھڑکی سے اندر نگاہ ڈالی۔ اسے اندر خواتین کا رش دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ بیلی کو دیکھ کر وہ خواتین پُرجوش انداز میں ہاتھ لہرانے لگیں۔

جواب میں بیلی نے بھی ہاتھ ہلا کر خیر سگالی کا جواب دیا پھر وہ سوچنے لگا کہ آیا وہ کچھ دیر بعد پلٹ کر دوبارہ یہاں آجائے۔ ہوسکتا ہے وقت گزاری کے لیے کوئی خاتون اس کا ساتھ دینے اور تھوڑا سا معاشقہ لڑانے پر رضامند ہوجائے۔

گھوسٹ ٹاؤن ڈائنر سڑک کے آخر میں واقع تھا۔ بیلی کو اب بھوک ستا رہی تھی۔ اس نے ڈائنر کے شیشے کے وزنی دروازے کو دھکا دے کر کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔

اس کے کانوں میں جو آواز سب سے پہلے پڑی، وہ تالیوں کی تھی جو ہر طرف سے بج رہی تھیں۔ کسی نے پہلے تالی بجائی تھی پھر دیگر اس کے ہم تال ہوگئے۔

میزبان سنہری زلفوں والی ایک نوجوان عورت تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر بیلی کا بازو تھام لیا اور اسے اپنے ساتھ ایک بوتھ میں لے گئی۔ وہ میز پر اس کے مقابل بیٹھ گئی اور اونچی آواز میں بولی۔ ''میں تمہیں اپنا کہنے کا دعویٰ کر رہی ہوں۔'' پھر گھوم کر کک کو پکارنے لگی۔ ''مینولانے کی زحمت مت کرنا، نکلسن! میرے اور زیویئر کے لیے جو کچھ بھی دستیاب ہے وہ لے آؤ۔''

زیویئر بیلی ٹپٹایا ہوا تھا۔ اس عورت نے کہا۔ ''تم برا تو نہیں مانو گے اگر میں تمہیں تمہارے اولین نام سے پکاروں...... کیوں؟''

زیویئر بیلی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''نہیں!''

زیویئر بیلی شدتِ جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا۔ اسے اس درجہ توجہ کی توقع بالکل بھی نہیں تھی۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دے اور اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے دے۔

تھوڑی دیر میں نکلسن نے ان کی میز کھانوں سے سجا دی۔ کھانا کھانے کے دوران وہ عورت بولی۔ ''میرا نام کلارا ہے۔ اس قصبے کے کچھ لوگوں کو یقین نہیں ہے کہ ہارلینڈ کا کارنامہ تم نے سرانجام دیا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ حاضر دماغی اور باتدبیری کی تمہاری شہرت بلا جواز ہے لیکن میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہاری طرف ہوں۔ ہارلینڈ میں موجود ان پانچوں کا گروپ غالباً اس بات کا حق دار تھا جو کچھ ان کے ساتھ ہوا لیکن ملک کی بیشتر پولیس اور بے شمار اخبارات نے کھلے بندوں یہ واویلا مچا دیا کہ تمہیں گرفتار کیا جائے اور فی الفور انصاف کا فیصلہ کیا جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہمارے یہاں میئر ایڈم گورڈن جیسا شخص موجود ہے جو کہ روایت کا مخالف ہے اور اس نے تمہارے ساتھ عزت واحترام کا وہی برتاؤ کیا ہے جس کے تم مستحق ہو۔''

''میں فطری طور پر جھوٹا نہیں ہوں، کلارا۔'' زیویئر بیلی نے کہا۔ ''میرے وکیل نے مجھ سے کہا تھا کہ میں مطمئن اور پُرسکون رہوں۔ اس بات سے مجھے دکھ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ میرے بارے میں وہ احساسات رکھتے ہیں جیسا کہ تم نے کہا ہے لیکن میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ ہارلینڈ کے اخبار والے نے جو کچھ اندازہ لگایا تھا کہ کیا ہوا ہوگا، وہ کم وبیش درست تھا۔ اگر لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ میں نہیں تھا تو یہ ان کا مسئلہ ہے۔ میں مختلف باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔''

''تم نے بہت خوب صورت بات کہی ہے، زیویئر۔'' کلارا نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''سنو، میرے پاس ایک عمدہ جگہ ہے جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ یہاں زیادہ شور شرابا اور کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ ہم کچھ دیر بعد وہاں جاسکتے ہیں تاکہ کچھ میٹھا ہوجائے اور تم بھی اس بارے میں وضاحت کر سکتے ہو کہ یہ کیسے کیا گیا اور یقیناً کسی قسم کے اعتراف کے بغیر۔ پھر میں تمہیں ایک الوداعی تحفہ دوں گی جو تم کبھی بھی فراموش نہیں کر سکو گے۔''

''وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' زیویئر بیلی نے پوری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے بے ساختہ جواب دیا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم مجھے اچھی طرح سمجھ گئی ہو۔ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ صرف تم اور تم ہو جو مجھے سمجھ سکی ہو۔ یہ اندازہ کوئی بے حد ذہین ہی لگا سکتا ہے کہ ان تمام لوگوں کو ایک وقت میں ایک جگہ کس طرح اکٹھا کیا گیا ہوگا۔ وہ تمام کے تمام نجوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اخبار کے بندے نے صحیح اندازہ لگایا تھا۔ ان لوگوں کو ایک جعلی پڑھنے کا مواد بھیجا گیا

تھا جس کی وجہ سے وہ سب ایک مقام پر ایک ہی وقت میں یکجا ہو گئے تھے۔ پھر باقی سب کچھ خود بخود ہوتا چلا گیا۔''

''تو پھر وہ واقعی تم تھے؟'' کلارا نے حیرانی سے کہا۔

''ہاں، وہ میں ہی تھا۔ میں تمہیں یہ اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم سچ مچ کھری ہو۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ میں تم پر اعتبار کر سکتا ہوں۔ میں تمہارے پاس کوئی کیمرا نہیں دیکھ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ ہنس دیا۔ ''اور تم نے ریکارڈ کرنے والے کسی آلے کا تار بھی نہیں پہنا ہوا ہے۔ ہے نا؟ جب ہم یہاں سے نکلیں گے تو میں خود ذاتی طور پر اسے تمہارے جسم پر تلاش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جو گھامڑ باہر موجود ہیں ان کو بتا دینا کہ تم جانتی ہو وہ سب کچھ میں نے ہی کیا تھا۔ لیکن یہ مت بتانا کہ یہ بات میں نے تمہیں بتائی ہے۔ وہ اگر یہی خیال کرنا چاہتے ہیں کہ میں ذہنی طور پر تیز ہوں تو ٹھیک ہے اور سچ بھی یہی ہے۔ اب میں کھانے سے فارغ ہو چکا ہوں۔ تمہاری رہائش گاہ پر چلنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''ہاں، میں بھی تیار ہوں، زیویئر...... لیکن تھوڑی دیر میں چلیں گے۔ مجھے اچانک سر میں شدید درد ہونے لگا ہے۔ فرض کرو کہ اگر ہم ایک گھنٹے بعد دوبارہ یہیں پر ملیں تو کیسا رہے گا... ہنی؟ کیا یہ ٹھیک ہے؟'' کلارا نے اپنا سر تھامتے ہوئے کہا۔

زیویئر بیلی کو یہ سن کر مایوسی ہوئی۔

''او کے!'' اس نے بادل ناخواستہ ہامی بھر لی۔

پھر وہ ڈائنر سے باہر نکل آیا اور بے مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ ایک گھنٹا گزارنے میں اسے ایک سال بیت جائے گا۔

ایک گھنٹے بعد جب زیویئر بیلی واپس ڈائنر پہنچا تو وہاں باہر خاصی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ درجنوں مرد اور عورتیں مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ وہ چھوٹے بڑے کئی ٹرکوں میں سامان لاد رہے تھے۔ کچھ گاڑیاں وہاں سے روانہ ہو رہی تھیں۔

جو پولیس افسران اسے اس گھوسٹ ٹاؤن میں لائے تھے، وہ جیل سے باہر سڑک پر ایڈم گورڈن کے ساتھ خوش گپیاں کر رہے تھے۔ زیویئر بیلی کو کلارا کہیں دکھائی نہیں دی۔

جب آفیسر ولبرٹ کی نگاہ زیویئر بیلی پر پڑی تو وہ اپنا ریوالور تانے زیویئر کے پاس چلا آیا۔ اسی اثنا میں آفیسر جونسن اور آفیسر ٹرولر بھی ان کے پاس آ گئے اور انہوں نے فوراً ہی بیلی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔

''ہم چند منٹ میں یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں۔'' آفیسر ولبرٹ نے کہا۔

زیویئر بیلی مبہوت کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا کھیل تماشا ہے۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ...... یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''ہم اس گھوسٹ ٹاؤن کو واپس ویران بستی بنانے جا رہے ہیں۔'' آفیسر ولبرٹ نے بتایا۔ ''جو تمام لوگ تم یہاں دیکھ رہے ہو وہ پولیس فورس کے آدمی ہیں۔ اس ویران بستی میں گزشتہ پچاس سال سے کوئی گہما گہمی، کوئی ہلچل نہیں ہوئی تھی۔ یہ ایک غیر آباد بستی تھی۔ اب جبکہ تم نے ہارلینڈ میں ہونے والی انتہائی وحشیانہ اور ظالمانہ قتل و غارت گری کرنے کا اعتراف کر لیا ہے تو ہم اس بستی کی ویران حیثیت کو دوبارہ بحال کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد یہاں مکمل سناٹا ہوگا اور کوئی ذی روح یہاں دکھائی نہیں دے گا۔ البتہ تمہاری حیثیت اب ایک مووی اسٹار کی سی ہو گئی ہے۔ تم اس فلم کے مرکزی کردار اور ہیرو ہو جو تمہارے مقدمے کے دوران جیوری کو دکھائی جائے گی۔ وہ لوگ تمہارے اس جملے پر خاص طور پر دلچسپی لیں گے...... ہاں، وہ میں ہی تھا۔''

زیویئر بیلی یہ سن کر سناٹے میں آ گیا۔ اس پر کچھ دیر کے لیے سکتے کی سی کیفیت طاری رہی پھر وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''تو یہ سب ڈھونگ مجھ سے اعترافِ جرم کرانے کے لیے رچایا گیا تھا؟''

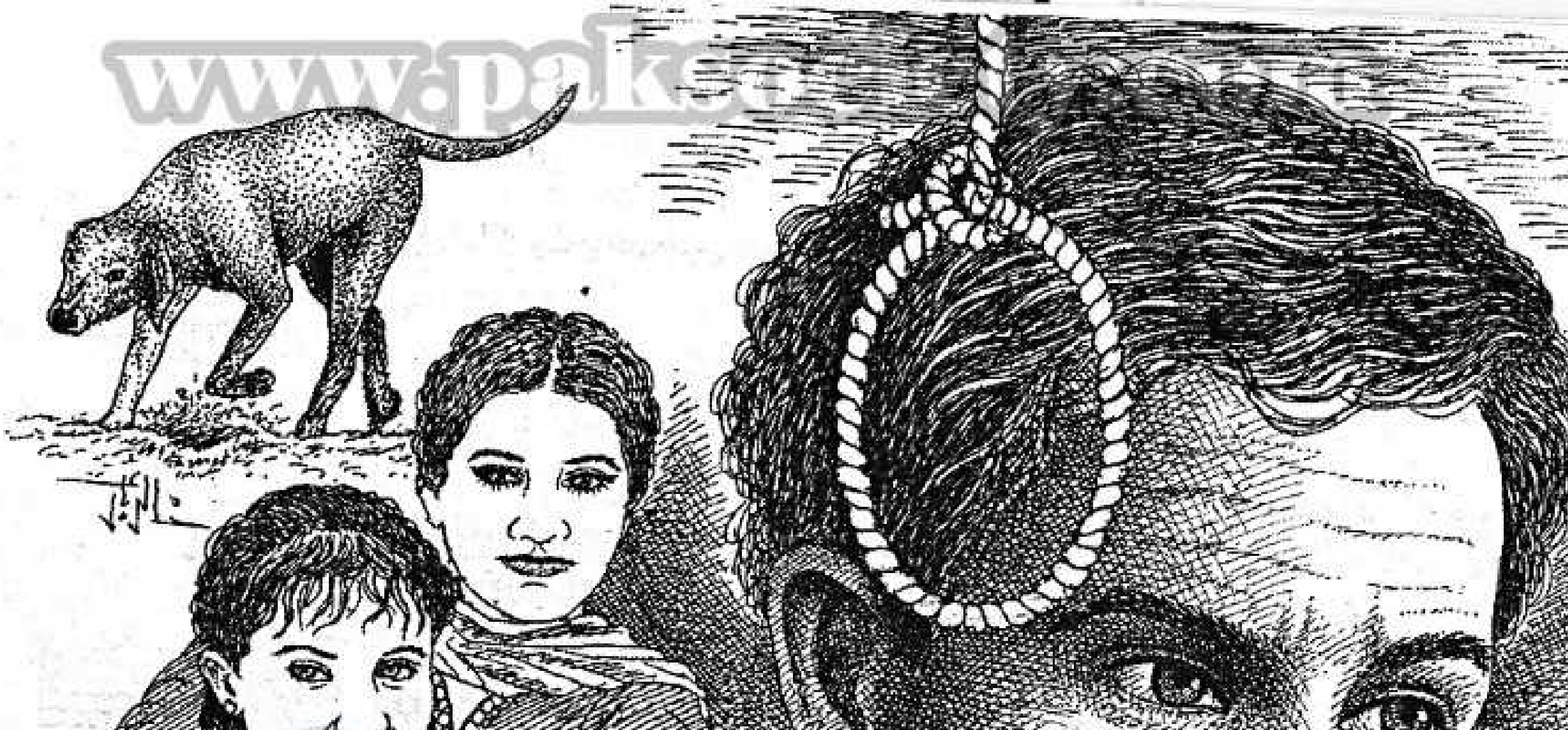
آفیسر ولبرٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور کلارا؟''

''اوہ، تمہارا مطلب آفیسر کلارا ویلز سے ہے! ہاں وہ بھی اس ڈھونگ کی ایک کردار تھی۔ ایک جیتا جاگتا کردار!''

زیویئر بیلی بھونچکا رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کلارا اسے دھوکا دے سکتی ہے۔ وہ اسے حقیقت میں اچھی لگی تھی۔ جبھی تو اس نے اس پر اعتبار کرتے ہوئے سب کچھ سچ اگل دیا تھا۔ اس کے دل کو ایک ٹھیس پہنچی تھی اور وہ رنجیدہ ہو گیا تھا۔

''بائی داوے آفیسر کلارا نے تمہارے لیے ایک پیغام بھیجا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق وقت پر نہ آنے پر معذرت خواہ ہے کیونکہ اس کے سر کا درد اب بھی باقی ہے۔''



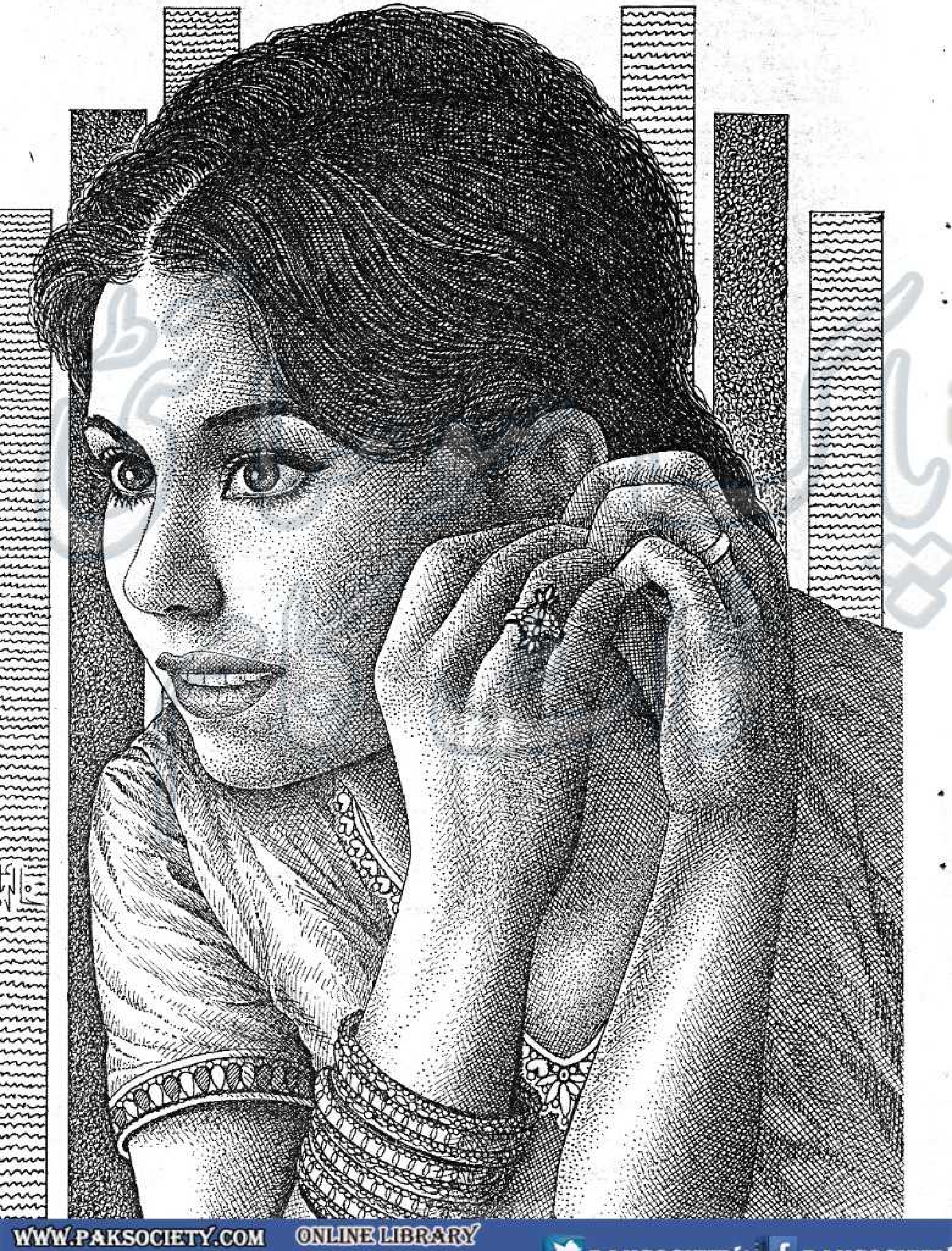
معاشرتی رشتوں اور قانونی اداروں کے مابین زخمی مسافتوں کی پراثر داستان

اسیر خیال

کاشف زبیر

جب سر پر کوئی سایا نہ ہو اور راہ میں کوئی چھایا نہ ملے... دل دھڑکتا ہو لیکن اس میں کوئی گیت نہ ملے... آنکھیں منظر دیکھ رہی ہوں مگر منظر میں کوئی رنگ نہ ہو... پیروں میں مسافت بچھی ہو لیکن منزل کا کچھ پتا نہ ہو... ایسے میں اگر کوئی انسان ہمت کرے اور آنکھوں میں کوئی خواب سجالے تو اس کے حوصلے کی داد دینا پڑتی ہے۔ کہتے ہیں جب انسان پیدا ہوتا ہے تو بالکل کورے کاغذ کے مانند ہوتا ہے مگر کیسی عجیب بات ہے کہ وہی کورا کاغذ پلٹ کر دیکھو تو تقدیر کا پورا قصہ اس پر درج ہوتا ہے۔ وہ بھی اکثر تنہائیوں میں یہی سوچتا رہا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا کیا تقدیر میں پہلے سے رقم تھا یا بعد میں زندگی نے خود کہانی ترتیب دے ڈالی۔ جو بھی تھا زندگی کا منظر نامہ اسے قدم قدم پر چونکا رہا تھا۔ زندگی کے نشیبوں سے لڑھکتے لڑھکتے جب وہ موت کی آغوش میں پہنچا تو اسی تقدیر نے اپنی دشمنی ختم کرکے دوستی کا ہاتھ بڑھادیا۔ اب جانے یہ ستم تھا یا کرم کہ قیمتی متاع چھین کر قسمت نے اس کی جھولی میں چند سچی محبتوں کی سوغات ڈال دی تھی۔ اگرچہ اسے اب ان کی نہ ضرورت تھی، نہ ہی پہچان... تو قدر کیسے کرلیتا۔ وہ تو شب و روز کی تلخیوں میں خزاں رسیدہ چاہتوں کا غم منا رہا تھا۔ ایسے میں صحرا کے آسمان پر تاروں کے جھرمٹ سے ایک تارہ جب اس پر مہربان ہوا تو جیسے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کی روح تک کو سرشار کرگیا۔

قیصر جمال اپنے گھر کے چھوٹے سے صحن میں ٹہل رہا تھا۔ صحن میں ایک طرف دیوار کے ساتھ مختلف پھول دار بیلیں لگی تھیں اور ان پر کھلے پھول مل کر سحر انگیز خوشبو بکھیر رہے تھے جبکہ ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے اوپری چھجے پر



چڑھی بوگن ویلیا کی بیل الگ ہی تاثر دے رہی تھی۔ اس کے سامنے پلاسٹک کی گول میز اور کرسیاں تھیں۔ چھٹی کے دن اور گرمیوں میں جب دن لمبے ہوتے ہیں اور وہ دفتر سے جلدی آجاتا تو وہ ہما کے ساتھ ہی شام کی چائے پیتا تھا۔ اس وقت روما اگر گھر میں ہوتی تو ان کے آس پاس کھیل رہی ہوتی تھی۔ سات سال کی روما اس کے اور ہما کے گھر کی رونق تھی۔ اگر یہ گھر جنت تھا تو وہ اس کی حور تھی۔ رات کے کھانے کے بعد جب تک ہما کچن سمیٹتی اور اس کے اور اپنے لیے الائچی والا قہوہ تیار کرتی، وہ اس چھوٹے سے صحن میں ٹہلتا اور اللہ کا شکر ادا کرتا کہ اس نے اسے یہ چھوٹا سا گھر اور اپنا خاندان دیا تھا۔

قیصر نے اکیلے پن میں ہوش سنبھالا تھا، یوں تو وہ جس گھر میں پلا بڑھا تھا وہاں بہت سے رشتے موجود تھے۔ جیسے دادا، دادی، اس کے دو چچا، ان کی بیویاں اور بچے، اس کی ایک پھوپی بھی تھیں اور اس نے سنا تھا کہ اس کی ایک خالہ بھی ہیں لیکن کبھی ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ہاں وہ رشتے جنہیں انسان اپنا کہتا اور سمجھتا ہے وہ ان سے محروم تھا۔ ماں باپ اور ایک چھوٹی بہن بائیک پر جاتے ہوئے آئل ٹینکر کے نیچے آگئے۔ بہن کی طبیعت خراب تھی۔ ماں باپ اسے ڈاکٹر کو دکھانے لے جا رہے تھے۔ وہ روتا رہ گیا کہ وہ بھی جائے گا۔ اس وقت وہ اتنا چھوٹا تھا کہ اسے یاد بھی نہیں تھا۔ ابھی وہ چار سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ البتہ اس گھر میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اور جو رویہ رکھا گیا وہ اسے آج تک یاد تھا۔

اس گھر میں تمام ہی افراد سے اس کا خون کا رشتہ تھا۔ وہ ایک ہی تھے لیکن صرف ماں باپ نہ ہونے سے وہ کسی لاوارث کی طرح پرورش پاتا رہا۔ چچا اور چچیاں اس سے امتیازی سلوک کرتے تو سمجھ میں آتا کہ وہ اس سے اپنے بچوں جیسا سلوک نہیں کر سکتے تھے مگر دادا اور دادی بھی اس سے امتیازی سلوک کرتے تھے۔ دوسرے پوتوں کے لیے ان کا جو رویہ اور پیار ہوتا تھا اس کی رمق بھی اسے اپنے لیے نظر نہیں آتی تھی۔ تو دس سال کی عمر میں اس کا کردار گھر کے فرد سے زیادہ گھر کے نوکر کا سا ہو گیا تھا۔ ہر کام کے لیے اسے آواز دی جاتی۔ جب دوسرے بچے ہوتے تب بھی اسے ہی کام کے لیے کہا جاتا۔ حد یہ کہ وہ سویا، کھا رہا یا اسکول کا کام کر رہا ہوتا تھا تب بھی اسے ہی کام کے لیے پکارا جاتا اور اگر وہ آنے میں ذرا تاخیر کرتا تو کام کا کہنے سے پہلے اسے خوب سنایا بھی جاتا۔

چھ سال کی عمر میں اسے سرکاری اسکول میں داخل کرا دیا گیا جبکہ اس کے کزن پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ وہ اس پر بھی خوش تھا کہ اسکول جائے گا۔ اسکول میں اس کا جو وقت گزرتا وہی اس کے لیے سب سے اچھا وقت ہوتا۔ بے شک اسکول سرکاری تھا اور وہاں اساتذہ اور بچوں کا رویہ بھی ایسا ہی تھا مگر وہ غیر تھے۔ اگر اس سے برا سلوک کرتے یا اسے نظر انداز کرتے تو اسے اتنا برا نہیں لگتا تھا۔ اسکول سے گھر آنے کے بعد رات سونے تک اس کا ایک ایک لمحہ مصروف گزرتا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا اسی لحاظ سے اس پر بوجھ بھی بڑھتا رہا۔ خاص طور سے دادا، دادی کا ہر کام اس کی ذمے داری تھی اور وہ خوشی سے یہ ذمے داری اٹھاتا۔

اگرچہ ان کے انداز میں قیصر کے لیے رکھائی ہوتی تھی مگر حقارت نہیں ہوتی تھی۔ جو گھر کے دوسرے افراد کے انداز میں واضح دکھائی دیتی تھی۔ کبھی کبھی وہ حیران ہوتا کہ وہ ایک متوسط طبقے کے گھر میں رہتا تھا یہاں سہولتیں تھیں مگر آسائشیں نہیں تھیں۔ دس سال کی عمر میں اسے الگ کھانا دینا شروع کر دیا گیا تھا مگر اب یہ ہوتا کہ دونوں چچا، چچیاں اور ان کے بچے تو ایک جگہ کھاتے تھے۔ دادا اور دادی کو ان کے کمرے میں کھانا دیا جاتا تھا اور یہ ذمے داری قیصر کی تھی۔ جب گھر کے تمام لوگ کھا چکے ہوتے تو وہ کچن میں بیٹھ کر کھاتا اور اس کے بعد تمام کچن صاف کرنا بھی اس کے ذمے تھا۔ پکانے اور برتن دھونے کے کام چچیاں کرتی تھیں۔ صفائی اور کپڑے دھونے کے لیے ماسی آتی تھی۔ جب وہ رات سونے کے لیے لیٹتا تو تھک کر چور ہو چکا ہوتا تھا۔

اس دو منزلہ گھر میں اوپر والا پورشن پہلے قیصر کے ماں باپ اور چھوٹے چچا کے پاس تھا لیکن جب قیصر اکیلا رہ گیا تو بڑے چچا نے اس پورے پورشن پر قبضہ کر لیا کہ ان کی فیملی بڑی تھی اور چھوٹے چچا جو پہلے ہی للچا رہے تھے مجبوراً نیچے آگئے۔ حالانکہ یہ پورشن بڑا تھا اور اس میں بھی انہیں اتنے ہی کمرے ملے جتنے کہ اوپر تھے۔ اصل بات آزادی کی تھی۔ نیچے ساس سسر کے ساتھ رہنا پڑتا تھا اور ان کی آزادی میں خلل پڑتا تھا۔ کچن اگرچہ مشترک تھا مگر اوپر رہنے والے باقی معاملات میں آزاد تھے۔ ننھے قیصر کو دادا دادی کے کمرے میں جگہ ملی اور وہ فرش پر اپنا بستر بچھا کر سوتا تھا۔ پھر یہی جگہ اس کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی۔ وہ بڑا ہوتا چلا گیا مگر اس کے لیے ایک سنگل بیڈ تک نہیں آیا۔ وہ گیارہ سال کا ہوا تو پہلے دادی دنیا سے رخصت ہوئیں۔ دادی کے

بعد دادا بیمار رہنے لگے۔

تنہائی اور بڑھاپے نے انہیں وقت سے پہلے موت کے پاس پہنچا دیا۔ وہ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ بستر سے... بہ مشکل ہی اٹھ پاتے تھے اوران کے سارے کام قیصر کو کرنے پڑتے تھے۔ ان دنوں وہ آٹھویں جماعت میں تھا۔ قیصر پڑھنے میں اپنے کزنز سے تیز تھا جو پرائیویٹ اسکولوں میں بھی بس پاسنگ مارکس لاتے تھے اور اس نے دو بار ڈبل پروموشن لیا۔ صرف تیرہ سال کی عمر میں آٹھویں میں آ گیا تھا۔ وہ اور پڑھنا چاہتا تھا اس لیے جب گھر میں یہ بات ہوئی کہ دادا کی دیکھ بھال کے لیے اسے اسکول سے اٹھا لیا جائے تو وہ ششدر رہ گیا اور پھر اس نے زندگی میں پہلی بار احتجاج کیا۔ ''مگر کیوں...... میں دادا جی کی خدمت تو کرتا ہوں۔''

''تم صبح سے دوپہر تک اسکول میں ہوتے ہو اس وقت ابا جی کو کون دیکھے گا؟'' بڑے چچا نے کہا۔

''گھر میں چچیاں ہوتی ہیں۔''

''وہ اپنے کام کریں یا ابا جی کو دیکھیں۔'' چھوٹے چچا نے کہا۔

''میں باقی سارا دن دیکھتا ہوں، اس وقت کوئی اور دیکھ لے۔''

''کوئی تمہاری طرح بیکار نہیں ہے۔'' بڑی چچی نے حقارت سے کہا۔

''تم نے پڑھ کر کرنا ہی کیا ہے؟'' چھوٹی چچی بولیں۔

''بس اب تم اسکول نہیں جاؤ گے۔'' بڑے چچا نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

وہ احتجاج کرتا رہ گیا اور کسی نے اس کی سنی نہیں۔ دادا اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ ان کی کوئی سنتا وہ تو خود اب دوسروں کے رحم و کرم پر آ گئے تھے۔ قیصر نے ان سے کچھ کہنا بیکار سمجھا۔ اسے اسکول جانے سے روک دیا گیا۔ اس کے امتحان ہونے میں ایک مہینا تھا۔ بہت مشکل سے اس نے پیپرز دینے کی اجازت حاصل کی مگر اس کے بعد اسے ایک دن بھی اسکول جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے گھر میں تیاری کر کے امتحان دیا۔ نتیجہ نکلا تو وہ کلاس میں دوسرے نمبر پر آیا تھا مگر اس کے بعد اسکول بند ہو گئے اور دو مہینے بعد دادا بھی دنیا سے گزر گئے۔ پورے گھر نے آنسو بہائے مگر اکثر کے آنسو دکھاوا تھے۔ اسے دادا کے مرنے کا دکھ تھا مگر اس سے رویا نہیں گیا۔

شاید اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے مگر دکھاوے کے آنسو بہانے والوں نے اسے بھی اس کا جرم بنا دیا کہ

ثبوت

وکیل۔ ''مائی لارڈ قانون کی کتاب کے صفحہ نمبر 15 کے مطابق میرے موکل کو باعزت رہا کیا جائے۔''

جج نے آرڈر دیا کہ کتاب پیش کی جائے۔

جب جج نے صفحہ 15 کھولا تو اس میں پانچ ہزار کے چار نوٹ رکھے ہوئے تھے۔

جج۔ ''آرڈر آرڈر اس کے تین ثبوت اور عدالت کو پیش کیے جائیں۔''

مرسلہ۔ محمد انعام، لودھراں

اسے دادا کے مرنے کی خوشی تھی اس لیے وہ رویا نہیں۔ سوئم کے بعد پورا گھر جرگہ بنا کر بیٹھا اور اس پر فردِ جرم عائد کی گئی۔ چچاؤں نے اسے بتایا کہ اب اس گھر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ یہاں صرف ایک صورت میں رہ سکتا ہے کہ وہ یہاں کام کرے۔ اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ یہ کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔ وہ کام تو پہلے ہی کر رہا تھا اس لیے وہ اسی طرح رہنے لگا۔ اسکول جانے کی آس باقی نہیں رہی تھی مگر زندگی اس کے لیے اتنی مشکل کر دی جائے گی اس نے سوچا نہیں تھا۔ پہلے وہ دادا کے کام کرتا تھا اور پھر باقی گھر والوں کے کام نمٹاتا تھا مگر اب اسے صبح سے رات گئے تک اوپر اور نیچے کے گھروں میں کاموں کے لیے دوڑنا پڑتا تھا۔ ابھی نیچے ایک کام کر رہا ہوتا تھا کہ اوپر سے آواز آ جاتی اور جب اوپر جاتا تو نیچے سے آوازیں آنا شروع ہو جاتیں۔ جانے میں دیر ہوتی تو باتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ صبح سے شام تک وہ بے شمار بار ذلت آمیز مراحل سے گزرتا رہتا۔

دادا کے مرتے ہی ان کے کمرے پر چھوٹے چچا نے قبضہ کر لیا اور اسے دوسری منزل پر اسٹور روم میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں پورے گھر کا کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا اور اس کے ساتھ وہ بھی رات کو چند گھنٹے کے لیے یہاں پڑ جاتا۔ صبح چھ سے رات بارہ بجے تک وہ یہاں نہیں آتا تھا، آ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ اگر کوئی کام نہیں ہوتا تو صرف اسے مصروف رکھنے کے لیے اس کے ذمے کوئی ایسا ہی کام لگا دیا جاتا جیسے ڈسٹنگ یا جالے صاف کرنا۔ سامان اوپر دھوپ میں لے جاؤ۔ دونوں چچیاں کام کرانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتی تھیں مگر جب کھانے کا وقت

آتا تو اس سے یوں انجان بن جاتیں جیسے اس کے ساتھ پیٹ ہی نہ لگا ہو۔ اس کے کھانے کے دن بانٹے ہوئے تھے۔ دادی کے مرتے ہی کچن الگ ہو گئے تھے اور دونوں فیملیز اب اپنے اپنے پورشن میں پکاتی اور کھاتی تھیں۔ کھانا لگتا اور سب بیٹھ کر کھاتے مگر اس کی طرف سے بے نیاز ہو جاتے حتیٰ کہ چچاؤں کو بھی اس کا خیال نہیں آتا تھا۔ پھر چچی احسانِ عظیم کرتے ہوئے اسے بچا کھچا کھانا کو دے دیتی تھی۔

اسے کام کرنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا مگر صبح سے شام تک وہ جس ذلت سے گزرتا تھا، وہ اس کے لیے نا قابلِ برداشت تھی۔ بات بات پر اسے سنانا اور اس کے مرے ہوئے ماں باپ کو بگھارنا جو خود تو مر گئے تھے اور اپنی بلا ان کے سر چھوڑ گئے تھے۔ زہر میں ڈوبے جملے اور طعنے اس کی روح پر لگتے تھے اور کبھی نہ بھرنے والے زخم کی طرح رہ جاتے تھے۔ رات کو وہ تھکن سے چُور ہو کر لیٹتا تو بجائے اس کے فوراً بعد سو جائے یہ جملے اور طعنے اس کے ذہن کے گنبد میں گونجتے رہتے تھے اور اسے لگتا جیسے وہ پاگل ہو جائے گا۔ ایک رات وہ سویا تو اس کا جسم اور ذہن دونوں ٹوٹ رہے تھے۔ اس کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ ایک بند جگہ پر تھا اور یہاں سے باہر جانے کا ایک ہی دروازہ تھا جو باہر سے بند تھا، اس نے گھبرا کر دروازہ پیٹا تو کسی نے اسے درشت لہجے میں بتایا کہ وہ شور نہ کرے ورنہ اسے انجکشن لگا دیا جائے گا۔ اس نے پوچھا۔

''میں کہاں ہوں؟''

''پاگل خانے میں۔'' جواب ملا۔

''مگر کیوں؟'' وہ چلایا۔

''تو پاگل جو ہے۔'' باہر موجود شخص ہنسا۔

''میں پاگل نہیں ہوں۔'' اس نے زیادہ زور سے چلا کر کہا تو جواب میں قہقہہ سنائی دیا۔ وہ چلاتا رہا اور باہر موجود شخص کو بتاتا رہا کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ آخری قہقہے کے بعد کوئی جواب نہیں آیا۔ پہلا دن بہت عذاب میں گزرا اور یہ ایسا عذاب اور کرب تھا کہ اسے اپنے چچاؤں کا گھر اچھا لگنے لگا، اس کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح یہاں سے نکل کر واپس اس گھر میں چلا جائے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں اس کا دم گھٹ رہا تھا اور بعض اوقات تو اسے لگتا کہ اس کی سانس واپس نہیں آئے گی۔ اسے سانس لینے کے لیے زور لگانا پڑتا تھا۔ رفتہ رفتہ اسے معلوم ہو گیا کہ اس پر دورہ پڑا تھا اور وہ قابو سے باہر ہو کر مارنے پیٹنے اور شور شرابے پر اتر آیا تھا۔ صبح چھوٹی چچی اسے اٹھانے آئیں تو اس نے ان پر بھی حملہ کر دیا اور جب اس نے شور شرابا کیا تو وہ کباڑ خانے کی چیزیں توڑنے اور پھینکنے لگا۔ چچاؤں نے اسے پکڑ کر یہاں پاگل خانے میں داخل کرا دیا تھا۔

☆☆☆

''کیا بات ہے آج باہر زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔'' ہما نے اندر سے جھانک کر کہا۔ ''اندر نہیں آئیں گے؟ قہوہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

قیصر چونکا اور اندر کی طرف بڑھا۔ ''ہاں، آج مجھے باہر زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔''

روما اندر سے دوڑتی ہوئی آئی اور اس سے لپٹ گئی۔ ''بابا! کل ہم آئس کریم کھانے جائیں گے نا؟''

''ضرور بیٹا۔'' قیصر نے جھک کر اس کا سر چوما۔ ''میں اپنی بیٹی کو ضرور لے کر جاؤں گا۔''

''اور ہم اوپر پہاڑی پر بھی جائیں گے۔'' ہما بولی۔

''اگر میں کل جلدی آ گیا تو۔'' قیصر بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''قہوہ لے آؤ۔''

وہ عام طور سے آٹھ بجے رات کا کھانا کھا لیتے تھے اور دس بجے تک وہ اپنے کام نمٹا کر اور اگلے دن کی تیاری کر کے بستر پر لیٹ جاتے تھے۔ اس دن بھی وہ چائے، ٹی وی اور واش روم سے فارغ ہو کر دس بجے تک لیٹ گیا تھا۔ روما کا کمرا الگ تھا اور وہ ساڑھے نو بجے بیڈ پر چلی جاتی تھی۔ ہما کچھ دیر اس کے پاس رہ کر اپنے کمرے میں آتی اور آخری کام وہ یہ کرتی کہ قیصر اور روما کے کپڑے پریس کرتی تھی۔ ہما تقریباً اٹھائیس برس کی خوب صورت اور صحت مند عورت تھی۔ اپنی مناسب جسامت اور بے داغ جلد کی وجہ سے وہ پچیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ وہ قیصر سے ایک سال چھوٹی تھی اور اسے شکوہ تھا کہ وہ دیکھنے میں اس سے کم عمر لگتا ہے۔ قیصر کسی قدر طویل قامت اور چھریرے جسم کے ساتھ لڑکوں جیسے نقوش کی وجہ سے چوبیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ ہما قد میں اس سے خاصی چھوٹی تھی مگر ان کی جوڑی اچھی لگتی تھی۔

قیصر نہ ایکسر سائز کرتا تھا اور نہ کھانے پینے میں احتیاط کرتا تھا، بس رات کے کھانے کے بعد آدھ پون گھنٹے صحن میں چہل قدمی کر لیتا تھا۔ ہما کھانے پینے میں احتیاط کرتی تھی۔ سارا دن چل پھر کر خود گھر کے سارے کام کرتی تھی اس کے باوجود ذرا سی بے احتیاطی سے اس کا وزن بڑھ جاتا تھا۔ جب ایسا ہوتا وہ میٹھا اور تلی ہوئی چیزیں کھانا چھوڑ دیتی تھی۔ اسے فٹنگ والے کپڑے پسند نہیں تھے مگر اسی

لیے وہ فٹنگ کے کپڑے پہنتی کہ وزن بڑھتے ہی اسے پتا چل جائے۔ قیصر اس سے محبت کرتا تھا اور اسے پروا نہیں تھی کہ اس کی بیوی حسن کے مروجہ پیمانوں پر بھی پورا اترتی ہے یا نہیں مگر ہما کو اس کی فکر رہتی تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ عورت اگر اوور ویٹ اور زیادہ عمر کی ہو تو اپنے شوہر سے بڑی لگنے لگتی ہے۔ قیصر اس کی فکر پر ہنستا تھا۔ آج بھی ہما نے اس کے اور روما کے کپڑے استری کیے اور پھر ویٹ مشین پر اپنا وزن چیک کیا۔ اس نے قیصر کو مطلع کیا۔ ''میرا وزن پچھلے ایک ہفتے میں ایک کلوگرام بڑھا ہے۔''

''اب کتنا ہے۔'' قیصر نے اپنا تکیہ درست کرتے ہوئے پوچھا۔

''ففٹی سیون کے جی۔'' ہما پریشانی سے بولی۔

قیصر ہنسا۔ ''حالانکہ یہ تمہاری ہائٹ اور عمر کے لحاظ سے بالکل مناسب ہے۔''

''ابھی فکر نہیں کروں گی تو یہ بے قابو ہو جائے گا۔'' ہما نے جواب دیا۔ اس کا قد پانچ فٹ چار انچ تھا۔ وہ قد میں قیصر سے پورے سات انچ چھوٹی تھی۔ قیصر کا وزن بہتر کلوگرام تھا مگر اپنی طویل قامتی کی وجہ سے وہ چھریرا لگتا تھا۔ ہما لائٹ بند کر کے بستر پر آئی اور ایک منٹ میں وہ سو چکی تھی۔ آج اس نے خاصے کام نمٹائے تھے۔ کپڑوں کی مشین لگائی اور چھت صاف کی تھی۔ پچھلے دنوں گرد کی آندھی آئی تھی جس نے پوری چھت مٹی مٹی کر دی تھی۔ اس کے بعد ہونے والی بارش نے اگرچہ درختوں اور پودوں کو دھو دیا تھا مگر چھت پر مٹی جمی تھی، اسے پانی مار کر صاف کرنا پڑا تھا۔ معمول کے کام اس کے علاوہ تھے۔ قیصر جاگ رہا تھا۔ صحن میں چہل قدمی کرتے ہوئے آج اسے اپنا ماضی یاد آ گیا تھا۔ اب اسے اپنا ماضی بہت کم یاد آتا تھا مگر نہ جانے کیوں آج اسے وہ سب یاد آیا جو اس پر گزرا تھا۔

سرکاری پاگل خانے میں وہ سچ مچ پاگل ہو جاتا مگر اس کی خوش قسمتی کہ اس کا کیس ڈاکٹر عزیز خان نے لے لیا۔ ڈاکٹر عزیز ہمدرد اور انسان دوست شخصیت کا مالک تھا۔ عمر زیادہ نہیں تھی مگر سب سے یوں پیش آتا جیسے وہ بزرگ ہو۔ اس نے قیصر کے کیس میں محسوس کیا کہ اس کا معاملہ نفسیاتی نہیں بلکہ کچل دینے والی شخصیت کا تھا اور اسے علاج کے ساتھ ساتھ مدد کی بھی ضرورت تھی۔ اسے اس بے سہارا لڑکے سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ قیصر کے چچا اسے یہاں داخل کرا کے ایسے گئے کہ پھر پلٹ کر نہیں آئے۔ انہوں نے اپنا پتا تک نہیں لکھوایا تھا۔ جب ڈاکٹر عزیز نے اسے دماغی لحاظ سے صحت مند قرار دیا تو اسے اسپتال سے ڈسچارج کرنا پڑا، اس کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس موقع پر بھی ڈاکٹر عزیز اس کے کام آیا۔ اس نے اسے اپنے کلینک پر ملازم رکھ لیا۔ وہ ڈاکٹر کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اس نے اسے اپنے بنگلے کے سرونٹ کوارٹر میں جگہ دی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر عزیز کے ساتھ کام کرتے ہوئے اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس نے آگے پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ڈاکٹر نے اس کی پرائیویٹ رجسٹریشن کرا دی۔ ان ہی دنوں اسے ڈرائنگ بنانے کا شوق ہوا۔ کلینک میں فارغ اوقات میں بیٹھا وہ ڈرائنگ بناتا رہتا۔ ڈاکٹر عزیز کا ایک دوست سبحان علی جو اپنی آرکیٹیکٹ اور سول انجینئرنگ کی فرم چلا رہا تھا، وہ کبھی کبھی ملنے کلینک آ جاتا تھا۔ اسے قیصر کے بارے میں معلوم تھا اور وہ اسے پسند بھی کرتا تھا۔ جب آتا تو سلام دعا کے علاوہ بھی اس سے گپ شپ کرتا تھا۔ اس نے ایک دن قیصر کو ڈرائنگ بناتے دیکھا اور اسے مشورہ دیا۔ ''تم ڈرائنگ اچھی بناتے ہو۔ ایسا کرو کہ سول ڈرافٹس کا کورس کر لو۔''

''یہ کیا ہوتا ہے جناب؟'' قیصر نے سادگی سے پوچھا۔

سبحان نے اسے سمجھایا کہ سول ڈرافٹس مین کیا کام کرتا ہے تو اسے اچھا لگا اور اس نے ڈاکٹر عزیز سے پوچھا، اس نے بھی حوصلہ افزائی کی اور اس کا داخلہ ایک ٹیکنیکل کالج میں کرا دیا جہاں سول ڈرافٹس مین کا تین سالہ ڈپلوما ہوتا تھا۔ ڈپلوما کے دوران ہی سبحان نے اسے اپنی فرم میں بہ طور اپرنٹس رکھ لیا۔ اب وہ صبح کالج جاتا۔ دوپہر میں وہاں سے سبحان کے دفتر چلا جاتا اور شام کو کلینک آتا۔ یہاں بھی اسے صبح چھ سے رات دس گیارہ بجے تک مستقل مصروف رہنا پڑتا تھا مگر وہ خوش تھا، اسے معلوم تھا کہ یہ محنت اور مصروفیت اسے مستقبل میں فائدہ دے گی۔ وہ پڑھ رہا تھا سیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی نوکری بھی کر رہا تھا۔ ڈاکٹر عزیز اس کے تمام اخراجات اٹھانے کے ساتھ اسے کچھ رقم بھی دیتا تھا۔ چھ مہینے بعد سبحان بھی اسے تنخواہ دینے لگا۔ مگر ان سب باتوں سے بڑھ کر اس کے لیے وہ عزتِ نفس اور اعتماد تھا جو اسے یہاں سے ملا تھا۔

ان تین سالوں میں اس نے تینوں جگہوں سے بہت کچھ سیکھا۔ ڈپلوما مکمل ہونے کے بعد سبحان نے اسے اپنی فرم میں فل ٹائم جاب دے دی۔ ڈاکٹر عزیز نے اس سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ رہنا چاہے تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن اگر وہ اپنی لائف خود بنائے تو اسے زیادہ خوشی ہوگی۔

قیصر نے دوسری صورت کو ترجیح دی۔ اس نے ڈاکٹر عزیز کا کلینک اور اس کے بنگلے کی رہائش چھوڑ دی۔ شروع میں تنخواہ زیادہ نہیں تھی اور اسے دفتر کے ہی دو لڑکوں کے ساتھ ایک کمرے کا فلیٹ شیئر کرنا پڑا تھا۔ اس میں اخراجات کم ہوتے تھے اور شروع کے دو سالوں میں اس نے خاصی بچت کرلی۔ سبحان نے اسے پھر مشورہ دیا کہ وہ صرف ڈپلوما کو کافی نہ سمجھے بلکہ آگے بھی پڑھے۔ اس نے بی ٹیک میں داخلہ لیا۔ وہ ایک ایوننگ کالج جانے لگا۔ دو سال بعد وہ بی ٹیک ہوگیا۔ انہی دنوں ہما سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ فرم میں ٹیلی فون آپریٹر کے طور پر آئی تھی اور پہلی نظر میں قیصر کو اچھی لگی تھی۔

سادہ سے حلیے میں اور لیے دیے رہنے والی ہما نے شروع میں قیصر پر بھی توجہ نہیں دی تھی مگر جلد اس نے محسوس کرلیا کہ قیصر دفتر میں کام کرنے والے دوسرے افراد سے مختلف ہے۔ اگر وہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کی آنکھوں میں ہما کے لیے پسندیدگی ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی اس میں ہما کے لیے احترام وخلوص بھی ہوتا تھا۔ غیر محسوس انداز میں وہ ایک دوسرے کے قریب آئے اور تب قیصر کو پتا چلا کہ اس کی اور ہما کی کہانی زیادہ مختلف نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کی ماں زندہ تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں میٹرک کرلینے کے بعد سے وہ اپنے اور ماں کے لیے جدوجہد کررہی تھی۔

ہما بارہ سال کی تھی جب اس کے باپ کا انتقال ہوگیا اور دو بڑے بھائیوں نے گھر پر قبضہ کرلیا اور جب ماں نے ہما کا حق مانگا تو اسے ہما سمیت گھر سے نکال دیا۔ ایک سال تک رشتے داروں کے پاس دھکے کھانے کے بعد ان ماں بیٹی نے ایک چھوٹی کوٹھری کرائے پر لے لی۔ ہما کی ماں ایک گارمنٹ فیکٹری میں کام کرنے لگی۔ وہ سلائی میں آنے والے اضافی دھاگے کاٹتی تھی۔ ہما نے میٹرک کے بعد اسی فیکٹری میں ملازمت کرلی۔ وہ ریسیپشن پر تھی۔ انٹر کے بعد اس نے یہاں سے جاب چھوڑ دی اور ٹیلی فون آپریٹر لگ گئی۔ انٹر پرائیویٹ کیا تھا پھر گریجویشن بھی کرلیا اور سبحان علی کی فرم میں اسے پہلی بار مناسب تنخواہ ملی تھی۔ اس کی ماں نے چند سال پہلے صحت کی خرابی کی وجہ سے ملازمت چھوڑ دی تھی۔ ایک بار اسے نمونیا ہوا اور اس کا اثر پھیپھڑوں پر آگیا، اس کے لیے موسم سرما اذیت لے کر آتا تھا۔

قیصر نے ملازمت کے دوران میں اتنا جمع کرلیا تھا کہ ایک گھر کا سامان کرسکتا تھا لیکن اس نے پہلے ہما سے بات کی اور اس کی رضامندی کے بعد اس کی ماں سے ملا۔ ہما کی ماں کی تو اولین خواہش یہی تھی کہ مرنے سے پہلے بیٹی کو اس کے گھر کا کردے۔ اسے بھی قیصر اچھا لگا۔ قیصر نے اسے اپنے بارے میں سب صاف بتا دیا تھا، کوئی بات نہیں چھپائی۔ یہ بھی بتا دیا کہ وہ چند ہفتے پاگل خانے میں رہا ہے۔ اگرچہ اس میں بھی اپنوں کی مہربانی کا زیادہ دخل تھا۔ ہما کی ماں نے ہاں کی تو اس نے ایک تین کمروں کا مکان کرائے پر لیا اور اسے مناسب سامان سے آراستہ کرکے سادگی سے ہما کو بیاہ کر اس کی ماں سمیت گھر لے آیا۔ اسے دوسرا کمرا دے دیا تھا۔ ہما اس کی زندگی میں آئی تو اسے پہلی بار احساس ہوا کہ زندگی حسین بھی ہوتی ہے۔ ہما جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی خوب سیرت بھی تھی۔ اس نے آکر قیصر اور اس کے گھر کو یوں سنبھال لیا جیسے وہ ہمیشہ سے یہی کام کرتی آئی ہو۔ جواب میں قیصر نے اپنی ساری محبت اور اعتماد اسے دے دیا جیسے اس نے ہما کے لیے ہی سنبھال رکھا تھا اس سے پہلے اس نے کسی سے محبت نہیں کی تھی۔

ہما نے شادی کے بعد جاب نہیں چھوڑی۔ اگرچہ قیصر نے اس سے کہا تھا کہ اس کی تنخواہ کافی ہے مگر دوراندیش ہما نے کہا۔ ”ٹھیک ہے لیکن ہم کچھ بچائیں گے تو اپنا گھر بنا سکیں گے۔“

اس کا کہا درست ثابت ہوا۔ قیصر کی تنخواہ میں سے بھی وہ بچت کرلیتے تھے لیکن ہما کی تو ساری تنخواہ ہی بچ جاتی تھی۔ اس سے انہوں نے کمیٹی ڈال لی۔ اس کی رقم نکلی تو انہی دنوں مالکِ مکان ضرورت کی وجہ سے اپنا مکان فروخت کرنے لگا۔ انہیں پتا چلا تو انہوں نے مالک سے بات کرلی۔ مکان مناسب علاقے میں اور مین روڈ سے ایک گلی اندر تھا۔ نزدیک ہی بس اسٹاپ اور مارکیٹ سمیت تمام سہولیات تھیں۔ یہاں نچلے طبقے کے لوگ رہتے تھے مگر انہیں لوگوں سے کیا لینا دینا تھا۔ انہوں نے مالکِ مکان سے کہا کہ وہ آدھی قیمت ابھی لے لے اور باقی وہ دو سال میں ادا کردیں گے۔ خوش قسمتی سے وہ مان گیا۔ وہ بیوی سمیت حج پر جارہا تھا اور اس میں کچھ رقم کم پڑ رہی تھی، اس لیے مکان فروخت کررہا تھا۔ آدھی قیمت ادا کرکے انہوں نے کرائے میں ہونے والی بچت سے مزید کمیٹی ڈال لی اور پھر دو سال کے اندر پوری ادائیگی کرکے مکان حاصل کرلیا۔

ان دو سالوں میں روما دنیا میں آئی اور جب وہ ڈیڑھ سال کی تھی تو ہما کی ماں دنیا سے رخصت ہوگئی۔ ماں کی موت ہما کے لیے دکھ کا باعث تھی مگر وہ جلد ہی سنبھل گئی کیونکہ ڈاکٹر

چند مہینے پہلے ہی اسے جواب دے چکے تھے کہ کسی وقت بھی اس کے پھیپھڑے کام کرنے سے انکار کرسکتے ہیں۔اس بیماری کے عالم میں بھی وہ روما کو سنبھالتی اور ہما نوکری پر چلی جاتی تھی مگر ماں کی وفات کے بعد اس نے استعفادے دیا۔ ان کا مکان ہو گیا تھا اور روما کو اور گھر کو اب کسی دیکھ بھال کرنے والے کی ضرورت تھی۔ روما نانی سے مانوس تھی وہ اس کی وفات پر بہت دن گم صم سی رہی۔ ان دو سالوں میں وقت اور واقعات بہت تیزی سے گزرے مگر پھر زندگی خود بہ خود معمول پر آگئی۔

مکان پرانا تھا۔قیصر نے رفتہ رفتہ گنجائش کے مطابق اس کی مرمت کرا کے اسے ری نیو کیا۔ ہما کو پھول پودوں کا شوق تھا۔ اس نے صحن میں کیاریاں بنائیں، بیلیں چڑھائیں اور پھول دار پودے لگائے۔ گھر کے آگے پام ٹری لگایا۔ ان دنوں زمینوں اور جائداد کی قیمتوں میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ اچھا علاقہ ہونے اور پھر مین روڈ سے پاس ہونے کی وجہ سے یہاں قیمتیں بڑھیں تو نچلے طبقے کے لوگ اپنے مکان بیچ کر سستے علاقوں میں جانے لگے اور یہاں اوپری متوسط طبقے کے لوگ آنے لگے۔ ان کی وجہ سے چند سالوں میں یہ علاقہ ہی بدل کر رہ گیا۔ اب یہاں زیادہ تر اچھی فیملیز کے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ ہما نے آس پاس آنے والی اچھی فیملیز سے تعلق قائم کرلیا تھا۔ قیصر بھی چھٹی کے دن باہر نکلتا تو سب سے سلام دعا کرتا لوگوں کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا اور اگر کسی کو کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہوتی تو حتی الامکان مدد بھی کرتا تھا۔

ہما کے نوکری چھوڑنے سے قیصر کو کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ گھر مکمل طور پر اس کی آمدنی سے چل رہا تھا۔ ایک سال سے وہ سبحان علی کی فرم چھوڑنے کا سوچ رہا تھا کیونکہ بی ٹیک کرنے کے بعد بھی وہ اب تک ڈرافٹس مین کے طور پر ہی کام کر رہا تھا اور تنخواہ بھی اس لحاظ سے ناکافی تھی۔ روما بڑی ہو رہی تھی اور اگلے سال اسے اسکول میں داخل کرانا تھا۔ اس نے دوسری نوکری کی تلاش شروع کردی۔ آغاز میں وہ اتنی تندہی سے تلاش نہیں کر رہا تھا مگر پھر دفتر میں کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ دل برداشتہ ہو کر اس نے فرم چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کی کوششیں رنگ لائیں اور اسے دارالحکومت میں کام کرنے والی ایک بڑی آرکیٹیکٹ کمپنی میں سپروائزر کی جاب مل گئی۔ تنخواہ زیادہ تھی اور دوسری سہولیات بھی اچھی تھیں۔ اس نے سبحان علی کی فرم سے استعفادیا اور یہاں جوائن کرلیا۔

خالی ہاتھ

فضل الباری صاحب جو اپنے پیسے ہم سے گنواتے ہیں اور ہانگ کانگ کی کرنسی سے ابھی تک سمجھوتا نہیں کرسکے۔ وزیر خزانہ ہوں نہ ہوں۔ کامرس منسٹر بہت عمدہ ہوسکتے ہیں۔ ان کے جوہر آج کھلے۔ ویسے تو وہ کوئی چیز خریدنے کے قائل نہیں اور ہم ان کی حب الوطنی کو قابل تقلید جانتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں، کوئی چیز مت خریدو۔ پاکستان میں مہنگی سستی مل ہی جاتی ہے۔ کیوں اپنا زرمبادلہ گنواتے ہو، ملک کو اس کی ضرورت ہے لیکن آج ہم انہیں بازار کھینچ لے ہی گئے۔ فرمانے لگے۔ چیزیں پسند تم کرو۔ بھاؤ تاؤ ہم پر چھوڑ دو۔ جانے کونسی چیز تھی۔ دکاندار نے اس کے نوے ڈالر مانگے۔ ہم نے باری صاحب سے اردو میں کہا کہ پچاس سے شروع کرنا چاہیے لیکن انہوں نے چالیس ڈالر دام لگائے۔ دکاندار نے بہت زور مارا کہ یہ ساٹھ کر دیں۔ پچاس کر دیں۔ پینتالیس کر دیں، اکتالیس کر دیں لیکن باری صاحب نے کہا، چالیس سے ایک دھیلا زیادہ نہیں۔ آخر اس نے ہتھیار ڈال دیے تو باری صاحب نے کہا ایسے بدمعاملہ لوگوں سے چیز خریدنی ہی نہیں چاہیے اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئے۔

سنگاپور کے بازاروں سے ہم واقف تھے۔ وہاں چیزیں اچھی خاصی مل جاتی ہیں بلکہ کپڑا زیادہ اچھا وہاں ملتا ہے لیکن باری صاحب نے کہا ہانگ کانگ سے لینا۔ ہانگ کانگ میں قیمتوں کا تعین اپنے ذمے لے لیا تو ہمارے کچھ خریدنے کا سوال ہی نہ رہا۔ ایک روز ضرور جب وہ آرام کر رہے تھے ہم چوری چھپے بازار سے چند چیزیں مول لے آئے ورنہ ان کا تو کہنا ہے کہ ٹوکیو میں دیکھیں گے بلکہ ڈھاکا آنا، وہاں یہ ساری چیزیں مل جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ہم ہانگ کانگ سے اسی شان سے جائیں گے جس طرح سکندر دنیا سے گیا تھا۔ یعنی خالی ہاتھ۔

ابن انشا کے سفرنامے ”دنیا گول ہے“ سے اقتباس

اگلے سال روما کو اسکول میں داخل کرایا۔ وہ اب تک اکلوتی تھی حالانکہ ان کی خواہش تھی کہ اب ان کی مزید اولاد ہو اور وہ کوئی احتیاط بھی نہیں کرتے تھے مگر اوپر والے کی طرف سے دیر ہو رہی تھی۔ کچھ عرصے بعد وہ بھول گئے کہ انہیں مزید اولاد کی خواہش تھی۔ اگرچہ یہ خواہش ختم نہیں ہوئی تھی لیکن کہیں دب ضرور گئی تھی۔ نئی کمپنی میں قیصر کا باس کمال ظفر اچھا انسان تھا اور اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے قیصر کام کو بھی انجوائے کرتا کیونکہ وہ ماتحتوں کے ساتھ نہ صرف اچھا سلوک کرتا تھا بلکہ ان کے کام کو آسان بنانے میں ہر ممکن مدد بھی دیتا تھا۔ آفس میں ماحول اچھا تھا اس لیے قیصر اور دوسرے لوگوں کو زیادہ کام کرنے پر بھی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ خاص طور سے جب انہیں اس کا اضافی معاوضہ اور پروجیکٹ کی کامیاب تکمیل کے بعد بونس بھی ملتا تھا۔

گھر کے بعد قیصر کی خواہش تھی کہ ان کے پاس گاڑی بھی ہو بے شک چھوٹی سی ہو۔ اگرچہ اس کے پاس بائیک تھی۔ ہما اور روما کے ساتھ کہیں جانے میں بھی مشکل نہیں ہوتی تھی اس کے باوجود وہ گاڑی چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں تھا کہ روما ساتویں سال میں لگ گئی تھی اور کچھ عرصے بعد ان تینوں کا بائیک پر آنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ رفتہ رفتہ اپنے ٹارگٹ کے پاس ہوتا جا رہا تھا۔ اچانک ہی ان دنوں کمپنی میں اس کے شعبے میں ایسی تبدیلی آئی جس نے پورے شعبے کو اور خاص طور سے قیصر کو متاثر کیا۔ کمال ظفر کے کمپنی کے ایک ڈائریکٹر سے کچھ اختلافات ہو گئے تھے جو بتدریج اتنے بڑھے کہ کمال ظفر نے ملازمت چھوڑ دی۔ اس نے خلاف قواعد نوٹس دیے بغیر آفس آنا بند کر دیا اور گھر سے ہی استعفا بھیج دیا۔

کمپنی نے کمال ظفر کے خلاف کارروائی شروع کر دی کیونکہ وہ چند اہم ترین پروجیکٹس پر کام کر رہا تھا اور وہ عام ملازم کی طرح جاب چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس سے پروجیکٹس کا کام متاثر ہوتا۔ اس کی جگہ کسی دوسرے آدمی کو کام سمجھنے میں خاصا وقت لگ جاتا اور اس کے بعد وہ آگے کام شروع کرتا۔ اسی اکھاڑ پچھاڑ میں خاصا وقت گزر گیا اور ان کے شعبے میں نیا سربراہ تاخیر سے آیا۔ تمام ہی پروجیکٹس متاثر ہوئے تھے۔ ان کے سالانہ انکری منٹس اور بونس پروجیکٹس کی کامیاب تکمیل سے مشروط ہوتے تھے۔ اس لیے نئے سربراہ کی آمد پر سب نے اطمینان کا سانس لیا مگر... بدقسمتی سے کمال ظفر کے بعد جو باس آیا اسے کام سے زیادہ جوڑ توڑ اور سازشوں سے دلچسپی تھی اور اس نے آتے ہی نہ جانے کیوں قیصر کو تاڑ لیا۔ تعارف کے دوران ہی اس نے قیصر سے کہا۔ ”بہت تیار ہو کر آئے ہو...... تمہارا کیا خیال تھا کہ تمہیں یہاں باس بنا دیا جائے گا؟“

قیصر حیران ہوا پھر اس نے سنبھل کر کہا۔ ”نو سر! میں ایسا کیسے سوچ سکتا ہوں، اس پوسٹ کے لیے تو بہت تجربے کار اور اعلیٰ ڈگری ہولڈر کی ضرورت ہے۔ میں کوالیفائی نہیں کرتا۔“

اس پر آغا انجم الدین نے بہت برا منایا بعد میں قیصر کو پتا چلا کہ اس کے پاس نہ تو مطلوبہ ڈگری تھی اور نہ ہی اسے کام کا زیادہ تجربہ تھا، اس کا واحد ہنر اس کی جوڑ توڑ کی صلاحیت تھی۔ روپے کے معاملے میں وہ اعلیٰ درجے کا خود غرض تھا۔ یعنی کسی سے کام ہوتا تو اس کے قدموں میں بچھ جاتا اور جب مطلب نکل جاتا تو پہچاننے سے بھی انکار کر دیتا۔ دوسروں کی ناکامیوں پر اپنی کامیابی کی عمارت کھڑی کرنا اسے خوب آتا تھا۔ بعد میں سننے میں آیا کہ کمال ظفر کو فرم سے نکلوانے میں بھی اسی کا ہاتھ تھا۔ وہ اس ڈائریکٹر کا منہ چڑھا ہوا تھا جس سے اختلاف کی وجہ سے کمال ظفر کو نوکری چھوڑنا پڑی تھی۔ آغا انجم الدین نے آتے ہی اپنے جیسے نااہل اپنے آس پاس جمع کر لیے ان کی مدد سے آغا انجم الدین نے سب سے پہلے شعبے پر اپنی گرفت مضبوط کی اور اسے پتا چل گیا کہ وہ کس کس سے کیا کام لے سکتا ہے۔ بدقسمتی سے یہاں بھی قیصر نمایاں تھا۔ اس سے جلنے والوں نے آغا انجم الدین کو اطلاع دی کہ کام میں قیصر سب سے تیز ہے۔

اس لیے اب سب سے زیادہ اور مشکل ترین کام اسے دیا جانے لگا مگر کافی ہوشیاری سے۔ کسی بھی کام کے مشکل ترین حصے اسے دے دیے جاتے اور جب وہ یہ کام کر لیتا تو آغا اس سے لے کر باقی رہ جانے والا آسان کام خود کر کے اسے آگے بڑھا دیا کرتا۔ یعنی کام قیصر کرتا اور نام آغا انجم الدین کا ہوتا تھا۔ جلد قیصر کو اندازہ ہو گیا کہ اس کے ساتھ کیا گیم کھیلا جا رہا ہے کیونکہ اکثر اس کا واسطہ اوپر والوں سے بھی پڑتا تھا اور وہاں اسے وہ کام آغا انجم الدین کے نام سے نظر آتا جو اصل میں اس نے کیا ہوتا تھا۔ ایک ڈائریکٹر میڈم یاسمین جو ایک فائیو اسٹار ہوٹل کا پروجیکٹ کر رہی تھیں اور کبھی کبھی مدد کے لیے اسے بلا لیتی تھیں۔ اس نے قیصر سے کہا۔ ”کیا بات ہے، اب تم نے ڈرائنگز پر اپنا نام لکھنا اور سائن کرنا بند کر دیے ہیں؟“

”میڈم! میرے پاس مکمل کام آتا ہی نہیں ہے۔“ اس نے وضاحت کی۔ ”آغا صاحب کچھ کام مجھ سے کراتے

ہیں اور باقی خود کرتے ہیں۔ فائل وہی کرتے ہیں اس لیے سائن بھی ان ہی کے ہوتے ہیں۔''

میڈم حیران ہوئیں۔ ''یہ تو غلط ہے۔ ایک کام مکمل طور پر ایک فرد کو دیا جاتا ہے اور تمہارے شعبے میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔''

قیصر جانتا تھا کہ باقی افراد کو پورا کام دیا جاتا تھا۔ اس نے میڈم سے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، سوائے میرے سب کو مکمل کام دیا جاتا ہے۔''

اسی شام اسے آغا نجم الدین نے بلالیا۔ اس کا موڈ نہایت خراب تھا اور اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''تم یہاں کام کرنے کی تنخواہ لیتے ہو، شکایتیں کرنے کی نہیں۔''

قیصر سمجھ گیا کہ اس تک بات پہنچ گئی ہے، اس نے تحمل سے کہا۔ ''میں نے کب اور کس سے شکایت کی ہے سر؟''

''تم نے میڈم یاسمین کے سامنے جو بکواس کی ہے، وہ مجھ تک پہنچ گئی ہے۔'' آغا نجم الدین نے نہایت خراب لہجے میں کہا۔ اس کے خراب لہجے پر قیصر کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''سر! اول تو میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی اور دوسرے میں اس لہجے میں بات کرنے اور سننے کا عادی نہیں ہوں۔''

نجم الدین کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور اس نے غرا کر کہا۔ ''اب تم مجھ سے زبان چلاؤ گے۔''

''میں نے مؤدبانہ عرض کیا ہے۔'' قیصر نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس روز اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کے لیے مشکل حالات شروع ہو گئے ہیں۔ ایسے شخص کے ساتھ صبح سے شام تک کام کرنا آسان نہیں تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اتنی اچھی کمپنی اور اتنی اچھی تنخواہ مارکیٹ میں بہت کم تھی۔ اسے قسمت سے یہ ملازمت مل گئی تھی، ورنہ یہاں آنے کے لیے لوگ بہت کوششیں کرتے ہیں۔ ڈھائی سال اس نے یہاں بہت مزے سے جاب کی تھی مگر آغا نجم الدین کے آتے ہی ماحول یکسر بدل گیا اور اب شعبے میں کام سے زیادہ سازشیں اور جوڑ توڑ ہوتا تھا کہ کس طرح کام کرنے والوں کو نیچا دکھایا جائے اور اپنا قد بڑھایا جائے۔ انہی دنوں کمپنی نے سالانہ بونس کا اعلان کیا تو وہ حیران رہ گیا کہ اس کا نام ہی نہیں تھا اور اس کے شعبے کے دو افراد کا نام تھا جن کا کام صبح سے شام تک آغا نجم الدین کی خوشامدیں اور جی حضوری کرنا تھا۔ قیصر نے اس پر آغا نجم الدین کے بجائے اپنے شعبے کے ڈائریکٹر سے احتجاج کیا۔

''سر! میں نے ایسی کوئی غلطی نہیں کی جس کی پاداش میں میرا بونس روک لیا جائے۔''

''بونس شعبے کے سربراہ کی سفارش پر دیا جاتا ہے اور اس بار رپورٹ میں تمہارا نام نہیں تھا۔''

قیصر جانتا تھا کہ آغا سے بات کرنا بیکار تھا۔ وہ اسے ذلیل کرتا اور اس کی ذلت سے لطف اندوز بھی ہوتا۔ اس لیے وہ دل ہی دل میں جلتا کڑھتا ہوا واپس آگیا۔ اگر اسے بونس مل جاتا تو اس کا ٹارگٹ پورا ہوجاتا اور وہ کار لے لیتا مگر اب اسے مزید کچھ عرصے انتظار کرنا پڑتا۔ اس شام وہ گھر آیا تو ہما نے اس کی صورت سے اندازہ لگالیا۔ ''کیا ہوا، آج پھر اس گھٹیا شخص نے کوئی حرکت کی ہے؟''

قیصر ہما کو دفتر میں ہونے والی باتوں سے باخبر رکھتا تھا۔ اسے آغا نجم الدین کے بارے میں معلوم تھا۔ قیصر نے ہما کو بتایا کہ اسے پہلی بار بونس سے محروم کیا گیا ہے اور یہ آغا کی حرکت ہے۔ ہما کو بھی غصہ آگیا مگر جب قیصر نے اسے بتایا کہ اس بونس کی کمی سے وہ اب جلد کار نہیں لے سکے گا تو اس نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میرے پاس کچھ رقم ہے، وہ آپ لے لیں۔''

''تمہارے پاس کہاں سے آئی؟'' قیصر نے حیرت سے کہا۔

''آپ جو میری پاکٹ منی دیتے ہیں اس سے میں کوئی چھوٹی کمیٹی ڈال لیتی ہوں، اکٹھے ملتے ہیں تو کہیں کام آجاتے ہیں۔ پچھلے مہینے ملی ہے، ابھی تک رکھی ہے۔''

قیصر خوش ہوگیا۔ اگرچہ کمیٹی کی رقم زیادہ نہیں تھی مگر گزارہ ہوسکتا تھا۔ اس نے کار کی تلاش شروع کردی اور یہاں قسمت نے اس کا ساتھ دیا۔ ایک ڈاکٹر جو بیرون ملک شفٹ ہورہا تھا، اپنی بہت سنبھال کر استعمال کی ہوئی کار فروخت کررہا تھا۔ چند سال پرانی یہ کار تقریباً نئی جیسی تھی۔ مارکیٹ سے کم قیمت پر مل رہی تھی اور پھر کوئی کام نہیں تھا اس لیے قیصر نے ہمت کرکے لے لی۔ جس دن وہ کار لے کر آیا، بہت خوش تھا۔ اس نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی مگر اسے زیادہ تجربہ نہیں تھا اس لیے سنبھل کر ڈرائیونگ کرتا رہا۔ اس سے زیادہ ہما اور سب سے زیادہ روما خوش تھی۔ روما نے فوری فرمائش کی۔ ''بابا! ہم ہر ویک اینڈ پر کہیں گھومنے جائیں گے۔''

''اسی لیے تو لی ہے میری گڑیا۔'' قیصر نے کہا۔ روما خوش نظر آنے لگی۔ جب سے کار آئی تھی، وہ اس کے آس پاس منڈلا رہی تھی۔

''بابا! میں اس کی صفائی کروں گی۔''

''صفائی میں کروں گا، آپ ہاتھ بٹانا۔ ابھی آپ

اتنے بڑے نہیں ہوئے ہو۔"

صحن میں گنجائش تھی۔ وہ کار اندر ہی کھڑی کرتا تھا اور جب کہیں لے جانا ہوتا تب باہر نکالتا۔ اس نے ہما سے کہا کہ جب اس کا ہاتھ صاف ہو جائے گا تو وہ اسے بھی ڈرائیونگ سکھائے گا۔ گاڑی کی خوشی تھی مگر دفتر کی ٹینشن نے یہ خوشی ماند کر دی تھی۔ بونس والے واقعے سے قیصر کو اندازہ ہوا کہ آغا نجم الدین کس حد تک اس کے خلاف ہو گیا ہے اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ عرصے اس کے ساتھ کام نہیں کر سکے گا۔ اگرچہ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ وہ دوسری ملازمت تلاش کرنا شروع کرتا مگر اس کے ذہن میں یہ بات آ گئی تھی کہ جلد یا بدیر اسے کہیں اور جاب تلاش کرنا پڑے گی۔ اتفاق کی بات ہے جب وہ کار خرید کر آ رہا تھا تو ایک دفتری کولیگ نے اسے دیکھ لیا اور اس نے چند دن میں پورے دفتر میں یہ بات پھیلا دی۔ وہ دوسرے شعبے میں کام کرتا تھا اس لیے اس کے شعبے تک آنے میں ذرا تاخیر ہوئی تھی اور جیسے ہی آغا نجم الدین تک یہ خبر پہنچی، اس نے فوراً قیصر کو طلب کر لیا۔ اس وقت وہ ایک اہم ڈرائنگ پر کام کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آغا نے اسے کام کے سلسلے میں طلب کیا ہو گا مگر اس نے نہایت عجیب سے انداز میں پوچھا۔

"تم نے نئی کار لی ہے؟"

قیصر چونکا۔ "نئی تو نہیں لیکن نئی جیسی ہے۔ آپ کو کیسے پتا چلا؟"

وہ مسکرایا۔ "تم کیا سمجھتے ہو کہ تم چھپاؤ گے اور بائیک پر آؤ جاؤ گے تو دفتر والوں کو پتا نہیں چلے گا۔"

"میں نے چھپایا نہیں ہے۔ ابھی گاڑی لی ہے، ہاتھ صاف نہیں ہے اور دوسرے میں نے گاڑی گھر کے لیے لی ہے، دفتر کے لیے نہیں...... میں روز دفتر گاڑی میں آنا جانا افورڈ نہیں کر سکتا۔"

آغا نجم الدین نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "گاڑی افورڈ کر سکتے ہو، آنا جانا نہیں کر سکتے۔"

قیصر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔ "سر! میں اس وقت انتہائی اہم ڈرائنگز پر کام کر رہا ہوں اور وہ آپ نے مجھ سے دو دن میں طلب کی ہیں۔ اگر آپ اسی طرح مجھے غیر متعلقہ باتوں کے لیے بلاتے رہے تو میں یہ کام وقت پر مکمل نہیں کر سکوں گا۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟" آغا نجم الدین نے میز پر ہاتھ مارا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، یہاں صرف تم کام کرتے ہو اور باقی لوگ فارغ بیٹھے رہتے ہیں۔"

"میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے۔ اگر آپ نے کچھ اور نہیں کہنا تو میں جا سکتا ہوں؟" قیصر نے کہا اور اس کی طرف سے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر آ گیا۔ عقب میں آغا نجم الدین حسب معمول بکواس کر رہا تھا۔ وہ دبے لہجے میں یوں گالی دیتا کہ لفظ تو واضح نہ ہو مگر دوسرے کی سمجھ میں آ جائے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس وقت بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ قیصر کا خون کھول رہا تھا مگر وہ مجبور تھا، کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اس دن وہ دفتر سے آیا تو اس کا ذہن منتشر تھا اور شاید اسی وجہ سے اسے اپنا وہ تکلیف دہ ماضی یاد آ گیا جسے اس نے اپنے ذہن کے نہاں خانوں میں دفن کر دیا تھا۔ رات بھی یہی یادیں اس کے ذہن میں گردش کرتی رہیں، اس لیے وہ دیر سے سویا اور صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ ہما نے دو تین بار اسے آواز دی تو وہ ہمت کر کے اٹھا اور ضروریات سے فارغ ہو کر اس نے شاور لیا۔ شاور سے اس کی طبیعت کسی قدر بہتر ہوئی تھی۔ ناشتے میں اس نے صرف چائے اور چند پاپے لیے تھے پھر دوا لے کر وہ دفتر روانہ ہو گیا۔ جب وہ دفتر پہنچا تو اسے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ آغا نجم الدین آج دفتر نہیں آیا ہے۔ اس نے سوچا کہ ممکن ہے اس شخص کی اپنی طبیعت خراب ہو گئی ہو جو دوسروں کی طبیعت خراب کر دیتا ہے۔

دوپہر تک وہ دل جمعی سے اپنا کام کرتا رہا، اگرچہ اس کے سر کا درد معمولی سا ہی کم ہوا تھا مگر آغا کے دفتر میں نہ ہونے سے وہ خود کو بہتر محسوس کر رہا تھا۔ لنچ میں اس نے دو سینڈوچز لیے تھے۔ لنچ ہما بنا کر دیتی تھی کیونکہ اسے باہر کھانا پسند نہیں تھا۔ لنچ کے بعد اس نے دوبارہ کام شروع کیا تو اسے عجیب سی بے چینی ہونے لگی۔ اس کا دل وحشت زدہ ہو رہا تھا اور کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ شام تک وہ بے دلی سے کام کرتا رہا۔ اس کے سر کا درد پھر عود آیا اور وہ شدت سے انتظار کر رہا تھا کہ چھٹی ہو اور وہ گھر جا سکے۔ طبیعت خرابی کی وجہ سے اس کا کام بھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اچھا ہوا آج آغا نجم الدین نہیں آیا ورنہ وہ اسے کہاں بخشتا کام مکمل نہ ہونے پر۔ ساڑھے پانچ بجے اس نے اپنی چیزیں سمیٹنا شروع کیں۔

پچھلے دنوں اس کی پیپر نائف گم ہو گئی تھی تو اس نے نئی منگوائی تھی۔ شیخ مشتاق احمد آفس اور سٹیشنری انچارج تھے۔ بہ قول دفتر والوں کے ربر پنسل پر بھی ناگ بن کر بیٹھے رہتے تھے اور کوئی اپنی ضرورت سے جاتا تو بات سننے سے پہلے پھن کاڑھ لیتے تھے۔ ان سے کوئی چیز نکلوانا سانپ کے منہ

سے زہر نکلوانے جتنا مشکل تھا۔ زیادہ تر اس بات پر کڑھتے کہ دفتر والے چیزوں کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ کئی بار یاددہانیوں کے بعد آج نیا پیپر نائف ملا تھا اور وہ اس کی میز پر رکھا تھا۔ چھ بجے کے انتظار میں قیصر پیپر نائف سے کھیلنے لگا۔ اچانک ہی اسے باہر سے آغا نجم الدین کی آواز آئی اور اس کا دل ڈوب گیا۔ اس نے تشویش سے سوچا کہ یہ اس وقت کہاں سے آ گیا؟ اس کے ساتھ ہی اس کے سر کا درد بڑھنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ وہ اسے طلب نہ کرے مگر اس کی دعا قبول نہ ہوئی۔ چند لمحے بعد آغا نجم الدین کی طرف سے بلاوا آ گیا اور وہ اٹھ کر اس کے کمرے تک آیا۔ آغا کا موڈ معمول سے زیادہ خراب لگ رہا تھا، اس نے قیصر سے پوچھا۔ ''کام ہو گیا؟''

''کون سا سر؟''

''کون سا سر۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''کیا نواب صاحب کے سر بہت سے کام ہیں جو یوں پوچھ رہے ہیں۔ میں اس کام کا پوچھ رہا ہوں جو تمہیں کل دیا تھا۔''

''وہ نہیں ہو سکا آج میری طبیعت......''

''نہیں ہو سکا۔'' آغا اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ ''میں صرف اس کام کی خاطر تیس میل دور سے ڈرائیو کر کے آ رہا ہوں اور تم کہہ رہے ہو کہ وہ مکمل نہیں ہوا۔''

قیصر کے سر میں اب لہریں سی اٹھنے لگی تھیں۔ اس نے بہ مشکل کہنا چاہا۔ ''میری طبیعت......''

''جہنم میں گئی تمہاری طبیعت۔'' آغا نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور اس کے پاس آ کر اس کے سینے پر انگلی رکھی۔ ''تم نے نااہلی اور کام چوری کی انتہا کر دی ہے۔ خود کو آج اور اسی وقت جاب سے فارغ سمجھو۔''

اس نے بے یقینی سے آغا کو دیکھا۔ ''کیا...... کیا کہا تم نے...... مجھے جاب سے نکال رہے ہو؟''

''ابھی اور اسی وقت۔ مسٹر قیصر جمال یو آر فائر۔'' آغا بولا اور لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی تھی۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور تب قیصر نے دیکھا اس کے ہاتھ میں موجود پیپر نائف آغا کے سینے میں اترا ہوا تھا۔ عجیب بات تھی کہ اسے یہ دیکھ کر کوئی پریشانی یا بوکھلاہٹ نہیں ہوئی بلکہ اسے یہ منظر اچھا لگا۔ اس نے پیپر نائف واپس کھینچا اور فوارے کی طرح اچھلنے والے خون کی پروا کیے بغیر اسے دوبارہ آغا کے سینے میں اتار دیا اور اسے...... ایسا کرتے ہوئے بہت لطف آیا۔ دوسرے وار پر آغا کراہ کر نیچے گرنے لگا تو قیصر بھی اس کی طرف جھکا اور جب دفتر کے لوگوں نے آ کر اسے قابو کیا تو وہ اس پر پے در پے وار کر رہا تھا اور ایک ہی جملہ کہہ رہا تھا۔

''تم مجھے جاب سے نکالو گے۔''

☆☆☆

سلاخوں کے دوسری طرف ہما سہمی ہوئی روما کو ساتھ لگائے بیٹھی تھی اور سلاخوں کے اس طرف قیصر تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی اور چہرہ ستا ہوا تھا مگر اس کے چہرے اور جسم پر تشدد کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اس نے رضاکارانہ اعتراف جرم کر لیا تھا کہ اس نے اشتعال میں آ کر آغا نجم الدین کو قتل کیا تھا۔ پولیس کے لیے یہ آسان کیس تھا۔ اس کا صرف سات دن کا ریمانڈ لیا گیا اور چالان عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ ہر مرحلے میں قیصر نے اپنے جرم کا اقرار کیا۔ مگر پولیس نے بنا کسی تفتیش کے اس کے خلاف تین سو دو کا مقدمہ بنا دیا۔ سیشن کورٹ نے اسے پھانسی کی سزا سنائی۔ ہما نے اس کے لیے جو وکیل کیا تھا، اس نے ہائی کورٹ میں درخواست کی مگر وہاں سے اپیل مسترد ہو گئی اور پھر سپریم کورٹ نے بھی اپیل مسترد کر دی۔ آج اسے اطلاع ملی تھی کہ اس کی اپیل صدر مملکت نے بھی مسترد کر دی تھی۔ ہما کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ قیصر نے کہا۔

''مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہیں اور روما کو اس دنیا میں بے یار و مددگار چھوڑ کر جا رہا ہوں۔''

''پلیز! ایسا نہ کہیں۔'' ہما بولی۔ ''آپ نے ہمارے لیے بہت کیا ہے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ میرے بعد تمہیں کوئی مشکل نہ ہو اس لیے میں نے وصیت کی ہے کہ مجھے سرکاری طور پر دفنا دیا جائے۔''

ہما اب شدت سے رو دی اور اس کی دیکھا دیکھی روما بھی رونے لگی۔ قیصر بھی رو رہا تھا مگر اس کے پاس تسلی کے الفاظ نہیں تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اپنی بیوی اور بچی کو اس دنیا میں چھوڑ کر جا رہا ہے جہاں زندگی ہرگز آسان نہیں ہے۔ وہ ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا ڈیتھ وارنٹ جاری ہو گیا تھا۔ یہ اس کی ہما اور روما سے آخری ملاقات تھی۔ دو دن بعد اسے پھانسی دی جانی تھی۔ اسے لگا جیسے یہ سب بہت تیزی سے ہو گیا ہو۔ آغا نجم الدین کے قتل سے لے کر پھانسی گھاٹ تک کا سفر اس نے جیسے منٹوں میں طے کر لیا تھا۔ ملاقات کا وقت ختم ہوا تو ہما اور روما بہ مشکل وہاں سے اٹھے۔ ان کے جانے کے بعد بھی وہ روتا رہا۔ اپنی زندگی کی آخری رات وہ جاگتا رہا۔ اسے رہ رہ کر یہی خیال

آرہا تھا کہ کاش کسی طرح وہ اپنی زندگی میں واپس جا سکے۔ کاش سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔

جب اسے پھانسی گھاٹ لے جانے کے لیے کوٹھری سے نکالا اور گھاٹ تک لایا گیا تب اس نے دیکھا کہ وہاں موجود افراد میں ڈاکٹر عزیز خان بھی تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر عزیز یہاں کیوں آیا ہے کیا وہ اس سے آخری بار ملنے آیا ہے؟ مگر اس نے قیصر سے ملاقات یا بات نہیں کی بس دور سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے گھاٹ پر چڑھایا گیا اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھ کر جلاد نے اس کے گلے میں رسا ڈالا پھر اس کے چہرے پر غلاف پہنا دیا۔ آنکھوں پر غلاف آنے سے پہلے اس نے آخری چہرہ ڈاکٹر عزیز کا ہی دیکھا تھا، وہ اٹھ کر پھانسی گھاٹ کی طرف آرہا تھا۔ پھر اس نے جیلر کی ہلکی سی آواز سنی۔ لیور کھینچنے کی آواز آئی۔ اس کے پیروں تلے تختہ کھل گیا اور وہ خلا میں گرا۔ ایک جھٹکے کے بعد اندھیرا چھا گیا۔ موت کا سا ابدی اندھیرا۔ اب میدانِ حشر میں ہی آنکھ کھلنا تھی۔

☆☆☆

وہ درختوں کے نیچے سے گزشتہ سرما میں خشک ہو کر گر جانے والے پتے جمع کر رہا تھا۔ سخت تنکوں والی جھاڑو جس کے ساتھ لمبا ڈنڈا تھا اور کچرا سمیٹنے والا اسکریپر بھی تھا۔ کچرا اٹھانے والی ٹرالی غلام چلا رہا تھا۔ اس کا نام تو غلام قادر تھا مگر سب اسے وہاں غلام ہی کہتے تھے۔ چھوٹے قد اور مختصر جسم کا یہ سولہ سترہ سالہ لڑکا بہت دبی شخصیت کا مالک تھا۔ وہ کسی سے نظر ملا کر بات نہیں کرتا تھا۔ اس کے چھوٹے سے وجود میں ہمہ وقت بے چینی کی لہریں امنڈتی رہتی تھیں۔ وہ بولتا تو اس کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ ہوتی تھی۔ سردی کی مناسبت سے اس نے شلوار قمیص پر گرم اپر پہن رکھا تھا۔ البتہ وہ ورکر اچھا تھا۔ غلام اور اس کے ذمے یہاں کی بیرونی اور اندرونی صفائی تھی۔ یہ جگہ شہر سے کچھ دور پہاڑوں میں تھی اور شہر جانے والی ہائی وے یہاں سے کچھ فاصلے سے گزرتی تھی۔

وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی یہ جگہ کئی عمارتوں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے ایک عمارت میں غلام اور اس جیسے لوگ رہتے تھے جو یہاں علاج کے لیے آتے تھے۔ وہ علاج گاہ میں رہتا تھا مگر وہ علاج کے لیے نہیں آیا تھا۔ اس کی رہائش لکڑی سے بنے ایک چھوٹے سے کیبن میں تھی۔ عمارتوں، درختوں اور باغات کے گرد ایک بڑا سا احاطہ تھا اور کیبن اسی احاطے کے ایک کونے میں سب سے الگ تھلگ تھا۔ ڈیوٹی کا کوئی وقت مخصوص نہیں تھا۔ وہ صبح ناشتے کے بعد کام میں لگ جاتا اور شام تک کام کرتا رہتا تھا۔ کھانا میس میں ملتا تھا۔ باقی سب وہیں کھاتے تھے لیکن اس کا دل چاہتا تو اپنے لیے پیک کروا کر لے آتا اور اپنے کیبن میں کھاتا تھا۔ باقی سب میس میں کھانے کے پابند تھے۔ آٹھ بجے ان کی عمارت کے دروازے بند کر دیے جاتے تھے۔

وہ آزاد تھا۔ جب دل چاہتا اپنے کیبن سے نکل آتا اور احاطے میں موجود جنگل میں گھومتا پھرتا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تو احاطے سے نکل کر قریبی پہاڑیوں اور چٹانوں تک بھی چلا جاتا۔ یہاں ایک وسیع چٹان تھی جس کے اوپر جانا آسان نہیں تھا مگر اس نے راستہ تلاش کر لیا تھا۔ چٹان کے اوپر سے سورج طلوع ہونے اور ڈوبنے کا نظارہ ایک ناقابل بیان تجربہ ہوتا تھا اور ہر بار جب وہ اس تجربے سے گزرتا تو اسے بالکل نیا سا لگتا تھا۔ یہ جگہ ڈاکٹر اطہر وقار... ...کی تھی۔ ڈاکٹر اطہر تقریباً ساٹھ سال کا، نرم چہرے اور ہمدرد طبیعت والا شخص تھا۔ وہ سائیکاٹرسٹ تھا اور اس نے یہاں اپنی علاج گاہ قائم کی تھی۔ وہ یہاں آنے والے مریضوں کا پوری توجہ سے علاج کرتا تھا اور اس نے عام نفسیاتی علاج گاہوں کے مقابلے میں یہاں کا ماحول بالکل منفرد رکھا تھا۔ ویسے یہاں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ مشکل سے ایک درجن افراد تھے۔

عملے میں ڈاکٹر کے علاوہ دو اس کے نائب تھے اور دو ہی پیرامیڈک کے افراد تھے۔ ان کا اصل کام قابو سے باہر ہو جانے والے مریضوں کو قابو کرنا تھا۔ ڈاکٹر سیفی اور ڈاکٹر زین صبح آتے اور شام کو چلے جاتے تھے۔ البتہ پیرامیڈک سلطان اور رفیق یہیں رہتے تھے۔ ان کی رہائش مریضوں کی رہائشی عمارت کے ساتھ ہی تھی۔ اسپتال کی عمارت الگ تھی۔ ایک اور عمارت تھی جو دفتر کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ ڈاکٹر اطہر کی رہائش شہر میں تھی اور وہ ہفتے میں چار دن دو دو گھنٹے کے لیے یہاں آتا تھا۔ البتہ کسی ایمرجنسی میں اس کی ضرورت پڑتی تو وہ ایک گھنٹے میں آجاتا تھا۔ احاطے کے گیٹ کے ساتھ چوکی میں گارڈ شمس رہتا تھا۔ اس کی بھی چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی تھی۔ باورچی شوکت اور اس کا نائب صبح آتے اور رات کو جاتے تھے۔ یہاں کی دیکھ بھال اور صفائی ستھرائی اس کے اور غلام قادر کے سپرد تھی۔ کبھی کبھی کوثر نامی آدمی بھی آجاتا تا مگر ہفتے میں ایک دو دن ہی اس کی طبیعت ٹھیک ہوتی تھی۔ اسے لرزہ طاری رہتا تھا۔ اس کیفیت میں اس سے کھانا بھی نہیں کھایا جاتا تھا اور اسے کھانا کوئی اور

کھلاتا تھا۔

سرما ختم ہونے کے قریب تھا اور درختوں اور پودوں پر نئے پتے نمودار ہو رہے تھے مگر سردی ابھی برقرار تھی۔ گرم کپڑوں کے بغیر گزارہ نہیں تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے چھ مہینے ہونے والے تھے۔ اس عرصے میں وہ یہاں کی ایک ایک چیز سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ کم سے کم وہ جہاں کام کرتا ان جگہوں کو جاننے لگا تھا۔ سوائے دفتر کی عمارت کی ایک راہداری کے جہاں اسے یا کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ شروع میں اسے یہاں وحشت سے ہوتی تھی مگر رفتہ رفتہ اس کا دل لگ گیا۔ یا شاید اس نے اپنے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ آج صبح ناشتے کے بعد اس نے غلام سے کہا کہ آج وہ عقبی باغ کی صفائی کریں گے۔ غلام کسی بات سے انکار نہیں کرتا تھا۔ وہ صفائی کے سامان کے لیے مخصوص اسٹور تک آئے اور وہاں سے سامان لے کر انہوں نے صفائی کا عمل شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ وہ باغ کے آخری حصے تک چلے آئے۔ یہاں سے ہائی وے اور اس کے ساتھ گزرتے بجلی اور فون کے کھمبے اور تار دکھائی دیتے تھے۔ غلام کن انکھیوں سے اسی سمت دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھا کہ غلام نے کہا۔ ”وہ ہر وقت ہمیں دیکھتے ہیں۔“

”کون؟“

مگر غلام نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکائے ٹرالی چلا رہا تھا۔ تب اس نے دیکھا دور ہائی وے کے ساتھ ایک کھمبے پر ایک آدمی چڑھا ہوا ہے اور... بہ ظاہر وہ وہاں مرمت کا کام کر رہا تھا۔ اس کے پاس اوزاروں والا بیگ بھی تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا غلام نے اس شخص کی طرف اشارہ کیا ہے مگر کوئی ان کی نگرانی کیوں کرے گا اور وہ بھی اس طرح سے۔ لنچ کا وقت قریب تھا۔ اس نے غلام کے ساتھ مل کر کچرا احاطے میں موجود ایک گڑھے میں ڈالا۔ یہ کچرے کے لیے مخصوص تھا اور جب کچرا ایک حد سے زیادہ ہو جاتا تو وہ اسے آگ لگا دیتے تھے۔ اس میں جمع ہونے والی راکھ وہ پودوں اور درختوں میں ڈالتے تھے۔ واپسی میں اس نے غلام سے پوچھا۔

”تم نے یہ بات کیوں کی؟“

اس نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ”میں محسوس کرتا ہوں۔“

انہوں نے سامان واپس اسٹور میں رکھا۔ وہ میس میں آئے وہاں دو افراد نہیں تھے اور اس کا مطلب تھا کہ ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ انہیں ان کے کمروں سے باہر آنے کی اجازت ملتی۔ ان میں ایک رفیع زمان بھی تھا۔ یہ جوان اور خوب صورت شخص اکثر اپنے کمرے میں بند رہتا تھا۔ جب اسے دورہ پڑتا تو وہ بہت مشکل سے قابو میں آتا تھا۔ اسی بنا پر اسے بہت کم کمرے سے باہر آنے کی اجازت ملتی تھی۔ کن افراد کو باہر نکالنا ہے اور کن کو ان کے کمروں میں رکھنا ہے، یہ فیصلہ ڈاکٹر سیفی اور ڈاکٹر زین کرتے تھے۔ وہ سلطان اور رفیق کو ہدایت دیتے اور وہ عمل کرتے تھے۔ جب مریض باہر ہوتے تو وہ ان کے آس پاس ہی موجود رہتے تھے۔ اس وقت بھی وہ میس میں موجود بہت چوکنا تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ کوئی بالکل... پُرسکون نظر آنے والا فرد اچانک ہنگامہ آرائی پر اتر آیا یا اسے دورہ پڑ گیا تو سلطان اور رفیق کو فوری طور پر حرکت میں آنا پڑتا تھا۔ وہ اور غلام اپنے لیے دال چاول اور فنگر فرائی لے کر ایک میز پر آ گئے۔

باورچی شوکت کھانا اچھا بناتا تھا۔ ڈاکٹر اطہر کا کہنا تھا کہ اچھی صحت کے لیے اچھی خوراک لازمی ہے۔ ناشتے میں انہیں ابلا ہوا انڈا، دودھ کا گلاس اور شہد لگے سلائس دیے جاتے تھے۔ دوپہر کے کھانے میں دال، چاول اور کوئی سبزی ہوتی تھی جبکہ رات کو چکن، بیف، مٹن یا فش کی کوئی ڈش ہوتی تھی۔ ہفتے میں تین بار رات کو سویٹ ڈش بھی دی جاتی تھی۔ یہ متوازن خوراک مریضوں کی صحت کے لیے بہترین تھی۔ جب وہ یہاں آیا تو اس کی صحت بہت گری ہوئی تھی اور اس کی ہڈیاں نکل آئی تھیں مگر اب وہ تقریباً پہلے جتنا صحت مند تھا۔ غلام بہ ظاہر تو کھانے میں لگ گیا مگر اس کی اضطرابی کیفیت مزید بڑھ گئی تھی۔ اس نے اچانک دھیمی آواز میں کہا۔ ”وہ ہمیشہ دیکھتے رہتے ہیں... کیا تم نے کبھی محسوس نہیں کیا؟“

”نہیں۔“ اس نے غیر ارادی طور پر کہا اور پھر خاموشی سے کھانے لگا۔ کھانے کے بعد وہ میس سے نکلا اسے یاد آیا کہ دفتر والی عمارت کے کچھ حصے صاف کرنے تھے۔ پہلے اس نے غلام کو ساتھ لینے کا ارادہ کیا مگر پھر اس نے سوچا کہ چھوٹا سا کام ہے وہ آسانی سے کر سکتا ہے۔ اس نے صفائی کا سامان لیا اور عمارت میں آیا۔ اس نے پہلے ان دو کمروں کی صفائی کی جہاں ڈاکٹر سیفی اور ڈاکٹر زین بیٹھتے تھے۔ یہاں صرف فائلیں تھیں یا دفتری سامان تھا۔ اسپتال میں مختلف آلات اور مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ جب ان مشینوں اور آلات کو دیکھتا تو اسے عجیب سا خوف محسوس ہوتا تھا اور وہ اللہ کا شکر ادا کرتا کہ وہ مریض نہیں ہے ورنہ اسے بھی ان مشینوں اور آلات کی تھراپی سے گزرنا پڑتا۔ اسے

ان کے فنکشن کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا اس کے باوجود اسے ان سے خوف آتا تھا۔

کمروں کی صفائی سے فارغ ہو کر وہ راہداری میں آیا اور ڈاکٹر اطہر کے دفتر کی طرف بڑھا جو راہداری کے سرے پر تھا۔ راہداری سے گزرتے ہوئے اس نے پہلی بار اس دروازے کو کھلا دیکھا۔ یہ دھات کا بنا ہوا دروازہ تھا جس کے اوپری حصے میں شیشہ لگا ہوا تھا۔ اس سے پہلے اس نے یہ دروازہ ہمیشہ مقفل دیکھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دروازے کے اندر ایک طویل سرنگ نما راہداری تھی جو آگے جا کر دائیں طرف مڑ رہی تھی مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ سرنگ کہاں جا رہی تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ یہ سرنگ نما راستہ اسپتال والی عمارت کو دفتر کی عمارت سے ملاتا تھا۔ جب اس نے پہلی بار صفائی کے دوران اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کی اور وہ لاک نکلا تو اس نے غلام سے وجہ پوچھی۔ اس نے جواب دیا۔ ”یہ ہمیشہ بند رہتا ہے۔ یہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

”تب یہاں کی صفائی کون کرتا ہے؟“

غلام کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کے بعد اس نے ہمیشہ اس دروازے کو مقفل دیکھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ جب اس نے یہ دروازہ کھلا پایا۔ وہ آگے آیا اور اس نے اندر جھانکا۔ اسے وہی منظر دکھائی دیا جو دروازے کے اوپر لگے شیشے سے جھانکنے پر نظر آتا تھا۔ یہ ایک چوکور سرنگ تھی۔ سرنگ کوئی چار فٹ چوڑی، سات فٹ اونچی اور کوئی تیس فٹ لمبی تھی۔ اس کے بعد یہ دائیں طرف مڑ رہی تھی۔ سرنگ میں ہر دس قدم کے بعد ایک سیلنگ لائٹ تھی۔ وہ ہچکچایا پھر اندر آیا۔ صفائی کا سامان اس کے ہاتھ میں تھا اور اس نے محسوس کیا کہ سرنگ کی بہت کم صفائی ہوتی تھی۔ اندر گرد مٹی تھی اور دیواروں پر بھی جالے لگے ہوئے تھے۔ اس نے بالٹی رکھی اور جھاڑن لے کر ایک طرف دیوار پر لگے جالے صاف کرنے لگا کہ اچانک ڈاکٹر اطہر اندر سے نمودار ہوا اور اسے دیکھ کر رک گیا۔ وہ ہمیشہ مسکرا کر نرمی سے بات کرتا تھا مگر اس وقت اس نے رکھائی سے کہا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”میں صفائی کرنے آیا تھا۔ یہ دروازہ کھلا دیکھا تو رک گیا۔ یہاں بہت گندگی ہو رہی ہے۔“ اس نے صفائی پیش کی۔

مگر ڈاکٹر نے اس کی وضاحت نہیں سنی۔ ”یہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔ دروازہ کھلا ہو تب بھی کوئی یہاں نہیں آ سکتا۔“

ڈاکٹر اطہر کا اشارہ واضح تھا۔ اس نے سامان اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر بھی باہر آیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے اسے چابی سے لاک کر دیا اور پھر اس کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ اسے ڈاکٹر کا رویہ کچھ عجیب سا لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ڈاکٹر کو اس کا یہاں رک کر کھلے دروازے کو دیکھنا اور اندر جانا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے شانے اچکائے اور سامان لے کر عمارت سے نکل آیا۔ سامان رکھ کر وہ اپنے کیبن میں آ گیا۔ یہ ایک کمرے اور ایک واش روم پر مشتمل کیبن تھا۔ ایک تار کی مدد سے یہاں بجلی آ رہی تھی۔ اندر آ کر اس نے روشنی کی اور ایک طرف لگے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اس کی شیو کسی قدر بڑھی ہوئی تھی۔ اب وہ ریزر نہیں پھیرتا تھا بلکہ ہفتے میں دو بار باریک مشین پھیر لیتا تھا۔ شروع میں اس کا چہرہ ستا ہوا اور آنکھوں کے گرد حلقے ہوا کرتے تھے مگر اب وہ بہتر لگ رہا تھا۔

اسے پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے پانی پیا اور باہر کیبن کی سیڑھیوں پر آ بیٹھا۔ اسے یہ جگہ اچھی لگتی تھی کیونکہ اس کے سامنے چھوٹا سا جنگل تھا۔ اس میں یوکلپٹس اور چھوٹے سدابہار کے درخت لگے تھے۔ درمیان میں پگ ڈنڈیاں تھیں۔ جنگل کے پار وہ راستہ تھا جو احاطے کے گیٹ کی طرف جاتا تھا۔ گیٹ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اچانک آسمان پر زور سے بادل گرجے۔ اس نے اوپر دیکھا بادل دور مغرب میں تھے اور یہاں آسمان صاف تھا مگر بادلوں کو یہاں آنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ دس منٹ میں آسمان کالے بادلوں سے بھر گیا۔ پہلے ہلکی بوندا باندی ہوئی اور اس کے بعد بارش تیز ہو گئی۔ پانی خاصا سرد تھا اس لیے اسے اٹھ کر اندر آنا پڑا۔ اسے بارش اور تاریک موسم اچھا نہیں لگتا تھا۔

اس نے سوچا کہ آج پچھلے باغ کی صفائی کر کے اچھا کیا ورنہ بھیگے پتے اور کچرا صاف کرنا مشکل ہو جاتا۔ شام تک وہ آرام کرتا رہا۔ چھ بجے بارش رک گئی مگر بادلوں کے گھنے پن میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی وقت بھی دوبارہ بارش شروع ہو جائے گی۔ سات بجے بارش پھر شروع ہوئی مگر اس بار اس کا انداز دھیما تھا۔ رات کے کھانے کا وقت قریب تھا۔ کچھ دیر بعد وہ کیبن سے نکلا اور اپنی جیکٹ کا ہڈ سر پر رکھ کے تیز قدموں سے میس تک آیا۔ وہ اندر آیا تو وہاں رفیع موجود تھا۔ وہ اسی کی میز پر آ گیا۔ ”دوپہر میں تم نہیں آئے تھے؟“

"ہاں میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" رفیع زمان نے کہا۔ "اب بھی میرے پاؤں میرے قابو میں نہیں ہیں۔"

"میں تمہارے لیے بھی کھانا لے آتا ہوں۔" اس نے پیشکش کی اور اٹھ کر کچن تک آگیا۔ شوکت نے آج مٹن کڑاہی بنائی تھی۔ اس کے ساتھ روٹیاں اور سلاد تھی۔ اس نے اپنے ساتھ رفیع کے لیے بھی کھانا لیا اور میز پر آگیا۔ کھانے کے دوران رفیع زمان نے اسے آگاہ کیا۔

"میں زیادہ عرصے یہاں نہیں رہوں گا۔ جلد یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"وہ کیسے؟" اس نے پوچھا۔

"بس تم دیکھ لینا۔" اس بار رفیع کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔ "یہ لوگ مجھے زیادہ دیر قید نہیں کر سکیں گے۔"

کچھ عرصے پہلے رفیع عمارت سے نکلنے میں کامیاب رہا تھا اور وہ اس چٹان پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جو اسے بہت پسند تھی۔ سلطان اور رفیق نے عین موقع پر اسے جا لیا تھا۔ اسے بڑی مشکل سے قابو کیا تھا کیونکہ وہ صحت مند اور مضبوط آدمی تھا، بالکل قیصر کی طرح۔ اس نے دیکھا کہ سلطان اور رفیق اسے دبوچ کر لا رہے تھے مگر وہ اتنی بری طرح مچل رہا تھا کہ مجبوراً ڈاکٹر زین کو اسے باہر ہی بے ہوشی کا انجکشن دینا پڑا۔ اس نے سلطان اور رفیق کو زخمی کر دیا تھا۔ جب وہ بے ہوش ہوا تب وہ اسے اٹھا کر لے گئے اور پھر اسے کئی ہفتے تک باہر نکلنے نہیں دیا تھا۔ اس نے رفیع کو سمجھایا۔ "ایسی باتیں مت کرو ورنہ یہ تمہیں ایک بار پھر قید کر دیں گے۔"

"مجھے ان کی پروا نہیں ہے۔" رفیع کے لہجے میں حقارت آگئی۔ "یہ مجھے نہیں روک سکتے اور مجھے اپنے پیاروں سے دور نہیں رکھ سکتے۔"

"تم اس چٹان پر کیوں جا رہے تھے؟"

"کیوں جا رہا تھا۔" رفیع نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ میں اپنے پیاروں کے پاس جانا چاہتا ہوں۔"

وہ پوچھتے پوچھتے رہ گیا کہ وہ تھے کہاں؟ اسے یاد آیا اس نے کسی سے سنا تھا کہ اس نے کسی بات پر مشتعل ہو کر اپنے بیوی بچوں کو مار دیا تھا اور میڈیکل بورڈ نے اسے نفسیاتی مریض قرار دیا تھا۔ اسے سزا سنانے کے بجائے اسپتال بھیج دیا اور وہاں سے اسے یہاں بھیجا گیا تھا۔ رفیع تقریباً اس کے ساتھ آیا تھا۔ جب رفیع کو بتایا جاتا کہ اس کے بیوی بچے مر گئے ہیں تو وہ مشتعل ہو جاتا اور پھر اس پر دورہ پڑ جاتا۔ اس لیے اس نے اپنے اوپر قابو پایا ورنہ شاید اس کی زبان سے نکل جاتا۔ کھانے کے بعد اس نے شوکت اور اس کے نائب کی مدد کی اور کچن صاف کیا۔ رات میں چائے اور کافی بھی دی جاتی تھی۔ اس نے اپنے لیے پیک ہونے والے کاغذی کپ میں کافی لی اور اپنے کیبن کی طرف آیا۔ بارش بدستور جاری تھی۔ خنک ہوا کے تیز جھونکے آ رہے تھے۔ اس نے اندر آ کر اپنا کپ کھولا اور کافی کی گرمی اور خوشبو سے لطف اندوز ہونے لگا۔

اسے ہمیشہ سے کافی پسند تھی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اسے تو بہت کچھ پسند تھا مگر وہ سب اسے واپس نہیں مل سکتا تھا۔ کیوں نہیں مل سکتا تھا؟ یہ سوال اکثر اس کے ذہن میں آتا اور اس کا ایک ہی جواب تھا۔ وہ دنیا کے لیے مر چکا تھا۔ کیبن کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اسے خنک ہوا کے جھونکے اچھے لگ رہے تھے اس لیے اس نے دروازہ بند نہیں کیا اور اسی لیے ڈاکٹر عزیز کو اندر آنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس کا لمبا کوٹ پانی میں شرابور تھا مگر وہ ٹھیک لگ رہا تھا۔ اس نے اندر آ کر اپنا کوٹ جھاڑا اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "میرا خیال ہے تم اسی بارے میں سوچ رہے تھے۔ میں بروقت آیا نا؟"

"تم ہمیشہ بروقت آتے ہو۔" قیصر کا لہجہ سرد ہو گیا۔

"یہ میرا فرض ہے کہ تمہیں غلط سوچوں اور غلط عمل سے محفوظ رکھوں۔ یہ میری ذمے داری ہے کیونکہ میں نے ہی تمہیں یقینی موت کے پھندے سے بچایا اور یہاں پہنچایا۔"

"کاش کہ تم ایسا نہ کرتے۔"

ڈاکٹر عزیز اس کے سامنے کرسی پر ٹک گیا۔ "یہ ضروری تھا کیونکہ تم سزائے موت کے حق دار نہیں تھے۔"

قیصر نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم نے مجھے بتایا کہ یہ سب ایک خصوصی حکم نامے کے تحت ہوا۔ تم نے وہ حکم نامہ کیسے حاصل کیا؟"

"میڈیکل بنیادوں پر۔" ڈاکٹر عزیز نے جواب دیا۔ "تم بھول رہے ہو، میں شروع سے تمہارا ڈاکٹر رہا ہوں۔ میرے پاس تمہاری مکمل میڈیکل ہسٹری رہی ہے۔"

"لیکن اس طرح سے دنیا کو دھوکا دے کر مجھے یہاں بھیج دینا؟"

"یہ ضروری تھا ورنہ آغا نجم الدین کے لواحقین اسے پھر کورٹ تک لے جاتے۔ اسی وجہ سے تمہاری شناخت بھی بدل گئی۔"

''مگر کیوں؟''

''تمہاری جان بچانے کے لیے یہ سب کرنا ضروری تھا۔'' ڈاکٹر عزیز نے ہمیشہ کی طرح حتمی جواب دیا اور کھڑا ہوگیا۔ ''یاد رکھنا اب ماضی سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''یہاں مجھے کس حیثیت سے بھیجا گیا ہے کیونکہ یہاں کوئی مجھے قیصر جمال کے نام سے نہیں جانتا۔ سب مجھے جہانگیر احمد سمجھتے ہیں۔ میں یہاں مریض نہیں ہوں کیونکہ مجھے مریضوں والی عمارت میں پابند نہیں رکھا گیا اور میں یہاں ملازم بھی نہیں ہوں کیونکہ مجھے کوئی تنخواہ نہیں ملتی۔ میں اپنی مرضی سے کام کرتا ہوں۔ میری کیا حیثیت ہے یہاں؟''

''تم نے ٹھیک کہا۔ تم نہ مریض ہو اور نہ ملازم ہو لیکن تمہیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے اور تم اسی وجہ سے بچے ہوئے ہو۔ سوچو اگر تمہاری حقیقت سامنے آجائے تو کیا تم کو دوبارہ تختۂ دار پر نہیں چڑھا دیا جائے گا؟''

قیصر کو جھٹکا سا لگا۔ یہاں آنے کے بعد یہ ڈاکٹر عزیز سے اس کی دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب اسے ایک وین میں ہوش آیا اور ڈاکٹر عزیز اس کے پاس تھا۔ وہ سمجھا کہ یہ خواب تھا جو اس نے دیکھا تھا مگر ڈاکٹر عزیز نے اسے بتایا کہ نہ یہ خواب ہے اور نہ وہ خواب تھا جو اس نے دیکھا تھا۔ اسے سچ مچ پھانسی کے پھندے پر لٹکایا گیا تھا مگر ساتھ ہی ایسا بندوبست کیا گیا تھا کہ اس کی موت واقع نہ ہو۔ جیل کے ڈاکٹر کے بجائے ڈاکٹر عزیز نے اس کی موت کی تصدیق کی اور کسی نے شک نہیں کیا۔ اس نے آئینے میں اپنے گلے پر آنے والا رسی کا نشان دیکھا تو اسے یقین آیا۔ اس نے اس وقت بھی یہی سوال کیے تھے جو آج کیے تھے اور اس وقت بھی ڈاکٹر عزیز نے یہی جواب دیے تھے۔ پھر اس نے اسے ڈاکٹر اطہر کی علاج گاہ میں اس کے حوالے کیا۔

اس نے راستے میں ہی اسے سمجھا دیا تھا کہ اب وہ جہانگیر احمد ہے اور اسے یہاں بہ طور مددگار رکھا جائے گا۔ وہ اپنے بارے میں کسی سوال کا جواب نہ دے اور نہ ہی کوئی اس سے سوال کرے گا اور ایسا ہی ہوا۔ ڈاکٹر اطہر نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور اسے اگلے ہی دن اس کیبن میں رہائش دے دی گئی۔ اس کے ذمے کوئی کام نہیں تھا۔ ڈاکٹر اطہر نے اس سے کہہ دیا کہ وہ اپنے لیے جو ذمے داری چاہے چن لے اور اسے اپنی مرضی سے نبھائے۔ وہ کسی کا ماتحت نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی اسے کسی قسم کا حکم یا ہدایت دے گا۔ پھر سچ مچ ایسا ہی ہوا۔ آغاز میں وہ بہت جھجک رہا تھا مگر رفتہ رفتہ اس نے ایک قسم کی آزادی محسوس کی۔ وہ جہاں چاہتا آجا سکتا تھا، کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ تین وقت اسے میس کی طرف سے کھانا ملتا تھا۔ اسے دن میں کئی بار چائے پینے کی عادت تھی۔ اسے چائے بنانے کا سامان مہیا کر دیا گیا۔ کیبن میں ایک برقی کیتلی تھی، وہ اس میں چائے بناتا تھا۔ اس کے پاس چند برتن تھے۔ جب وہ اپنا کھانا پیک کرا کے لاتا تو ان برتنوں کو استعمال کرتا تھا۔ اسے ہر شے میسر تھی۔ اس کے علاوہ اسے جس چیز کی ضرورت ہوتی وہ لکھ کر ڈاکٹر اطہر کو دے سکتا تھا اور اسے جلد ہی وہ چیز فراہم کر دی جاتی۔ شروع میں اسے یہاں رہنا کھانا پینا اور چیزیں لینا عجیب سا لگتا تھا مگر جب اس نے یہاں اپنی ذمے داری سنبھالی تو وہ مطمئن ہوگیا کہ اسے جو مل رہا تھا، وہ اس کا حق تھا۔ پہلے اس کے پاس رقم نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی اسے کبھی ضرورت محسوس ہوئی لیکن ایک دن ڈاکٹر اطہر نے اسے اپنے دفتر میں بلا کر ایک لفافہ دیا۔ اس نے پوچھا کہ اس میں کیا ہے تو ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''کچھ رقم ہے۔''

''مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

ڈاکٹر اطہر نے اصرار کیا۔ ''ممکن ہے تمہیں کہیں ضرورت پڑ جائے۔''

اس نے شکریہ ادا کر کے لفافہ لے لیا۔

اس کے باوجود وہ شروع دنوں میں بہت بے چین رہا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ ایسا کہاں ہوتا ہے اور ہمارے یہاں ایسا کب ہوتا ہے کہ کسی کو پھانسی کے پھندے سے اتار کر اس کی شناخت بدل کر کہیں بھیج دیا جائے۔ جب ڈاکٹر عزیز اسے یہاں چھوڑ کر گیا تو بہت دنوں تک اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ آزاد ہے۔ ایک بار وہ ڈرتے ڈرتے باہر نکلا اور اسے کسی نے نہیں روکا۔ وہ ایسے ہی بلا مقصد آس پاس گھومتا رہا۔ اس کے بعد اس کا اعتماد کسی قدر بحال ہوا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تو وہ آس پاس گھومنے چلا جاتا تھا۔ ہائی وے کے ساتھ چند گھر تھے اور یہاں سے گزرنے والوں کے لیے چند دکانیں تھیں۔ وہ وہاں چلا جاتا تھا۔ وہ لکڑی کی بینچ پر بیٹھ کر گزرتی گاڑیوں کو دیکھا کرتا تھا۔

اگلے دن موسم بہت صاف تھا اور تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ہوا میں دھلی ہوئی تازگی تھی۔ ناشتے اور کام سے فارغ ہو کر اس نے باہر جانے کا سوچا اور احاطے سے نکل آیا۔ احاطے سے ہائی وے تک نیم کچا راستہ تھا۔ اس میں ٹائروں والی جگہ پکی تھی۔ درمیان اور کناروں پر گھاس اگی

ہوئی تھی۔ وہ درمیانی گھاس پر چلتا ہوا ہائی وے تک آیا۔ موسم صاف ہونے کی وجہ سے ہائی وے پر ٹریفک رواں تھا۔ وہ اسٹور تک آیا اور اس کے آگے فٹ پاتھ پر لگی بنچ پر بیٹھ گیا۔ چند ایک گاڑیاں کھڑی تھیں اور لوگ اپنی ضرورت کی اشیا لے رہے تھے۔ ایک آدمی اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ جب سے قیصر یہاں آیا تھا، اس نے اخبار نہیں دیکھا تھا۔

اسٹور سے دو بچے اور ایک عورت نکلی۔ وہ اس گاڑی کی طرف آئے۔ آدمی نے اخبار تہ کر کے نزدیک موجود ڈسٹ بن میں ڈال دیا اور کار اسٹارٹ کرنے لگا۔ جیسے ہی عورت اور بچے بیٹھے اس نے کار آگے بڑھا دی۔ اس کا رخ پہاڑوں کی طرف تھا۔ کچھ دیر میں باقی کاریں بھی وہاں سے روانہ ہوگئیں۔ قیصر کچھ دیر بیٹھا رہا پھر اٹھ کر ڈسٹ بن کی طرف بڑھا اور اس میں سے اخبار نکال لیا۔ اخبار تازہ تھا اور آدمی نے شاید راستے میں لیا تھا۔ قیصر نے اسے لپیٹ کر اپنے اپر کے اندر کر لیا۔ وہ واپس احاطے کی طرف چل پڑا۔ ہائی وے کسی قدر بلندی پر تھی مگر یہاں سے احاطے کی عمارتیں بہ مشکل ہی دکھائی دیتی تھیں۔ اسے غلام کی بات یاد آئی اور اس نے سر جھٹکا۔ ''ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی کھمبوں پر چڑھ کر صرف ہماری نگرانی کرے۔''

وہ سست قدموں سے راستے کے بیچ میں اگی نم گھاس پر چل رہا تھا کہ عقب سے ہارن کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک چھوٹی سرخ کار تھی جس میں ایک سرخ چہرے والی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے ساکت پا کر لڑکی نے پھر ہارن دیا تو اس نے ایک طرف ہو کر راستہ دیا مگر لڑکی کار گزار کر لے جانے کے بجائے اس کے نزدیک آکر رکی اور فرنٹ سیٹ کا شیشہ نیچے کر کے کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''ایکسکیوزمی...... کیا یہ راستہ ڈاکٹر اطہر کی علاج گاہ تک جاتا ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔ لڑکی نے جانے کے بجائے پھر سوال کیا۔ ''تمہارا تعلق بھی علاج گاہ سے ہے؟''

اس نے پھر سر ہلایا اور منہ سے اس بار بھی کچھ نہیں کہا۔ لڑکی نے دروازہ کھول دیا۔ ''آجاؤ۔''

''نہیں شکریہ، میں چلا جاؤں گا۔'' اس نے کسی قدر جھجک کر کہا اور تب اس نے دیکھا پیچھے ایک سفید کوٹ اور بیگ رکھا ہوا تھا۔

لڑکی شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔ اس نے سوچا کہ کیا وہ ڈاکٹر تھی؟ وہ احاطے میں داخل ہوا تو کیبن کی طرف جانے والے راستے پر مڑنے سے پہلے اس نے کار کو دفتر والی عمارت کے سامنے رکے دیکھا۔ اس نے اخبار لے جا کر کیبن میں اپنے بستر کے نیچے چھپا دیا۔ پھر وہ میس گیا۔ لنچ کے بعد وہ احاطے سے نکلا اور چٹان کی طرف آیا۔ چٹان شمال مغربی سمت میں تھی اور اس کے صرف ایک طرف سے راستہ تھا جس سے اوپر جایا جاسکتا تھا۔ دوسری طرف چٹان بالکل عمودی اور گہری کھائی میں اتر رہی تھی۔ اس کا آخری حصہ ڈھلان جیسا تھا اور اس پر بہت احتیاط سے بیٹھنا پڑتا تھا۔ اس پر بیٹھنے کے لیے آدمی کو خود طے کرنا پڑتا کہ اسے کتنا آگے جانا ہے۔ اندازے میں غلطی کی سزا خود اسے بھگتنا پڑتی۔ اوپر جانے والا راستہ بھی آسان نہیں تھا۔

وہ اوپر پہنچا تو سورج مغرب کی طرف ڈھلنے لگا تھا۔ رات کی بارش نے چٹان کو دھو کر نکھار دیا تھا اور ڈھلان پر پھسلن تھی اس لیے وہ بہت احتیاط سے آگے گیا اور جب اس نے محسوس کیا کہ آگے جانا خطرناک ہوسکتا ہے تو وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اسے خیال آیا کہ اس کے پاس اب کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنا سب کچھ گنوا چکا تھا۔ اپنی شناخت تک کھو بیٹھا تھا۔ اسے تعجب ہوا اس کے باوجود اسے زندگی کا اتنا خیال تھا کہ وہ اس چٹان پر احتیاط سے بیٹھ رہا تھا کہ کہیں حادثاتی طور پر نیچے نہ گر جائے۔ کیا اپنا سب کچھ کھو کر بھی وہ زندہ رہنا چاہتا تھا؟ شروع دنوں میں جب وہ بہت مایوس ہوتا تھا تو ایک دن اس نے ڈاکٹر اطہر سے پوچھا۔ ''ڈاکٹر صاحب! اگر آدمی کے پاس زندہ رہنے کا کوئی جواز نہ ہو تو اسے کیا کرنا چاہیے؟''

''زندہ رہنا چاہیے۔'' ڈاکٹر اطہر نے جواب دیا۔ ''کیونکہ زندگی اپنا جواز خود پیدا کر لیتی ہے۔''

''تب لوگ خودکشی کیوں کر لیتے ہیں؟''

''وہ اس مغالطے کا شکار ہوجاتے ہیں کہ اب زندگی میں ان کے لیے کچھ باقی نہیں رہا ہے۔''

اس کے پاس جو تھا، وہ زندگی کے جواز کے لیے ناکافی تھا۔ اس کے باوجود وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ لیٹ گیا۔ چٹان کسی قدر گرم ہوگئی تھی اور یہ گرمائش اچھی لگ رہی تھی۔ اسے اونگھ آگئی۔ وہ چونکا تو گھڑی میں تین بج رہے تھے اور سورج اب مغرب کی طرف آگیا تھا۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے سے یہاں تھا۔ وہ چٹان سے اترا اور واپس آرہا تھا کہ اسے اچانک نزدیک سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اس نے آواز کی سمت دیکھا تو اسے براؤن رنگ کا کسی قدر بڑے بالوں والا کتا دکھائی دیا۔ وہ اچھی نسل کا کتا تھا مگر اس کے گلے میں کوئی پٹا نہیں تھا۔ وہ بھونکا تو اس کا انداز دوستانہ تھا۔

قیصر اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھا تو کتا اس کے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ اس نے محسوس کیا تو رک گیا اور بولا۔

''جاؤ یہاں سے۔''

کتا بھونکا اور دم ہلانے لگا۔ قیصر پھر چل پڑا۔ کتا بھی اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ اس بار اس نے اسے روکا نہیں۔ وہ احاطے میں داخل ہوا تو اسے وہاں ہلچل محسوس ہوئی۔ وہ آگے بڑھا تو اسے سلطان اور رفیق تیز قدموں سے جنگل کی طرف جاتے دکھائی دیے۔ ڈاکٹر سیفی کے ساتھ وہی لڑکی باہر موجود تھی اور اس نے سفید کوٹ پہنا ہوا تھا۔ قیصر کا اندازہ درست نکلا تھا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ پہلے قیصر نے ان کی طرف جانے کا سوچا مگر پھر ارادہ ملتوی کر کے کیبن کی طرف بڑھ گیا۔ کتا یہاں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ کیبن کے آس پاس خاموشی تھی مگر چند لمحے بعد یہ سناٹا ہنگامے میں بدل گیا۔ درختوں کی طرف سے شور اور چلانے کی آوازیں آئیں اور کچھ دیر بعد سلطان اور رفیق یوں نمودار ہوئے کہ انہوں نے رفیع زمان کو دبوچ رکھا تھا۔ وہ خود کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہا تھا اور چلا رہا تھا۔ اس کے جملے لایعنی تھے مگر اسے دیکھتے ہی اس نے تڑپنا اور چلانا بند کر دیا۔ وہ صاف لہجے میں بولا۔

''تم دیکھ لینا میں ایک دن یہاں سے نکل جاؤں گا اور کوئی مجھے نہیں روک سکے گا۔ سنا تم نے......'' جملہ مکمل کرتے ہی وہ پھر چلانے اور مچلنے لگا۔ سلطان اور رفیق بمشکل اسے قابو کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک طرف سے ڈاکٹر سیفی اور وہی لڑکی برآمد ہوئے۔ ڈاکٹر سیفی کے ہاتھ میں انجکشن تھا۔ اس نے آتے ہی انجکشن رفیع کے بازو میں اتار دیا۔ انجکشن گوشت میں لگا تھا، اس لیے اس کا فوری اثر نہیں ہوا مگر ایک منٹ بعد رفیع کی مزاحمت میں کمی آئی اور دو منٹ بعد وہ سلطان اور رفیق کے بازوؤں میں جھول گیا۔ وہ اسے اٹھا کر لے گئے اور ڈاکٹر سیفی بھی ان کے پیچھے چلا گیا تھا البتہ لڑکی وہیں رکی رہی۔ اس کی توجہ رفیع کے بجائے قیصر کی طرف تھی۔ وہ اس کے پاس آئی اور بے تکلفی سے بولی۔

''میں شیما ہوں، ڈاکٹر شیما ابصار۔''

''جہانگیر احمد۔'' اس نے کسی قدر تاخیر سے جواب دیا کیونکہ وہ اپنا اصل نام بتانے جا رہا تھا۔

''میں ڈاکٹر زین کی جگہ آئی ہوں۔''

''ڈاکٹر زین کہاں گئے؟''

''ادارہ چھوڑ رہے ہیں، اب ان کی جگہ میں کام کروں گی۔''

وہ سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر اطہر اور ڈاکٹر سیفی نے اس کے بارے میں اسے بتایا ہوگا۔ وہ مریض نہیں تھا مگر یہاں مقیم تھا۔ وہ چونکا شیما کچھ کہہ رہی تھی۔ اس نے معذرت کی۔ ''سوری، میں نے سنا نہیں۔''

''میں کہہ رہی ہوں تمہارا کتا اچھا ہے۔''

''یہ میرا کتا نہیں ہے۔'' اس نے کتے کی طرف دیکھا جو کیبن کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ''نہ جانے یہ کہاں سے آ گیا ہے۔''

شیما کو تعجب ہوا۔ ''اچھا، انداز سے تو لگ رہا ہے جیسے تمہارا ہو۔ دیکھو کتنے بے تکلف اور نارمل انداز میں بیٹھا ہے۔''

قیصر کو اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے سرد لہجے میں دہرایا۔ ''یہ میرا کتا نہیں ہے۔''

وہ کہتے ہوئے کیبن کی طرف بڑھا تھا کہ شیما نے عقب سے کہا۔ ''پھر ملیں گے۔''

اس نے صرف سر ہلایا اور اندر چلا گیا۔ اسے اچھا نہیں لگا تھا کہ جو چیز اس کی نہیں تھی، اسے اس کا سمجھا جائے۔ وہ تاریکی چھانے سے پہلے باہر نہیں آیا۔ جب وہ باہر نکلا اور اس نے کیبن کے سامنے والی لائٹ روشن کی تو اس نے کتے کو وہیں پایا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ شاید واپس چلا گیا ہو۔ اس سے پہلے وہ کہیں رہتا ہوگا، کوئی اس کی دیکھ بھال اور اس کی خوراک کا انتظام کرتا ہوگا، کتا اسی کے پاس چلا جائے گا مگر وہ اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا جہاں قیصر نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بھونکا۔ اس کی آواز میں فریاد تھی۔ وہ بھوکا تھا اور کھانے کو مانگ رہا تھا مگر قیصر کے پاس اسے دینے کے لیے کچھ نہیں تھا، اس نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ''جاؤ یہاں سے...... میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ جہاں رہتے ہو وہیں چلے جاؤ۔''

مگر کتا بھونکا اور واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اس کا یہاں سے جانے کا ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔ شاید اس کا مالک اسے چھوڑ گیا تھا یا پھر وہ کسی گاڑی میں یہاں تک آیا تھا اور پھر یہیں رہ گیا تھا۔ کتا اچھی حالت میں تھا اور جب اسے ملا تب بھوکا بھی نہیں تھا مگر اب وہ بھوکا ہو رہا تھا۔ قیصر میس کی طرف آیا۔ ابھی ڈنر کی تیاری کا آغاز ہوا تھا۔ آج موسم کی مناسبت سے سوپ تیار ہوا تھا۔ غلام، شوکت کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ آج سویٹ ڈش بھی تھی اور کام زیادہ تھا۔ قیصر میز پر بیٹھا تو غلام کچھ دیر بعد اس کے اور اپنے لیے سوپ لے آیا۔ آج اس کے تاثرات بدلے ہوئے تھے۔ اس نے خوشی سے قیصر کو اطلاع دی۔ ''آج پورے چاند کی رات ہے۔ کیا تم میرے کمرے میں آؤ گے؟''

غلام کا کمرا دوسرے فلور پر تھا اور اس کی کھڑکی مشرق کی طرف کھلتی تھی اس لیے جب چاند طلوع ہوتا تو وہاں سے بہت صاف نظر آتا تھا۔ قیصر نہیں جانتا تھا کہ اسے چاند دیکھنا اتنا پسند کیوں تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''میں آؤں گا۔''

''ہم دونوں مل کر چاند دیکھیں گے۔'' غلام مزید خوش ہو گیا۔ ''تمہیں پتا ہے آج نئی ڈاکٹر آئی ہے اور وہ بہت خوب صورت ہے۔''

''میں ملا ہوں۔ تم نے ٹھیک کہا وہ بہت خوب صورت ہے۔''

''بالکل کسی تازہ کھلے گلاب کی طرح۔'' غلام نے سادگی سے شاعری کی۔ ''وہ مجھ سے بہت نرمی سے پیش آئی۔''

''اس کا مطلب ہے وہ سچ مچ بہت اچھی ہے۔''

''مجھے ڈاکٹر زین پسند نہیں تھا۔ اچھا ہوا وہ یہاں سے چلا گیا۔''

''ڈاکٹر زین بھی اچھا آدمی تھا۔''

''وہ اچھا نہیں تھا۔'' غلام نے اصرار کیا۔ ''وہ مجھ سے بہت برے انداز میں پیش آتا تھا۔''

قیصر جانتا تھا کہ غلام کو برداشت کرنا آسان نہیں ہے۔ اس کے وجود سے جیسے اضطراب کی لہریں پھوٹتی تھیں اور وہ دوسروں کو متاثر کر دیتا تھا۔ خود قیصر نے بڑی مشکل سے خود کو اس کا عادی بنایا تھا۔ وہ ایک بات بہت بار دہراتا تھا۔ اسے قطعی پروا نہیں تھی کہ اگلا آدمی سن سن کر پک چکا ہے۔ قیصر اس کی باتوں پر اتنی توجہ نہیں دیتا تھا مگر وہ ظاہر یہی کرتا کہ وہ پوری توجہ سے اس کی بات سن رہا ہے۔ سوپ کے بعد کھانا شروع ہوا۔ آج مٹر آلو اور قیمے کی ڈش بنی تھی۔ یہ قیصر کی فیورٹ تھی اور ہما بہت اچھا بناتی تھی۔ شوکت ویسا نہیں بناتا تھا مگر اس کا آلو مٹر قیمہ بھی مزے کا ہوتا تھا۔ جب وہ کھانا لے رہا تھا تو اس نے شوکت سے کہا کہ وہ بچ جانے والا کھانا اسے کسی شاپر میں کر کے دے دے۔ اس نے شوکت کو کتے کے بارے میں بتایا تو وہ فوراً مان گیا۔

''آج میں نے خاصی مقدار میں پکایا ہے۔ اکثر اوقات بچ جاتا ہے، آج لازمی بچے گا.... میں روٹی توڑ کر دے دوں گا۔''

جب اس نے کھانا کھا لیا تو شوکت نے کاغذ کے ڈبے میں سالن اور توڑی ہوئی روٹی اسے دے دی۔ وہ کیبن تک آیا جہاں کتا بدستور اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ قیمے کی خوشبو محسوس کر کے وہ چوکنا ہو گیا۔ قیصر نے ڈبا کھول کر اس کے سامنے رکھا تو اس نے پہلے بھونک کر اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر بیتابی سے کھانے لگا۔ وہ واضح طور پر کئی وقت کا بھوکا تھا۔ شوکت نے کھانا زیادہ مقدار میں دیا تھا۔ قیصر کو امید تھی کہ کتے کا پیٹ بھر جائے گا۔ وہ واپس میس آیا۔ سویٹ ڈش اور کافی کے بعد وہ غلام کے ساتھ روانہ ہوا۔ سلطان کے ذمے دوسرا فلور تھا وُہی سب کے کمرے بند کرتا تھا۔ اسے غلام کے ساتھ دیکھ کر وہ بولا۔ ''دروازہ کھولنے کب آؤں؟''

''نو بجے کے بعد۔'' غلام بولا۔ ''ابھی تو چاند طلوع ہوا ہو گا۔''

''چاند طلوع ہو گیا ہے۔'' سلطان نے اطلاع دی اور ان کے کمرے میں جاتے ہی دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ غلام کے کمرے میں ایک بستر کے علاوہ ایک چھوٹی الماری اور ایک کرسی میز تھی۔ کھڑکی چھ فٹ سے زیادہ بڑی تھی اور اس میں فکس شیشے کے پٹ لگے تھے۔ گرمیوں میں یہ پٹ کھول دیے جاتے تھے اور اندر کی طرف نلائی نیٹ لگا دی جاتی تھی۔ اس کی چوکھٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ چوڑی تھی اور وہ آرام سے اس پر بیٹھ سکتے تھے۔ قیصر اس کے ساتھ کھڑکی پر بیٹھا تو غلام نے دھیمے اور پراسرار لہجے میں کہا۔

باتیں داناؤں کی

☆ قائدے قوانین داناؤں اور جابروں نے کمزور دل رکھنے والوں کو قابو میں رکھنے کے لیے بنائے ہیں۔

☆ جو شخص ہاتھی کی لگام ہی تلاش کرتا رہ جائے وہ اس پر کبھی چڑھ نہیں سکتا۔

☆ سیانی بیٹی کتنی بھی چہیتی ہو، ماں باپ کی چھاتی پر پہاڑ ہوتی ہے۔

☆ غصہ جتنا کم ہوگا اس کی جگہ اداسی لیتی چلی جائے گی۔

☆ دنیا کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی کسی کھیل میں منہمک بچے سے زیادہ سنجیدہ نہیں ہو سکتا۔

☆ گھوڑا صرف اس وقت بزدل ہوتا ہے جب اس کا سوار بزدل ہو جائے۔

☆ سانپ کا زہر کینچلی میں، بچھو کا دم میں، بھڑ کا زہر ڈنک میں ہوتا ہے اور پاگل کتے کا دہانے میں ......انسان واحد حیوان ہے جو اپنا زہر دل میں رکھتا ہے۔

مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ، لاہور

''میں تمہیں چاند دکھانے نہیں لایا ہوں۔''

قیصر نے اس کی طرف دیکھا۔''پھر کیا دکھانے لائے ہو؟''

غلام کا لہجہ مزید پراسرار ہو گیا۔''تم نے میری بات پر توجہ نہیں دی تھی کہ وہ نگرانی کرتے ہیں۔ آج میں تمہیں دکھاؤں گا کہ وہ نگرانی کرتے ہیں۔''

''کون ہیں وہ؟''

''میں نہیں جانتا لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ وہ چوبیس گھنٹے ہمیں دیکھتے ہیں۔ ایک لمحے کو بھی ہمیں اکیلا نہیں چھوڑتے۔''

''میری کوئی نگرانی نہیں کرتا۔''

''کرتے ہیں لیکن تم جانتے نہیں ہو۔'' غلام نے یوں کہا کہ اسے غصہ آنے لگا وہ خود پر قابو پا رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

''تم مجھے کچھ دکھانے کا کہہ رہے تھے؟''

''ہاں تبھی میں نے تمہیں نو بجے تک یہاں روکا ہے۔ وہ دیکھ رہے ہو؟'' غلام نے دور ہائی وے کے ساتھ بنے ایک مکان کی اوپری منزل کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ایک کھڑکی روشن تھی۔ اوپر نظر آنے والی یہی واحد کھڑکی تھی۔

''یہاں کون ہے؟''

''وہ یہیں سے نگرانی کرتے ہیں۔''

''یہاں کوئی فیملی رہتی ہے اور وہ کیوں ہماری نگرانی کرنے لگے؟''

''ابھی تم دیکھ لوگے۔'' غلام نے کہا۔ وہ دونوں ہاتھ اپنے پیروں کے گرد سمیٹ کر بیٹھ گیا اور مسلسل ہل رہا تھا۔ اس کے وجود سے پھوٹتی اضطراب کی لہریں جیسے شدید ہو گئی تھیں۔ قیصر نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس نے اکثر اس مکان کی بالکونی میں کسی عورت کو دیکھا تھا جو کبھی کپڑے لٹکا رہی ہوتی تھی اور کبھی کپڑے سمیٹتی تھی۔ بعض اوقات ایک مرد بھی نظر آتا تھا۔ وقت آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ غلام کی نظر چاند اور قیصر کی نظر گھڑی پر مرکوز تھی۔ کبھی کبھی وہ چاند کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ اسے بھی پورا چاند دیکھنا اچھا لگتا تھا مگر اس وقت اسے چاند سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جیسے ہی گھڑی نے نو بجائے تو کھڑکی سے آتی روشنی بند ہو گئی۔ غلام جو ہل رہا تھا اور اس کی نظریں چاند پر مرکوز تھیں وہ اچھل پڑا۔''دیکھا..... دیکھا تم نے؟''

''ہاں۔'' قیصر کا لہجہ سرد تھا۔''میں نے دیکھا کہ روشنی بجھ گئی ہے۔''

''روز ٹھیک نو بجے یہ روشنی بند ہو جاتی ہے۔''

''یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہاں جو رہتا ہے وہ نو بجے سو جاتا ہے یا پھر اس کمرے کی روشنی بند کر دیتا ہے۔'' قیصر کھڑکی سے اتر آیا۔''یہ تمہارا وہم ہے کہ کوئی ہماری نگرانی کر رہا ہے۔''

''میری بات کا یقین کرو۔'' غلام بھی کھڑکی سے اتر آیا اور اس نے ملتجی لہجے میں کہا۔''وہ ہماری نگرانی کرتے ہیں۔'' اس نے کہتے ہوئے قیصر کا بازو پکڑ لیا مگر قیصر نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑا لیا اور اسی لمحے سلطان نے باہر سے دروازہ کھول دیا۔ قیصر باہر آ گیا اور سلطان نے دروازہ بند کر دیا۔ عقب میں غلام مسلسل کہہ رہا تھا۔''وہ دیکھتے ہیں...... ہر وقت دیکھتے ہیں...... میری بات کا یقین کرو۔''

وہ نچلی منزل سے گزر رہا تھا کہ اس نے رفیع کے کمرے کے دروازے سے اسے جھانکتے دیکھا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا مگر آواز نہیں آ رہی تھی۔ قیصر بس اتنا سمجھ سکا۔''بہت جلد...... بہت جلد۔'' سلطان اس کے ساتھ تھا اس لیے وہ رک نہیں سکتا تھا اور وہ اسے باہر تک چھوڑنے آیا۔ اس کے عقب میں عمارت کا مرکزی دروازہ بند ہو گیا۔ وہ روشوں اور درختوں کے نیچے سے گزرتا ہوا کیبن تک آیا جہاں کتا برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کاغذ کا ڈبا مکمل طور پر خالی کر دیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر اٹھا اور برآمدے کی لکڑی کا کنارہ سونگھنے اور پنجوں سے کھرچنے لگا۔ اس نے اسے روکا۔''نہیں، ایسا مت کرو۔ اب جاؤ یہاں سے۔''

کتے نے منہ اٹھا کر اسے دیکھا اور ذرا آگے جا کر زمین کھودنے لگا۔ اس بار قیصر نے اسے سختی سے روکا۔''ایسا مت کرو، اگر کچھ آ رہا ہے تو وہاں جاؤ۔'' اس نے درختوں کی طرف اشارہ کر کے سخت لہجے میں کہا تو کتا رک گیا اور پھر سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔ قیصر اندر آیا اور اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اس کا کیبن کھلا رہتا تھا، وہ آتے جاتے بس دروازہ بھیڑ جاتا تھا مگر اس وقت اس نے اندر سے دروازہ لاک کر دیا۔ آگے اور پیچھے کی کھڑکیوں پر پردے برابر کیے اور پھر بستر کے نیچے دبا ہوا اخبار نکالا۔ یہ چھ صفحے والا چھوٹا اخبار تھا۔ اسے لگا جیسے وہ نہ جانے کتنے عرصے بعد اخبار دیکھ رہا ہے۔ یہ حقیقت تھی کہ یہاں چھ مہینے میں اس نے ایک بار بھی کوئی اخبار یا رسالہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ صفحے پلٹ رہا تھا۔ عام سی خبریں تھیں۔ جن سے اسے کبھی دلچسپی نہیں رہی مگر اب وہ اسے اچھی لگ رہی تھیں۔ اس نے آخری صفحہ نکالا تو ایک تصویر پر وہ رک گیا۔

یہ شہر میں ٹریفک جام کی تصویر تھی۔ سڑک کے ایک طرف سے فوٹوگرافر نے یوں تصویر لی تھی کہ سڑک کے دوسری طرف کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دوسری

طرف ایک عورت اور اس کے برابر میں ایک سات آٹھ سال کی بچی کھڑی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ ہما اور روما تھیں۔ وہ دوسری طرف کھڑی تھیں۔ روما نے سرخ رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی اور اس کے شانوں پر اسکول بیگ کی اسٹرپ دور سے بھی نمایاں تھیں۔ یہ بیگ اسے قیصر نے لاکر دیا تھا۔ ہما نے سادہ سفید چادر پہن رکھی تھی اور وہ اپنے آپ پر چھائی سوگواریت سے بیوہ ہی نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جانا پہچانا سیاہ ہینڈ بیگ تھا۔ وہ یقیناً روما کو اسکول سے لے کر آرہی تھی۔ قیصر کو سڑک اور اس کے پاس کے مناظر بھی جانے پہچانے لگے۔ گویا یہ اسی کا علاقہ تھا جہاں اس کا گھر تھا اور اس کا ایک مطلب تھا کہ ہما اور روما اب تک وہیں رہ رہے تھے۔

قیصر کے اندر طوفان سا اٹھا۔ اس نے اخبار ہاتھ میں دبوچ لیا۔ جب وہ یہاں آیا بلکہ لایا گیا تو اسے شروع میں ہما اور روما بہت یاد آتے تھے۔ ان کی یاد دل سے جاتی نہیں تھی۔ وہ خود کو نہ جانے کیسے قابو کرتا تھا کہ اب وہ واپس نہیں جاسکتا ہے۔ اگر وہ گیا تو بھی اس کا فائدہ نہیں ہوگا اور وہ پکڑا جائے گا اور لازمی سزائے موت پائے گا۔ رفتہ رفتہ اس نے خود کو پکا کرلیا کہ اب اسے اپنی باقی زندگی اسی احاطے میں بسر کرنی ہے اور باہر کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا ہے۔ مگر آج اخبار میں ہما اور روما کی تصویر دیکھ کر اسے لگا کہ وہ اب تک خود کو دھوکا دیتا آیا تھا۔ وہ ان کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر وہ اخبار ہاتھ میں لیے ہوئے اسی طرح بیٹھا رہا پھر وہ چونکا اور تب اسے احساس ہوا کہ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے۔ اس نے اٹھ کر منہ دھویا۔ پھر قینچی لی اور اخبار سے تصویر والا حصہ کاٹ لیا۔

اگرچہ یہاں کوئی نہیں آتا تھا مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو پتا چلے کہ وہ یہاں اخبار لایا تھا۔ تصویر نکال کر وہ باقی اخبار لے کر باہر آیا اور درختوں کے درمیان اس نے اسے ماچس سے آگ دکھا دی۔ وہ ایسی جگہ تھا کہ آگ عمارتوں سے نہیں دیکھی جاسکتی تھی، خاص طور سے مریضوں والی عمارت سے۔ وہاں سلطان اور رفیق تھے اگر ان تک آگ کی اطلاع پہنچ جاتی تو وہ تفتیش کے لیے آجاتے۔ لمحوں میں پورا اخبار راکھ ہوگیا۔ جب اس راکھ کی چنگاریاں بھی بجھ گئیں تو وہ اندر آگیا۔ اس رات وہ دیر تک لیٹا تصویر دیکھتا رہا۔ پھر اسے سینے پر رکھے رکھے سوگیا۔ صبح اس کی آنکھ تاخیر سے اور دستک سے کھلی۔ دستک خاصی دیر سے جاری تھی کیونکہ اس کی لَے اب تیز تھی۔ اس نے آواز دی۔ ''ہاں، اٹھ گیا ہوں۔''

''میں غلام ہوں۔'' باہر سے آواز آئی۔ وہ اٹھا تو بھول گیا کہ اس کے سینے پر تصویر رکھی ہے۔ اخبار کا تراشا اڑا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے پکڑتا وہ ہلکورے لیتا ہوا بستر کے برابر میں رکھے ریک کے نیچے مختصر سے خلا میں چلا گیا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر خلا کے نیچے انگلیاں ڈالنے کی کوشش کی مگر خلا بہت چھوٹا تھا اس میں انگلیاں جانے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس دوران میں غلام نے پھر دروازہ بجانا شروع کردیا۔ اب قیصر کو غصہ آنے لگا تھا۔ اس نے چلا کر کہا کہ وہ آرہا ہے اور مزید دروازہ نہ بجایا جائے۔ غلام رک گیا مگر قیصر جانتا تھا کہ وہ دروازے کے باہر موجود رہے گا۔ اس نے آس پاس دیکھا اور پھر ایک چیچ اٹھا کر اس سے تصویر باہر نکالنے کی کوشش کی مگر وہ باہر نہیں آئی۔ اس کے پاس فی الوقت ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے وہ تصویر باہر نکال سکتا۔ مایوس ہوکر وہ اٹھا، اس نے اپر پہنا اور باہر آگیا۔ غلام سر جھکائے کھڑا تھا۔ قیصر کا غصہ ٹھنڈا ہونے لگا۔

''میں رات دیر سے سویا تھا۔'' قیصر نے کہا۔ ''اس لیے میری آنکھ نہیں کھلی۔''

''ناشتے کا وقت نکل رہا تھا اس لیے میں تمہیں بلانے آگیا۔ میں بہت دیر سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔''

''آؤ۔'' قیصر نے ایک نظر کتے کو دیکھا، وہ ایک طرف لیٹا ہوا دھوپ سینک رہا تھا۔ وہ اور غلام میس میں آئے جہاں ناشتے کا آخری دور چل رہا تھا۔ شوکت نے ان کا ناشتا نکالتے ہوئے کہا۔

''میں نے تمہارا کتا دیکھا ہے، اچھی نسل کا ہے۔''

قیصر اسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس کا کتا نہیں ہے مگر اسے شوکت کے منہ سے یہ سن کر اچھا لگا اور اس نے ارادہ ملتوی کردیا۔ شوکت نے کہا۔ ''تم روز رات کو مجھ سے بچا ہوا کھانا لے جایا کرو۔ میرا خیال ہے، میں نے کل رات جو دیا تھا، وہ اس کے چوبیس گھنٹے کے لیے کافی ہوگا۔''

''ہاں، میں ابھی آیا تو وہ بھوکا نہیں تھا۔''

شوکت اپنے اندازے کی درستگی پر خوش ہو گیا۔ ''آج میں اس کے لیے ہڈیاں بھی دوں گا۔ کتے ہڈیاں شوق سے کھاتے ہیں۔ اس سے ان کے دانت اور جبڑے بھی ٹھیک رہتے ہیں۔''

قیصر اس کا شکریہ ادا کرکے میز پر آگیا۔ اس نے غلام سے کہا۔ ''آج بارش کی نمی خشک ہوگئی ہوگی۔ ہم سامنے والا باغ اور جنگل صاف کریں گے۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



غلام نے سر ہلایا پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا تم نے کل رات جنگل میں کچرا جلایا تھا؟''

قیصر چونکا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''وہ...... میں نے وہاں راکھ دیکھی تھی۔''

''ہاں، میں نے کچھ کچرا جلایا تھا۔'' قیصر نے دزدیدہ نظروں سے سلطان اور رفیق کی طرف دیکھا اور جھک کر بولا۔ ''تم کسی سے ذکر مت کرنا۔ تم جانتے ہو جنگل میں آگ جلانا منع ہے۔''

غلام نے صرف سر ہلایا اور کھانے میں مصروف ہو گیا۔ آج دیر ہوگئی تھی۔ وہ پہلے عمارتوں میں آئے۔ دوپہر تک وہ وہیں مصروف رہے۔ وہ دفتر میں آیا تو وہاں ڈاکٹر شیما اپنے کمرے میں موجود تھی۔ پہلے یہ کمرا ڈاکٹر زین کے پاس تھا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ ''کیا تمہیں اس طرح کام کرنا اچھا لگتا ہے؟''

''ہاں، مجھے یہ کام اچھا لگتا ہے۔''

''حالانکہ یہ تمہاری حیثیت اور شخصیت سے کم ہے۔''

اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ میری حیثیت اور شخصیت کیا ہے لیکن یہ کام میں نے خود منتخب کیا ہے۔''

''تم پڑھے لکھے ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''گریجویشن کیا ہے۔''

''تب تم یہاں بہتر کام کر سکتے ہو۔''

وہ کچھ خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ''مجھے یہ کام پسند ہے۔''

ڈاکٹر شیما میز کے پیچھے سے نکل کر اس کے پاس آگئی۔

''تمہیں میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے ضرور بتانا۔''

قیصر نے سر ہلایا اور باہر نکل آیا۔ دفتری بلڈنگ چھوٹی اور دو منزلہ تھی۔ یہاں کی صفائی سے وہ جلد نمٹ جاتے تھے۔ آج غلام کے حصے میں دوسرا فلور آیا تھا۔ قیصر نے اپنے فلور کا کام مکمل کرلیا۔ جب وہ راہداری کے دروازے کے سامنے سے گزرا تو ایک لمحے کو رکا۔ پھر وہ باہر آیا اور بنچ پر بیٹھ کر غلام کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ڈاکٹر شیما کی بات پر غور کر رہا تھا۔ اسے بھلا اس کی مدد کی کیا ضرورت ہوسکتی تھی اور وہ خود یہاں ملازم تھی مگر اس کے انداز میں ذاتی دلچسپی تھی۔ قیصر جہاندیدہ آدمی تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ شیما اس میں کس انداز میں دلچسپی لے رہی تھی۔ ورنہ ایک ڈاکٹر کو صفائی کرنے والے شخص سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ غلام اوپر والے فلور کی صفائی کرکے آیا تو وہ اسپتال والی عمارت کی طرف روانہ ہوئے آج مریضوں کے کمروں کی بھی صفائی کرنا تھی۔ سلطان نے اسے رفیع کے کمرے کی صفائی سے روک دیا۔ اس نے پوچھا۔

''کیوں؟''

''اس کی حالت فی الحال ایسی نہیں ہے کہ اسے کھولا جائے۔''

تب قیصر نے دروازے کے اوپری شیشے سے دیکھا۔ رفیع کو حفاظتی جیکٹ پہنائی گئی تھی تاکہ وہ خود کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ وہ ایک کونے میں سمٹا بیٹھا تھا اور اس کا سر مسلسل دائیں بائیں ہل رہا تھا۔ قیصر نے دل میں افسوس محسوس کیا۔ اتنی اچھی پرسنالٹی والا شخص اس حال میں تھا۔ گہرے صدمے نے اسے ذہنی طور پر معطل کردیا تھا۔ وہ خیالی دنیا میں جی رہا تھا اور دن رات اپنے مرجانے والے بیوی بچوں کے پاس جانے کا سوچتا تھا۔ جب اسے موقع ملتا وہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا تھا مگر اب تک اسے کامیابی نہیں ملی تھی۔ لنچ تک اس نے اور غلام نے اسپتال کی بھی صفائی کردی تھی۔ وہ تھک گیا تھا اس لیے اس نے سامنے والے باغ اور جنگل کی صفائی کا پروگرام اگلے روز تک کے لیے ملتوی کردیا۔ اسے کچھ ذاتی سامان کی ضرورت تھی۔ اس نے فہرست بنا کر ڈاکٹر اطہر کو دی اور وہاں سے نکل رہا تھا کہ ڈاکٹر شیما سے سامنا ہوگیا۔ وہ سرنگ والے دروازے سے نکل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ ٹھٹکی پھر جلدی سے بولی۔

''آج تم سے دوسری بار ملاقات ہو رہی ہے۔''

''میں ڈاکٹر صاحب کے پاس کام سے آیا تھا۔'' قیصر نے کہا۔

''مجھے یہ جگہ اچھی لگی ہے۔'' شیما اس کے پاس چلی آئی تھی۔ اپنے شانوں سے نیچے آنے والے بال جھٹک کر چہرے سے ہٹائے۔ اس لمحے قیصر کو اس کی ہلکی سرمئی آنکھوں میں عجیب سا فسوں نظر آیا۔ وہ بلاشبہ حسین تھی اگر چاہتی تو ماڈل بن سکتی تھی مگر اس نے ڈاکٹر بننے کو ترجیح دی تھی۔ سفید کوٹ بھی اس پر جچ رہا تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر اس کے پاس نئے ماڈل کی کار تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کی پریکٹس بہت اچھی چل رہی تھی یا پھر اس کا تعلق دولت مند خاندان سے تھا۔ قیصر کو دوسری بات درست لگی تھی۔ ورنہ اتنی سی عمر میں بہت زیادہ مالی کامیابی صرف بہت زیادہ خوش نصیبوں کو ہی ملتی ہے۔ قیصر نے کہا۔

''یہ اچھی بات ہے کہ تمہیں یہ جگہ پسند آئی۔''

''ایک کپ کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

قیصر ہچکچایا پھر اس نے سر ہلایا۔ شیما اسے اپنے دفتر میں لے آئی۔ سوائے ڈاکٹر اطہر کے تمام اسٹاف میس

میں ہی کھاتا تھا۔ وہ میس میں نظر نہیں آئی تھی۔ ''تم لنچ دفتر میں کرتی ہو؟''

''نہیں۔'' شیما نے کافی مشین میں کافی ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں لنچ نہیں کرتی اگر بھوک لگے تو بسکٹ لے لیتی ہوں۔''

شاید اپنا وزن ایک حد میں رکھنے کے لیے وہ لنچ نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ اس کا وزن کم ہی تھا۔ ہما کا بدن شادی کے بعد کسی قدر بھاری ہوگیا تھا مگر شیما چھریرے جسم کی مالک تھی اور اس کے باوجود بھی اس میں نسوانی دل کشی موجود تھی۔ کافی بنانے کے دوران وہ اس سے بات کرتی رہی۔ اس سے اس کی دلچسپیوں اور کاموں کے بارے میں پوچھتی رہی۔ قیصر نے اسے بتایا کہ فارغ اوقات میں وہ ہائی وے کی طرف چلا جاتا ہے یا پھر چٹان پر جاتا ہے۔ چٹان کا سن کر شیما نے پُرشوق انداز میں پوچھا۔ ''مشکل ہے یا عام آدمی بھی آسانی سے چڑھ سکتا ہے؟ مجھے بھی ہائکنگ کا شوق ہے مگر موقع نہیں ملتا ہے۔''

''اتنا مشکل نہیں ہے۔'' قیصر نے کہا۔ ''آج میرا جانے کا ارادہ ہے اگر تم چاہو تو چل سکتی ہو۔''

''میں چلوں گی۔'' وہ خوش ہوگئی۔ ''لیکن میں چار بجے آف کرتی ہوں۔''

''میں چار بجے باہر انتظار کروں گا۔'' قیصر نے کہا۔ شیما نے کافی کا مگ اس کے سامنے رکھا۔ دورانِ گفتگو قیصر نے محسوس کیا کہ شیما اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ بہت مہارت سے سوال کر رہی تھی۔ قیصر کو سوچ سمجھ کر جواب دینے پڑ رہے تھے۔ کئی بار اسے جھوٹ بولنا پڑا حالانکہ اسے جھوٹ بولنے سے کوفت ہوتی تھی۔ کافی ختم کر کے وہ شیما کا شکریہ ادا کر کے باہر آیا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چٹان کی طرف جاتے وقت بھی اس نے اسی طرح کریدنا جاری رکھا تو اس کے لیے مشکل ہوجائے گی مگر اب وہ کہہ چکا تھا۔ وہ کیبن کی طرف آیا تو کتا بے چین تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ بھونکنے لگا مگر اس کا انداز کچھ طلب کرنے والا نہیں تھا۔ قیصر نے اسے چپ ہونے کو کہا مگر وہ بھونکتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اسے خبردار کرنا چاہ رہا ہو۔ مگر کس چیز سے؟ بھونکنے کے دوران میں وہ کبھی کبھی کیبن کے سامنے زمین پر پنجے بھی مارنے لگتا تھا۔

قیصر نے غسل کر کے کپڑے تبدیل کیے اور اتارے ہوئے کپڑے لانڈری میں جمع کرا دیے۔ سلطان لانڈری کا ذمے دار تھا۔ اس نے اپنی کاپی میں اس کے کپڑوں کا اندراج کیا۔ قیصر نے اس سے پوچھا۔

''جس کیبن میں، میں رہتا ہوں، اس میں پہلے کون رہتا تھا؟''

''کوئی نہیں۔'' سلطان نے جواب دیا۔ ''یہ جگہ تھراپی کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ کبھی کبھی مریضوں کو یہاں رکھا جاتا تھا۔''

''کس قسم کی تھراپی؟''

''پتا نہیں، میں کبھی وہاں گیا نہیں۔'' سلطان نے شانے اچکا کر جواب دیا۔ قیصر نے سوچا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ سلطان یا رفیق کسی تھراپی میں شامل نہ ہوں۔ بہت سے کام انہیں ہی کرنا پڑتے تھے مگر وہ اسے جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔

''جب میں آیا تو مجھے یہ جگہ دے دی؟''

سلطان نے سر ہلایا۔ ''ہاں تم سے پہلے یہاں کوئی نہیں رہا۔ مریض بھی صرف تھراپی کی حد تک رکھے جاتے تھے۔''

چار بجنے والے تھے، وہ باہر آیا۔ احاطے کے گیٹ سے نکل کر وہ ہائی وے کی طرف جانے والے راستے پر وہاں تک آیا جہاں سے ایک چھوٹا راستہ چٹان کی طرف جاتا تھا۔ قیصر وہیں رک کر انتظار کرنے لگا۔ شیما کی کار کسی قدر تاخیر سے نمودار ہوئی۔ اس نے راستے پر ایک ایسی جگہ کار روکی جہاں سے آنے جانے والی گاڑیوں کا راستہ نہ رکے۔ وہ نیچے اتری اور معذرت کی۔ ''سوری، ڈاکٹر سیفی نے روک لیا تھا کسی کام سے اس لیے دیر ہوگئی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' قیصر آگے بڑھا اور شیما اس کے ساتھ چلنے لگی۔ اس نے کوٹ اتار دیا تھا اور خالی شلوار سوٹ میں تھی۔ نیلی قمیص پر پیلے اور سرخ پھول پرنٹ تھے اور کسی قدر فٹنگ کا یہ لباس اس پر سج رہا تھا۔ وہ جھاڑیوں سے دوپٹا بچا رہی تھی۔

''یہ جگہ کچھ سنسان نہیں ہے؟''

''کیا تمہیں خوف محسوس ہو رہا ہے؟'' قیصر چلتے چلتے رک گیا۔

شیما نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''ہاں...... لیکن تم سے نہیں۔''

''انسان کو انسان سے ڈرنا چاہیے۔ باقی کوئی چیز اسے کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

''کیا اس میں انسان کی اپنی ذات بھی شامل ہے؟''

''انسان کو سب سے زیادہ خود سے ڈرنا چاہیے۔'' قیصر نے سر ہلایا۔ ''انسان کو سب سے زیادہ دھوکا خود اس کی اپنی ذات دیتی ہے۔''

"ہاں، انسان کو سب سے زیادہ دھوکا اپنی ذات سے ملتا ہے۔" شیما نے تائید کی۔ وہ چٹان کے پاس آئے۔ شیما نے سر اٹھا کر دیکھا۔ "بہت مشکل ہے۔"

"دیکھنے میں لگ رہی ہے اور پہلی بار مشکل ہوگی۔ ایک بار تم نے اسے سر کر لیا تو اس کے بعد یہ اتنی مشکل نہیں رہے گی۔"

"ہاں، مشکل ہمیشہ پہلی بار پیش آتی ہے۔" شیما بولی تو قیصر اوپر چڑھنے لگا شیما اس کے نقشِ قدم پر چل رہی تھی۔ جہاں کوئی مشکل جگہ آتی تو قیصر اسے سہارا دیتا۔ ایک پتلے سے چھجے پر جو ایک فٹ چوڑا اور چھ فٹ لمبا تھا، وہاں سے گزرنا شیما کو سب سے زیادہ مشکل لگا۔ آخری مرحلے پر اس کے قدم لڑکھڑائے مگر قیصر نے بروقت اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اسے کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ وہ قیصر کے سینے سے لگی کسی چڑیا کی طرح کانپ رہی تھی۔ بات ڈرنے کی تھی، اگر وہ نہ سنبھلتی تو نیچے گہرائی کم سے کم پچاس فٹ تھی اور نیچے پتھر ہی پتھر تھے۔ پھر اس نے خود پر قابو پا لیا۔ وہ قیصر سے دور ہوئی تو اس کا چہرہ زیادہ سرخ ہو رہا تھا مگر قیصر کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ حیرت انگیز طور پر شیما کو اس کے بعد خوف محسوس نہیں ہوا۔ وہ چٹان کے اوپر پہنچے تو شیما ہانپ رہی تھی مگر قیصر کا سانس بالکل ہموار تھا۔ شیما نے کہا۔ "تمہارا اسٹیمنا بہت اچھا ہے۔"

"میں عادی ہوں اور اکثر یہاں آتا رہتا ہوں۔" قیصر نے کہا اور کنارے کی طرف بڑھا۔

"رک جاؤ۔" شیما بے ساختہ بولی۔ "یہ خطرناک ہے۔"

"نہیں ہے، میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ تم بھی آجاؤ۔"

شیما محتاط قدموں سے آئی اور آخری دو قدم اس نے بیٹھ کر طے کیے۔ وہ قیصر کے برابر میں آئی۔ یہاں کسی قدر ہوا تھی اس کے بال اڑ رہے تھے۔ قیصر نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم نے میرے بارے میں سب پوچھ لیا مگر اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

وہ مسکرانے لگی۔ "تم نے محسوس کر لیا تھا؟"

"ہاں...... حالانکہ تم نے بہت مہارت سے سوالات کیے تھے۔"

"اپنے بارے میں کیا بتاؤں۔ مجھے سائیکاٹرسٹ بننے کا شوق تھا۔ اصل میں میرے آل فیملی ممبرز میڈیکل کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ماما پاپا ڈاکٹر ہیں۔ میرے دو بھائی سرجن ہیں۔ ایک ہارٹ سرجن ہیں دوسرے نیورو سرجن ہیں۔ میری ایک سسٹر گائناکولوجسٹ ہے اور میں نے یہ شعبہ چنا۔ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہوں۔ آنے والے بارہ اپریل کو پورے پچیس کی ہو جاؤں گی۔ تنہائی پسند ہوں۔ بہت کم دوست ہیں۔ گھر میں بھی زیادہ تر گمن رہتی ہوں۔ صورت شکل کی کیسی ہوں، یہ دیکھنے والے ہی بتا سکتے ہیں۔"

قیصر نے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہیں کوئی ناپسند نہیں کر سکتا۔"

وہ مسکرانے لگی۔ "شکریہ، میں زیادہ گھلتی ملتی نہیں ہوں اس لیے گھر والے آدم بیزار کہتے ہیں۔"

"لگتا تو نہیں ہے۔"

"کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے انسان بالکل بیزار نہیں ہو سکتا۔" شیما نے اس کی بات کا بلاواسطہ جواب دیا۔

"میرا اندازہ تھا کہ تم دولت مند فیملی سے ہو۔"

"ہاں، ابھی میں نے زیادہ نہیں کمایا ہے۔ میرا اپنا کلینک ہے۔ میں شام پانچ سے رات آٹھ تک وہاں ہوتی ہوں۔ دو سال ہوئے ہیں، ابھی پریکٹس جما رہی ہوں۔"

"اور یہاں؟"

"یہاں میں سیکھنے آئی ہوں۔ میری خوش قسمتی کہ ڈاکٹر اطہر نے میری درخواست قبول کی۔ میں ایک سال سے یہاں کام کرنے کی منتظر تھی۔"

قیصر حیران ہوا۔ وہ یہاں رضاکارانہ کام کر رہی تھی۔ یعنی اسے کوئی معاوضہ نہیں مل رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ اسے اپنی خوش قسمتی قرار دے رہی تھی۔ اس کی حیرت دیکھتے ہوئے شیما نے مزید وضاحت کی۔ "ڈاکٹر اطہر کا شمار ملک کے نامور ترین ماہرِ نفسیات میں ہوتا ہے۔ وہ بین الاقوامی سطح پر بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔"

"یہاں ایسی کیا بات ہے؟ مجھے تو لگتا ہے یہاں بس کچھ لوگوں کو رکھا ہوا ہے۔"

"اس ادارے میں انہوں نے بہت خاص مریض رکھے ہیں۔ ہر ماہرِ نفسیات ان مریضوں کا علاج نہیں کر سکتا۔ علاج کرنا تو دور کی بات ہے، وہ ان کے مرض کی جڑ تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ یہاں میں جو سیکھوں گی، وہ مجھے یورپ یا امریکا میں سیکھنے کا موقع مل سکتا ہے۔"

قیصر نے کہا۔ "میں تو سمجھتا ہوں کہ یہاں کچھ خاص نہیں ہو رہا ہے۔"

"تم ڈاکٹر اطہر کے سیٹ اپ سے ناواقف ہو......" شیما بولتے بولتے رک گئی پھر اس نے کہا۔ "اصل میں تمہارا تعلق ان چیزوں سے نہیں ہے۔ یقین کرو یہاں

موجود ہر فرد چن کر لیا گیا ہے۔''

''میں نے کبھی اس بارے میں زیادہ سوچا نہیں۔''

''تم کس بارے میں زیادہ سوچتے ہو؟''

''پتا نہیں، شاید میں زیادہ سوچتا نہیں ہوں۔''

''یہ ممکن نہیں ہے کہ انسان نہ سوچے۔''

''ہوسکتا ہے۔'' قیصر نے اس کی طرف دیکھا۔ ''لیکن میں ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے زیادہ سوچنا اچھا نہیں لگتا۔''

''اپنے ماضی کے بارے میں بھی نہیں؟''

''ماضی کے بارے میں سوچنا ہی تو اچھا نہیں لگتا۔''

''کیوں؟''

''میں وضاحت نہیں کرسکتا۔''

شیما پاؤں کے انگوٹھے سے چٹان کی سطح کھرچنے لگی۔ ''ایک پرسنل سوال کرسکتی ہوں؟''

''ہاں کرو۔''

''تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟''

قیصر نے گہری سانس لی۔ ''ہاں کی ہے، اب بھی کرتا ہوں۔''

''وہ عورت......''

''تم نے ایک سوال کا کہا تھا۔'' قیصر نے اس کی بات کاٹی۔ اس نے جتا دیا کہ وہ اس موضوع کو ایک ہی سوال تک محدود رکھے۔ قیصر کہہ کر لیٹ گیا تھا۔ مغرب کی طرف جھک جانے والے سورج کی دھوپ ماند پڑ گئی تھی اور اس کی ہلکی حرارت اب اچھی لگ رہی تھی۔ شیما نے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے چٹان پر ٹیک لیے۔ بدن خود ابھر آیا تھا۔ اس کا یہ انداز اتنا نظر نواز تھا کہ قیصر بے اختیار نظر چرانے پر مجبور ہوگیا۔ وہ شفاف آسمان دیکھنے لگا۔ اس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ''تم نے یہ سوال کیوں کیا؟''

''پتا نہیں۔'' وہ بولی اور اس کے پاس لیٹ گئی۔ اگرچہ وہ اس سے کوئی گز بھر دور تھی مگر قیصر اس کی قربت محسوس کر رہا تھا اور اسے کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی۔ اس نے سر گھما کر دوسری طرف دیکھا۔ وہ اپنی توجہ بٹانا چاہتا تھا۔ اس کی نظر دور بجلی کے کھمبے پر چڑھے ٹیکنیشن پر گئی۔ وہ کچھ کام کر رہا تھا مگر اس کا رخ ان کی طرف تھا۔ جس طرح وہ اسے دیکھ رہا تھا، اسی طرح وہ بھی ان دونوں کو دیکھ رہا ہوگا۔ قیصر کو جھٹکا سا لگا اور وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کا انداز محسوس کر کے شیما بھی اٹھ بیٹھی تھی۔ ''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' قیصر نے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔''

شیما نے اس سمت دیکھا جس طرف قیصر نے دیکھا تھا اور پھر اس نے بھی ٹیکنیشن کو دیکھ لیا۔ شاید وہ سمجھ بھی گئی۔ اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے یہ شخص کام کر رہا ہے۔''

''میں نے وضاحت نہیں چاہی ہے۔'' قیصر کا لہجہ سرد تھا۔ اس نے اپنا لباس جھاڑا اور اترنے والے راستے کی طرف بڑھا۔ اس نے شیما سے چلنے کو نہیں کہا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر اس کے پیچھے لپکی۔

''مجھے کہاں چھوڑے جا رہے ہو؟''

قیصر جواب دیے بغیر نیچے اترنے لگا۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر نیچے جا رہا تھا اور اس نے شیما کی مدد کرنے یا سہارا دینے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا رویہ بالکل بدل گیا تھا۔ وہ پہلے بھی کم بول رہا تھا اور اس کی طرف کم دیکھ رہا تھا مگر اس کے انداز میں اس وقت ایک اجنبی سی رکھائی آگئی تھی۔ جیسے وہ اسے جانتا ہی نہ ہو۔ وہ صرف پہلے چھجے کے پاس رکا۔ شیما نے بہ مشکل اسے پار کیا۔ ایک موقع پر اسے ہلکا سا چکر آیا اور اسے لگا جیسے وہ گر جائے گی۔ وہ بے ساختہ دیوار سے چمٹ گئی اور جب اس کے حواس بحال ہوئے تو خود کو دیوار کے ساتھ لگے پا کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ قیصر نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر اب اسے غصہ آگیا تھا۔ اس نے قیصر کا ہاتھ نظر انداز کر دیا اور خود دوسری طرف آگئی۔ نیچے اترنے کے دوران اس نے کسی بھی مرحلے پر قیصر کا سہارا نہیں لیا اور نہ اس سے بات کی۔ البتہ جب وہ اپنی کار کی طرف جانے لگی تب اس نے قیصر کو تھینک یو کہا۔ قیصر کھڑا اسے جاتا دیکھ رہا تھا، جب اس کی کار نظروں سے اوجھل ہوگئی تو وہ بھی احاطے کی طرف مڑ گیا۔ ابھی روشنی تھی اور غلام بھی باہر موجود تھا۔ وہ بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ قیصر اپنا دھیان بٹانا چاہتا تھا۔ اس سے کہا۔

''کیا خیال ہے، سامنے والا حصہ نہ صاف کر دیں؟''

''نہیں۔'' خلافِ توقع اس نے انکار کر دیا۔

''لیکن کیوں؟''

غلام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ہل رہا تھا۔ جب وہ یوں ہلتا تو قیصر سمجھ جاتا کہ وہ اندر سے بہت مضطرب ہے۔ ایسے وقت وہ زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ قیصر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو اس نے ہاتھ جھٹک دیا اور بولا۔

''تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتے۔ میں نے صرف تمہیں بتایا ہے۔''

''بات اعتماد کی نہیں ہے، میں اب تک سمجھ نہیں پایا

کہ احاطے سے باہر کھمبوں پر چڑھ کر کوئی شخص کس طرح ہماری نگرانی کر سکتا ہے۔''

غلام کا ہلنا کم ہو گیا۔ ''تم مت مانو لیکن ایک دن آئے گا جب تم مان جاؤ گے۔''

''میں نے احاطے کے چاروں طرف دیکھا ہے۔ مجھے کہیں کوئی نگرانی کرنے والا نظر نہیں آیا۔'' قیصر کو کہتے ہوئے وہ شخص یاد آیا جو بجلی کے کھمبے پر چڑھا ہوا کچھ کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر قیصر کا موڈ بدل گیا تھا اور اسے نہ جانے کیوں شیما پر بھی غصہ آنے لگا تھا۔ اب اسے اپنی کیفیت پر ندامت ہو رہی تھی اور ساتھ ہی غلام پر ترس آ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ غلام یہاں کیوں تھا؟ لیکن اس نے اسے بہت دبی ہوئی اور کچلی ہوئی شخصیت کا مالک پایا تھا۔ وہ ہر ایک سے دب جاتا، ہر ایک کے آگے جھک جاتا۔ ابھی اس نے قیصر کا ہاتھ جھٹکا تو اسے تعجب ہوا تھا کیونکہ اس میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ شاید قیصر اس کے لیے دوست تھا اس لیے وہ اس حد تک چلا گیا۔ شروع میں جب وہ اس کا مددگار بنا تو کئی دن اس نے قیصر سے بات نہیں کی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ اس سے بات کرنے لگا اور ایک دن صفائی کرتے ہوئے اچانک اس نے قیصر سے کہا۔

''کیا تم مجھ سے دوستی کرو گے؟''

وہ عمر میں قیصر سے بہت چھوٹا تھا اور اس کا تعلق بھی بہت نچلے طبقے سے تھا۔ یہ بات اس کی زبان اور انداز سے بھی عیاں تھی۔ قیصر نے سر ہلایا۔ ''کیوں نہیں، میں تم سے دوستی کروں گا۔''

پہلی بار غلام کے چہرے پر خوشی نمودار ہوئی تھی۔ اس نے گرم جوشی سے کہا۔ ''اب ہم دوست ہیں۔ مجھ سے آج تک کسی نے دوستی نہیں کی۔''

اس کے بعد سے آج غلام نے پہلی بار دوستی کے حوالے سے کوئی بات کی تھی۔ غلام نے اس کی بات سنی تھی تب بھی اس نے توجہ نہیں دی۔ وہ اپنی سوچ پر قائم تھا۔ ''ہم دوست ہیں اگر تم مجھ سے کہو گے تو میں آنکھ بند کر کے یقین کروں گا۔''

قیصر کو اندر سے شرمندگی ہوئی۔ بارہا ایسا ہوا کہ اس نے غلام سے ایسے ہی کچھ کہہ دیا اور غلام نے اس کی بات کا پورا یقین کیا۔ دو تین بار ایسا ہوا کہ اس کی بات غلط ثابت ہوئی مگر غلام نے اسے یاد نہیں دلایا کہ اس نے ایسا کہا تھا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ''دوست! اگر تمہیں میری بات سے تکلیف ہوئی ہے تو میں سوری کرتا ہوں۔''

''دوستوں میں سوری نہیں ہوتی۔'' غلام نے جواب دیا۔ بہ ظاہر وہ جاہل اور کم عقل لگتا تھا مگر کبھی کبھی ایک جملے میں ایسی بات کہہ جاتا جو دوسرے ایک پیراگراف میں بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس کا مطلب واضح تھا کہ دوستی میں معذرت نہیں کی جاتی۔ خاموش رہا جاتا ہے یا رجوع کیا جاتا ہے مگر وہ اس کی ایسی بات کیسے مان لیتا جس پر اسے یقین نہیں تھا۔ غلام سے بحث کرنا بھی بیکار تھا۔ وہ اس بارے میں کہہ چکا تھا کہ اسے کچھ نہیں معلوم اور اسے لگتا تھا کہ ایسا ہوتا ہے۔ اسے اپنے گمان پر یقین تھا اور وہ چاہتا تھا کہ قیصر بھی اس کے یقین پر یقین کر لے۔ قیصر خاموش ہو گیا۔ سورج ڈوب گیا اور اندھیرا ہونے لگا۔ اس سے پہلے ہی احاطے کی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ یہاں بجلی کا ایسا نظام تھا کہ کبھی لائٹ نہیں جاتی تھی۔ اس احاطے سے باہر لائٹ جاتی تھی مگر یہاں ہمیشہ بجلی ہوتی تھی اور یقیناً یہاں کوئی بیک اپ سسٹم تھا مگر قیصر نے ایسا بیک اپ سسٹم دیکھا نہیں تھا۔ عمارتوں میں روشنی کا جدید ترین نظام تھا۔ اپنے وقت پر روشنیاں خودکار انداز میں جلتی اور بند ہوتی تھیں اور اس میں کبھی خلل نہیں آتا تھا۔

سات بجے وہ کھانے کے لیے اٹھ گئے۔ میس میں کھانے کے بعد شوکت نے اسے دو شاپر دیے۔ ایک میں کتے کے لیے کھانا تھا اور دوسرے میں اس کے لیے ہڈیاں تھیں۔ اس نے قیصر سے پوچھا۔ ''تم نے اس کا کوئی نام رکھا؟''

وہ ہچکچایا۔ ''نہیں، ابھی کوئی نام نہیں رکھا ہے۔''

''براؤن کیسا رہے گا؟'' شوکت نے کہا۔ ''اس کا رنگ بھی براؤن ہے۔''

''ہاں، اچھا نام ہے۔''

''اگر تم نے اسے رکھنے کا فیصلہ کیا ہے تو اسے پٹا ڈال دو ورنہ یہ باہر گیا تو کوئی پکڑ کر لے جائے گا۔''

قیصر کا اسے مستقل رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے وہ پٹے والی بات پر خاموش رہا۔ وہ باہر نکلا تو شمال کی طرف سے خنک ہوا چل رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پہاڑوں پر پھر برف باری ہوئی تھی۔ جاتی سردی ہمیشہ زور لگاتی تھی۔ اس نے اپنے اپر کا ہڈ اوپر کر لیا اور روش سے ہوتا ہوا کیبن تک آیا۔ کھانے کی خوشبو پہلے ہی کتے کی ناک تک پہنچ گئی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور اس کے چاروں طرف گھومنے لگا۔ وہ اس سے کھانے کی التجا کر رہا تھا۔ بے ساختہ قیصر کو اس پر پیار آیا۔ اس نے جھک کر اس کا سر

سہلایا۔ ”صبر براؤن صبر...... ابھی دیتا ہوں۔“

اسے اچھا نہیں لگا کہ اس اچھی نسل کے کتے کو گلی کے کتوں کی طرح کھانا دے۔ اس کے پاس کیبن میں ایک اضافی پلیٹ تھی۔ وہ اسے لے آیا اور ڈبے سے روٹی اور سالن کا ملغوبا اس میں ڈال کر براؤن کے سامنے رکھا۔ وہ بے تابی سے کھانے لگا۔ چند لقمے لینے کے بعد اس کی بیتابی کم ہوئی تو اس نے بھونک کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ آج قیصر اسے کھانا ڈال کر اٹھا نہیں بلکہ اس کے پاس بیٹھا اسے کھاتا دیکھتا رہا۔ آج بھی شوکت نے خاصی مقدار میں دیا تھا اور براؤن نے آخر تک کھایا۔ پلیٹ تک چاٹ کر صاف کر دی۔ قیصر نے دوسرا شاپر کھولا اور اس میں سے ہڈیاں نکال کر پلیٹ میں ڈالیں تو براؤن کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ وہ باقاعدہ چہک کر بھونکا مگر پھر اس نے عجیب حرکت کی۔ اس نے ہڈیاں دانتوں میں دبائیں اور وہاں سے بھاگ گیا۔ قیصر حیران ہوا۔ براؤن نے گوشت، سبزی اور روٹی کا کھانا تو سکون سے کھایا مگر ہڈیاں یوں لے کر بھاگ گیا جیسے وہ ابھی اس سے چھین لے گا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا جانوروں کی بھی نفسیات ہوتی ہے؟ وہ ایک ہی چیز کے لیے مختلف ردِعمل دیتے ہیں؟

ہوا میں تندی آ گئی تھی۔ وہ اندر آیا تو اسے تصویر کا خیال آیا۔ اس نے چمچ لے کر پھر سے ریک کے نیچے سے تراشا نکالنے کی کوشش کی مگر وہ پکڑ میں نہیں آ رہا تھا۔ اندر تاریکی تھی۔ اس کے پاس ایک ٹارچ تھی۔ اس نے اس کی روشنی اندر ڈال کر دیکھا مگر اسے نیچے خلا میں کاغذ نظر نہیں آیا۔ بس تاریکی سی تھی۔ تنگ آ کر اس نے ریک دیوار سے ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ دیوار اور فرش میں فکس تھا۔ دونوں چیزیں لکڑی کی بنی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید ریک کے نیچے فرش بنانے کے بجائے خلا چھوڑ دیا گیا ہو ورنہ تراشا کہاں جا سکتا تھا؟ البتہ جب وہ چمچ نیچے کرتا تو اسے لکڑی کا فرش محسوس ہوتا تھا۔ اس نے اپر اتارا اور واش روم سے آ کر وہ لیٹا تھا کہ اسے باہر کچھ کھرچنے جیسی آواز آئی۔ اس نے اٹھ کر دیکھا تو براؤن ایک بار پھر برآمدے کے فرش کو پنجوں سے کھرچ رہا تھا۔ قیصر نے اسے ڈانٹا۔ ”براؤن! مت کرو۔“

کتے نے اسے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر اس طرف چلا گیا جہاں وہ لیٹ کر آرام کرتا تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اس آدمی کو اس کی حرکت پسند نہیں آئی ہے۔ وہ اندر آ کر لیٹا تو اس کے ذہن میں شیما آ گئی۔ آج وہ جس طرح اس کے نزدیک آئی تھی وہ انداز بہت کچھ بتا رہا تھا مگر اس کا ذہن اس بات کو تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ وہ ایک عام سا فرد تھا اور یہاں بہت معمولی سا کام کر رہا تھا جسے جاب بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ شیما کا تعلق ایک دولت مند اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان سے تھا۔ وہ حسین اور جوان تھی۔ اسے ایک سے بڑھ کر ایک آدمی مل سکتا تھا اسے ایک ایسے شخص کی طرف متوجہ ہونے کی کیا ضرورت تھی جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی اور اگر جانتی تھی تو یہ زیادہ لایعنی بات تھی۔ وہ پہلے سے شادی شدہ اور سزا سے مفرور مجرم تھا۔ وہ لاوارثوں کی طرح اس ادارے میں رہ رہا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی طرف آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ قیصر خوش شکل تھا۔ اس میں ایسی کشش تھی جو لڑکیوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا مگر ہما نے کئی بار اسے بتایا تھا۔ اس کی کشش مردانہ نہیں بلکہ لڑکوں والی تھی اور اس میں کرختگی نہیں بلکہ خوش روئی اور معصومیت تھی۔ لڑکیاں اور عورتیں اس پر اعتماد کر لیتی تھیں۔ ہما سے شادی سے پہلے بھی کئی لڑکیاں اس کی طرف آئیں مگر اس کے ذہن میں ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی کہ وہ ان کی طرف توجہ دیتا۔ ہما پہلی لڑکی تھی جس کی طرف وہ متوجہ ہوا اور اب شیما تھی جو اس کی طرف آئی تھی اور اتنے پُرزور انداز میں آئی تھی کہ اس نے بنا کہے قیصر کو اپنے جذبات اور احساسات سے آگاہ کر دیا تھا مگر وہ اسے کچھ نہیں دے سکتا تھا اور اس صورت میں اسے قبل از وقت روک دینا ہی مناسب تھا۔ قیصر نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اس سے فاصلہ رکھے گا۔ جلد یا بدیر وہ سمجھ جائے گی۔ یہ فیصلہ کر کے وہ مطمئن ہو گیا اور کچھ دیر میں اسے نیند آ گئی۔

صبح اس کی آنکھ وقت پر کھلی۔ اسے لگا کہ باہر کوئی گاڑی رکی ہے۔ وہ اٹھ کر چپل پہنتا ہوا باہر آیا تو ڈاکٹر اطہر کی گاڑی کیبن کے سامنے رکی ہوئی تھی۔ وہ فرنٹ سیٹ سے کچھ اٹھا رہا تھا پھر ایک شاپر لے کر آگے آیا۔ قیصر نے سلام کیا تو اس نے جواب دے کر شاپر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”تم نے جو منگوایا تھا، اس میں ہے اور میری طرف سے بھی کچھ ہے...... اگر تمہیں پسند آئے تو۔“

”میں آپ کا احسان مند ہوں۔“ قیصر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”آپ نے مجھ جیسے بے گھر اور بیکار شخص کو یہاں رکھا ہوا ہے، میری ہر ضرورت پوری کرتے ہیں۔“

”میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ تم یہاں رہ رہے ہو کیونکہ یہ تمہارا گھر ہے اور تم اس کی دیکھ بھال ایسے کرتے ہو جیسے انسان اپنے گھر کی کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو تم

جتنا کرتے ہو اس کے مقابلے میں تمہیں کم ملتا ہے۔ تمہاری ہر ضرورت پوری کرنا میرا فرض ہے۔"

قیصر نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ ہاتھ ہلاتا ہوا واپس چلا گیا۔ قیصر نے اندر آکر شاپر دیکھا۔ اس میں اس کی ضرورت کی چیزیں تھیں۔ اس کے علاوہ دو نئے ٹھنڈے ٹراؤزرز اور ٹی شرٹس تھیں۔ چند دنوں بعد اسے ان کی ضرورت پڑتی۔ سب سے نیچے ایک لفافہ تھا۔ اس نے اسے کھولا تو اس میں دو ہزار روپے کے مختلف مالیت کے نوٹ تھے۔ اس نے انہیں بھی پرس میں رکھ لیا۔ ڈاکٹر نے اسے پہلے جو رقم دی تھی، اس میں سے بھی بہت کم خرچ کیا تھا۔ اسے ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ ہر چیز یہاں سے مل جاتی تھی اور جو نہیں ہوتی وہ کہہ دیتا تو اگلے دن آجاتی تھی۔ اسے خیال آتا تھا کہ ڈاکٹر اطہر اس کے لیے یہ سب کیوں کر رہا ہے جبکہ وہ اس کا مریض بھی نہیں تھا؟ ڈاکٹر عزیز نے اسے کیا کہہ کر یہاں رکھوایا تھا؟ ایسا ممکن نہیں تھا کہ ڈاکٹر اطہر کچھ بھی نہ جانتا ہو لیکن اگر اسے قیصر کی حقیقت کا علم بھی تھا تب بھی اس نے کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔

دوپہر میں وہ کام نمٹا کر ہائی وے کی طرف روانہ ہوا۔ آج اس کا کچھ خریداری کا موڈ تھا۔ اس نے سوچا نہیں تھا کہ وہ کیا لے گا مگر اس نے یہ ضرور سوچا تھا کہ آج وہ کچھ رقم خرچ کرے گا۔ وہ صرف ایک بار ہائی وے کے ساتھ موجود ایک اسٹور میں گیا تھا۔ یہاں سے کھانے پینے کا سامان اور گروسری ملتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک گفٹ اور سووینئر شاپ بھی تھی۔ وہ اندر آیا۔ وہاں بہت کچھ تھا۔ جیولری آئٹم بھی تھے اور کھلونے بھی۔ اس کے علاوہ بڑوں کے لیے بھی تحفے تھے۔ وہ بھٹکتی نظروں سے شیلف اور شوکیسوں میں دیکھ رہا تھا۔ جیولری والے شوکیس میں اس کی نظر رک گئی۔ اسے ایک نازک سی چین پسند آئی۔ یہ میٹیلک گولڈ کلر کی تھی اور اس میں ہر چند کڑیوں کے بعد ٹیولپ کے پھول بنے ہوئے تھے۔ چین بہت صفائی اور نفاست سے بنی ہوئی تھی۔ سیلز مین نے اس کی دلچسپی محسوس کرتے ہوئے اسے شوکیس سے نکال کر اسے سامنے رکھ دیا۔

"بالکل نئی چیز ہے، آپ کی وائف کو پسند آئے گی۔"

"وائف۔" اسے جھٹکا سا لگا مگر پھر اس نے کہا۔

"اسے نکال دو۔"

سیلز مین نے جلدی سے اسے ایک چھوٹے اور لمبے باکس میں ڈال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے قیمت پوچھی۔ "کتنے ہوئے؟"

"صرف ساڑھے تین سو روپے سر۔"

اس نے ادائیگی کی اور باکس اٹھا کر اپر کی جیب میں رکھ لیا۔ وہ باہر آیا اور فٹ پاتھ پر لگی بنچ پر بیٹھ گیا۔ شام قریب تھی اور سرد ہوا میں اضافہ ہو رہا تھا مگر اس کا ابھی واپس جانے کا موڈ نہیں تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اپر کی جیبوں میں دیے بیٹھا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ چین والے باکس پر تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے اسے کیوں لیا ہے؟ کیا شیما کے لیے؟ مگر اسے لیتے ہوئے اس کے ذہن میں دور دور تک شیما کا کوئی خیال نہیں تھا۔ پھر کیا اس نے ہما کا سوچ کر لیا تو یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا۔ کیوں نہیں جا سکتا؟ اسے بس تیس پینتیس کلومیٹرز دور جانا تھا۔ یہ کوئی فاصلہ نہیں تھا اور وہ ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ نہیں گیا۔ چھ مہینے سے وہ صرف سوچ رہا تھا۔ اسی لمحے مشینی گنگناہٹ اور ہائیڈرولک کے پریشر نے اسے چونکایا۔ سامنے ایک بس رکی تھی۔ اس سے چند افراد اتر رہے تھے۔ اس کی توجہ بس کے سامنے شیشے پر لکھے علاقوں کے نام پر گئی۔ یہ نام اس بس کے روٹ میں آتے تھے اور تب ایک نام پر اس کا دل رک سا گیا۔

یہ اس کے علاقے کا نام تھا جو سب سے آخر میں تھا۔ یہ بس وہاں بھی جاتی تھی جہاں اس کی بیوی اور بیٹی رہتی تھیں۔ جہاں اس کا گھر تھا۔ بس کے انجن کی آواز بدلی تو وہ بے ساختہ بنچ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بلند کیا تو بس چلتے چلتے ٹھہر گئی۔ وہ پاس آیا تو اس کا خودکار دروازہ کھل گیا اور وہ اندر آ گیا۔ اس کے اندر آتے ہی دروازہ بند ہوا اور بس آگے روانہ ہو گئی۔ موسم یا روٹ کی وجہ سے بس میں رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ اسے شروع میں سیٹ مل گئی۔ اس نے کنڈیکٹر سے اپنے علاقے تک کا ٹکٹ مانگا اور ٹکٹ لے کر اسے مطلوبہ رقم دے دی۔ اس نے یہ سب بے ساختہ کیا تھا۔ اس کے ذہن میں کہیں خیال نہیں آیا تھا کہ اسے جانا چاہیے۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح اٹھا اور اس بس میں سوار ہو گیا جو اسے اس کے گھر کی طرف لے جا رہی تھی۔ اس کی فیملی کی طرف لے جا رہی تھی۔ اسے لگا جیسے اس سے کسی نے یہ سب کرایا ہے۔

بس میں بیٹھ کر اس نے سوچا کہ اس نے کیا کیا ہے اور پھر ٹکٹ لے کر اس نے اپنا ارادہ پختہ کر لیا تھا۔ سورج ڈوبتے ہی بہت تیزی سے تاریکی چھائی تھی۔ باہر سڑک کے کنارے لگی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ بس ہر ایک ڈیڑھ کلومیٹر بعد آنے والے اسٹاپ پر رکتی تھی اور مسافر چڑھتے

اترتے اور بس آگے روانہ ہو جاتی۔ بس ایک اسٹاپ پر رکی تو وہاں سے صرف ایک شخص بس میں سوار ہوا۔ وہ اندر آیا اور قیصر کی سیٹ والی قطار کے برابر والی قطار میں پہلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ قیصر نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ وہ باہر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس شخص نے کہا۔ ''بعض اوقات انسان غلط بس پکڑ لیتا ہے۔ وہ اس طرف جانا چاہتا ہے جو اس کی منزل نہیں ہوتی ہے۔''

قیصر نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کی رگوں میں جیسے خون جم گیا۔ وہ ڈاکٹر عزیز تھا۔ وہ حیران تھا کہ ڈاکٹر عزیز کو اس کی حرکت اور ارادے کا کیسے علم ہوا؟ ڈاکٹر عزیز اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا مگر وہ جیسے اسے اندر سے پڑھ رہا تھا۔ اس نے پھر دھیمے لہجے میں کہا۔ ''انسان جو ذمے داری لیتا ہے، اسے پورا کرنے کے لیے اسے بعض اوقات بہت جان مارنی پڑتی ہے۔''

''کیا میں نے کسی سے درخواست کی تھی کہ وہ یہ ذمے داری دے۔'' اس نے بھی دھیمے لیکن تلخ لہجے میں کہا۔ اتفاق سے ان کے آس پاس کوئی اور مسافر نہیں تھا اس لیے ان کی گفتگو صرف ان تک محدود تھی۔ جواب میں ڈاکٹر عزیز نے اپنے مخصوص دھیمے انداز میں کہا۔

''انسان بہت سی چیزوں کی درخواست نہیں کرتا لیکن اسے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ تب کسی دوسرے انسان کا فرض اور ذمے داری بن جاتی ہے کہ اسے پورا کرے۔''

''میں تمہیں اس ذمے داری سے آزاد کرتا ہوں۔''

''اب یہ صرف تمہارا اختیار نہیں ہے۔ تم نے کبھی سوچا ہے کہ اس کام میں کتنے لوگ ملوث ہیں اور اگر بات کھل گئی تو کتنے لوگوں کو جواب دینا ہوگا۔'' ڈاکٹر عزیز کا لہجہ خبردار کرنے والا ہو گیا۔

''میں کچھ نہیں جانتا۔'' قیصر نے کسی قدر ہذیانی انداز میں کہا۔ ''میں اب مزید اپنی بیوی اور بچی سے دور نہیں رہ سکتا۔ میں ان کے پاس جا رہا ہوں، کوئی مجھے نہیں روک سکتا۔''

ڈاکٹر عزیز آج لمبے کوٹ کے بجائے چھوٹے اور سادہ کوٹ میں تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کوئی کسی کو نہیں روک سکتا۔ یہ فیصلہ انسان نے خود کرنا ہوتا ہے کہ اس کا اٹھایا جانے والا قدم ٹھیک ہے یا نہیں۔ اب یہ فیصلہ تم نے کرنا ہے۔''

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔'' اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بیکار میں مجھے روکا، جب میں اس بس پر سوار ہوا تو میں فیصلہ کر چکا تھا۔''

''تم نے ابھی فیصلہ نہیں کیا ہے۔'' ڈاکٹر عزیز ذرا جھک کر بولا۔ اسی لمحے بس رکنے لگی۔ اگلا اسٹاپ آ رہا تھا۔ ''تمہارے پاس وقت ہے۔ ابھی تم فیصلہ کر سکتے ہو۔''

بس رکی اور ڈاکٹر عزیز کھڑا ہو گیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا اور نیچے اترنے سے پہلے اس نے مڑ کر ایک بار قیصر کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا مگر اس نے ڈاکٹر عزیز کی نظروں کو واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ اس کے اترتے ہی دروازہ بند ہو گیا اور بس آگے بڑھ گئی۔ ڈاکٹر عزیز کے آنے اور اس کی باتوں سے پہلے اس کے اندر جو اطمینان اور سکون تھا، وہ اب رخصت ہو گیا تھا اور... وہ مضطرب تھا۔ اس کے اندر کوئی کہہ رہا تھا کہ اسے نہیں جانا چاہیے۔ کیا فائدہ ایسے جانے کا کہ وہ پھر اپنی بیوی بچی کو تڑپتا ہوا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو جائے۔ وہ خود بھی نہیں ہوگا اور اس کی بیوی اور بچی پھر اسی اذیت سے گزریں گے جس سے وہ ایک بار پہلے بھی گزر چکے ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا اور اس کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ اگلا اسٹاپ نزدیک آ رہا تھا۔ بس شہر میں داخل ہو چکی تھی اور اس کا علاقہ کچھ ہی دور رہ گیا تھا۔ اسٹاپ آیا اور بس رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے اندر کی کشمکش بڑھ گئی۔ اس کا دماغ کہہ رہا تھا کہ اسے بس سے اتر جانا چاہیے اور دل کہہ رہا تھا کہ بس میں بیٹھے رہنا چاہیے۔ اس نے اپنا سر تھام لیا۔ وہ بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ سب اس کے اختیار میں تھا مگر اسے لگ رہا تھا کہ کچھ بھی اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ پھر وہ دروازہ بند ہونے کی آواز پر چونکا اور بے اختیار کھڑے ہو کر کہا۔

''رک جاؤ...... بس روکو۔''

ڈرائیور نے بس روک دی۔ وہ آگے بڑھا۔ دروازہ کھل گیا اور وہ نیچے اتر گیا۔ دروازہ بند ہوا اور بس آگے بڑھ گئی۔ ایک گھنٹے بعد وہ واپسی کی بس سے علاج گاہ کے اسٹاپ پر اترا۔ وہ سڑک کراس کر رہا تھا کہ اچانک بجلی کے کھمبے کی طرف سے ایک جھماکا سا ہوا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے وہاں کھمبے پر ایک شخص چڑھا دکھائی دیا۔ قیصر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے قیصر کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اپنا سامان سمیٹا اور تیزی سے کھمبے سے نیچے آیا۔ جب قیصر اس کے پاس پہنچا تو وہ اپنا بیگ موٹر سائیکل پر رکھ رہا تھا۔ اس سے کام میں کوئی غلطی ہوئی تھی جس سے جھماکا ہوا تھا مگر... بہ ظاہر بجلی کے جھماکے نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ قیصر نے اس سے پوچھا۔ ''تم ٹھیک ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے اپنا بیگ باندھتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

''تم مجھے اکثر یہاں کھمبوں پر چڑھے دکھائی دیتے ہو، کبھی بجلی کے کھمبے پر اور کبھی فون کے کھمبے پر۔''

''میں نہیں سمجھ سکا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے زیرلب کہا۔ وہ عجلت میں اپنا بیگ باندھ رہا تھا۔

''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم اکثر یہاں بجلی کے کھمبوں پر دکھائی دیتے ہو جبکہ بجلی اور فون کے کھمبے الگ الگ ہیں۔ کیا دونوں محکموں نے تمہیں ملازم رکھا ہوا ہے؟''

اس بار وہ جواب دیے بغیر موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا۔

''اے..... تم اس طرح نہیں جاسکتے۔'' قیصر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''میرے سوالوں کا جواب دو۔''

اس نے جو جواب دیا، وہ قیصر نے سوچا نہیں تھا۔ اس نے مخالف سمت میں ذرا جھک کر اچانک اس کے پیٹ پر لات ماری اور قیصر لڑکھڑا کر ذرا دور جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر اٹھتا اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور ایکسلریٹر دیا۔ جب تک قیصر کھڑا ہوتا، وہ خاصا آگے جا چکا تھا۔ قیصر نے چلا کر کہا۔ ''تم ایسے نہیں جاسکتے۔''

اس نے ایک پتھر بھی اس کی طرف اچھالا مگر وہ اس کی زد سے دور جا چکا تھا۔ قیصر نے اپنے کپڑے جھاڑے۔ اس کے دماغ میں جیسے طوفان آیا ہوا تھا۔ اگر وہ شخص سچ مچ کوئی ٹیکنیشن تھا تو اسے یوں فرار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ دال میں کچھ کالا تھا۔ غلام ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ان کی نگرانی ہوتی ہے۔ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ نگرانی اس طرح سے کیوں ہوتی تھی۔ بے شک ان کھمبوں سے احاطے کے اندر کا بیشتر حصہ نظر نہیں آتا تھا مگر ان کھمبوں سے احاطے کے گیٹ اور سڑک کی طرف آنے والے راستے کی نگرانی کی جاسکتی تھی اور اگر کوئی احاطے سے نکلنا چاہتا تو کھمبے پر موجود فرد کو فوراً نظر آجاتا۔ جاسوسی کا یہ نظام اتنا تیز تھا کہ فوری طور پر اس کی شہر روانگی کی خبر ڈاکٹر عزیز کو دے دی گئی اور وہ بس اسٹاپ پر اس کا منتظر تھا۔ جیسے ہی اس کی بس آئی وہ اس میں سوار ہو گیا۔ اس نے قیصر سے بات کی اور اسے مجبور کیا کہ وہ واپسی کا فیصلہ کرے۔ جیسے جیسے وہ اس بارے میں سوچ رہا تھا، اسے لگ رہا تھا کہ تصویر واضح ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے غصہ بھی آرہا تھا۔ اس نے سوچا۔

'مجھے واپس نہیں آنا چاہیے تھا۔'

مگر فوراً ہی اس نے خود سے کہا۔ ''یہ الگ معاملہ ہے۔'' واپسی کا فیصلہ غلط نہیں تھا، یہ فیصلہ ہی اس کے حق میں ہے۔ ہاں اس کی اور دوسرے لوگوں کی جو نگرانی ہو رہی ہے وہ غلط ہے۔ وہ اندر جا رہا تھا کہ اسے خیال آیا کہ نگرانی اصل میں اس کی نہیں بلکہ علاج گاہ کے مریضوں کی ہو رہی تھی۔ اسی نگرانی کی وجہ سے رفیع زمان کئی بار فرار ہوتے ہوئے پکڑا گیا۔ یہ خیال آتے ہی اس کا اشتعال کم ہونے لگا اور جب وہ اندر آیا تو کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اسے کبھی احاطے سے باہر جاتے ہوئے نہیں روکا گیا۔ نہ ہی اس نے محسوس کیا کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ یہ بات غلام نے محسوس کی کہ ان کی نگرانی ہو رہی ہے اور ان کی سچ مچ نگرانی ہوتی تھی۔ وہ سب نفسیاتی مریض تھے اور ان کو آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ مگر ڈاکٹر عزیز کو کیسے پتا چلا کہ وہ بس میں بیٹھ گیا ہے اور اپنے گھر کی طرف جا رہا ہے۔

اس کا مطلب تھا کہ کل وقتی تو نہیں لیکن کسی حد تک نگرانی کی جا رہی تھی۔ اسے احاطے اور آس پاس گھومنے پھرنے اور آنے جانے کی مکمل آزادی تھی مگر اس جگہ سے دور جانے کی آزادی نہیں تھی۔ وہ الجھنے لگا۔ کبھی اسے لگتا کہ اس کی نگرانی نہیں ہو رہی ہے اور کبھی لگتا کہ اس کی بھی نگرانی ہو رہی ہے۔ چوکیدار شمس نے اس سے معمول کی سلام دعا کی اور اس نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا جس سے لگے کہ اس کی گمشدگی محسوس کی گئی تھی۔ احاطے میں کوئی نہیں تھا۔ ڈاکٹر زین اور شیما جا چکے تھے کیونکہ پارکنگ میں ان کی گاڑیاں نہیں تھیں۔ دفتر اور اسپتال والی عمارت کی اندرونی روشنیاں بند تھیں۔ صرف میس اور رہائش والی عمارت کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ وہ تقریباً آٹھ بجے واپس آیا تھا اور ڈنر کا وقت ختم ہونے کو تھا۔ وہ میس میں داخل ہوا تو وہاں کوئی نہیں تھا سوائے شوکت اور اس کے نائب کے اور وہ بھی جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ شوکت نے اسے دیکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''تم نے دیر کر دی ہے۔''

''کوئی بات نہیں...... مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں صرف براؤن کے لیے کھانا لینے آیا ہوں۔''

میس کے قواعد کے مطابق وقت گزرنے کے بعد کسی کو کھانا نہیں دیا جاتا تھا۔ شوکت نے براؤن کا شاپر تیار کیا ہوا تھا۔ ''میں سوچ رہا تھا کہ جاتے ہوئے تمہارے کیبن پر دیتا جاؤں، ویسے آج آئے کیوں نہیں؟''

''میں ذرا مصروف تھا۔'' قیصر نے اس سے شاپر لیا۔ ''شکریہ۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' شوکت نے کہا اور پھر

ذرا جھک کر بولا۔ ''اس میں الگ سے ایک پیکٹ ہے، اس میں دو سینڈوچز ہیں تمہارے لیے۔''

قیصر نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا۔ براؤن حسب معمول بے تابی سے اس کا منتظر تھا۔ قیصر نے پلیٹ میں اُس کا کھانا ڈال کر دیا تو وہ ٹوٹ پڑا۔ قیصر نے اپنے لیے سینڈ وچز نکالے۔ یہ سیلوفین میں تھے اور وہ وہیں برآمدے کے کنارے بیٹھ کر کھانے لگا۔ اس وقت ہوا رک گئی تھی اس لیے سردی اتنی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ براؤن نے اپنا کھانا ختم کر کے بھونک کر اس کا شکریہ ادا کیا اور وہیں زمین پر لیٹ گیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ آج اسے سردی نہیں لگ رہی تھی۔ پھر وہ اٹھ کر برآمدے کے کنارے تک آیا۔ قیصر نے بھانپ لیا کہ اب وہ پنجوں سے کنارہ کھرچے گا۔ اس نے خبردار کرنے والے انداز میں کہا۔ ''براؤن۔''

وہ سمجھ گیا اور وہیں زمین پر لیٹ گیا اور دونوں پاؤں اوپر کر لیے۔ گویا وہ تعمیل کر رہا تھا۔ قیصر نے خالی ڈبا اور اپنا سیلوفین شاپر میں ڈال کر اسے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ آج شوکت نے ہڈیاں نہیں دی تھیں۔ اس رات بھی وہ دیر سے سویا۔ واقعات اور خیالات اس کے ذہن میں گھومتے رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اسے نیند آئی۔ رات کسی وقت بارش ہونے لگی اور موسم خاصا سرد ہو گیا۔ اسے اپنے گرم بستر میں بھی سردی لگ رہی تھی اور اسی وجہ سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ سردیوں میں گرمائش کے لیے ہیٹر تھا مگر اس وقت اسے چلانے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ سردی لگی تو اسے خیال آیا کہ ہیٹر آن کر لے مگر بستر سے نکلنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ لیٹا رہا اور پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح اس کی آنکھ براؤن کے بھونکنے اور نسوانی ہنسی کی آواز سے کھلی۔ اس نے جیکٹ پہنی اور باہر آیا جہاں شیما گلابی رنگ کے سوٹ اور ہم رنگ سوئٹر میں براؤن کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ وہ اس کے لیے فریس بی لائی تھی اور اسے دور اچھالتی تو براؤن بھاگ کر لے آتا تھا۔ جب وہ اسے لا کر دیتا تو ساتھ ہی اچھل اچھل کر مطالبہ کرتا کہ وہ فریس بی اچھالے۔ شیما کو اس پر ہنسی آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے فریس بی زیادہ دور اچھال دی اور اس کی طرف آئی۔

''ہیلو۔''

قیصر نے سر ہلایا۔ ''کیسی ہو تم؟''

''فائن۔'' وہ بولی۔ ''تمہارا کتا تربیت یافتہ ہے۔ یہ فریس بی سے کھیلنا جانتا ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم تھا۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''مجھے یہاں آئے ہوئے چھ مہینے سے اوپر ہو گئے ہیں لیکن مجھے یہاں کے لوگوں کے بارے میں بھی ٹھیک سے علم نہیں ہے تو دو دن میں اس براؤن کے بارے میں کیا جان سکتا ہوں۔''

شیما کی مسکراہٹ ماند پڑ گئی۔ ''کیا کچھ ہوا ہے؟''

قیصر کو خیال آیا کہ اس سے کہے لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ خاموش رہا۔ براؤن فریس بی لے کر اس کے پاس آیا اور مطالبہ کرنے لگا کہ اب فریس بی وہ پھینکے لیکن اس نے فریس بی براؤن سے لے کر شیما کو تھما دی اور پلٹ کر جانے لگا۔ شیما کا چہرہ بالکل بجھ گیا۔ وہ کچھ دیر اپنے نازک لب کاٹتی رہی پھر اس کے پیچھے لپکی۔ ''سنو، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

''اندر آ جاؤ۔'' قیصر نے کہا۔

''نہیں۔'' وہ ہچکچا کر بولی۔ ''یہیں کر لیتے ہیں۔''

قیصر پلٹ کر آیا۔ ''کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔''

اس کے روکھے لہجے اور انداز پر شیما کو غصہ آ گیا۔ ''تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟''

''میں خود کو کچھ نہیں سمجھتا۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

''پھر میرے ساتھ یوں کیوں پیش آتے ہو؟'' شیما بولی تو اس کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ ''کیا تمہیں میری انسلٹ کرنا اچھا لگتا ہے۔''

''نہیں۔'' اس بار اس کا لہجہ دفاعی ہو گیا۔ ''میں نے یوں کبھی نہیں سوچا۔ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ تم جیسی خوب صورت اور اعلیٰ خاندان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی میری طرف متوجہ ہو۔''

''تم ایسا کیوں سوچتے ہو؟'' وہ جذباتی ہو گئی۔

''تم میرے بارے میں جانتی ہو؟''

''صرف اتنا جتنا کہ یہاں موجود دوسرے لوگ جانتے ہیں۔''

''جب تم میرے بارے میں جانتی نہیں ہو تو میری طرف کیوں بڑھ رہی ہو؟'' قیصر نے ذرا کھل کر کہا۔ شیما کی نظریں جھک گئیں۔

''میں...... میں نہیں جانتی۔''

قیصر نے گہری سانس لی۔ ''شیما! میں ایک ایسا شخص ہوں جو اپنا سب کھو چکا ہے اور میں کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔''

''تم ایسا کیوں سوچتے ہو۔ تم زندہ ہو، صحت مند ہو۔ جو کھویا ہے، کیا وہ دوبارہ نہیں مل سکتا؟''

''نہیں۔'' قیصر کا لہجہ پھر روکھا ہو گیا۔ ''میں نے جو

کھویا ہے وہ مجھے واپس نہیں مل سکتا۔“
”جہانگیر۔“ شیما نے کہنا چاہا تو وہ بات کاٹ کر بولا۔
”پلیز! میری التجا ہے اس موضوع پر مجھ سے بات مت کرو۔ ہم صرف اچھے دوست بن سکتے ہیں اور وہ بھی ایک دوسرے کے لیے۔ اس سے زیادہ کوئی تعلق درست نہیں ہوگا۔“

شیما سر جھکائے ہونٹ کاٹ رہی تھی پھر وہ پلٹی اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی چلی گئی۔ ایک بار اس نے یوں چہرے کی طرف ہاتھ کیا جیسے آنسو صاف کر رہی ہو۔ قیصر اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر اندر آگیا۔ وہ پہلے ہی زندگی کے مشکل ترین دور سے گزر رہا تھا اور شیما کا رویہ اس کے لیے مشکلات میں اضافہ ہی کرتا۔ وہ تیار ہو کر میس میں آیا۔ وہاں غلام سمیت سب موجود تھے۔ رفیع بھی تھا اور آج خاصا تروتازہ لگ رہا تھا۔ قیصر غلام کے ساتھ اس کی میز پر آگیا۔ رفیع سے علیک سلیک کے بعد وہ بھی ناشتے میں لگ گیا۔ رفیع نے بتایا کہ آج اس کا چیک اپ ہوگا اور اگر وہ کامیاب رہا تو وہ یہاں سے جاسکے گا۔ اس خیال نے اسے بہت خوش کر دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے یقین ہو کہ وہ یہاں سے چلا جائے گا۔

ناشتے کے بعد وہ اور غلام اپنے کام میں لگ گئے۔ آج کام زیادہ تھا۔ تینوں عمارتوں کی مکمل صفائی کرنا تھی۔ تفصیلی صفائی مہینے میں دو بار کی جاتی تھی اور اس میں خاصا وقت لگ جاتا تھا۔ آغاز انہوں نے رہائشی عمارت سے کیا۔ اس میں سب سے زیادہ وقت لگا۔ جب وہ میس کی صفائی کر چکے تو کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ کھانے کے بعد انہوں نے باقی جگہوں کی صفائی شروع کی۔ اگلی باری دفتر کی عمارت کی تھی۔ ڈاکٹر اطہر، ڈاکٹر سیفی اور شیما اسپتال والی عمارت میں تھے۔ وہ سیفی کی صفائی کر کے باہر نکلے تو انہیں ہلچل دکھائی دی۔ سلطان، رفیق اور ان کے ساتھ شمس بھی کسی کو تلاش کر رہے تھے۔ قیصر نے ڈاکٹر سیفی سے پوچھا تو اس نے کہا۔ ”رفیع غائب ہے۔ اسے چیک اپ کے بعد چند منٹ کے لیے کمرے میں چھوڑا گیا اور جب دوبارہ دیکھا تو وہ اپنی جگہ نہیں تھا۔“

وہ سب اسے احاطے میں تلاش کر رہے تھے مگر قیصر کا خیال کچھ اور تھا۔ اس نے غلام سے کہا۔ ”تم اسپتال کی صفائی شروع کرو، میں ابھی آتا ہوں۔“
کچھ دیر بعد شیما غلام کے پاس آئی۔ اس نے قیصر

کے بارے میں پوچھا تو غلام نے اسے بتا دیا کہ وہ احاطے سے باہر گیا ہے۔ یہ سن کر شیما کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے بھی تیز قدموں سے احاطے سے باہر کا رخ کیا۔

☆☆☆

غلام کو سامان دے کر قیصر تیزی سے احاطے سے باہر آیا اور اس نے چٹان کا رخ کیا۔ عجلت میں اوپر جاتے ہوئے وہ معمول سے جلد اوپر پہنچ گیا تھا اور جیسے ہی وہ اوپر پہنچا اسے رفیع نظر آ گیا۔ وہ چٹان کے ڈھلان والے کنارے پر خطرناک حد تک آگے کھڑا ہوا تھا۔ ذرا توازن بگڑنے کی دیر تھی اور وہ پلٹ کر واپس بھی نہیں آسکتا تھا۔ اس نے قیصر کی آمد کی آہٹیں سن لی تھیں اور جب وہ اس کے پاس آیا تو وہ مڑے بغیر بولا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں زیادہ دن اپنے بیوی بچوں سے دور نہیں رہوں گا۔“

قیصر ممکن حد تک آگے آیا۔ ”تمہارے بیوی بچے کہاں ہیں؟“

رفیع نے ذرا سا سر موڑا۔ اس کا جسم ساکت تھا اور وہ اپنا زور توازن پر لگا رہا تھا۔ ”تم نہیں جانتے؟“

”جانتا ہوں۔“

”پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”تم اپنے بیوی بچوں کے پاس جانا چاہتے ہو لیکن وہ مر چکے ہیں۔ تم نے اپنے ہاتھ سے انہیں مارا تھا۔“

وہ عجیب سے انداز میں ہنسا۔ ”یہ احمق سمجھتے ہیں کہ میں پاگل ہوں۔ میں اپنے بیوی بچوں کو زندہ سمجھ رہا ہوں، ان کے پاس جانا چاہتا ہوں۔“

قیصر دم بخود رہ گیا۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ ”تو تم ایسا نہیں سمجھتے؟“

”میں ایسا سمجھتا تو کیا فرار کی کوشش کرتا۔“ رفیع کا لہجہ بدل گیا۔ وہ رو رہا تھا۔ ”میں پاگل ہوں، میں نے اپنے بیوی بچوں کو مار دیا۔ مجھے شاہدہ کے کردار پر شک تھا۔ میں بچوں کو اپنے بچے نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے انہیں اپنے شک کی بھینٹ چڑھا دیا۔ میں پاگل تھا مگر میرا پاگل پن انہیں مار کر ختم ہو گیا۔ اب میں ہوش مند ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔“

”تم اب بھی غلط کر رہے ہو۔“

”یہ تمہارا اور دوسروں کا خیال ہے۔ مجھ جیسے شخص کی کیا سزا ہونی چاہیے؟“

”تم اپنے بیوی بچوں سے ملنا چاہتے ہو؟“

”ہاں میں اسی لیے یہاں آیا ہوں۔“

”مگر اس طرح تم خودکشی کر کے ان سے نہیں مل سکو گے۔“

رفیع کا تنا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ قیصر کی طرف گھوما اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ بھی ایک دھوکا ہے جو میں خود کو دیتا آیا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں خود کو اپنے کیے کی سزا دینا چاہتا ہوں۔ وہ سزا جو عدالت نے مجھے نہیں دی۔ مجھے ایک دنیاوی جہنم میں دھکیل دیا جبکہ میں اصل جہنم کا حق دار ہوں۔“ اس نے کہتے ہوئے قیصر کی طرف دیکھا۔ ”تم مجھ سے کہیں اچھے انسان ہو اور اس انجام کے مستحق نہیں ہو جو میرا مقدر بن چکا ہے۔ خدا حافظ۔“

”نہیں۔“ قیصر چلایا مگر رفیع پیچھے کی طرف جھکا اور اس کا جسم طویل خلا میں یوں گیا جیسے اسے کسی نے نیچے سے کھینچ لیا ہو۔ قیصر کو عقب سے چیخ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو شیما منہ پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ وہ کب اوپر آئی قیصر کو پتا نہیں چلا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ اس نے شیما کا بازو تھاما تو وہ ہذیانی لہجے میں بولی۔

”وہ نیچے کود گیا ہے، وہ مر گیا ہے۔“

”ہاں، وہ مر چکا ہوگا۔“ قیصر نے نرمی سے کہا۔ ”ہم اس کے لیے اب کچھ نہیں کر سکتے مگر دوسروں کو اطلاع دینا ضروری ہے۔“

دو گھنٹے بعد ایک نجی فلاحی تنظیم کے رضا کار رسیوں سے اسٹریچر سے بندھی رفیع کی لاش اوپر لا رہے تھے۔ قیصر نے شیما کو نیچے پہنچا دیا اور خود واپس اوپر آ گیا تھا۔ وہ لاش کے ساتھ ہی واپس آیا۔ علاج گاہ میں یہ سوگ کا دن تھا۔ سب خاموش اور افسردہ تھے۔ ان میں سے ایک آدمی کم ہو گیا تھا۔ رفیع کے لواحقین آ گئے تھے مگر ڈاکٹر اطہر نے پہلے پوسٹ مارٹم کرانے پر زور دیا اور پولیس لاش سرکاری اسپتال لے گئی تھی۔ لواحقین میں رفیع زمان کی ایک بہن اور دو بھائی تھے۔ اسے شیما کے بارے میں پتا چلا کہ اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور وہ چلی گئی تھی۔ جب وہ اسے چٹان سے نیچے چھوڑنے آیا تھا تب بھی اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی اور وہ صدمے کی کیفیت میں تھی مگر اس نے قیصر سے کہا تھا کہ وہ خود چلی جائے گی۔ اب اسے پتا چلا کہ وہ گھر چلی گئی تھی۔ قیصر، ڈاکٹر اطہر کے پاس آیا۔

”ڈاکٹر شیما کی حالت اچھی نہیں تھی، ان کو ڈرائیو نہیں کرنا چاہیے تھی۔“

”میں بھی اسے منع کرتا مگر وہ بتائے بغیر چلی گئی۔“ ڈاکٹر اطہر نے کہا۔ ”میری ابھی اس سے بات ہوئی ہے، وہ گھر میں ہے اور بالکل ٹھیک ہے۔“

''کیا میں اس سے بات کر سکتا ہوں؟'' قیصر نے جھجک کر پوچھا۔

ڈاکٹر اطہر نے اپنا موبائل نکالا اور اس پر شیما کا نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔ ''شیما! کیسی ہو... جہانگیر تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' اس نے کہہ کر موبائل قیصر کی طرف بڑھا دیا۔ وہ موبائل لے کر ذرا فاصلے پر آیا۔

''شیما! کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔'' وہ بولی۔ ''تمہیں میرا خیال کیسے آ گیا؟''

''تمہاری حالت ٹھیک نہیں تھی اور تم ڈرائیو کر کے چلی گئیں اس لیے مجھے فکر ہو رہی تھی۔''

''میں آرام سے پہنچ گئی تھی اور اب ٹھیک ہوں۔''

''بس مجھے یہی پوچھنا تھا۔''

''ایک منٹ رکو۔'' شیما جلدی سے بولی تو وہ ڈاکٹر کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔

''کہو؟''

''مجھے تمہارا یوں فکر مند ہونا اچھا لگا۔''

''خدا حافظ۔'' قیصر نے کہہ کر موبائل ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ ''تھینک یو ڈاکٹر۔''

پولیس نے قیصر سے بیان لے لیا تھا اور اس نے وہی سب بتایا جو ہوا تھا۔ پولیس کے بعد ڈاکٹر اطہر نے بھی اپنے دفتر میں اس سے سوالات کیے۔ ایک خاص سوال جو پولیس نے نہیں پوچھا مگر ڈاکٹر اطہر نے پوچھا۔ ''تمہیں کیسے خیال آیا کہ وہ چٹان کی طرف گیا ہوگا؟''

''کیونکہ اسے ایک بار چٹان کے پاس سے پکڑا گیا تھا اور وہ ہمیشہ اپنے بیوی بچوں کے پاس جانے کی بات کرتا تھا۔ اس کے بیوی بچے مر چکے تھے اور یہ بات وہ بھی جانتا تھا۔ اس سے مجھے لگا کہ وہ خودکشی کرنا چاہتا تھا۔ آج اس نے نیچے گرنے سے پہلے جو کہا، اس سے تصدیق بھی ہوئی کہ وہ مرنا چاہتا تھا۔''

ڈاکٹر اطہر نے اسے غور سے دیکھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے اس نے ٹھیک کیا؟''

قیصر حیران ہوا۔ ''بالکل نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میرے خیال میں خودکشی کسی صورت درست قدم نہیں ہے۔''

''اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کا قاتل تھا۔''

''تب بھی اسے سزا دینا عدالت کا کام تھا۔ اسے خود اپنی زندگی ختم کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔''

ڈاکٹر اطہر نے سر ہلایا۔ ''تم نے ٹھیک کہا، کسی انسان کو حق نہیں ہے کہ وہ اپنی زندگی خود ختم کرے۔ موت اور زندگی پر صرف اللہ کا اختیار ہے اور جو اس حد کو توڑتا ہے اسے دائمی عذاب سہنا پڑتا ہے۔''

''لیکن انسان اپنی زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے تب؟''

''کیسا فیصلہ؟''

''یہی کہ وہ اپنے ماضی میں جانا چاہے؟''

''ماضی میں جانا ناممکن ہے۔''

''میرا مطلب ہے کہ وہ چاہے کہ اس کی زندگی پہلے جیسی ہو جائے تو کیا یہ سوچ غلط ہوگی؟''

''اگر اس کی پہلی زندگی اس کے نزدیک زیادہ خوش اور مطمئن کرنے والی ہو تو اسے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' اس بار ڈاکٹر اطہر کا لہجہ محتاط تھا۔

''اگر اس میں کوئی مشکل ہو تب؟''

''اس کی مشکل حل کرنے کے لیے معاشرے میں ادارے اور افراد موجود ہیں، اسے ان پر بھروسا کرنا چاہیے۔''

''لیکن رفیع زمان نے ایک ادارے میں اور آپ لوگوں کے ہوتے ہوئے خودکشی کر لی۔'' وہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ''مجھے اجازت دیں، میں تھک گیا ہوں۔''

''بالکل، اب تم آرام کرو۔'' ڈاکٹر اطہر نے کہا۔ ''تمہارے ذہن میں جو سوالات ہیں، تم بالکل فری ہو کر مجھ سے پوچھ سکتے ہو۔''

''میں جلد آپ سے پوچھوں گا۔'' اس نے جواب دیا اور باہر نکل آیا۔ رفیع والے واقعے کے فوراً بعد تمام مریضوں کو ان کے کمروں میں بھیج دیا گیا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور سورج تقریباً غروب کے قریب تھا۔ وہ کیبن میں آیا تو خود کو سچ مچ تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ گزشتہ دو دن سے ہونے والے واقعات اور حالات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ رفیع کی خودکشی بھول جانے والی بات نہیں تھی جبکہ اس نے آخری گفتگو اس سے کی تھی اور اس کے سامنے ہی نیچے کود گیا تھا۔ اسے رہ رہ کر وہ منظر یاد آ رہا تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ کیا اس کی منزل بھی خودکشی ہوگی؟ اس نے ڈاکٹر کے سامنے شدت سے اس کی مخالفت کی تھی مگر انسان کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کے سامنے کب زندگی کا دروازہ بند ہو جائے اور اس کے لیے سوائے موت کے اور کوئی راستہ باقی نہ رہے۔ شاید رفیع کے لیے بھی زندگی کا

دروازہ بند ہوگیا تھا اور اس نے موت کا انتخاب کیا۔

☆☆☆

اپریل کا پہلا ہفتہ گرمی کا احساس لایا تھا۔ سردی ختم ہوگئی تھی۔ پودوں اور درختوں نے نئے پتوں کا مکمل پیراہن اپنالیا تھا اور خزاں کے تمام آثار مٹ گئے تھے۔ رفیع زمان کی خودکشی کا سانحہ بھی مدھم پڑگیا تھا۔ سب کچھ معمول پر آگیا تھا مگر اس کے لیے سب معمول پر نہیں آیا تھا۔ اس کے اندر جیسے بوجھل پن بڑھ گیا تھا۔ شیما سے اس کی تقریباً ہر روز بات ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس کے کیبن تک آجاتی تھی مگر وہ کبھی کیبن کے اندر نہیں آئی تھی۔ صفائی کے دوران وہ اس کے دفتر میں اس سے مل لیتا تھا۔ وہ اسے کافی ضرور دیتی تھی۔ اس روز بھی اس نے اسے کافی پر روک لیا۔ قیصر کو اس کے ہاتھ کی بنی کافی اچھی لگتی تھی۔ اس نے کافی مشین میں ڈالی اور اس کی طرف دیکھا۔ ’’ایک بات کہوں؟‘‘

’’کہو۔‘‘

’’تم یہ کام مت کرو۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’یہ تمہاری شخصیت پر سجتا نہیں ہے۔ تم اس سے کہیں اوپر کے کام کے قابل ہو۔‘‘

’’میں اس کام سے مطمئن ہوں۔‘‘

’’لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا۔‘‘

وہ خاموش رہا۔ شیما نے اس کے سامنے مگ رکھا۔ اس نے گھونٹ لیا اور پوچھا۔ ’’تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟‘‘

’’کوئی ایسا کام جو تمہاری شخصیت اور صلاحیت کے مطابق ہو۔‘‘

’’جب میں اپنی شخصیت اور صلاحیت کے مطابق کام کررہا تھا تب مجھے اس کا کیا فائدہ ہوا؟‘‘

شیما ذرا آگے جھکی۔ ’’ضروری نہیں ہے کہ انسان کو ہمیشہ نقصان ہی ہو۔‘‘

’’میرے مقدر میں نقصان ہی ہے۔‘‘ اس نے گہری سانس لی۔ ’’بچپن سے اپنے لیے نقصان ہی دیکھا ہے۔‘‘

شیما نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور نرمی سے بولی۔ ’’قیصر! مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم مجھ پر اعتماد کرسکتے ہو۔‘‘

قیصر کئی دن سے محسوس کررہا تھا کہ اس کے اندر بوجھ بڑھ رہا ہے اور اگر اس نے یہ بوجھ کسی کے سامنے ہلکا نہ کیا تو شاید اسے بھی رفیع زمان کی طرح اپنی زندگی ختم کرنا پڑے گی اور وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ جب شیما نے پوچھا تو اسے لگا کہ اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ وہ بولنے لگا۔ اس نے بچپن کی پہلی یاد سے آغاز کیا اور جب وہ خاموش ہوا تو شیما کو اپنی زندگی کے ہر گوشے سے آگاہ کرچکا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی اور اس کا ہاتھ سہلاتی رہی۔ اس نے ایک بار بھی مداخلت نہیں کی۔ جب قیصر خاموش ہوا تب بھی وہ چپ رہی۔ پھر اس نے خالی ہونے والے مگ اٹھالیے۔ قیصر کھڑا ہوگیا۔ ’’بہت دیر ہوگئی ہے، اب میں چلوں گا۔‘‘

شیما اس کے قریب آگئی۔ ’’میں اور میرا وقت تمہارے لیے ہے۔‘‘

تب بے اختیار قیصر کے بازو اس کے نازک وجود کے گرد حمائل ہوگئے اور وہ اسے سمیٹتے ہوئے اس کے صبیح چہرے پر جھک گیا۔ شیما نے مزاحمت نہیں کی بلکہ خود کو اس کے سپرد کردیا۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی اور جب وہ ہلکا سا کسمسائی تو قیصر چونکا اور اسے چھوڑ دیا۔ شیما کا چہرہ انتہائی حد تک سرخ ہورہا تھا مگر اس کی سرمئی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ قیصر نے کہنا چاہا۔

’’سوری میں......‘‘

اس نے قیصر کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ’’نو سوری۔‘‘

قیصر باہر آیا تو خود کو بالکل بدلا ہوا انسان محسوس کررہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس نے ہما کے ہوتے ہوئے کیسے کسی دوسری عورت کے لیے اپنے اندر محبت کا جذبہ محسوس کیا اور کیسے اس کے وجود پر اپنا حق جتایا۔ بے شک وہ اس کی طرف آئی اور اسے اپنی طرف متوجہ کیا مگر آج پیش قدمی اس نے کی تھی۔ اس کے اندر کا بوجھل پن غائب تھا اور وہ خود کو ہلکا پھلکا اور مطمئن محسوس کررہا تھا۔ بہار کے آغاز کے ساتھ ہی مالی آگیا تھا۔ اس نے نئی کیاریوں اور پھول دار پودوں کی بوائی شروع کردی تھی۔ پرانے اور خراب ہوجانے والے پودے اور درخت نکالنے کے کام کا آغاز کردیا تھا۔ قیصر اور غلام اس کی مدد کررہے تھے۔ کبھی کبھی براؤن بھی مدد کو آجاتا اور شاخیں اور پتھر منہ میں دبا کر کچرے کے لیے مخصوص گڑھے میں پھینک آتا۔ ان کے ساتھ رہ کر اسے پتا چل گیا تھا کہ کچرا کہاں پھینکا جاتا ہے۔ عمارتوں کے درمیان والی جگہیں مکمل طور پر لان میں بدلنے کا فیصلہ ہوا تھا۔

کچھ پرانے اور خراب ہوجانے والے درخت کاٹے جارہے تھے۔ ان سے لکڑی نکال کر جمع کی جارہی تھی۔ مریضوں کے لیے مخصوص عمارت میں گرمائش اور گرم پانی

کی فراہمی ایک بھٹی سے کی جاتی تھی جو لکڑی سے جلتی تھی۔ گرما میں درختوں کی کاٹ چھانٹ سے جو لکڑی نکلتی وہ اس مقصد کے لیے جمع کرلی جاتی تھی۔ یہ کام قیصر اور غلام کر رہے تھے۔ ان کے پاس برقی اور دستی آریاں اور کلہاڑیاں تھیں۔ سامنے والے لان سے چند درخت کم ہوئے تو یہاں سے ہائی وے کے ساتھ بنے مکان نظر آنے لگے۔ بعض مکان پورے نظر آرہے تھے اور بعض کی صرف اوپری منزل نظر آتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایک درخت کے گرے تنے کو ٹکڑوں میں کاٹ رہے تھے۔ اچانک غلام نے کچھ کہا تو اسے برقی آری کے شور میں سنائی نہیں دیا۔ اس نے آری روکی اور پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟''

غلام کے جسم میں پھر اضطرابی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ نگرانی کررہے ہیں۔''

قیصر نے آس پاس دیکھا۔ ''کہاں؟''

''وہ دیکھو۔'' غلام نے ہائی وے کے مکانات کی طرف اشارہ کیا اور قیصر نے دیکھا تو اسے ایک مکان کی سائڈ والی دیوار پر ایک شخص سیڑھی سے چڑھا کچھ کرتا نظر آیا۔ چند لمحے دیکھنے کے بعد قیصر نے اندازہ لگایا کہ وہ رنگ کررہا تھا۔ اتنی دور سے اس کے ہاتھ میں برش تو واضح نہیں تھا مگر اس کی جسمانی حرکات بتا رہی تھیں کہ وہ رنگ کررہا ہے۔ قیصر کا اچھا خاصا موڈ خراب ہونے لگا مگر اس نے نرمی سے کہا۔

''وہ رنگ کررہا ہے۔''

''نہیں۔'' غلام نے اصرار کیا۔ ''وہ نگرانی کررہا ہے۔ کوئی نہ کوئی ہماری نگرانی کرتا ہے۔''

قیصر کو غصہ آنے لگا مگر وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ ''تم غلط سمجھ رہے ہو۔''

غلام نے ہاتھ میں موجود کلہاڑی نیچے پھینک دی اور تیز لہجے میں بولا۔ ''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''

قیصر آگے آیا۔ اس نے غلام کے شانے پکڑ کر اسے جھنجوڑ ڈالا اور سخت انداز میں کہا۔ ''سنو، یہ سب تمہارا وہم ہے۔ کوئی ہماری نگرانی نہیں کررہا ہے...... سنا تم نے، کوئی نگرانی نہیں کررہا ہے۔''

غلام کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ اس نے زیرِلب کہا۔ ''تم مجھ پر اعتبار نہیں کررہے۔''

''ہاں اگر تم احمقانہ بات کروگے تو میں کبھی تسلیم نہیں کروں گا۔'' قیصر نے ایک جھٹکے سے اسے چھوڑ دیا۔ وہ مڑا اور برقی آری اٹھانے لگا۔ اس نے دیکھا نہیں کہ غلام نے کلہاڑی اٹھالی ہے اور وہ زیرِلب کہہ رہا تھا۔

''تم بھی دوسروں جیسے ہو۔ تم نے بھی مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔''

پیچھے سے عجیب سی آواز آئی تو قیصر نے مڑ کر دیکھا۔ غلام نیچے گرا ہوا لرز رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے کلہاڑی چھوٹ گئی تھی۔ ایک طرف سے سلطان نمودار ہوا اور اس نے ٹیزر گن کا تار غلام کے جسم سے الگ کیا تب اس کی تھرتھراہٹ تھم گئی۔ قیصر نے چلا کر کہا۔ ''یہ تم نے کیا کیا ہے؟''

''یہ تم پر کلہاڑی سے وار کرنے والا تھا۔'' سلطان نے غلام کو الٹ کر اس کے ہاتھ پیچھے کرکے نائلون کی فکس ہوجانے والی ڈوری سے باندھے۔

''تم غلط کہہ رہے ہو۔'' قیصر آگے آیا تو سلطان نے ٹیزر گن کا رخ اس کی طرف کردیا۔

''پیچھے ہٹ جاؤ اور یہ نیچے رکھ دو۔'' اس کا اشارہ برقی آری کی طرف تھا۔ قیصر نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور برقی آری نیچے رکھ دی۔ اسے اب تک یقین نہیں آیا تھا کہ غلام ایسی حرکت کرسکتا ہے۔ وہ اس پر کیوں حملہ کرنے لگا؟ مگر آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر اطہر کے دفتر میں اس کے کمپیوٹر مانیٹر پر سی ٹی وی کیمرے کی ریکارڈنگ دیکھ کر اسے یقین آگیا۔ اس کے مڑتے ہی غلام نے کلہاڑی اٹھالی تھی اور پھر سر سے بلند کرکے اس پر وار کرنے والا تھا کہ سلطان نے بروقت پہنچ کر اس پر ٹیزر گن آزمائی۔ اگر وہ ایک لمحے کی تاخیر کرتا تو غلام اس پر وار کردیتا۔ قیصر شاک میں رہ گیا۔ پھر اس نے ڈاکٹر اطہر سے کہا۔

''میں یا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ غلام جیسا شخص کسی پر وار کرسکتا ہے، وہ بھی مار ڈالنے کے لیے۔''

''وہ بہ ظاہر بے ضرر ہے۔'' ڈاکٹر اطہر نے کہا۔ ''لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ وہ صرف سولہ سال کی عمر میں اپنے باپ کو قتل کرچکا ہے۔ اس سے پہلے دوبار اس نے لوگوں پر قاتلانہ حملے کیے مگر ان کی خوش قسمتی کہ وہ بچ گئے۔ غلام کا باپ سخت گیر تھا اور اس نے غلام کی شخصیت کچل دی تھی۔ ایک شام گھر والوں نے غلام کو اس حالت میں پکڑا جب وہ اپنے باپ کے مردہ جسم پر چاقو سے وار کررہا تھا۔ اس کا باپ شاید پہلے ہی وار میں مرگیا تھا مگر وہ اس کے بعد بھی اس پر وار کرتا رہا تھا اور ڈاکٹروں نے کل اڑتالیس نشان بتائے جو احسان قادر کے جسم پر گردن سے پیٹ تک آئے تھے۔ غلام کو گرفتار کرلیا گیا مگر میڈیکل بورڈ

نے اسے پاگل قرار دے کر پاگل خانے بھیج دیا اور وہاں سے یہ میرے پاس آیا۔"

قیصر حیران ہوا۔ "جب وہ اس حد تک خطرناک ہے تو اسے اتنی آزادی کیوں دی گئی؟ اس کے مقابلے میں رفیع کو یہ آزادی نہیں دی گئی۔"

"رفیع اپنی جان لینا چاہتا تھا۔"

"اور غلام؟"

"وہ جب سے یہاں آیا ہے اس نے ایک بار بھی جارحانہ رویہ نہیں دکھایا۔" ڈاکٹر اطہر نے مبہم انداز میں جواب دیا اسی لمحے اس کی کال آگئی اور اس نے ریسیو کر کے قیصر سے کہا۔ "تم سے پھر بات کروں گا۔"

قیصر اس کا مطلب سمجھ کر اس کے دفتر سے باہر نکل آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ غلام خطرناک نہیں رہا تھا تو اسے آزادی دی گئی مگر اس نے ثابت کر دیا کہ وقت پڑنے پر وہ خطرناک ہو سکتا ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ سلطان کیسے... بروقت پہنچ گیا تھا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ غلام خطرناک ہو رہا ہے اور وہ اس پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ بالکل درست وقت پر پہنچا اور اس نے اسے ٹیزر گن سے قابو کر لیا۔ اس واقعے کے بعد تمام مریضوں کو ان کے کمروں تک محدود کر دیا گیا تھا۔ وہ باہر آیا تو رفیق اس کا منتظر تھا۔ اس نے کہا۔ "تمہیں اپنے کیبن تک محدود رہنا ہے۔"

"کیوں؟"

"بس کچھ حالات ایسے ہو گئے ہیں۔" رفیق نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ "یہ عارضی حکم ہے۔"

قیصر نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے جب حکم ختم ہو جائے تو مجھے بتا دیا جائے۔"

"تم فکر مت کرو۔"

وہ کیبن کی طرف آیا جہاں براؤن موجود تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بھونکا جیسے پوچھ رہا ہو کہ وہ بے وقت کیوں آیا ہے۔ قیصر نے اس کا سر سہلایا اور اندر آگیا۔ یہاں آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب اسے یوں کوئی حکم ملا ہو اور وہ اپنے کیبن تک محدود کر دیا گیا ہو۔ شاید غلام کی حرکت کی وجہ سے ایسا ہوا تھا لیکن وہ یہاں مریض نہیں تھا ورنہ اسے بھی اسی عمارت میں رکھا جاتا مگر اب تک وہ آزاد تھا اور پہلا موقع تھا کہ اسے پابند کیا گیا تھا۔ وہ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اسے کیبن میں رہنے کا حکم ملا ہے لیکن کوئی اسے یہاں قید نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کی نگرانی ہو سکتی تھی کیونکہ یہاں کیمرے نہیں لگے تھے۔ اگر وہ یہاں سے نکل جائے تو کسی کو کیا پتا چلے گا؟ اس نے اٹھ کر جوتے پہنے اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ وہ باہر نکلا تو براؤن اس کے پاس آکر دم ہلانے لگا۔ رات ہو چکی تھی اور وہ یقیناً بھوک محسوس کر رہا تھا۔ اس نے براؤن کا سر سہلایا اور آہستہ سے بولا۔

"تم یہیں رکو۔"

وہ مروجہ راستے کے بجائے درختوں کے درمیان سے گزرتا ہوا گیٹ کی طرف آیا۔ تب اس نے خلافِ معمول پہلی بار گیٹ بند دیکھا اور شمس وہاں چوکس موجود تھا۔ گیٹ بند کرنے سے ظاہر تھا کہ اس وقت کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ درختوں کی آڑ لیتے ہوئے اور روشنی سے بچتے ہوئے گیٹ کے پاس جا رہا تھا۔ وہ گیٹ کے پاس پہنچا تھا کہ اسے عمارتوں کی طرف سے کوئی آتا دکھائی دیا اور قیصر جلدی سے ایک بڑے تنے کی آڑ میں ہو گیا۔ آنے والا سلطان ثابت ہوا اور اس نے آتے ہی شمس سے پوچھا۔ "قیصر یہاں تو نہیں آیا؟"

"نہیں وہ یہاں نہیں آیا۔" شمس نے جواب دیا۔

"ہوشیار رہنا، وہ کیبن سے نکل گیا ہے۔ اگر اس طرف آئے تو مجھے اشارہ دینا۔"

"تم بے فکر رہو۔" شمس نے جواب دیا تو سلطان واپس چلا گیا۔ قیصر کو لگا جیسے اس کے اندر طوفان آگیا ہو۔ وہ درختوں سے ہوتا ہوا اور دوڑتا ہوا کیبن تک آیا۔ کیبن کے پاس آکر اس نے کسی چیز کی تلاش شروع کی مگر وہ اسے نہیں ملی۔ اسے مضطرب دیکھ کر براؤن نے بھی بھونکنا شروع کر دیا۔ پھر وہ کیبن کے سامنے زمین کو پنجوں سے کھودنے لگا۔

قیصر اندر آیا۔ اس نے ایک بار پھر چیچ سے ریک کے پیچھے تصویر تلاش کرنے کی کوشش کی مگر تصویر باہر نہیں آئی۔ تب اس نے انگلیاں ریک اور دیوار کے درمیانی خلا میں پھنسائیں اور زور لگایا۔ چرچراہٹ کے ساتھ ریک دیوار سے الگ ہونے لگا اور پھر وہ الگ ہو گیا۔ تب اس نے دیکھا فرش پر تختے لگے تھے اور تصویر غائب تھی۔ یہاں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں تصویر غائب ہو جاتی۔ کسی نے اسے یہاں سے نکالا تھا اور کسی کو صرف ایک صورت میں یہاں تصویر کا علم ہو سکتا تھا۔

اس نے کیبن میں ایک ایک جگہ دیکھنا شروع کر دیا اور بالآخر اسے..... وہاں لگے چھوٹے سے فانوس کے اوپر وہ کیمرا نظر آگیا جو یہاں کے مناظر کہیں دکھا رہا تھا۔ اسے کرسی پر چڑھ کر دیکھنا پڑا تھا۔ اس کی ایک تار نکل کر چھت

کی طرف جارہی تھی۔ اس نے کیمرا پکڑ کر کھینچا تو وہ تار سے نکل آیا۔ قیصر نے اسے فرش پر پٹخ کر توڑ دیا۔ وہ کیبن سے باہر آیا اور اس نے برآمدے کے سامنے لگا تختہ اکھاڑنے کی کوشش کی۔ وہ بہت مضبوط تھا۔ تب اس کی توجہ براؤن کی کھودی ہوئی زمین کی طرف گئی۔ اس نے گڑھے میں جھانکا تو اسے اندر کوئی سیاہ سی چیز نظر آئی۔ اس نے اسے پکڑ کر کھینچا تو وہ تار نکلا۔ ایک طرف یہ کیبن میں جارہا تھا اور دوسری طرف مخالف سمت میں جارہا تھا۔ اس نے زور لگا کر زمین سے تار کھینچنا شروع کیا۔ وہ زیادہ گہرائی میں نہیں تھا۔ مشکل سے سات آٹھ انچ کی گہرائی تھی اس لیے آرام سے یہ کام ہو رہا تھا۔ ہر بار جھٹکے سے کئی گز تار زمین سے باہر آجاتی تھی۔

زمینی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے تار کو مضبوط پلاسٹک کے خول میں رکھا گیا تھا اس لیے تار ٹوٹ نہیں رہی تھی اور یہ فون کی تار کی طرح مضبوط تھی۔ وہ اسے کھینچتا ہوا عمارتوں کے درمیان والے باغ تک آیا اور جب اس نے یہاں چند بار تار کھینچی تو اسے اندازہ ہوگیا کہ تار کا رخ دفتر والی عمارت کی طرف تھا۔ وہ ابھی عمارت سے کچھ دور تھا کہ مریضوں والی عمارت سے سلطان اور رفیق برآمد ہوئے۔ انہیں دیکھتے ہی قیصر نے تار پھینکا اور دفتر کی طرف بھاگا۔ وہ بھی لپکے مگر قیصر تیز ثابت ہوا وہ دروازہ کھول کر اندر گھسا اور اسے اندر سے لاک کر دیا۔ فوراً ہی باہر سے دروازے پر زور آزمائی ہونے لگی مگر اسے کھولنا یا توڑنا آسان نہیں تھا۔ قیصر نے کمروں میں جھانکا مگر اسے تینوں کمروں میں کوئی نظر نہیں آیا۔ تب اس کا خیال سرنگ کی طرف گیا۔ اس کا دھاتی دروازہ بند تھا۔ اس نے ایک طرف دیوار پر لگے فائر فائٹر کے باکس کا شیشہ کہنی کے وار سے توڑا اور اندر سے کلہاڑی نکال لی۔

اب باہر والے دروازے پر ضربیں لگنا شروع ہوگئی تھیں۔ سلطان اور رفیق لاک توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے ان کی طرف توجہ دیے بغیر کلہاڑی گھما کر پوری قوت سے دروازے کے لاک والے حصے پر ماری۔ کلہاڑی اندر گھس گئی تھی۔ اس نے کلہاڑی واپس کھینچی اور پھر ماری۔ تیسری ضرب پر دروازے کا لاک جواب دے گیا اور اس نے لات ماری تو دروازہ کھل گیا۔ وہ کلہاڑی بدست اندر داخل ہوا اور سرنگ سے مڑ کر اس حصے میں آیا جو اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ سرنگ کے آخری حصے میں ایک دروازہ تھا اور وہ بند ثابت ہوا۔ کھولنے میں ناکامی کے بعد اس نے یہاں بھی کلہاڑی آزمائی۔ اس دروازے کا لاک دو ضربوں میں ٹوٹ گیا۔ وہ اندر داخل ہوا تو ڈاکٹر اطہر، ڈاکٹر سیفی اور شیما وہاں موجود تھے۔ ایک طرف دیوار پر درجن بھر اسکرینیں لگی تھیں اور ان پر احاطے میں لگے مختلف کیمروں کے مناظر دکھائے جارہے تھے۔ ڈاکٹر اطہر اور ڈاکٹر سیفی کے چہروں پر خوف تھا مگر شیما سر جھکائے کھڑی تھی۔

''کیوں......'' اس نے شدتِ جذبات سے گھٹ جانے والی آواز میں کہا۔ ''میرے ساتھ ایسا کیوں؟''

''قیصر! میری بات سنو۔'' ڈاکٹر اطہر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ وہ ذرا احتیاطاً پیچھے سرک گیا تھا۔ قیصر کے تاثرات اور اس کے ہاتھ میں موجود کلہاڑی نے اسے ڈرا دیا تھا۔

''کیا سنوں اور اب تمہیں میرا اصل نام بھی یاد آگیا۔'' قیصر نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''مجھے دھوکے سے یہاں رکھا گیا اور بہ ظاہر مجھے آزادی دی گئی۔''

''اس کی وجہ ہے......'' ڈاکٹر اطہر نے کہنا چاہا۔

''بکواس...... یہ سب مجھے میری بیوی بچی سے دور رکھنے کی سازش تھی۔'' قیصر نے چلا کر کہا اور کلہاڑی گھما کر سامنے میز پر رکھے آلات پر ماری۔ ڈاکٹر سیفی لرز گیا۔

''ایسا نہیں ہے۔'' شیما پہلی بار بولی۔

''تم...... تم چپ رہو۔'' قیصر نے اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔ تم ان لوگوں کے ساتھ ملی ہوگی۔ اسی لیے تم کیبن میں نہیں آتی تھیں تمہیں معلوم تھا کہ وہاں کیمرا لگا ہوا ہے۔''

''قیصر پلیز ٹھنڈے دماغ سے میری بات سن لو۔'' ڈاکٹر اطہر نے پھر کہا۔

''مجھے بیوقوف مت بناؤ۔ تم صرف مہلت لے رہے ہو تاکہ تمہارے گرگے آجائیں اور مجھے بے بس کر کے دوبارہ قید کر دیا جائے۔ سچ مچ قید کر دیا جائے۔''

''اوکے۔'' ڈاکٹر اطہر نے کہا۔ ''تم میری بات نہیں سننا چاہ رہے ہو تو جو تمہارا دل کرے وہ کرو۔ مجھے مار دو، یہاں موجود ہر فرد کو مار دو۔''

''ڈاکٹر۔'' سیفی چلایا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ سچ مچ ہمیں مار دے گا۔''

''تب ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر اطہر نے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ ''یہ کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔''

شیما نے ایک بار پھر کہا۔ ''قیصر پلیز! ایک بار سن لو۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''کہو لیکن اس خیال میں مت رہنا کہ کوئی مجھ پر قابو پالے گا۔ جب تک یہ کلہاڑی میرے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہاتھ میں ہے کوئی میرے پاس نہیں آسکتا۔''

ڈاکٹر اطہر ذرا آگے آیا۔ ''یہ حقیقت ہے کہ تم یہاں ایک پیشنٹ کی حیثیت سے موجود ہو مگر تمہارا کیس اتنا منفرد ہے کہ تمہیں بہ ظاہر آزادی دی گئی۔''

''مگر میری پوری طرح نگرانی ہوتی تھی۔ غلام ٹھیک کہتا تھا۔''

''ظاہر ہے، ہم تمہیں آزاد کس طرح چھوڑ سکتے تھے۔''

''اگر ایسا ہی تھا تو ڈاکٹر عزیز نے مجھے پھانسی کے پھندے سے کیوں بچایا، یہاں کیوں پہنچایا؟''

''یہ صرف تمہارا خیال ہے۔ تمہیں نہ پھانسی کے پھندے سے بچایا گیا ہے اور نہ یہاں پہنچایا گیا ہے۔''

قیصر کا چہرہ تن گیا۔ ''ایسا لگ رہا ہے، تم وقت گزاری کی کوشش کر رہے ہو۔''

''یہ سچ کہہ رہے ہیں۔'' شیما بولی۔ ''تم نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا جس پر تمہیں پھانسی دی جا سکتی۔''

''میں نے آغا نجم الدین کو قتل کیا تھا۔''

''میں نے کہا نا یہ تمہارا خیال ہے۔ آغا نجم الدین آج بھی زندہ ہے۔'' ڈاکٹر اطہر نے کہا۔

''بکواس، مجھے سب یاد ہے۔''

''تمہیں جو یاد ہے، وہ سب تمہارے دماغ کی تخلیق ہے۔ اس نے اصل حقیقت تم سے چھپا کر تمہیں ایک ایسی کہانی دے دی جس نے تمہیں یقین دلایا کہ تم پھانسی کے پھندے سے بچ کر یہاں آئے ہو۔''

قیصر چند لمحے کو چکرا گیا۔ ''تمہارا مطلب ہے، مجھے کوئی سزا نہیں ہوئی اور نہ پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا؟''

''بالکل ایسا ہی ہے۔''

''ڈاکٹر عزیز نے مجھے بچایا، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''ڈاکٹر عزیز بھی تمہارا خیال ہے۔ ڈاکٹر عزیز کا تین سال پہلے ایک ائر کریش میں انتقال ہو چکا ہے۔''

قیصر نے اپنا سر تھام لیا۔ ''یا تو میں پاگل ہوں یا تم مجھے بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''تمہارا کیس اتنا منفرد ہے کہ اس نے ماہرین کو بھی حیران کر دیا اور اسی وجہ سے میں تمہیں یہاں لایا ہوں۔ میں تمہارا علاج کرنا چاہتا تھا۔''

قیصر نے اس کی طرف دیکھا۔ ''اگر میں نے ایسا کچھ نہیں کیا اور مجھے سزا نہیں ہوئی تو پھر میں یہاں کیوں موجود ہوں؟''

''تاکہ تمہیں اصل حقیقت سے روشناس کرایا جائے اور تمہیں اس صدمے کو سہارنے کے قابل بنایا جائے جس سے تمہیں بچانے کے لیے تمہارے دماغ نے یہ کہانی تخلیق کی ہے۔''

''کیسا صدمہ...... کیا میرے ساتھ کچھ ہوا تھا؟''

''ہاں۔'' ڈاکٹر اطہر نے کہا۔ ''بہت برا ہوا تھا۔ اس شام جب اپنے خیال میں تم نے آغا نجم الدین کو قتل کیا، تم دفتر سے نکل کر گھر آئے تھے۔''

''مجھے ایسا کچھ یاد نہیں ہے۔'' اس نے جھٹلانے والے انداز میں کہا۔

''یہ سچ ہے۔'' ڈاکٹر اطہر نے کہا تو شیما نے مداخلت کی۔

''ڈاکٹر! کیا اسے بتانا مناسب ہوگا؟ آپ جانتے ہیں اس کا شدید ری ایکشن ہو سکتا ہے۔ اسے ری ایکشن سے بچانے کے لیے آپ نے یہ سارا سیٹ اپ کیا تھا۔''

''لیکن اس سچویشن میں ہمارے پاس سوائے سچ بولنے کے اور کیا راستہ رہ گیا ہے؟''

''ہاں ڈاکٹر! ہمیں اسے سچ بتا دینا چاہیے۔'' ڈاکٹر سیفی نے تائید کی' اسے اپنی فکر لگی تھی۔ ڈاکٹر اطہر نے اس کی طرف دیکھا۔

''قیصر! میں واضح کر دوں کہ تمہارے لیے یہ بہت بڑا صدمہ ہوگا۔''

اس کا دل تیز دھڑکنے لگا تھا۔ ''کیسا صدمہ؟''

''سب سے بڑا صدمہ جو تمہیں اپنی زندگی میں ہو سکتا ہے۔''

''میری نوکری چھوٹ گئی تھی، آغا نجم الدین نے مجھے ملازمت سے نکال دیا تھا؟''

''نہیں، بات اس سے کہیں بڑی ہے۔'' ڈاکٹر اطہر نے ہچکچا کر کہا۔ ''تم سوچ سکتے ہو کہ تمہاری زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت کس چیز کی ہے؟''

''میری بیوی اور بچی کی۔'' قیصر نے کہا۔ ''ان کو کیا ہوا ہے؟''

''تم اسی شام انہیں گھمانے کے لیے لے کر نکلے تھے۔ تم اپنی کار پہاڑی کے اوپر لے گئے تھے۔''

''مجھے یہ سب کیوں یاد نہیں آ رہا؟'' اس نے اپنا ماتھا مسلا۔

''واپسی میں تمہاری کار کو حادثہ پیش آیا اور......''

''میں سب بھول گیا۔''

''ہاں لیکن یہ یادداشت کی گم شدگی نہیں بلکہ اصل کے بجائے ایک فرضی یادداشت کی تخلیق کا کیس ہے۔'' ڈاکٹر اطہر نے اعتماد سے کہا۔ ''تم اس حادثے کو بھول گئے اور تم نے فرض کر لیا کہ اس روز تم دفتر سے آئے ہی نہیں تھے اور تم

نے آغا نجم الدین کو قتل کردیا پھر تمہیں سزائے موت ہوئی اور تمہیں ڈاکٹر عزیز نے موت کے پھندے سے بچا کر یہاں پہنچا دیا۔ تمہاری شناخت بدل دی گئی۔"

"جبکہ ایسا کچھ نہیں ہوا؟" اس نے پھر بے یقینی سے کہا۔

"ہاں، ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔"

"تب حقیقت میں کیا ہوا تھا؟"

"تم اس کار حادثے میں بچ گئے مگر ہوش میں آنے کے بعد تم یوں ظاہر کررہے تھے جیسے تم نے آغا نجم الدین کو قتل کردیا ہے اور تم اب پولیس کی تحویل میں ہو۔ پھر تمہیں عدالت سے سزائے موت ہوئی۔ تمہاری بیوی بچی سے تمہاری آخری ملاقات کرائی گئی اور تمہیں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔"

"ایسا سچ میں ہوا تھا۔" اس نے کہا۔

"نہیں، یہ قطعی خیال ہے۔ ہمارے ملک میں گزشتہ کئی سالوں سے کسی مجرم کو پھانسی نہیں دی گئی ہے۔"

اب قیصر کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ "میں نے ایسا کیوں سوچا؟ بھلا کوئی انسان اس حد تک مکمل فرضی بات سوچ سکتا ہے؟"

ڈاکٹر اطہر نے سر ہلایا۔ "میں ماہرِ نفسیات ہوں اور گزشتہ تیس سال سے اس شعبے میں ہوں۔ میں نے ہزاروں مریضوں کا علاج کیا ہے۔ بے شمار ایسے حیرت انگیز واقعات اور کیسز دیکھے ہیں جن میں سے ہر ایک منفرد ہے۔ تمہارا کیس بھی ایسا ہی ہے۔ انسانی دماغ دنیا کی طاقتور ترین مشین ہے جبکہ یہ اپنی پوری استعداد سے کام بھی نہیں کرتا ہے۔ ذہین ترین افراد اپنے دماغ کا مشکل سے دس فیصد استعمال کرتے ہیں۔"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ انسانی دماغ کیسے اور کتنا کام کرتا ہے۔" قیصر بولا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟ کس صدمے نے مجھے اس حال میں پہنچایا۔"

ڈاکٹر اطہر نے گہری سانس لی۔ "پہاڑی سے اترتے ہوئے تمہاری کار بے قابو ہو کر ایک درخت سے ٹکرائی اور اس میں آگ لگ گئی۔"

"میں جل گیا تھا مگر میرے جسم پر کوئی نشان نہیں ہے۔"

"نہیں، تم بچ گئے تھے۔ تم جھٹکے سے دروازہ کھلنے سے باہر جا گرے تھے اور کسی بڑی چوٹ سے بھی محفوظ رہے تھے۔"

اب تک وہ شعوری طور پر اس بات کو نظر انداز کررہا تھا۔ اس نے ہما اور روما کے بارے میں نہیں پوچھا تھا حالانکہ وہ بھی کار میں تھے۔ وہ اپنے خدشے کو جھٹلا رہا تھا اور خود کو یقین دلا رہا تھا کہ ہما اور روما خیریت سے ہیں۔ اس نے خود ان کو تصویر میں دیکھا ہے مگر ڈاکٹر اطہر اور اس سے زیادہ شیما کے تاثرات اور انداز بتا رہا تھا کہ شاید وہ خیریت سے نہیں تھیں۔ وہ بھی بتاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ قیصر نے بہ مشکل پوچھا۔ "اور کار میں دوسرے جو تھے؟"

ڈاکٹر اطہر نے اس سے نظریں چرالیں۔ شیما آگے آئی، اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ کسی بھی موقع پر اس سے خوفزدہ نظر نہیں آئی تھی بلکہ اس کے تاثرات شرمساری کے تھے۔ شیما نے آہستہ سے کہا۔ "قیصر! کیا تمہیں کچھ یاد نہیں ہے؟"

"کیا یاد نہیں ہے؟" اس کا لہجہ وحشت زدہ ہوگیا۔

"اپنے ذہن پر زور دو۔" شیما کا لہجہ ملتجی ہوگیا۔ "یہ ضروری ہے اگر ہم نے بتایا تو تمہیں شاک لگ سکتا ہے۔"

"میں...... میں۔" قیصر کہتے ہوئے رک گیا۔ اچانک اسے لگا جیسے وہ کہیں اور ہو۔ وہ کار پر کپڑا یار رہا تھا اور روما اندر سے اچھلتی کودتی آرہی تھی اور چلا رہی تھی کہ وہ آج بہت سارا گھومے گی۔ پھر وہ آئس کریم پارلر میں آئس کریم کھا رہے تھے۔ پھر وہ پہاڑی پر تھے اور کار نیچے جا رہی تھی۔ وہ بریک دبا رہا تھا اور بریک کام نہیں کررہے تھے۔ پھر اس کے سامنے آگ بھڑک رہی تھی۔ آگ کار میں لگی تھی اور اس کے اندر ہما اور روما تھیں۔ وہ سیٹ بیلٹ سے بندھی تھیں اور خود کو آزاد کرانے کی کوشش کررہی تھیں مگر بدحواسی میں یا کسی وجہ سے وہ خود کو آزاد نہیں کرا پا رہی تھیں۔ وہ آگ میں جلتے ہوئے مدد کے لیے چلا رہی تھیں۔ وہ سڑک پر گرا ہوا انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کی چیخیں اور فریادیں سن رہا تھا۔ ہما اسے پکار رہی تھی۔ روما، بابا...... بابا کہہ رہی تھی مگر وہ ان کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا پورا جسم مفلوج ہوگیا ہے۔ آگ میں تیزی آ رہی تھی۔ ہما اور روما کی چیخیں اب مدھم پڑ گئی تھیں اور پھر وہ غائب ہوگئیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی جیسے تاریکی میں ڈوب گیا۔ وہ چونکا تو شیما سامنے تھی۔ اس نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ "یہ کیسے ممکن ہے۔ میں نے خود ان کی تصویر اخبار میں دیکھی اور اپنے پاس تراشا بھی کاٹ کر رکھا تھا۔"

"تم اس تراشے کی بات کررہے ہو۔" ڈاکٹر اطہر نے تراشا آگے کیا۔ "اس میں موجود عورت اور بچی ہما اور روما نہیں ہیں بلکہ تمہارے تخیل نے انہیں ہما اور روما کی صورت میں دکھایا ہے۔"

قیصر نے تراشا دیکھا۔ اس میں عورت اور بچی بچ بچ کوئی اور تھیں۔ باقی سب ویسا ہی تھا مگر وہ ہما اور روما نہیں تھیں۔ اسے لگا کہ اس کا سر چکرا رہا ہے اور پھر تراشا اور پورا ماحول اس کی آنکھوں کے سامنے دھندلانے لگا۔ آخری احساس یہ تھا کہ وہ گر رہا ہے اور کوئی اسے تھام رہا ہے۔

☆☆☆

وہ جاگا تو کھڑکی کے آگے درخت کی ہری سی شاخ پر ایک خوش رنگ پرندہ بیٹھا ہوا سریلی آواز نکال رہا تھا۔ کھلی کھڑکی سے تازہ ہوا کے ساتھ نباتات اور پھولوں کی ملی جلی خوشبو بھی آرہی تھی۔ وہ اپنا ذہن اور جسم ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اچانک اسے ہما اور روما کا خیال آیا تو اسے اپنی آنکھوں میں نمی کا احساس ہوا مگر دکھ کا یہ احساس ایسا نہیں تھا کہ اس پر حاوی ہوجاتا۔ اس کے ذہن نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا تھا۔ پھر اسے پاس ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے سر گھمایا تو بستر کے پاس ہی ڈاکٹر اطہر اور شیما موجود تھے۔ اسے جاگتے دیکھ کر شیما آگے آئی اور اس کے بازو پر اپنا گلابی ہاتھ رکھا۔ ”اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

”بہتر۔“ اس نے جواب دیا۔

ڈاکٹر اطہر نے جھجک کر پوچھا۔ ”کیا تمہیں سب یاد ہے؟“

اس نے سر ہلایا تو شیما نے ڈاکٹر اطہر کی طرف دیکھ کر کچھ اشارہ کیا اور وہ خاموشی سے باہر چلا گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی شیما بستر پر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ”اللہ کا شکر ہے کہ تمہیں سب یاد ہے اور تمہیں نقصان نہیں ہوا۔“

”اس سے زیادہ نقصان اور کیا ہوگا۔“ قیصر نے گہری سانس لی۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ شیما کچھ دیر بعد بولی۔ ”صدمہ شدید تھا تبھی تمہارے دماغ نے اسے بھلا دیا۔ ورنہ شاید تم پاگل ہوجاتے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، کیا اب میں ٹھیک ہوں؟“

”امید تو یہی ہے۔“ شیما نے جواب دیا۔ ”ورنہ جب تک تم ہوش میں نہیں آئے تب تک ڈاکٹر اطہر بھی یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔“

”کیا مجھے یہاں سے جانے کی اجازت ہو گی؟“ قیصر نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا۔

”کیوں نہیں، تمہارا مسئلہ نفسیاتی نہیں بلکہ سیلف ڈیفنس کا تھا۔ ڈاکٹر اطہر اور دوسرے ماہرین کا کہنا تھا کہ تمہیں خود سب یاد آئے تو بہتر ہے۔ دوسری صورت میں تمہیں شدید نقصان کا خطرہ ہے۔ اس میں نروس بریک ڈاؤن سے لے کر ہمیشہ کے لیے دماغی معطلی جیسا کوئی بھی نقصان ہوسکتا تھا۔“

قیصر سوچ رہا تھا کہ وہ باہر جا کر کیا کرے گا۔ اب تک وہ خود کو بہلاتا آیا تھا کہ باہر اس کی بیوی، بچی ہے اور شاید وہ کبھی ان کے پاس جاسکے مگر اب وہ جانتا تھا کہ باہر کوئی اس کا منتظر نہیں ہے۔ شیما اس کی کیفیت نوٹ کر رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”قیصر! باہر دیکھو، یہ شاخ چند مہینے پہلے خشک اور خالی تھی۔ آج یہ ہری اور پتوں سے بھری ہے۔ وقت سب بدل دیتا ہے۔“

”ہاں لیکن جو انسان سے چھن جاتا ہے، وقت اسے لوٹا نہیں سکتا۔“

شیما نے گہری سانس لی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ بات میں نے بھی بہت مشکل سے سمجھی ہے۔“

قیصر نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ ”تمہارے ساتھ کیا ہوا؟“

”میں نے اپنا منگیتر کھو دیا۔ وہ صرف منگیتر نہیں میرا کزن بھی تھا۔ ہمارا بہت طویل ساتھ تھا۔ شادی سے صرف دو مہینے پہلے گھر سے دفتر جاتے ہوئے ایکسیڈینٹ کا شکار ہو گیا۔ میں بکھر گئی تھی۔ میرا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔ مجھے بہت مشکل سے زندگی کی طرف واپس لایا گیا۔ مجھے واپس لانے میں ڈاکٹر اطہر کا اہم کردار ہے۔ پھر انہوں نے مجھے اپنے ہاں کام کرنے کی پیشکش کی اور جب میں پہلی بار یہاں آئی اور میں نے تمہیں دیکھا......“ وہ بولتے بولتے رک گئی۔

”تم نے مجھے دیکھا......؟“

جواب میں شیما نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویر نکال کر اس کے سامنے کردی۔ قیصر کو ایک لمحے کو لگا کہ یہ اسی کی تصویر ہے۔ مگر اس نے زندگی میں کبھی اس رنگ کی شرٹ نہیں پہنی تھی اور نہ ہی اس نے کبھی کسی اسپورٹس کار کے ساتھ تصویر کھنچوائی تھی۔ شیما نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ سمیر ہے میرا منگیتر۔“

”مجھ سے مل رہا ہے۔“

”جب تمہیں دیکھا تو مجھے بھی یہی لگا تھا۔“

قیصر نے گہری سانس لی۔ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ شیما اس کی طرف کیوں متوجہ ہوئی، اس کی طرف کیوں بڑھی تھی۔ اس نے تصویر رکھ کر شیما کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، وقت سب کچھ نہ سہی ...... لیکن بہت کچھ بدل دیتا ہے۔“